100 سال پہلے
PDFBOOKSFREE.PK
ایم اے راحت
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ایک جوانِ رعنا کا قصۂ حیرت ناک ....

عجیب وغریب، پراسرار واقعات اس کے ہم قدم ہو گئے تھے

100 سال پہلے

ایم اے راحت

ناشر:۔

مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ

اردو بازار۔ لاہور۔ فون: 7668958

E.mail: al_quraish@hotmail.com

کامران نے پانی کا گلاس ہارون کو پیش کیا تو ہارون نے چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔

''پانی ...... میں نے تو نہیں مانگا تھا۔''

''آپ نے بے شک نہیں مانگا تھا لیکن سر! آپ کے خشک ہونٹ یہ بتا رہے ہیں کہ آپ کو پانی کی ضرورت ہے اور یہ بات میں جانتا ہوں کہ آپ خود سے کس قدر لاپرواہ ہیں۔ بھابی نے خصوصی طور پر مجھے ہدایت کی تھی کہ کامران بھیا! ذرا خیال رکھنا۔ تم جانتے ہو کہ یہ کس قدر لاپرواہ ہیں۔''

ہارون نے اسے گھور کر دیکھا، پھر بولا بولا۔ ''یار تم تو کبھی کبھی مجھے اپنی سالی لگتے ہو...... سالیاں ہی اتنا خیال رکھتی ہیں۔''

''آپ نہایت بد ذوق انسان ہیں ...... آپ کی مسز اتنی اچھی خاتون ہیں کہ اگر آپ مجھے اپنا سالا کہہ دیتے تو میں بالکل برا نہ مانتا لیکن آپ کے ذوق کی بھلا کیا داد دی جائے ...... چلئے سالی کہیں، بیوی کہیں، یہ پانی پی لیجئے۔''

ہارون کے برابر بیٹھا ہوا ڈرائیور اکرم زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ دونوں دوستوں کی یہ نوک جھونک ہمیشہ ہی مزیدار ہوا کرتی تھی اور اکرم کو اس کا خوب تجربہ تھا۔ جیپ میں یہ دونوں سوار تھے۔ مزدوروں کا ٹرک پیچھے آ رہا تھا۔ جس پر سروے کا سامان، خیمے، کھانے پینے کی اشیاء کے انبار بھرے ہوئے تھے۔ بہت بڑا ٹرک تھا اور اس پر اس کے سرکاری محکمے کا نام لکھا ہوا تھا۔ جس میں ہارون سول انجینئر تھا اور کامران اس کا دوست اور اس کا ماتحت۔

اب یہ پتہ نہیں کہ یہ دوستی قدیم تھی یا پھر محکماتی دوستی تھی لیکن بہرحال دونوں بہت اچھے ساتھی تھے۔ گورنمنٹ کے ایک تعمیراتی ادارے میں یہ ملازمت کرتے تھے۔ ہارون سول انجینئر تھا اور اس وقت یہ ٹیم ایک خاص علاقے میں سروے اور مارکیٹنگ

کرنے جارہی تھی جس پر گورنمنٹ کے ایک پروجیکٹ پر کام کرنے کا انحصار تھا۔ اس علاقے میں یہ پروجیکٹ قائم کرنے کے لئے بہت عرصے سے کاغذی کارروائی چل رہی تھی۔ جو اب مکمل ہوگئی تھی۔ جس علاقے میں انہیں سروے کرنا تھا وہ قطعی غیر آباد تھا۔ البتہ اس سے متصل ایک علاقہ قدیم سہائے پور کہلاتا تھا۔ لیکن وہ قدیم سہائے پور ایک بار شدید زلزلے کا شکار ہوکر تباہ ہوگیا تھا اور یہ بات بھی تقریباً اسی سال پرانی تھی۔ سہائے پور کی تقریباً نوے فیصد آبادی ختم ہوگئی تھی۔ دس فیصد لوگ ادھر ادھر جا کر آباد ہوگئے۔ کوئی چالیس سال تک وہاں کسی آبادی کا نام ونشان نہ رہا تھا۔ لیکن پھر وہاں سے کوئی ڈھائی میل کے فاصلے پر حکومت نے سہائے پور دوبارہ آباد کیا تھا۔

قدیم سہائے پور کے کھنڈرات اب بھی بکھرے ہوئے تھے اور یہ بات منصوبے میں شامل تھی کہ جب گورنمنٹ کا یہ پروجیکٹ یہاں بنے گا تو ان کھنڈرات کو ختم کردیا جائے گا۔ ویسے بھی ٹوٹے پھوٹے مکانات اور ایک قدیم حویلی کے آثار جو بظاہر اپنی مضبوط دیواروں کے ساتھ کھڑی تھی لیکن اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ البتہ جائے وقوع کے لحاظ سے نیا سہائے پور خاصی ترقی کرتا جارہا تھا۔ البتہ وہاں کی آبادی ابھی چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی کیونکہ مکمل طور پر وہاں ترقیاتی کام نہیں ہوسکے تھے۔

امید تھی کہ گورنمنٹ کا یہ پروجیکٹ اگر یہاں قائم ہوجائے گا تو نئے سہائے پور کی تقدیر بھی بدل جائے گی۔ نئے سہائے پور کے رہنے والے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلد ہی یہاں کام شروع ہو۔ تاکہ سہائے پور کی قسمت بھی بدلے لیکن یہ بات عام لوگوں کے درمیان نہیں تھی۔ محنت مشقت کرنے والے ہر جگہ اپنے لئے آسانیاں فراہم کرلیتے ہیں۔ ہاں پڑھا لکھا طبقہ اور وہ جو نئے سہائے پور کی اردگرد کی زمینوں کے مالک تھے اس بات کی امید لگائے بیٹھے تھے کہ بہت جلد سہائے پور میں بھی ترقیاتی کام ہوں گے۔

شہروں کو ملانے والی سڑکیں بن جائیں گی۔ بسیں چلنے لگیں گی۔ پانی کا معقول انتظام ہوجائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اور اب یہ کام شروع ہونے جارہا تھا۔ اس کی ذمہ داری ہارون کو سونپی گئی تھی اور ہارون تیاریاں کرنے کے بعد چل پڑا تھا۔

ایک اچھے مزاج کا تندرست وتوانا اور صحت مند نوجوان تھا جو اپنی بیوی افشاں اور بیٹے اشعر کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزار رہا تھا۔ ہارون کے ماضی کی بھی ایک داستان تھی لیکن وہ جدید دور کا انسان تھا اور قدیم داستانوں کے بارے میں اکثر کہا

کرتا تھا کہ افشاں جو گزر گیا سو کل، ہم آج کے پرستار ہیں۔ ہمارا آج اچھا ہونا چاہیے۔ میں سخت جدوجہد کرکے انشاء اللہ اپنے بیٹے کو ایک اعلیٰ مقام دلاؤں گا۔ مجھے مزید بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔

شہر کے ایک خوبصورت سے علاقے میں ایک اچھا سا مکان ہارون نے خود بنوایا تھا اور وہاں اپنی بیوی، بیٹے اور دو ملازموں کے ساتھ بڑی پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ بہرحال زندگی میں اگر مشقت نہ ہو تو زندگی بے مقصد ہوجاتی ہے۔ ہارون کا نام محکمے کی گڈ بک میں تھا حالانکہ اس دور میں ٹیلنٹ کو کون پوچھتا ہے۔ بڑے مشکل حالات سے گزرنے کے بعد اگر کوئی حیثیت حاصل ہوجائے تو انسان کی خوش بختی ہے ورنہ کرنے والے تو زندگیاں ختم کردیتے ہیں اور انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ہارون نے اپنا ایک مقام بنایا تھا اور اس کے محکمے کے اعلیٰ ترین افسران اس کی عزت کرتے تھے۔ مزدوروں کی یہ ٹیم لے کر ہارون سہائے پور کے نواحی علاقے میں جارہا تھا اور سخت موسم کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام کے بارے میں سوچوں میں گم تھا کہ اسی وقت اس کے دوست اور محبت کرنے والے اسسٹنٹ کامران نے اسے پانی کا گلاس پیش کیا تھا۔ سفر تیز رفتاری سے جاری تھا اور آخر کار اوورسیئر نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں سروے کرنا تھا۔ اوورسیئر پہلے کسی ٹیم کے ساتھ اس جگہ کو دیکھ کر گیا تھا۔ ٹرک وہاں رک گیا۔ تاحد نگاہ ویرانے نظر آرہے تھے۔ دھوپ کی تپش نے زمین کو کچھ اور بدنما بنا دیا تھا۔ تھوہر اور ناگ پھنی کی جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ماحول میں ایک عجیب سی گونج محسوس ہوتی تھی۔ سورج آسمان کے بیچ چلچلا رہا تھا۔

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سروے انجینئر اور اس طرح کی ٹیموں کو اس سے ہزار درجے خطرناک جگہوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔ ہارون، کامران کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ ڈرائیور نے ادھر ادھر دیکھا، ایک خودرو درخت نظر آیا جو ہرے ہرے ڈنٹھلوں کے ایک جھنڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس کا تھوڑا سا سایہ بن رہا تھا۔ جیپ کو اسی سائے کی آڑ میں کھڑا کردیا گیا اور درخت کا چھدرا چھدرا سایہ جیپ کو محفوظ کرنے کی مضحکہ خیز کوشش کرنے لگا۔ ہارون کمر پر ہاتھ رکھے دور دور تک نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ یہ جگہ کسی قدر بلندی پر واقع تھی۔ مین سڑک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہارون نے اوورسیئر کو اپنے قریب بلایا۔ اوورسیئر جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"ہاں، نقشہ نکال کر لاؤ۔" ہارون نے کہا۔

اوور سیئر تیزی سے ٹرک کی جانب دوڑ گیا جہاں اس کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس نے چمڑے کے بیگ سے ایک کاغذ کا رول اور پنسل نکالی اور اس کے بعد وہ ہارون کے پاس پہنچ گیا جو جیپ کے بونٹ پر کہنی رکھے کھڑا آس پاس کے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ اوور سیئر نے نقشہ جیپ کے بانٹ پر پھیلا دیا اور بولا۔

''وہ سر! سڑک کے اس طرف آپ اٹھائیس بٹا دو کا سنگ میل دیکھ رہے ہیں۔ یہ دیکھئے نقشے پر اس کی نشاندہی کی گئی ہے اور اوپر کا یہ نشان اس طرف کا اشارہ کرتا ہے گو یہ جگہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گیا تھا اور مجھے اسی کی نشاندہی کی گئی تھی لیکن یہ نقشہ بھی ہمیں ڈیپارٹمنٹ سے موصول ہوا ہے۔ سڑک سے دو سو گز کے فاصلے پر یہ دیکھئے! یہ دو سو کا ہندسہ، اس جگہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ جو اسکوائر نشان بنایا گیا ہے سر! یہ اس جگہ کی نشاندہی کرتا ہے جہاں ہم لوگ اس وقت موجود ہیں۔ یہ دیکھئے یہاں سے آگے جا کر کچھ ڈھلان سے شروع ہو جاتے ہیں۔ گو یہ ڈھلان زیادہ گہرے نہیں ہیں لیکن نقشے میں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ہمیں ان ڈھلانوں کو بھی استعمال کرنا ہے۔''

''ہاں ...... یہ تو ٹھیک ہے، جگہ تو یہی ہے۔ میں نے اصل میں یہ اس لئے پوچھا تھا شوکت صاحب تاکہ صحیح جگہ کیمپنگ کرائی جاسکے۔''

''جی سر! آپ بالکل اطمینان رکھیے گا۔ یہی صحیح جگہ ہے۔''

''کامران! چلو خیمے لگواؤ۔''

ہارون نے حکم دیا اور کامران گردن خم کر کے آگے بڑھ گیا۔ یہ اس کی خوبی تھی کہ دوستی کے وقت دوست اور کام کے وقت ایک فرض شناس اسسٹنٹ جو کبھی اپنے افسر اعلیٰ کو ناراض نہیں ہونے دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی نگرانی میں ٹرک سے خیمے اتروانے شروع کر دیئے۔ موٹے موٹے کینوس، بانس، کھونٹے اور ایسی ہی دوسری چیزیں مزدور زمین پر ڈھیر کرنے لگے اور ہارون جیپ سے ٹیک لگائے ان محنت کشوں کو دیکھنے لگا جن کے جسم فولاد تھے اور ذہن موم۔ یہ زندگی سے زندگی نچوڑتے تھے۔ اپنی محنت سے اپنے گھروں کو پالتے تھے۔ سورج کی حشر سامانیاں ان سے شکست کھاتی تھیں۔ سخت موسم ان پر بے اثر تھے۔ کام کے وقت وہ ایک فولادی مشین بن جاتے تھے۔ ہارون ان کی دل سے قدر کرتا تھا۔ کسی بڑے مغرور شخص سے گفتگو کرتے وقت اسے اپنا ماضی یاد رہتا تھا کیونکہ وہ خود جس خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس خاندان کو آج

تک بھلایا نہیں جا سکا تھا۔ لیکن جب وہ محنت کشوں کے سامنے ہوتا تو ان سے اتنی نرمی اور پیار سے گفتگو کرتا کہ سامنے والا شخص جان نثار کرنے پر تیار ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ مزدوروں کی یہ ٹیم جو تقریباً ستائیس افراد پر مشتمل تھی اپنے انجینئر کو اپنا بھائی سمجھتی تھی اور اپنے فرائض سے ہٹ کر بھی اس کے ہر حکم کی تعمیل کے تیار رہتی تھی۔

مزدوروں نے خیمے لگانے کے لئے کھونٹے گاڑھنا شروع کر دیئے۔ لوہے کے بڑے بڑے کھن پتھریلی زمین کا جگر چیرنے لگے اور تھوڑی ہی دیر بعد وہاں کئی خیموں کا شہر آباد ہو گیا جن میں ایک خیمہ انجینئر کے لئے مخصوص تھا۔ تمام مزدوروں کے لئے بھی آرام دہ خیمے موجود تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کے ذخیرے اتار لئے گئے اور خیموں میں منتقل کر دیئے گئے۔

ایک خیمے میں کچن بنا لیا گیا جہاں سارے مزدوروں کا کھانا تیار کرنے کے لئے باورچی جو خود بھی مزدور تھا اپنے ایک معاون کے ساتھ تیار تھا۔ کامران ان تمام کاموں کی نگرانی کر رہا تھا پھر اس نے ایک دوربین لا کر ہارون کے حوالے کی۔ وہ جانتا تھا کہ ہارون کو اس وقت دوربین کی ضرورت ہے۔ پھر وہ ہارون کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

''سر! تمام انتظام آپ کی توقع کے مطابق ہو گئے ہیں۔''

''کیوں نہ ہوں گے بھائی! جناب کامران شامی صاحب کے ہاتھوں میں ہر چیز کی ذمہ داری ہو اور کوئی کمی باقی رہ جائے، یہ ممکن تو نہیں ہے۔''

''شکریہ! ویسے سر آپ اس جگہ کو دیکھ رہے ہیں۔ کوئی خاص بات محسوس کی آپ نے ......'' کامران نے ابھی یہ سوال کیا ہی تھا کہ اوور سیئر نے اسے آواز دی۔

''شامی صاحب، کامران شامی صاحب! ذرا براہ کرم ادھر آجایئے۔''

''میں آتا ہوں ......'' کامران نے کہا اور اوور سیئر کی جانب بڑھ گیا جو کسی کام کی نگرانی کر رہا تھا۔

ہارون آنکھوں سے دوربین لگا کر ہر طرف کا جائزہ لینے لگا۔ کامران نے جو الفاظ کہے تھے وہ انہیں محسوس کر رہا تھا اور اندازے لگا رہا تھا کہ کامران کا کہنا کیا معنی رکھتا ہے پھر اس نے ان ڈھلانوں کی طرف دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر درختوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ کامران تھوڑی دیر تک تو ایسے ہی دیکھتا رہا اور اس کے بعد وہ جیپ کے بونٹ پر پاؤں رکھ کر بونٹ پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے اسے وہ ڈھلان وغیرہ

بالکل صاف نظر آ رہے تھے جن کے اختتام پر درختوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور درختوں سے خاصے فاصلے پر ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے انبار تھے جو کالی ہو چکی تھیں۔ قد آدم کھڑی دیواریں، مکانوں کے ستون اور ایسی ہی دوسری چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ پروجیکٹ کا یہ حصہ بھی استعمال کیا جانا تھا لیکن ابھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ کامران اس بات کا جائزہ لے رہا تھا کہ ان کھنڈرات کی صفائی میں سب سے زیادہ وقت صرف ہو گا۔

بہر حال ایک پورا قصبہ کہا جائے یا شہر کہا جائے۔ کھنڈر کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔ اسے سمیٹ کر زمین کو میدانوں کی شکل دینا آسان کام نہیں تھا۔ کامران جانتا تھا کہ یہ کام بھی اسی کے سپرد ہو گا۔ لیکن یہ خود اس کی تجویز تھی کہ پہلے اس پروجیکٹ کے علاقہ کو مکمل کر لیا جائے اس کے بعد اس طرف قدم بڑھائے جائیں ورنہ بیک وقت کام خاصا طویل ہو جائے گا۔ تقریباً تین بجے تھے جب کھانا تیار ہو گیا اور دوپہر کے کھانے کے لئے کوئی خاص جگہ نہیں تھی چنانچہ کھانا تقسیم ہو گیا۔ کامران، ہارون کے پاس آ گیا۔

''آیئے سر! خیمے میں چلیں۔''

''نہیں ...... تم جانا چاہو تو جاؤ۔ میں ویسے بھی بس کوئی ہلکی پھلکی چیز لے لوں گا۔ البتہ میں ایک بات سوچ رہا تھا۔''

''کیا سر ......!''

''بھئی یہاں درخت وغیرہ آس پاس نہیں ہیں ...... میرا خیال ہے میں کچھ ایسی چھتریوں کا انتظام کرنا پڑے گا جنہیں زمین میں جگہ جگہ گاڑھ دیا جائے۔ مزدور ان کے نیچے تھوڑی سی چھاؤں حاصل کر کے کھانا وغیرہ کھا لیا کریں گے اور ستا لیا کریں گے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ کام کرتے کرتے اپنے خیموں میں جائیں اور وہاں ستا کر واپس آئیں۔''

''سر! بہت اچھا آئیڈیا ہے میں فوری طور پر ان کا بندوبست کر لوں گا۔''

''فوری طور پر نہیں میرا خیال ہے کل تم ان چھتریوں کے لئے کہہ دو شاید ہمارے پاس موجود بھی ہیں۔''

''بہت بڑی تعداد میں سر! کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

''ہاں! تم اس وقت کیا کہہ رہے تھے۔'' ہارون نے سوال کی اور کھانا کھانے

لگا۔

''سر! یہ تھوڑا بہت کام شروع ہو گیا ہے آپ یہ بتایئے کہ مارکنگ کب سے شروع کریں گے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد شام ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے جب تک ہم تیاریاں کریں گے ہمارے پاس وقت نہیں رہے گا۔''

''ٹھیک ہے باقی کام تو کر لیے ہیں ناں تم نے ......''

''جی سر! باقی کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے ...... یہ کام کل صبح سے شروع کیا جائے گا تو زیادہ بہتر رہے گا۔''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اس وقت کیا کہہ رہے تھے۔''

''سر! یہ جگہ کچھ عجیب عجیب سی نہیں لگ رہی ...... ویران، ویران سی ...... ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو ...... ہماری نگرانی کر رہا ہو ...... سر! شاید میں اپنے خیالات کا صحیح انداز میں اظہار نہیں کر پا رہا ...... یہ پتھر، یہ چھوٹی چھوٹی چٹانیں، یہ بکھرا بکھرا سا میدان یوں لگ رہا ہے ہماری آمد پر حیران اور ہمیں متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔''

''اصل میں قصور تمہارا نہیں ہے شاعری کی کتابوں کے اتنے انبار لگا رکھے ہیں تم نے کہ تمہیں ہر چیز میں شاعری ہی سوجھتی ہے۔''

''سر! نہیں قسم خدا کی ...... یہاں نہ میں شاعری کر رہا ہوں اور نہ مذاق کر رہا ہوں ...... بس یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو۔'' ہارون نے ایک گہری سانس لی اور پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ پانی پینے کے بعد اس نے کہا۔

''بہر حال ہر جگہ کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے سہائے پور کی تاریخ بھی کم نہیں ہے۔ کسی سے کھنڈرات کی کوئی عظیم کہانی ہو گی۔ یہ شہر کیسے تباہ ہوا اس کا بھی کوئی واقعہ ہو گا۔''

''سر! زلزلہ ...... زلزلہ۔''

''ہاں مگر ...... یار زلزلے بھی اسی وقت آتے ہیں جب ان کا کوئی پس منظر ہوتا ہے۔''

''سر! آپ اس جدید دور کا انسان ہوتے ہوئے بھی زلزلوں کے پس منظر پر یقین رکھتے ہیں۔''

''دور کتنا ہی جدید کیوں نہ ہو جائے ...... ہم قدیم کہانیوں کو قدیم روایات کو

چھوٹ تو نہیں کہہ سکتے ...... یا کہہ سکتے ہیں؟''

''نہیں سر! یہ بات تو آپ صحیح کہتے ہیں ...... ظاہر ہے ہم سب کی ایک ماں ہے، ایک باپ اور ماں باپ کی کہانی ہے۔ کیا ہم اس کہانی کو بھی جھوٹ کہہ دیں گے۔''

''یہی میں تم سے کہنا چاہتا تھا پھر کیوں یہ بات کہتے ہو، زلزلوں کا کوئی منظر نہیں ہوتا۔''

''بس سر! ایسے ہی ...... اصل میں اس دور کا انسان بری طرح بھٹکا ہوا ہے وہ پہلے آپ کو جدید کہنے کے لئے قدیم راستوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''وہ کامیاب کبھی نہیں ہو گا اطمینان رکھو ...... جدید اور قدیم کا جو رشتہ ہے وہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے ......صدیاں پہلے کی کہانیاں کچھ اور ہوا کرتی تھیں۔ صدیوں بعد کی کہانیاں ان سے ذرا مختلف ہوئیں اور اسی طرح اختلاف کا یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے لیکن صدیوں پہلے کی جو باتیں ہیں جھوٹ نہیں ہیں۔''

''جی سر......!'' کامران نے جواب دیا۔

ویرانے میں رات اتر آئی لیکن اصطلاحات غلط نہیں ہوتیں۔ جنگل میں منگل کہا جاتا ہے۔ اب یہ تو پتہ نہیں منگل کی حیثیت کیا ہے۔ جو جنگل میں منایا جاتا ہے پر اس وقت اس ویران ماحول میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔ مزدور دن بھر کی تپش کے بعد شام کو اتر آنے والی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ضروریات وغیرہ سے فراغت حاصل کر لی گئی تھ اور نرم موسم کے باوجود مزدوروں نے ایک جگہ الاؤ روشن کر لیا تھا اور اس پر چائے وغیرہ بنائی جا رہی تھی۔ وہ ہنس بول رہے تھے پھر کسی مزدور نے گیت شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ وہ سب اس گیت میں شامل ہو گئے وہ خوبصورت لے میں گا رہے تھے۔

دندا بھر گیا آری دا
نمایاں نمایاں سک سریاں، مد بجھ گیا یاری دا
چنا رنگ دے دوانی دا
اک تیرا رنگ مشکی، دو جا حسن جوانی دا
اٹھ پیسے دوانی دے

متھے اتے سوہنے لگدے تیرے کنڈل جوانی دے
کنیں کانٹے پائے ہوئے نیں
ساڈے نالوں بٹن چنگے جیہڑے سینے نال لائے ہوئے نیں

مزدوروں کی آواز فضا میں پھیل رہی تھی اور ہوائیں اسے منتشر کر رہی تھیں۔

ہارون بھی باہر نکل آیا۔ حالانکہ ابھی رات کے پونے دس بجے تھے لیکن باہر کا ماحول ایسا لگ رہا تھا جیسے رات آدھی سے زیادہ آگے بڑھ چکی ہے۔ کامران بھی اس وقت اپنے خیمے میں ہی تھا۔ ہارون خیمے کے پچھلے حصے میں کھڑے ہو کر مزدوروں کے گانے کی آوازیں سننے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور وہ نجانے کیا سوچ رہا تھا، بہت سے ایسے مواقع آئے تھے جب افشاں اور اشعر سے دور اسے مختلف سائیٹ پر کام کرنا پڑا تھا۔ ماضی بہت سی کہانیوں کا امین تھا لیکن کسی بزرگ نے اس سے کہا تھا کہ ماضی کی دلدل میں پھنس جانے کے بعد حال کے راستے دھندلا جاتے ہیں۔ ماضی اگر خوشگوار بھی ہے تب بھی اسے ایک ٹافی کی طرح کبھی کبھی ذائقے لے کر چوس لینا چاہیے اور اس کے بعد بھلا دینا چاہیے تاکہ حال کے راستے الجھ نہ جائیں۔ ہاں حال میں افشاں تھی، اشعر تھا، وہ ان دونوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جدید دور نے فاصلے کس قدر مختصر کر دیئے ہیں اس کا اندازہ ہر شخص کو ہے۔ اس نے ان لوگوں کی قربت حاصل کرنے کے لئے موبائل فون نکال لیا جبکہ اس سے دور دراز کے اس قصبے میں اس کے گھر کی کہانی اس کے تصورات سے مختلف نہیں تھی۔ اس کی نوجوان اور حسین بیوی افشاں ایک صوفے پر بیٹھی ہارون کا سویٹر بن رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر تقریباً سات سالہ اشعر کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔

اس سے کچھ پرے ایک گوشے میں ملازمہ رشیدہ کپڑے استری کر رہی تھی۔

اچانک ہی اشعر کی آواز بلند ہوئی۔

''بدصورت شہزادے نے خوبصورت شہزادی کو دیکھا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس قدر خوبصورت لڑکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شہزادی کا رنگ دودھ کی طرح سفید تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور اس قدر خوبصورت تھیں جیسے ان میں ستارے اتر آئے ہوں۔'' اشعر کے اچانک بول پڑنے سے افشاں اور رشیدہ دونوں کی توجہ اس کی جانب مبذول ہو گئی۔ افشاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بیٹے کو محبت

بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اشعر نے کتاب بند کر کے زور سے زمین پر دے ماری تھی۔

''ارے ...... ارے ...... یہ تمہارا ساونڈ بیریر اچانک کیسے ٹوٹ گیا اور بیٹا کتابوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔''

''مماں ...... اس دور کی کتابیں ہمارے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہیں ...... آ کے دیکھئے، آپ مجھے بتائیے کہ اب اس دور میں کوئی شہزادہ ہے ...... کوئی شہزادی ہے ...... جس کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہو ...... مماں ...... جتنے لوگوں کو میں نے آج تک دیکھا ہے آپ مجھے بتائیے کہ ان میں سے کتنوں کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہے اور کس کی آنکھوں میں ستارے اترے ہوئے ہیں ...... مماں ...... اگر آنکھوں کا رنگ نیلا ہے تو کیا ہوا ...... ذرا مجھے یہ بتائیے کہ یہ شہزادیاں کیا ہوتی ہیں اور یہ ستارے آسمان سے اتر کر ان کی آنکھوں میں کہاں سے آ جاتے ہیں ...... اگر شہزادی کی آنکھوں کا رنگ نیلا ہے تو مماں ...... صرف نیلے سے کیا ہوتا ہے ...... کونٹیکٹ لینز ہر کلر میں آتے ہیں ...... لگائیے اور خوبصورت شہزادی بن جائیے ...... مماں یہ لوگ یہ کتابیں کن کے لئے لکھتے ہیں ...... ہمارے لئے اور چھاپنے والے ان کتابوں کو کس لئے چھاپتے ہیں ...... آپ مجھے نکال کر دکھا دیجئے کہ یہ شہزادیاں کیا ہوتی ہیں، کیسی ہوتی ہیں۔''

''اے بھئی ...... اب نہیں ہوتیں تو کیا ہوا پہلے تو ہوتی تھیں ناں ...... ویسے اب یہ شہزادیاں بیٹا صرف کتابوں میں رہ گئی ہیں۔''

''افسوس یہ لوگ آئزک برانٹے کے بارے میں کتابیں کیوں نہیں چھاپتے جو آنے والی نسلوں کے لئے نئی نئی ایجادات کی تجویزیں سوچتا رہتا تھا۔ مماں ...... یہ لوگ جو کیلر کے بارے میں بات کیوں نہیں کرتے جو بچوں کو سائنسی دیو اور سائنسی پریوں کے دور میں لے جاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے مماں! کہ سائنس نے کیا کیا چیزیں ایجاد کی ہیں اور مستقبل میں ان سے کیا کیا کام لیے جا سکتے ہیں۔''

افشاں نے سویٹر ایک طرف رکھ دیا اور ایک خوشگوار حیرت سے اپنے سات سالہ معصوم اور خوبصورت بچے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''تم آئزک برانٹے کے بارے میں کیا جانتے ہو ......؟''

''کیسے جانوں گا مماں ...... کیسے جانوں گا ...... اس پر کوئی اچھی کتاب لکھی ہی نہیں گئی ...... بس ایک سبق میں اس کے بارے میں پڑھا ہے۔''

''ناں ...... بیٹا ناں ...... نہ ...... نہ اتنی بڑی بڑی باتیں نہیں کرتے ...... یہ باتیں تمہاری عمر سے زیادہ ہیں۔'' جواب میں اشعر کا منہ ٹیڑھا ہو گیا۔ پھر بولا۔

''کمال ہے مماں ...... آپ بزرگوں کو کتنا اچھا بہانہ ملا ہوا ہے کہ بیٹا یہ مت سوچو تم ابھی بچے ہو ...... مماں! ہم بچوں کو اگر آپ بڑی بڑی باتیں نہیں بتائیں گے تو ہم بڑے کیسے ہوں گے ...... ویسے آپ سے کہوں ایک بات ...... سچ کہہ رہا ہوں۔ سب سے بڑی غلطی کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات نہ رکھنا ہے ...... ہوں۔''

''خدا کی پناہ ...... خدا کی پناہ! اب کیا جواب دوں بیٹا تمہیں اس کا۔ چھوڑو ...... ٹی وی دیکھو۔ رشیدہ! تم کتنی دیر میں فارغ ہو جاؤ گی۔''

''بس آخری کپڑا رہ گیا ہے ...... ایک منٹ میں فارغ ہو جاؤں گی۔'' رشیدہ جو ماں بیٹے کی گفتگو کی جانب متوجہ ہو گئی تھی جلدی سے اپنے کام کی طرف رخ کر کے بولی۔

''بس اسے کر کے تم بھی جاؤ اور آرام کرو ...... نائٹ بلب جلاتی جانا مجھے نیند آ رہی ہے ...... اوکے ......!'' افشاں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سویٹر ایک طرف رکھ دیا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اشعر کے پاس آ گئی۔

''جناب عالی! ایک بات بتائیں گے آپ۔''

''جی ماما ......''

''کہانی کی یہ کتاب آپ نے کیوں خریدی؟ آپ خود خرید کر لائے تھے اسے۔''

''مماں! آپ اس کا ٹائٹل دیکھئے۔ ٹائٹل کچھ ہے اندر کچھ ہے۔ میں سمجھا اس میں کوئی کام کی بات ہو گی۔''

''چلئے ...... اٹھیے ...... اپنے بیڈ پر جائیے ...... آپ کو خوابوں میں سائنس کی پریاں نظر آئیں گی۔''

''نہیں مماں ...... آپ یقین کیجئے خواب دیکھنے والے ادھورے لوگ ہوتے ہیں ...... میں اپنی زندگی میں مکمل ہونا چاہتا ہوں۔''

''میرے خدا ...... میرے خدا! اتنی بڑی بڑی باتیں کر کے تم کیوں اپنا بچپن کھو رہے ہو ...... چلو سو جاؤ۔'' بچے کو اٹھا کر وہ بیڈ تک لے گئی اور پھر اس نے اسے لٹا کر اس پر ہلکا سا کمبل ڈال دیا۔

''کچھ بھی کر لیں آپ! میں خواب نہیں دیکھوں گا۔'' اشعر نے مسکرا کر کہا اور

آنکھیں بند کر لیں۔ افشاں ہنس پڑی تھی۔ رشیدہ نے آخری کپڑا استری کر کے الماری میں رکھا اور بولی۔

''کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے بیگم صاحبہ!''

''دھت تیرے کی ...... یہ تجھے اچانک کیا ہو جاتا ہے، بیگم صاحبہ ...... خوامخواہ میری عمر ستر سال کی کر دیتی ہے۔'' افشاں نے ہنس کر کہا۔

''بس جی منہ سے نکل جاتا ہے افشاں بی بی ......!''

''بس جاؤ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور سنو ...... روشنی بند کر کے نائٹ بلب جلا دو۔'' افشاں نے کہا اور بستر پر پہنچ گئی اور رشیدہ نے تیز روشنی بند کر کے نائٹ بلب جلایا اور باہر نکل گئی۔ افشاں تھوڑی دیر بیٹھی محبت بھری نگاہوں سے اصغر کو دیکھتی رہی اور پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور آہستہ آہستہ واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ ذہن نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور شاید ذہنی رابطہ اسے ہی کہتے ہیں کیونکہ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ افشاں پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون کی جانب لپکی رات کے اس حصے میں اسے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

چنانچہ اس نے فون کے قریب آ کر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو ......'' اس کی آواز ابھری۔

ادھر ہارون رات کے اس حصے میں جبکہ جنگل میں تاحد نظر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور صرف اس جگہ روشنی تھی جہاں مزدوروں نے الاؤ جلا رکھا تھا اور کلوں میں چائے انڈیلی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ہی گانے کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ فون جو افشاں کو موصول ہوا تھا ہارون ہی کا تھا۔ وہ رات کے اس ماحول میں اپنی شریک حیات کو فون کر رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کان سے لگا کر کہا۔

''افشاں! میں بول رہا ہوں۔''

''ہیلو ہارون! کیسے ہو ...... کہاں ہو ......؟'' مزدوروں کی تان پھر سے ابھری۔

''اک تیرا رنگ مشکی دوجا حُسن جوانی دا۔'' ہارون نے مسکرا کر کہا۔

''سن رہی ہو افشاں ......!''

''ہاں بھئی یہ گانا بجانا کب سے شروع کر دیا تم نے ......'' افشاں کی ہنستی ہوئی

آواز سنائی دی۔

''بس یہ بے چارے میرے دکھ درد کے ساتھی ہیں ...... تمہاری جدائی میں جو وقت کاٹ رہا ہوں وہ اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔''

''ہوں ...... کہاں اور کیسے ہو ......؟''

''بالکل ٹھیک ہوں ...... مجنوں بن کر جنگلوں میں بھٹک رہا ہوں ...... آسمان پر تارے چمکے ہوئے ہیں اور تاحد نظر تاریکی پھیلی ہوئی ہے ...... ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں اور میری آنکھیں خلاؤں میں بھٹک رہی ہیں کہ شاید میرا چاند مجھے نظر آ جائے۔'' ٹیلی فون کی گفتگو پر ہوا کے دوش پر مزدوروں کی اڑتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ ''متھے اتے سوہنے لگدے تیرے کنڈل جوانی دے۔'' ہارون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ افشاں کی آواز ابھری۔

''یہ کون سے چاند کی بات کر رہے ہیں جناب!''

''ہمارے دل کے آسمان کا ایک ہی چاند ہے افشاں! اسی کی بات کر رہے ہیں۔''

''کیا بات ہے ...... ماحول کچھ زیادہ ہی رومانی لگ رہا ہے ورنہ آدھی رات کو اس طرح شاعری نہ کی جاتی۔''

''ہاں ...... ایسی ہی بات ہے ...... ہاں واقعی ماحول بے حد رومانی ہے لیکن اس ماحول میں وہ کیا کہتے ہیں کہ تیری دنیا مجسم دلکشی معلوم ہوتی ہے مگر اس حُسن میں دل کی کمی معلوم ہوتی ہے'' ہارون نے کہا۔

''واپسی کب تک ہو جائے گی ہارون!'' افشاں کی آواز ابھری۔

''ارے ...... ارے ابھی آپ سے جدا ہوئے وقت ہی کتنا گزرا ہے دیکھتے ہیں کتنے دن لگتے ہیں۔''

''خدا کی قسم یوں لگ رہا ہے جیسے بہت سے دن گزر رہے ہوں۔''

''واقعی ......!''

''تو اور کیا۔''

''اور ہمارے ولی عہد کیا کر رہے ہیں۔''

''سو گئے ہیں ...... ویسے ہارون مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں ......؟''

’’بڑی خطرناک باتیں کرتا ہے ابھی سے ...... بالکل فلاسفر ہے۔ تم اس کی باتیں سنو تو حیران رہ جاؤ۔‘‘

’’لو تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں نے کبھی اس کی باتیں سنی ہی نہ ہوں ...... ویسے میں تمہیں بتاؤں افشاں، میرا بیٹا اپنی عمر سے دس سال آگے ہے۔‘‘

’’دس سال نہیں جناب پندرہ سال کہئے۔‘‘

’’ٹھیک ہے بیٹا کس کا ہے ...... او کے افشاں، آرام کرو رات بہت ہو گئی ہے۔ خدا حافظ۔‘‘

’’خدا حافظ۔‘‘ دوسری طرف سے افشاں کی آواز سنائی دی اور ہارون موبائل ہاتھ میں لے کر اسے دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس کی نگاہیں قرب و جوار میں بھٹکنے لگیں۔ تھوڑی دیر تک وہ ماحول کا جائزہ لیتا رہا اور اس کے بعد اس نے موبائل جیب میں ڈال لیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ وہ چہرہ اٹھا اٹھا کر ہواؤں میں بسی ہوئی خوشبو سونگھ رہا تھا کہ دفعتاً ہی اس کی نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔

بہت دور ڈھلانوں سے پرے کسی روشنی کی لو چمک رہی تھی۔ ہارون ایک دم متحیر ہو گیا۔ اس کی متجسس نگاہیں ادھر کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ سوچتا رہا اور اسے یوں لگا کہ ہواؤں میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا ہو۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے اور اس کے قدم بے خودی کے عالم میں ڈھلانوں کی جانب اٹھنے لگے۔ وہ ہوش اور بے ہوشی کی منزل میں ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا ئیں اسے پیچھے سے آگے دھکیل رہی ہوں۔ وہ سنبھلتا، رکنے کی کوشش کرتا اور فضاء میں ہونے والا ارتعاش ایک بار پھر اسے ذہنی طور پر درہم برہم کر دیتا۔ اس کے قدم ڈھلانوں پر آگے بڑھنے لگے۔ کسی کو اس کی اس کیفیت کا پتہ نہیں تھا وہ بس اپنی ہی دھن میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے انداز میں کبھی کبھی کشمکش رونما ہوتی اور کبھی اس پر بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا۔

لیکن ذہنی سوچ معتدل تھی۔ وہ روشنی جو چراغ کی لو کی طرح ٹمٹما رہی تھی اور متحرک تھی مسلسل نظر آ رہی تھی پھر اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ وہ روشنی کے کافی قریب پہنچ گیا ہے۔ ساتھ ہی اسے گھنگروؤں کی چھن چھن سنائی دی اور اس کے قدم پھر رک گئے۔ روشنی کے نیچے دو پاؤں متحرک تھے۔ دو انسانی قدم روشنی کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ کبھی کبھی روشنی ایک پورے انسانی وجود کو بھی مجسم کر دیتی تھی۔

رات گہری تھی اور روشنی محدود لیکن کسی اوڑھنی کے اڑتے ہوئے آنچل کی پھڑپھڑاہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک انسانی جسم اس روشنی میں نظر آ جاتا تھا۔ ہارون کچھ اور آگے بڑھا۔ چھن چھن کی آواز اس سے آگے چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کے ہاتھ میں دیا جل رہا ہو اور ایک ہاتھ سے وہ دیئے پر سایہ کیے ہوئے ہو۔

دیئے کی روشنی اوپر جانے کی بجائے نیچے زمین پر پڑ رہی ہو اور کبھی کبھی ہوا کی ایک لہر اس انسانی جسم کو نمایاں کر دیتی جو یقیناً نسوانی جسم تھا۔ پازیب کی چھن چھن چراغ کی روشنی اور چلتے ہوئے قدم ...... یہاں تک کہ یہ روشنی اور قدم ایک درخت کی آڑ میں پہنچ گئے اور قرب و جوار میں ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ ہارون آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر اس کے مکمل ہواس واپس آ گئے اس کے منہ سے ایک سرسراتی آواز نکلی۔

’’کون ہے یہ ...... کیا ہے یہ سب کچھ ...... کون ہو تم ...... کون ہو ...... سامنے آؤ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا ...... کون ہو تم ...... ؟‘‘ جواب میں ایک سرگوشی ابھری۔

’’ہوا ...... ہوا کا جھونکا۔‘‘ دوسری سرگوشی ابھری۔

’’آسیب ......‘‘ تیسری سرگوشی ابھری۔

’’چڑیل ......‘‘ چوتھی سرگوشی ابھری۔

’’پچھل پیری ......‘‘ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر بولا۔

’’میں ہارون ہوں ...... نہ تم پچھل پیری ہو ...... نہ چڑیل ہو ...... نہ آسیب ...... یہ سب کہانیاں ہیں، ہمارے اپنے وہم کی تخلیق ...... سمجھ رہی ہو؟ کچھ بھی نہیں ہو تم ...... کچھ بھی نہیں ہو ...... اگر کچھ ہو تو سامنے آؤ ...... تم ایک انسانی وجود ہو ...... کوئی شریر لڑکی جسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہاں ایک سروے پارٹی آ کر ٹھہری ہوئی ہے ...... تم نے سوچا چلو کسی کو بے وقوف بنایا جائے۔‘‘ جواب میں ایک ایسی ہنسی سنائی دی جو سماعت کو چیرتی ہوئی بجلی کی طرح کوندی اور دل میں اتر گئی۔ آہ کتنی خوبصورت آواز تھی جیسے سونے کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ اس آواز کے ساتھ ہی ایک بار پھر چراغ کی لو نظر آئی اور چھن چھن کی آوازوں کے ساتھ لہنگے اور چنری میں ملبوس کسی دیہاتی لڑکی کا سایہ آگے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ ہارون اسے دیکھ کر زور سے چیخا۔

’’کون ہو تم لڑکی ...... رکو میری بات سنو ...... سنو میری بات سنو ......‘‘ ہارون تیزی سے آگے بڑھا تو لڑکی دوڑنے لگی۔ ہارون اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ چیختا جا رہا تھا۔

’’رک جاؤ ...... میری بات سنو ...... رک جاؤ ...... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا ...... سنو لڑکی! میری بات سنو ......‘‘

درختوں کے درمیان بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ لڑکی ایک درخت کی آڑ سے نکل کر دوسرے درخت کی آڑ میں پہنچ جاتی۔ ہارون کافی دور نکل آیا تھا اور پھر لڑکی ایک درخت کے پیچھے غائب ہوگئی۔ ہارون رک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ سحر زدہ ماحول، یہ طلسم ایک آفاقی کیفیت کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ اس چالاک لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر غائب ہوگئی تھی اور ہارون کافی دور نکل آیا تھا۔

وہ حیران ہو کر رک گیا اور اس کی نگاہیں بدستور چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ اچانک چھن کی آواز اس کے عقب سے آئی اور اس کے ساتھ ہی ہنسی۔ ایک نوجوان لڑکی کی ہنسی۔ لیکن اتنی دلکش کہ انسان کا اپنے آپ پر قابو پانا مشکل نظر آئے۔ پھر اچانک چراغ کی روشنی کئی چراغوں میں تبدیل ہوگئی۔ وہ چراغ گردش کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی دیو داسی ہاتھوں میں دیوں کے تھال لئے رقص کر رہی ہو۔ روشنی اسی طرح اوپر نیچے آگے پیچھے ہو رہی تھی۔ ہارون رک گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا ہوا عالم ہوش میں اس آسیب زدہ ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی ایک بار سارے چراغ یک بیک بجھ گئے اور ایک تاریک ہیولا نظر آیا جو ایک جانب بڑھ گیا تھا۔

’’رک جاؤ ...... میں کہتا ہوں رک جاؤ ......‘‘ پھر اچانک ہی ہارون کی نگاہ درخت کی آڑ سے نمودار ہوتے ہوئے ایک اور وجود پر پڑی وہ چاروں ہاتھ پیروں کے ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن یہ انوکھا وجود جسم میں کافی بڑا تھا۔ وہ بالکل سیاہ نظر آ رہا تھا۔ بس دو روشن آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں وہ ریچھ نہیں تھا۔ دفعتہً ہی ہارون کو اپنے بدن میں ایک جھرجھری کا سا احساس ہوا۔ اس کے تمام حواس واپس آ گئے تھے۔ لڑکی تو نگاہوں سے اوجھل ہو ہی گئی تھی لیکن یہ خوفناک وجود کوئی درندہ بھی ہو سکتا ہے۔

بہرحال علاقہ ویران تھا اور کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہارون کو ایک دم اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ خوفناک وجود درخت کی آڑ سے نمودار ہو کر ان روشن مشعل کی طرح جلتی ہوئی آنکھوں سے ہارون کو گھور رہا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا لیکن اس نے ہارون کی طرف دوڑ نہیں لگائی تھی۔ البتہ ہارون سوچ رہا تھا کہ زبردست حماقت ہوئی ہے۔ اسے یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔

چنانچہ وہ تیزی سے واپس چل پڑا وہ پلٹ پلٹ کر اس وجود کو دیکھے جا رہا تھا جس نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن ہارون جس قدر برق رفتاری سے دوڑ سکتا تھا دوڑ رہا تھا۔ پھر اس وقت اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اب وہ اپنے کیمپ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ مزدوروں کی چہل پہل اب بھی جاری تھی۔ یہ شکر ہے کہ کسی نے اس کی اب تک کی کیفیت کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ پھرتی سے مزدوروں کی نگاہوں سے بچتا ہوا اپنے خیمے کے پاس پہنچا اور خیمے کا پردہ اٹھا کر خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔

پھر وہ بستر پر لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ باہر کالی کالی رات آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ بستر پر لیٹ کر ہارون کو اپنا بدن ہلکا محسوس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا بدن ہوا میں ہو۔ چھن چھن کی وہ آواز، درختوں کے درمیان بھاگ دوڑ، خیمے میں جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں وہ دو خوبصورت سفید پیروں میں پہنی ہوئی پازیب دیکھ رہا تھا۔ وہ کروٹ بدلتا رہا۔ کیا ہے یہ سب کچھ؟ وہم تو بالکل نہیں تھا۔ ہوش و حواس کے عالم میں ان درختوں تک پہنچا تھا۔ لیکن کیا وہ ہوش و حواس کا عالم تھا۔ اس نے اپنے آپ پر غور کیا تو اسے یوں لگا جیسے چراغ کی اس مدھم روشنی نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا۔ یہ کسی بھی طرح عقل کی بات نہیں تھی۔ ایک ویران اور غیر آباد علاقے میں اس طرح ایک روشنی دیکھ کر دوڑ پڑنا غیر فطری سا معلوم ہوتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ پیچھے سے پراسرار ہوائیں اسے آگے دھکیل رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا سامنے پانی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ قریب ہی گلاس بھی موجود تھا۔ وہ اٹھ کر بوتل اور گلاب کے قریب پہنچا اور اس نے بوتل کا پانی گلاس میں انڈیلا۔ حالانکہ پانی گرم تھا۔ نجانے یہ بوتل کب سے رکھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ تین گلاس پانی پی گیا۔

گلاس رکھ کر وہ تھکے تھکے قدموں سے بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ اسے چھن کی ایک آواز سنائی دی۔ وہ اچھل پڑا اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ چھن، چھن، چھن کی

آواز اس بار تین دفعہ سنائی دی تھی۔ اور پھر ایک طرف سے خیمے کا ایک تھوڑا سا پردہ ہٹا اور اس نے دو آنکھیں دیکھیں جنہوں نے اپنے چہرے کو ڈھانک کر اندر جھانکا تھا۔ وہ اچھل پڑا۔ اس نے ان آنکھوں کو صاف دیکھا اور دوسرے لمحے اس کی گھگھیائی ہوئی آواز نکلی۔

''کون ہے ......؟'' آنکھیں جلدی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ لیکن ہارون اب برداشت نہیں کر سکا تھا۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا اور خیمے کے دروازے کی طرف دوڑ پڑا اس کے منہ سے آواز نکل رہی تھی۔

''رک جاؤ سنو ...... میری بات تو سنو! کون ہو تم ...... رک جاؤ ...... رک جاؤ، دیکھو......''

وہ خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر نکل آیا۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ ابھر رہی تھی اور وہ بے تحاشہ اس سائے کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور پیچھے گیا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا اور اس کے منہ سے ایک خوفزدہ آواز نکل گئی۔ تبھی اسے کامران کی آواز سنائی دی۔

''مسٹر ہارون ...... مسٹر ہارون کیا ہوا ...... سر! کیا بات ہے ...... کیا ہوا......؟'' ہارون ایک دم رک گیا۔ اس نے وحشت زدہ انداز میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پھر بے اختیار بولا۔

''تم نے دیکھا تھا ناں اسے کون تھا وہ ...... کون تھا ...... تم نے دیکھا اسے کامران......؟'' کامران کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں لیکن اب ہر طرف مکمل خاموشی اور سناٹا چھا گیا تھا۔ اس نے ہارون کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کوئی نہیں تھا سر! دور دور تک کوئی نہیں ہے ...... کیا آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے۔'' ہارون نے وحشت زدہ انداز میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیری پھر بولا۔

''خواب ......''

''جی سر! آپ چیخ رہے تھے سر! کون ہے ...... رک جاؤ! کون ہے ...... تم کون ہو ...... سر! میں آپ کی آواز سن کر ہی خیمے سے باہر نکلا تھا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ سر! لگتا ہے آپ نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔'' ہارون اس دوران اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں شاید خواب ہی دیکھا ہے آؤ۔'' ہارون نے کامران کا ہاتھ پکڑا اور آگے

بڑھ گیا۔

''اوہو سر! آپ کو تو شدید پسینہ آ رہا ہے۔'' کامران نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں آؤ ...... ذرا کھلی جگہ میں آ کر ...... پتہ نہیں آؤ ...... آؤ۔'' ہارون خیموں سے نکل کر کھلی جگہ پہنچ گیا۔ اس کی نگاہیں اب بھی چاروں طرف بھٹک رہی تھیں پھر اس کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں جہاں اس نے اس متحرک چراغ کو دیکھا تھا اور ایک دم اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ چراغ کی روشنی اسے اب بھی متحرک نظر آ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار کامران کا بازو بھینچ لیا اور بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

''دیکھو ...... دیکھو ...... وہ، وہ، وہ......'' کامران اس کے اشارے کی سمت دیکھنے لگا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا اس نے کہا۔

''کون ...... سر! کون، کہاں ...... کچھ بھی تو نہیں ہے ......؟''

''وہ درختوں کے اس طرف ...... اس طرف۔''

''درخت ...... کہاں ہیں یہاں ...... وہ تو ڈھلان کے پار ہیں ...... سر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں کچھ بھی تو نہیں ہے ...... آیئے واپس چلنے میں آپ کو پانی پلاتا ہوں۔'' ہارون نے ہانپتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''پانی نہیں، بس ایسے ہی سوری کامران تمہیں پریشان کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ آؤ واپس آؤ۔''

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے ...... میں بالکل پریشان نہیں ہوں ...... ویسے سر! آپ کسی خواب سے متاثر ہو گئے ہیں ...... اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے ساتھ آپ کے خیمے میں سو جاؤں۔'' ہارون نے اس دوران خود پر قابو پانے کی بڑی کوشش کی تھی اور کافی حد تک وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''نہیں یار! بے حد شکریہ ...... میں اب ٹھیک ہوں ...... میں واقعی بہت متاثر ہو گیا تھا ...... اصل میں یہاں کا ماحول بہت پراسرار ہے ...... بس نجانے کیوں ذہن پر سوار ہو گیا۔''

''ویسے آپ نے کیا خواب دیکھا تھا سر! مجھے بتایئے۔''

''سوری یار! بس حماقت ہو گئی اور کیا بتاؤں ایسے ہی فضول... بس کچھ بھی نہیں۔''

''سر! ویسے خواب کیا تھا۔'' کامران نے ضد کرتے ہوئے پوچھا۔

''خواب ...... نہیں یار اس وقت کچھ نہیں۔ بس اب سونا چاہتا ہوں ...... دیکھو مائنڈ مت کرنا کل سنا دوں گا اپنا خواب۔'' دونوں خیمے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ کامران نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر! شب بخیر میری ضرورت ہو تو مجھے ضرور آواز دے دیجئے گا۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں ...... ظاہر ہے۔''

''میں ابھی بہت دیر تک جاگوں گا ...... کچھ پڑھ رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے ...... میری طرف سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''پریشانی نہیں سر! افشاں بھابی نے ایک بات کہی تھی مجھ سے، جسے میں نے اپنی گرہ میں باندھ لیا ہے۔''

''کیا کہا تھا ......؟''

''سر! انہوں نے کہا تھا کہ ہارون کے اندر ایک بچہ چھپا ہوا ہے وہ کتنا ہی ذہین ہی لیکن کبھی کبھی وہ بالکل بچہ بن جاتا ہے۔ اس بچے کا ذرا خیال رکھنا۔''

''ٹھیک ہے میرے محترم بزرگ آپ ضرور میرا خیال رکھیے گا ...... بس اب مجھے سونے دیجئے۔''

ہارون نے کہا اور خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔

حالات کیسے بھی ہوں، ذمہ داریاں بہرطور اپنا مقام رکھتی ہیں۔ رات کو نجانے کب تک نیند نہیں آئی تھی۔ اور بعد میں نیند آئی بھی تو کتنی ہی بار آنکھ کھلی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہارون صبح جلدی اٹھ گیا۔ دماغ پر ایک بوجھ سوار تھا۔ رات کا واقعہ تو زندگی بھر بھولنے کے قابل نہیں تھا۔ اتنی جلدی بھلا کیا بھول جاتا۔ خیمے سے باہر نکلا تو سارے مزدور وغیرہ جاگ گئے تھے۔ چائے چڑھی ہوئی تھی اور وہ اپنی ضرورتوں کے مطابق ناشتہ کر رہے تھے تاکہ جلدی سے کام شروع کر دیں۔ ہارون کو خوشی ہوئی اس کے ساتھی ذمہ دار ہیں اور اس ٹیم کو ہمیشہ ہر کام میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

بہرطور ہارون نے بھی جلدی سے منہ ہاتھ وغیرہ دھویا۔ کامران اس کے لئے ناشتہ لے آیا۔ ٹرے میں چائے کا ایک کپ، ڈبل روٹی وغیرہ۔ ہارون کی اپنی ایک عادت تھی۔ جب کبھی آوٹ ڈور کام کرتا تھا تو مزدوروں والا کھانا خود بھی کھاتا تھا۔ جو ناشتہ مزدور کرتے تھے وہی ناشتہ خود کرتا تھا۔ اس سے اسے ایک ذہنی سکون ملتا تھا۔ کبھی کبھی ماضی کی سرد ہوائیں چلتیں تو وہ ہواؤں میں اُڑنے لگتا۔ لیکن اس کے بعد وہ پُرسکون ہو جاتا۔ جو زندگی اب گزار رہا تھا وہ سب سے بہتر تھی۔ جو گزار چکا تھا وہ ایک بھولا ہوا خواب تھا جس کی پرچھائیاں وہ اپنے آپ پر نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس نے اپنا ماضی تاریکیوں میں سُلا دیا تھا اور ایک نئے ہارون کی حیثیت سے دنیا میں اپنا مقام بنایا تھا۔

جلد ہی وہ ناشتہ کرنے کے بعد مزدوروں کے درمیان آ گیا۔ کامران نے کیمرے وغیرہ سیٹ کئے۔ دوربینیں لگائیں اور اس کے بعد لینڈ مارکنگ ہونے لگی۔ ہارون بے شک اپنے کام میں مصروف تھا لیکن دماغ کے سوئے سوئے نقوش اب بھی جاگ رہے تھے۔ یہ سوتے جاگتے کا عمل پتہ نہیں کیوں اس کے شانوں پر سوار ہو گیا تھا اور اسے اپنے شانے وزنی لگ رہے تھے۔ پھر اس وقت وہ دوربین سے مطلوبہ

علاقے کا جائزہ لے رہا تھا کہ دور بین گھومتے گھومتے اس جگہ آ رکی جہاں وہ درخت تھے اور جہاں اس نے رات کو وہ پراسرار وجود دیکھا تھا جس کی پازیب کی جھنکار دماغ سے لے کر دل تک اتر گئی تھی۔ اور جب بھی وہ آنکھیں بند کرتا، یہ جھنکار دماغ میں گونجنے لگتی۔ کتنی ہی بار اس نے اپنے سر کو جھٹکا۔ دماغ سے وہ سب کچھ نکالنے کی کوشش کی لیکن نجانے کیوں وہ اس جھنکار کو ابھی تک اپنے دماغ سے نکال کر نہیں پھینک سکا تھا۔ دور بین نے ان درختوں کو فوکس کر رکھا تھا اور ہارون ان میں کھویا ہوا تھا کہ کامران اس کے عقب میں پہنچ گیا۔

''سر!'' اس نے ہارون کو مخاطب کیا اور ہارون بری طرح اچھل پڑا۔ اس کے حلق سے ایک خوفزدہ سی آواز نکل گئی تھی۔

''سر!'' کامران اس کے سامنے آ گیا اور ہارون پھیکے پھیکے انداز میں ہنسنے لگا۔ کامران نے کہا۔

''آپ کی طبیعت ضرور خراب ہے سر! آپ مجھ سے کیوں چھپا رہے ہیں؟''

''نہیں کامران! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ رات کو ایک معمولی سا واقعہ پیش آ گیا تھا میرے ساتھ جس نے ابھی تک میرے ذہن کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ بس وہی بات ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ اگر میری طبیعت خراب ہوتی تو میں تم سے ضرور کہتا۔''

''آپ نے مجھ سے ایک خواب کا تذکرہ کیا تھا اور کہا تھا کہ کل مجھے سنائیں گے۔ اصل میں سر! آپ کافی دیر سے دور بین کے پاس کھڑے ہوئے سامنے دیکھے جا رہے ہیں۔ بہت دیر سے آپ کی دور بین کا کوئی زاویہ تبدیل نہیں ہوا۔ آپ کے چہرے پر بھی کھوئے کھوئے تاثرات تھے اس لئے میں آپ کی جانب متوجہ ہوا۔''

''ہاں...... اچھا یہ بتاؤ کتنی مارکنگ ہو گئی؟''

''کام شروع کروا دیا ہے سر! اوور سیئر کو سارا ناپ دے دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مزدور چونے سے نشان لگانا شروع کر دیں گے۔''

''آؤ ادھر بیٹھتے ہیں۔'' ہارون نے کہا اور کامران کا ہاتھ پکڑ کر دور بین کے پاس سے ہٹ گیا۔ کامران ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر وہ ایک چٹان پر جا بیٹھے۔ کامران کے چہرے پر تجسس کے نقوش منجمد تھے اور ہارون سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

''کامران! رات کو میں نے تم سے ایک خواب کا تذکرہ کیا تھا۔''

''جی سر!''

''میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں سر! آپ......''

''ہاں میں بتا رہا ہوں تمہیں۔ وہ خواب نہیں تھا۔ ابھی ابھی میں نے تم سے کہا ہے ناں کہ میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔''

''جی سر!...... جی سر......! آپ جس وقت خیمے سے باہر......''

''ہاں یار...... بتا رہا ہوں نا۔ میں خود بھی پڑھا لکھا آدمی ہوں اور بے تکی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے وہ پورے ہوش و حواس کے عالم میں پیش آیا۔ میں نہ ذہنی مریض ہوں اور نہ کسی قسم کی مشکل کا شکار۔ جو ہوا ہے وہ ابھی تک میرے لئے ناقابل فہم ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ اگر کوئی چیز دماغ کے لئے تجسس بن جائے اور بات بھی ایسی ہو جو معمولی نہ ہو تو انسان کی ذہنی کیفیت منتشر ہو جاتی ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!'' کامران نے اعتراف کیا۔

''رات کو جب مزدور تانیں اڑا رہے تھے، میں باہر نکل آیا تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں ٹہلتا ہوا ڈھلانوں کے کنارے تک پہنچ گیا اور پھر وہاں سے میں نے درختوں کے درمیان ایک روشنی دیکھی۔ میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ روشنی کی طرف دوڑنے میں میری قوتِ ارادی کا دخل نہیں تھا۔ بس مجھے یوں لگا جیسے ہوا کے جھونکے مجھے آگے بڑھا رہے ہوں اور پھر میں ان درختوں کے درمیان پہنچ گیا۔''

ہارون نے باقی پوری تفصیل بھی کامران کو بتائی جو اس کے ساتھ پیش آئی تھی اور کامران حیرت اور دلچسپی سے یہ باتیں سنتا رہا۔ ہارون بار بار آنکھیں بند کر کے گردن جھٹک رہا تھا جیسے گزرے ہوئے واقعات کے اثرات کو ذہن سے دور کرنا چاہتا ہو۔

کامران کے چہرے پر حیرت اور شوق کے آثار تھے۔ ہارون خاموش ہوا تو کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر کامران نے کہا۔

''سر! ایک بات بتایئے آپ مجھے۔ آپ کو جنوں، بھوتوں، چڑیلوں پر یقین ہے؟''

"کبھی واسطہ تو نہیں پڑا کامران! قصے کہانیوں کی حد تک میں نے بھی ان کے بارے میں سنا ہے۔ ذاتی طور پر کبھی تجربہ نہیں ہوا۔"

"ویسے سر! عالمِ ارواح کا وجود تو ہے، بدروحیں بھی ہوتی ہیں۔ میری نانی جان نے تو ایک جن کو بھائی بنایا ہوا تھا۔ ویسے سر! آپ نے یہ کہانی سنا کر بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرے تجسس کو جگا دیا ہے۔ اب میری تو راتوں کی نیندیں گئیں۔"

"میں جانتا تھا کہ تم اس کے علاوہ کوئی بکواس نہیں کرو گے۔"

"نہیں سر! آپ یقین کیجئے، بکواس نہیں کر رہا میں۔"

"بہر حال میرا تجربہ تو زیادہ اچھا نہیں ہے۔ ویسے کیا روحوں کو اتنے قریب سے بھی دیکھا جا سکتا ہے؟"

"سر! میں آپ سے عرض کروں کہ میں نے بھی کبھی کسی روح کو نہیں دیکھا۔ ویسے سر! ایک بات آپ کو بتاؤں، میرے دل میں تو زبردست خواہش ہے کہ میں بھی کبھی کسی روح کو دیکھوں اور آپ نے جس لعلِ شب کا تذکرہ کیا ہے سر! میرے دل میں تو اسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی ہے۔"

"یار، دیکھ کامران! میں تجھے بتاؤں۔ میں نے جو کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ پھر یہ علاقے اور پرانے سہائے پور کے کھنڈرات، پتہ نہیں یہ پرانا سہائے پور تباہ کیسے ہوا تھا؟ یا پھر یہ نیا سہائے پور بسا کر یہاں کی آبادی کو وہاں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ذرا اس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کریں گے۔ اصل میں، میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ جب مجھے سہائے پور کے بارے میں میرے افسرِ اعلیٰ نے بتایا تو میں نے اس سے یہ سوال نہیں کیا کہ سہائے پور ہے کیا چیز؟ بعد میں پوری تفصیل خود ہی مجھے بتا دی گئی تھی۔ لیکن بہرحال یہ واقعہ اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ میں اپنے احساسات تمہیں بتا رہا ہوں کامران! مجھ پر ابھی تک رات کا سحر طاری ہے۔ البتہ یہ سمجھ لو کہ اگر واقعی وہ بدروح ہوئی تو جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔"

"سر!......سر!......تھوڑی سی بے تکلفی کی اجازت دے دیجئے۔ بلکہ جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

"بکو......" ہارون نے اپنے شریر ماتحت اور بہترین دوست کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سر! اگر وہ کوئی بدروح بھی ہے تو کوئی بات نہیں ہے۔ روح تو ہے ناں۔ سر! آج تک کسی نیک روح نے بھی مجھے منہ نہیں لگایا۔ اگر کوئی بدروح ہی منہ لگا لے، وہ

جو کہتے ہیں ناں کسی پازیب کی چھنکار تو چھنکے اور کوئی اب تک نہیں آیا میرے ویرانے میں۔" کامران نے گا کر بتایا۔

"ہوں...... اور اگر تمہارے ویرانے میں کوئی آ ہی گھسا بیٹھے تو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔"

"ہائے وہ لعلِ شب چراغ پازیب کی جھنکار۔ معافی چاہتا ہوں، معافی چاہتا ہوں ہارون صاحب! ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے سامنے کسی گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن کسی بدروح سے دوستی ہو جائے تو بقول غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے۔"

"تم پاگل ہو کامران۔"

"سر! ابھی تک تو نہیں ہوں لیکن خدا کی قسم پاگل ہونا چاہتا ہوں۔ سر! مان لیں میری بات۔" کامران نے جھک کر ہارون کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"یار بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"سر! پلیز ایک بار مجھے بھی وہاں لے جایئے، میں بھی تو دیکھوں کہ تیری پائل کی جھنکار چھیڑ گئی میرے دل کے تار۔"

"جاؤ ادھر دیکھو، وہ کیا کر رہے ہیں۔"

"چھوڑیئے سر! آپ کا کامران اب کسی قابل نہیں رہا۔"

"کامران! زیادہ بکواس مت کرو یار۔ ایک بات بتاؤ، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ رات کو وہ پازیب کی جھنکار اور وہ خوبصورت آنکھیں اور وہ بھاگ دوڑ مجھے کیوں دکھائی دی؟ میرا ان سے کیا تعلق ہے؟"

"ہو سکتا ہے سر! آپ کسی پچھلے جنم کے راجکمار ہوں اور وہ روپ متی اس جنم میں آپ کو تلاش کر رہی ہو۔ سر! اگر ایسا ہے تو بیڑہ غرق۔" کامران نے کہا۔ اس کی افسردگی دیکھ کر ہارون ہنس پڑا۔

"بیڑا کیوں غرق؟"

"وہی بات ناں سر کہ اپنی دال تو گلنے سے پہلے ہی سڑ گئی۔"

"نہیں بھائی اگر ایسا ہے تو وہ بھتنی تجھے ہی مبارک۔ مجھے اللہ نے پہلے ہی ایک خوبصورت بھتنی دے رکھی ہے اور میں اس سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ سمجھا۔"

"سمجھا سر! ہماری بھی اس چھنن، چھنن سے سفارش کر دیں اور اس سے کہیں کہ

رخ بدل لے۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔'' کامران نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... بھگتو گے خود۔ میرا کیا ہے۔ وہ کوئی کالج گرل نہیں ہے کہ لائن ماری اور کام بن گیا۔''

''سر وہ جو کوئی بھی ہے، ہے تو چھنن چھنن ناں۔ اور بس ہم نے کہہ دیا کہ ہم تو دیکھے بغیر ہی اس کے دیوانے ہو گئے ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آپ اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ سر! پھر آج رات کو چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے...... میرا کیا ہے، ٹرائی کر لیتے ہیں۔ ویسے کام خطرناک ہے۔ میں پہلے ہی کہے دے رہا ہوں کہ یہ علاقہ مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ تم خواہ مخواہ اپنے سر مصیبت لے رہے ہو۔''

''ہائے سر! وہ مصیبت میرے سر پڑے تو سہی۔ پتہ نہیں وہ آپ کی طرف کیوں متوجہ ہو گئی؟ لیکن جہاں تک آگے کے معاملات ہیں تو سر! وہ جو کہا جاتا ہے ناں جو ڈر گیا وہ مر گیا۔''

''اوکے، اوکے۔ اوہو...... دیکھو ادھر، یہ لوگ کیوں جمع ہو رہے ہیں؟'' ہارون نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''عادت ہے ان کی سر! کوئی [illegible] آ گیا ہوگا کسی کو۔'' کامران مست لہجے میں بولا پھر آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا۔

''سر! چھنن...... چھنن...... چھنن......''

ہارون اس کی شرارت پر مسکرا دیا تھا۔

❁

اشعر کو سر شام اچانک بخار چڑھ آیا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ افشاں بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ رشیدہ گھر کی واحد ملازمہ تھی۔ مرد عورت جو کچھ بھی سمجھ لیا جائے سارے کام اسی کے سپرد تھے۔ اس وقت بھی وہ اشعر کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور افشاں اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہی تھی۔ رشیدہ اس کو پٹیاں بھگو بھگو کر دے رہی تھی۔ بخار پہلے تو ہلکا ہلکا تھا لیکن آہستہ آہستہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر غشی سی طاری ہو گئی تھی۔ بخار مزید تیز ہوا تو رشیدہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میری مانئے افشاں بی بی تو صاحب کو فون کر دیجئے۔ بخار بہت تیز ہے۔ دیکھیں تو چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا ہے۔''

''ابھی انہیں گئے ہوئے وقت ہی کتنا گزرا ہے۔ نوکری تو بہر حال نوکری ہی ہوتی ہے رشیدہ! پریشان ہو جائیں گے۔ دوڑے چلے آئیں گے۔ تھوڑا فاصلہ نہیں ہے، کئی گھنٹے کا سفر ہے۔ اشعر سے بہت محبت کرتے ہیں۔ طوفانی انداز میں گاڑی چلائیں گے۔ خدا نہ کرے پریشانی میں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔''

''میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ اشعر میاں کہیں باپ کو یاد تو نہیں کر رہے اندر ہی اندر۔ ویسے بھی یہ باپ بیٹا ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ لیکن وہ اتنی دور ہیں۔ میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ تم ایسا کرو کہ جا کر ڈاکٹر صاحب کو فون کر دو۔ اب مجبوری ہے۔ فضل شاہ صاحب کو بلانا ہی پڑے گا۔''

''میں فون کئے دیتی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا اور وہاں سے باہر نکل گئی۔ افشاں پریشانی سے اپنے خوبصورت بیٹے کو دیکھتی رہی۔

پٹر پٹر منہ سے باتیں بناتا ہے۔ اپنی عمر سے کہیں بڑی بڑی باتیں کرتا ہے۔ نظر نہ لگی ہو تو اور کیا ہوگا۔ وہ بیٹھی بیٹھی انہی تمام باتوں کو سوچ رہی تھی کہ رشیدہ آ گئی۔

''فضل صاحب نے کہا ہے کہ میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔'' افشاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ خاموشی بہت دیر تک طاری رہی۔ پٹیاں بدستور کئے جا رہی تھی۔ پھر جب بیل بجی تو رشیدہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ڈاکٹر صاحب آ گئے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ افشاں نے اشعر کا لباس درست کیا، پاس رکھے پانی کے برتن اٹھائے اور رشیدہ اندر آ گئی۔

''ہاں کیا ہوا؟''

''فضل خان صاحب ہی ہیں۔'' رشیدہ نے کہا۔

''بلا لو...... اندر بلا لو۔'' افشاں نے اپنا لباس درست کر کے کہا۔

رشیدہ پھر باہر نکل گئی۔ چند لمحات کے بعد وہ ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بیگ ایک طرف رکھا اور بولے۔

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب! کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جسے تذکرے کے طور پر آپ کو بتایا جائے۔ بالکل نارمل حالات تھے۔ کھیلتا کودتا رہا، پڑھائی بھی کی۔ اس کے بعد بدن گرم ہونا شروع ہو گیا اور پھر بخار آ گیا۔ میں نے چیک کیا، پہلے ایک سو ایک

تھا۔ پھر ایک سو تین ہو گیا اور اب دیکھئے میری ہمت نہیں پڑی کہ بخار چیک کروں۔
یہ اور تیز ہو گیا ہے۔''

''ہوں......'' ڈاکٹر فضل خان نے کہا اور ماتھا چھو کر دیکھا۔ پھر ٹمپریچر وغیرہ لیا۔
تھوڑی دیر تک نبض وغیرہ دیکھتا رہا پھر بولا۔

''بخار واقعی تیز ہے لیکن فکر کی بات نہیں ہے۔ انجکشن دینا ہوگا۔ ہارون صاحب
نظر نہیں آئے۔ کہیں گئے ہوئے ہیں؟''

''جی یہی تو سب سے زیادہ پریشانی کی بات ہے۔ وہ آؤٹ آف سٹی ہیں۔
آفس کی طرف سے ایک علاقے کا سروے کرنے گئے ہوئے ہیں۔''

دفعتہً ہی اشعر غشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

''کتنے افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ ملک چلانے کی بات کرتے ہیں وہ
ٹیکسیاں چلا رہے ہیں۔ اور جو ملک کی تقدیر بنا سکتے ہیں وہ جماعتیں بنا رہے ہیں۔ ہم
نیلی آنکھوں والی شہزادیوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ کیا ہوگا اس نئی نسل کا۔ کیا بنے گا اس
کا؟ انہیں حسین شہزادیوں کا زہر دیا جا رہا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

ڈاکٹر فضل خاں نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں اور اشعر کو دیکھنے لگا۔ وہ توجہ
سے اس کے الفاظ سن رہا تھا۔ افشاں اور رشیدہ بھی متوجہ ہو گئی تھیں۔ افشاں کے
چہرے پر عجیب گھبراہٹ طاری تھی۔ اشعر بدستور بڑبڑا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے آنکھیں بند
کر کے گردن جھٹکی پھر بیگ بند کیا اور بولا۔

''یہ نیلی آنکھوں والی شہزادی کون ہے افشاں؟''

''وہ ڈاکٹر صاحب! ایک کہانی کی کتاب پڑھی تھی اس نے۔ باتیں تو اپنی عمر
سے کہیں زیادہ بڑی کرتا ہے آپ کو یہ اندازہ تو ہے۔''

''ہاں......اس کے الفاظ سنے آپ نے؟'' ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ڈاکٹر صاحب! بہت بڑی بڑی باتیں کرتا ہے۔''

''ویسے کہہ تو بالکل ٹھیک رہا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ یہ اس بچے کی اپنی سوچ
تھی یا پھر وہ باتیں جو اس نے کہیں پڑھی ہوں لیکن اس کے ذہن نے اس کی تشریح
کر پائی ہو۔ اس دور میں بھی پریوں کی کہانیاں خریدتی ہیں آپ۔ یہ فرسودہ کہانیاں تو
پرانی نسل کے بھی کچھ کام نہیں آئیں۔ خدا کا شکر ہے اس دور میں نہ تو پریاں ہیں نہ
شہزادیاں۔ آپ براہِ کرم اس بات کا خیال رکھئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری

تاریخ عظیم کرداروں سے بھری پڑی ہے۔ آپ پر ایک مضبوط نسل تیار کرنے کی ذمہ
داری پڑتی ہے محترمہ! آپ اس مضبوط نسل کو تیار کرنے میں انہیں ہمارے ہیروز کے
بارے میں بتائیے۔ ان کے کارناموں کی تفصیل ان کے ذہنوں میں بٹھائیے۔''

افشاں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی، ڈاکٹر صاحب۔''

''معافی چاہتا ہوں میں زیادہ بول گیا۔ میں نے بخار فوراً اتارنے کی کوشش نہیں
کی ہے۔ یہ رفتہ رفتہ ہی اترے گا۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ پریشان
نہ ہوں۔ اچھا اجازت۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اپنا بیگ اٹھایا اور افشاں نے پرس میں سے نوٹ نکال کر
رشیدہ کو دیئے اور رشیدہ ڈاکٹر صاحب کے پیچھے نکل گئی۔ افشاں بچے کی پیشانی چھو کر
دیکھنے لگی اور گھبرا کر بولی۔

''اللہ خیر کرے...... بخار تو اور تیز ہو گیا ہے۔ کیا کروں؟''

کچھ دیر بعد رشیدہ اندر آ گئی اور افشاں کو پریشان دیکھ کر بولی۔

''کیا بات ہے افشاں بی بی؟''

''دیکھو تو سہی۔ بخار اور تیز لگ رہا ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میرا خیال ہے
مجھے اب ہارون کو فون کرنا ہی پڑے گا۔ آج انہوں نے بھی فون نہیں کیا ابھی تک۔''

فون کے پاس جا کر افشاں نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ریسیور ٹھیک نہیں رکھا
تھا۔ وہ پلٹ کر رشیدہ کو دیکھ کر بولی۔

''رشیدہ! ادھر آؤ۔''

رشیدہ اس کے پاس پہنچی تو افشاں نے فون کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''تم نے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا تھا ناں ابھی؟''

''جی بی بی جی، کیا تھا۔''

''ذرا دیکھو یہ ریسیور تم نے ٹھیک رکھا ہے؟ رشیدہ میں نے تم کو کتنی بار سمجھایا ہے
کہ فون کر کے ریسیور ٹھیک طرح رکھا کرو۔ خدا کے واسطے میری بات پر غور کرو۔ مجھے
پاگل مت سمجھا کرو۔ اور اگر ہارون نے فون کیا بھی ہوگا تو...... نہیں سمجھو گی، تم کبھی
نہیں سمجھو گی...... اُفوہ......'' یہ کہہ کر افشاں نے ریسیور اٹھایا اور پھر ٹیون ٹھیک کرنے
لگی۔ جب ٹیون ٹھیک ہو گئی تو اس نے نمبر ڈائل کیا اور رشیدہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

''جاؤ، تم اشعر کے پاس جا کر بیٹھو۔''

''جی بیگم صاحبہ!'' رشیدہ نے چور نگاہوں سے فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اشعر کی جانب چل پڑی۔

کامران واقعی ایک شوخ اور کھلنڈرا نوجوان تھا۔ حالانکہ اپنی ذمہ داریوں میں اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی تھی اور بہت عرصے سے ہارون کے ساتھ ہی کام کر رہا تھا لیکن اس کی فطرت اسے چین کہاں لینے دیتی۔ ہارون کی سنائی ہوئی کہانی نے اسے بھی سخت متجسس کر دیا تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے۔ مزدور دن بھر اپنا کام کرنے کے بعد اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے تھے۔ الاؤ جلانے کی عادت صرف عادت ہوتی ہے، کبھی کبھی ضرورت نہیں۔ یہ موسم بے شک الاؤ جلانے کا نہیں تھا لیکن جلتے ہوئے الاؤ کے کنارے بیٹھ کر دنیا بھر کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنانا اور بے ہنگم قہقہے لگانا ان کی عادت ہوتی ہے۔ سو اس وقت بھی یہ قہقہے بلند ہو رہے تھے لیکن کامران اپنے خیمے میں کپڑوں کے ڈھیر لگائے بیٹھا اپنے لئے کپڑے منتخب کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے مزیدار آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس نے قمیض اٹھا کر دیکھی اور پھر بولا۔

''سر! لیکن اس کے ساتھ تو ٹائی باندھنا ضروری ہے۔ پتہ نہیں وہ چھن چھن کون سے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ ٹائی پسند کرے یا نہ کرے۔ ورنہ شرٹ یا جرسی ٹھیک رہے گی۔ ہائے کاش تمہیں میرے پاس سے عشق نہ ہو گیا ہو میڈم، پلیز دیکھئے اللہ کا واسطہ وہ شادی شدہ ہیں اور افشاں بھابی نے انہیں میرے سپرد کیا ہے۔ کہا ہے کہ کامران خیال رکھنا۔ یہ کہہ کر انہوں نے آنکھوں سے اشارہ بھی کیا تھا۔ حالانکہ ہارون برا انسان نہیں ہے نہ ہی وہ عورت پرست ہے لیکن ہر بیوی اپنے شوہر کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ارے باپ رے باپ..... یہ کیا سوچنے لگا میں۔'' ایک بار پھر وہ کپڑوں کے ڈھیر کی طرف متوجہ ہو گیا اور انہیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک جرسی اور ایک پینٹ نکالی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

خیمے کے پردے کے پاس آ کر اس نے باہر جھانکا اور کسی کو نہ پانے کے بعد کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ چہرہ انڈے کے چھلکے کی طرح شفاف ہو گیا تھا۔ نجانے کتنی دیر تک رگڑ رگڑ کر شیو بنائی تھی۔ لباس پہننے کے بعد اس نے ایک چھوٹا سا آئینہ اٹھا کر خیمے کی ایک دیوار میں لٹکایا اور اپنے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر کنگھا لے کر بال سنوارے۔ اس کے بعد پرفیوم وغیرہ لگایا۔ جتنی تیاریاں وہ کر رہا تھا قابل دید تھیں۔ ان میں ذرا بھی مصنوعیت نہیں تھی۔ اس نے تمام تر تیاریاں مکمل کرنے کے بعد پردہ ہٹایا اور باہر نکل گیا۔

باہر مزدوروں کی ہنگامہ آرائیاں جاری تھیں۔ جگہ جگہ روشنیاں کر لی گئی تھیں۔ کامران کی نگاہیں جگہ جگہ بھٹکنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ ہارون اپنی جیپ کا بونٹ اٹھائے ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا ہے۔ پانی ڈال کر ہارون نے بونٹ بند کیا اور اتنی دیر میں کامران اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ کامران کے بدن سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ہارون نے پلٹ کر اسے دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

''گاڑی میں چلیں گے سر؟'' کامران نے فوراً سوال کیا۔

''تو پھر کیسے چلا جائے؟ نجانے کتنی دور چلنا پڑے۔ تم کہو تو پیدل چلیں۔''

''نہیں سر، ٹھیک ہے۔ جیسا آپ پسند کریں۔ ویسے آپ نے کپڑے نہیں بدلے۔''

''ارے بھائی! میں کون سا بر دکھاوے کے لئے جا رہا ہوں۔ مگر تم نے کیا زبردست تیاریاں کی ہیں۔ واہ کیا بات ہے۔ کون سا پرفیوم لگایا ہے؟ ویسے تمہیں میں ایک بات بتاؤں۔ یہ روحیں وغیرہ جو ہوتی ہیں ناں خوشبو کے سلسلے میں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ پرانے لوگ کہتے ہیں کہ خوشبو پر روحیں برستی ہیں۔''

''کک..... کک..... کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ اگر دو چار روحیں اور تمہاری طرف متوجہ ہو گئیں تو پھر تم بھی ایک روح ہی بن کر رہ جاؤ گے۔''

''آپ مجھے ڈرا رہے ہیں سر!''

''نہیں بھائی، بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ ویسے خوشبو کے معاملے میں تم واقعی بہت خوش ذوق ہو۔ البتہ یہ میں تمہیں بتا دوں کہ روحیں خوشبو پر ضرور عاشق ہو جاتی ہیں۔''

''تو سر! میں اور کیا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا ہو جائے تو ساری مشکلیں دور ہو جائیں گی۔''

''مگر دوسری مشکلوں کا کیا کرو گے؟'' ہارون نے ہنس کر کہا۔

''وہ کون سی؟''

''یار کمال کرتے ہو۔ ان روحوں کے باپ بھائی وغیرہ بھی تو ہوتے ہیں۔ وہ

زندہ باپ بھائیوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ کسی قانون کی گرفت
میں نہیں آتے۔ اپنا قانون چلاتے ہیں۔ اور ان کا قانون تو بہ......توبہ۔'' ہارون نے
دونوں کان چھوتے ہوئے کہا۔ کامران کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہو گئے۔
تھوڑی دیر تک وہ ہارون کا چہرہ دیکھتا رہا اور اس کے بعد گھگھیائی ہوئی آواز میں بولا۔

''سر! پلیز ڈرائیے مت۔ بڑے ارمانوں سے پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم رکھا
ہے۔ آپ پلیز......''

''ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے...... میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' ہارون نے کلائی پر بندھی
ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا پھر جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو پھر ٹھیک ہے، آؤ چلتے ہیں۔''

کامران خوشی سے اچھل کر جیپ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور ہنستے ہوئے بولا۔

''سر! ایک بات بتائیے، آپ تو مجھے بتا رہے تھے کہ آپ پیدل وہاں درختوں تک گئے
تھے۔ یہ اس وقت جیپ میں بیٹھ کر محبوبہ دلنواز سے ملنے کی کیا سوجھی؟''

''اس وقت میں اکیلا تھا۔ وہاں کے حالات اور معاملات دیکھ کر واپس پلٹ
پڑا۔ یہ سوچ کر کہ صورت حال کچھ اور سنگین نہ ہو جائے۔ لیکن اب تم میرے ساتھ
ہو۔ دور تک چلیں گے۔ دیکھیں گے۔ اور یہ بھی دیکھیں گے کہ ہمائے پور کے پرانے
کھنڈرات کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو اہمیت ہو گی ان کی۔ اور ویسے
بھی کھنڈرات وغیرہ سے منسوب کہانیاں خاصی مختلف ہوتی ہیں۔ آج ذرا ان کہانیوں کا
جائزہ بھی لے لیا جائے۔''

''ارے باپ رے...... میرے تو رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔''

''تو پھر باز آ جاؤ۔ نہ میں جاؤں نہ تم۔''

''نہیں، میں یہ عشق کر ڈالنا چاہتا ہوں۔'' کامران نے کہا اور اسی وقت ہارون
کے موبائل فون پر بیل ہوئی۔ ہارون نے جلدی سے موبائل نکال کر اس پر نمبر دیکھا
اور پھر موبائل کان سے لگا لیا۔

''ہیلو افشاں! خیریت سے ہو؟ میں نے تمہیں جان بوجھ کر فون نہیں کیا۔ کیونکہ
فون کرنے سے تمہاری آواز میرے کانوں تک پہنچتی ہے اور میرے وجود میں بے
چینیاں دوڑ جاتی ہیں۔ ہاں...... ہاں، بولو خیریت، کیا بات ہے؟ تمہاری...... تمہاری
آواز میں......'' یہ کہہ کر ہارون خاموش ہو گیا اور اس طرف کی بات سننے لگا۔ پھر اس

کی پریشان آواز ابھری۔

''اوہ...... تم نے مجھے فوراً کیوں نہیں بتایا۔ حماقت ہے تمہاری۔ کیا کہا، ڈاکٹر
صاحب نے کوئی وجہ بتائی؟ بہت تیز ہے؟ نہیں، گھبراؤ نہیں۔ میں آ رہا ہوں۔
ہاں...... ہاں، میں ابھی چل پڑتا ہوں۔ ہاں بابا...... آہستہ گاڑی چلاؤں گا۔ پھر بھی کئی
گھنٹے لگ جائیں گے۔ او کے۔ نہیں، فکرمند نہیں ہونا۔ میں آ رہا ہوں۔ ہاں...... ہاں
میں آ رہا ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔''

کامران تشویش زدہ نگاہوں سے ہارون کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی ہارون نے
فون بند کیا وہ جلدی سے بولا۔

''کک...... کیا ہوا چیف؟''

''یار کامران! سوری، آج نہیں چل سکتے۔ ایک پریشانی ہو گئی ہے۔''

''جی...... جی سر! خیریت، کیا بات ہے؟''

''ہاں...... وہ اشعر سخت بیمار ہو گیا ہے۔ میرا بیٹا ہی نہیں وہ میری زندگی ہے۔''

''جی...... جی سر! کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ تو پھر سر! آپ جا رہے ہیں؟''

''ہاں کامران! افشاں بہت پریشان ہے۔ فون پر رو رہی تھی۔ جانا ضروری
ہے۔''

''سر! میں بھی چلوں...... آپ اتنی رات میں اکیلے جائیں گے۔ سفر بھی چھوٹا
موٹا نہیں ہے، بہت لمبا ہے۔''

''نہیں، تمہارا بے حد شکریہ کامران۔ تمہارا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔ صبح کو
معمول کے مطابق کام شروع کر دینا۔ ہمیں جلد از جلد سروے رپورٹ مکمل کرنی
ہے۔''

''ٹھیک ہے سر! آپ بالکل فکر مت کریں...... بالکل فکر نہ کریں۔ البتہ میں آپ
کے لئے فکرمند رہوں گا۔''

''نہیں، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں فون پر تمہیں خیریت کی اطلاع دوں گا۔''

''تھینک یو سر...... تھینک یو۔'' کامران جیپ سے اتر آیا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔
وہ ہارون کی جیپ کی سرخ روشنیاں دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر شدید تشویش کے
آثار تھے۔ باقی ساری باتیں اپنی جگہ، ہارون نے ایک پراسرار داستان سنائی تھی۔
ہارون جس قدر بردبار اور نفیس طبیعت کا انسان تھا یہ بات تو خواب میں بھی نہیں سوچی

جا سکتی تھی کہ اس نے کوئی کہانی سنائی ہو گی یا کوئی فرضی داستان سنائی ہو گی۔ ایسے عالم میں کامران کے فطری تجسس کا جاگنا ایک فطری سی بات تھی۔ لیکن اس وقت جو ہوا تھا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر تاریکی میں نگاہیں دوڑانے لگا۔

مزدور اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے تھے۔ ہارون کی جیپ کی روشنیاں گم ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر نجانے کس خیال کے تحت وہ آگے بڑھ کر اس سرے پر پہنچ گیا جہاں سے ڈھلان نظر آتے تھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ بہت فاصلے پر درختوں کے درمیان اسے ایک روشنی متحرک نظر آ رہی تھی۔ یہ نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ یقیناً وہ کسی چراغ کی لو تھی اور پھر اس کے حساس کانوں میں ہلکی سی چھن کی آواز سنائی دی.....

چھن..... چھن..... چھن..... متحرک روشنی کے ساتھ ساتھ یہ آواز بھی ایک طرف چلی جا رہی تھی۔ کامران کا پورا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی گھگھیاں بندھ گئیں پھر اس کے منہ سے نکلا۔

"ارے باپ رے..... اور وہ بری طرح بھاگ کر خیمے میں جا گھسا۔ وہ اپنے خیمے میں گھس کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھا اور خیمے کے پردے کے پاس آ کر باہر جھانکنے لگا۔ گہری خاموشی، پُر ہول سناٹا۔ اس سناٹے میں کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ کامران کے منہ سے نکلا۔

"جل تُو جلال تُو، صاحب کمال تُو، آئی بلا کو ٹال تُو۔"

ابھی آخری جملہ پورا ہوا تھا کہ خیمے کے عقب سے چھن کی زوردار آواز سنائی دی اور کامران کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

چھن، چھن، چھن کی آواز دو تین بار سنائی دی۔ یہ اس کے کانوں کو دھوکہ نہیں ہوا تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی خیمے کے آس پاس گھوم رہا ہو۔ کامران کی دہشت بھری چیخ پھر فضا میں ابھری اور اس کے بعد یہ چیخیں مسلسل ہو گئیں۔ پاس کے خیموں میں جلدی جلدی مشعلیں، چراغ وغیرہ جلنے لگے اور مزدور باہر نکلنے لگے۔

"کیا ہوا..... کیا بات ہے..... کون چیخا تھا؟" سب ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے اور کچھ لوگ کامران کے خیمے کے پاس آ گئے۔ کامران پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ایک مزدور نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کیا ہوا بڑے بھائی جان! کیا ہو گیا، کیا ہو گیا؟"

"ایں....." کامران نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ دفعتہً اسے خیال ہوا کہ مزدوروں کو اصل بات تو بتانی نہیں ہے لیکن کچھ بتائے بغیر جان نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ لیا اور پھر ہائے ہائے کرنے لگا۔

"کیا ہو گیا صاحب..... کیا پیٹ میں گولی لگ گئی ہے؟" ایک مزدور نے کہا۔

"گولی کے بچے، درد ہو رہا ہے..... ہائے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" کامران نے تڑپتے ہوئے کہا۔

"شاید بدہضمی ہو گئی ہے۔" ایک مزدور بولا۔

"میرے پاس چورن ہے، لاؤں صاحب جی؟" دوسرے نے ہمدردی سے کہا۔

"نہیں، دوا ہے میرے پاس۔ بہت بہت شکریہ۔ تم جاؤ، آرام کرو۔ اکثر کبھی کبھی میرے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔ یہ معدے کا درد ہے اور میرے پاس اس کی دوا موجود ہے۔"

"نہیں صاحب جی! آپ دوا کھا لو۔ ہم یہاں بیٹھتے ہیں۔ دیکھیں گے اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی تو بڑے صاحب کو جا کر اطلاع دیں گے۔"

"نہیں، بڑے صاحب کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔" کامران نے کہا۔

"گئے ہوئے ہیں..... کب؟"

"ارے یار تم کیوں میرے کان کھا رہے ہو؟ تم لوگ جاؤ..... میں ٹھیک ہوں..... سب ٹھیک ہے۔"

مزدور شانے ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ کامران تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر اس نے خوفزدہ ہو کر دوبارہ اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کے بعد بولا۔

"واہ، محبوبۂ دلنواز یہ تو کچھ الٹا ہی معاملہ ہو گیا۔ یعنی تیرے در پر صنم چلے آئے۔ تو نہ آیا تو ہم چلے آئے۔ ارے..... بب..... بب..... باپ رے....." اس نے کہا اور اسی وقت اس کے کانوں میں چھنن..... چھنن کی آواز ابھری۔ یہ آواز بے شک دور سے آ رہی تھی لیکن پورے ہوش و حواس کے عالم میں کامران یہ سن رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا اور منہ تک ڈھک لیا تھا۔

رات کے پُر ہول سناٹے میں ہارون سڑک پر جیپ دوڑا رہا تھا۔ رات تھی لیکن آسمان پر تارے چمکے ہوئے تھے۔ چاند نہیں نکلا تھا۔ تاروں کی مدھم مدھم روشنی میں ماحول میں ایک اجالا سا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس سڑک کو بھرپور طریقے سے نمایاں کر رہی تھیں۔ ہارون سخت پریشان تھا۔ اشعر سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ یوں تو ہر والدین کو اولاد سے پیار ہوتا ہے لیکن بعض لوگوں کی زندگی کا محور اس قدر مختصر ہو جاتا ہے کہ پھر وہ پیار کی منزل سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اشعر ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش میں کچھ ایسے الجھے ہوئے معاملات پیدا ہو گئے تھے کہ ڈاکٹر نے ہارون سے سوال کیا تھا کہ اگر وہ بیٹے کی زندگی بچانا چاہتا ہے تو اس بیٹے پر ہی اکتفا کرے۔ آئندہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہو گی۔ اور اگر یہ کام نہ کیا جائے تو پھر ماں بیٹے دونوں کی زندگی کا رسک لینا پڑے گا۔ ہارون نے بڑی فراخ دلی سے یہ بات کہہ دی تھی کہ افشاں کو بچا لیا جائے۔ باقی معاملات تقدیر کے ہیں۔ لیکن افشاں کے ساتھ ساتھ اشعر کی زندگی بھی بچ گئی تھی۔

اور اس کے بعد ماں باپ کی محبتیں اپنے اکلوتے اور آخری بیٹے کے لئے وقف ہو گئی تھیں۔ دونوں ہی اشعر پر جان دیتے تھے۔ ہارون کی تو وہ آنکھوں کا تارا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اشعر سات سال کا ہونے کے باوجود اس قدر ذہین تھا کہ اس کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ اکثر ماں باپ خوفزدہ ہو کر سوچتے تھے کہ اس قدر ذہانت رکھنے والا بچہ کیا مکمل عمر پائے گا۔ بس ایک خوف کا احساس ان کے دل میں جاگزیں رہتا تھا۔ ہارون کو بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ اشعر کی سالگرہ کا دن تھا۔ اشعر خوبصورت کپڑوں میں ملبوس مہمانوں کے درمیان بھاگتا پھر رہا تھا۔ پھر کیک کاٹا گیا، تالیاں بجائی گئیں تو اشعر نے کہا۔

''پاپا! جب میں بڑا ہو جاؤں گا ناں تو آپ کی برتھ ڈے کا کیک لاؤں گا اور پھر میں آپ کو اپنی گود میں لے کر کیک کاٹوں گا۔''

ہارون نے اشعر کے خیالی چہرے کو چوم لیا۔ ایک دن وہ بچے کے ساتھ گیند کھیل رہا تھا۔ افشاں بھی سات تھی۔ اشعر ایک درخت کے جھنڈ کی آڑ میں چھپ گیا اور دونوں ماں باپ شدید پریشان ہو گئے۔ اچانک وہ درخت کے پیچھے سے نکل کر بولا۔

''آپ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ محبت کرتے ہیں یا مجھ سے؟'' یہ عجیب سا

سوال تھا۔

دفعتہً ہی ہارون کا پاؤں بے اختیار بریک پر جا پڑا۔ سڑک دور تک سنسان پڑی ہوئی تھی لیکن بریک لگانے کی وجہ وہ ایک انسانی ہیولا تھا جو دور سے نظر آیا تھا۔ وہ ایک عورت تھی جو سڑک کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تاریکی میں بس اس کے بدن کے نقوش نظر آ رہے تھے۔ ہارون نے رفتار بہت سست کر دی اور پھر اس نے بریک لگا کر اس عورت پر نگاہیں ڈالیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ عورت ساکت بیٹھی تھی۔ کچھ لمحے تک وہ اسے دیکھتا رہا اور پھر آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی۔ وہ جو کوئی بھی ہے کسی عورت کا اس طرح سنسان سڑک پر اکیلے بیٹھنا عام بات نہیں تھی۔ جیپ کو آگے لے جانا چاہئے۔

چنانچہ اس نے رفتار بڑھا دی اور اس جگہ سے آگے بڑھ گیا جہاں عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اچانک ہی جیپ کی ہیڈ لائٹ کی روشنیوں نے ایک عورت کو احاطے میں لیا۔ وہ سڑک کے ایک طرف سے اٹھی تھی اور جلدی سے دوسری طرف اتر گئی تھی۔ یہ شدید حیرانی کی بات تھی اور اب ہارون صبر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جیپ کو عین اس جگہ روکا جہاں اس عورت نے سڑک پار کی تھی۔ پھر وہ جیپ سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور سڑک کے اس نشیب میں جھانکنے لگا جہاں عورت دوسری طرف سے نکل کر اس طرف اتری تھی۔ لیکن نشیب میں کسی کا پتہ نہیں تھا۔

اچانک ہی اس کے کانوں میں چھن، چھن کی آواز ابھری۔ یہ آواز سڑک کے دوسری طرف سے آئی تھی۔ ہارون نے چونک کر ادھر دیکھا اور پھر دیکھتا ہوا اس طرف دوڑ پڑا۔ لیکن ادھر بھی اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ نہ کوئی ہیولا نہ کوئی انسانی وجود۔ البتہ پازیب کی یہ جھنکار اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔

ہارون کے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''سامنے آؤ..... کون ہو تم..... سامنے آؤ..... کیا چاہتی ہو؟..... میرے سامنے آؤ۔'' لیکن اس کی آواز فضا میں دور تک پھیلتی رہی۔ خاموشی اور سناٹا، اس کے علاوہ نہ کوئی آواز نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی روشنی۔ وہ دیر تک وہاں کھڑا رہا اور پھر جیپ میں آ بیٹھا اور اسے تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ اب اس کے چہرے پر غصے اور جھلاہٹ کے آثار تھے۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کے سامنے سے وہی عورت سڑک پار کرتی ہوئی نظر آئی۔ پازیب کی چھن چھن صاف سنائی دے رہی تھی۔

ہارون نے دانت بھینچ کر جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ عورت نے جیپ کو سر پہ آتے دیکھ کر ایک لمبی چھلانگ لگائی اور سڑک کے نشیب میں کود گئی۔ لیکن ہارون بخوبی یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی ایک پازیب سڑک کے کنارے گری رہ گئی تھی۔ ہارون وہاں سے آگے نکل چکا تھا۔ لیکن اس نے جیپ ریورس کی اور پیچھے جا کر اس جگہ بریک لگائی جہاں اس کی پازیب گری تھی۔ پھر وہ دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں عورت نشیب میں اتری تھی۔ لیکن حسب معمول نشیب خالی تھا۔ وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ البتہ جس چیز نے ہارون کو سکتے میں مبتلا کر دیا وہ پازیب تھی جو سڑک کے کنارے چمک رہی تھی۔ ہارون کے قدم آہستہ آہستہ پازیب کی جانب بڑھ گئے۔ وہ جھکا اور اس نے جھک کر پازیب اٹھالی اور اسے دیکھتا رہ گیا۔

پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ اشعر ذہن میں آیا اور ایک بار پھر وہ تیزی سے جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے پازیب جیب میں رکھ لی تھی اور اس کے بعد اس نے جیپ آگے بڑھا دی۔

❁

اس وقت دیوار پر لگی گھڑی میں ساڑھے چار بجے تھے۔ کمرے کا ماحول عجیب سوگوار سا ہو رہا تھا۔ ملازمہ رشیدہ صوفے سے ٹیک لگائے فرش پر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ خود افشاں مسہری پر اشعر کے پاس بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ البتہ اشعر اس وقت پُرسکون سو رہا تھا کہ باہر سے جیپ کے ہارن کی آواز سنائی دی اور افشاں بری طرح چونک پڑی۔ آواز دوبارہ آئی تو افشاں مسہری سے اتر آئی اور صوفے کے پاس بیٹھی رشیدہ کو جھنجھوڑ کر بولی۔

''رشیدہ...... رشیدہ...... اٹھو، ہوش میں آؤ۔ جاؤ گیٹ کھولو۔ صاحب آ گئے۔''

''آ گئے......؟'' رشیدہ کے حلق سے بڑبڑاتی ہوئی آواز نکلی۔

''دماغ قابو میں رکھو۔ جاؤ گیٹ کھولو۔'' افشاں نے کہا اور رشیدہ دروازے کی جانب دوڑ گئی۔ لیکن درمیان میں کسی چیز سے ٹکرائی اور تکلیف سے اس نے پاؤں پکڑ لیا۔

''رشیدہ پلیز...... ہوش میں آؤ۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔ جاؤ ہارون آ گئے ہیں۔''
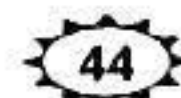
''ہائے......'' رشیدہ کے منہ سے نکلا اور اس کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ افشاں نے اشعر کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور اس کے منہ سے سکون کی گہری سانس نکل گئی۔

''اللہ تیرا شکر ہے...... اللہ تیرا شکر ہے۔ بخار تو اتر گیا۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور ہارون گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر تیزی سے اشعر کے پاس پہنچا اور اسے چھو چھو کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کسی قدر مطمئن ہو کر کہا۔

''اب تو بخار نہیں ہے۔''

''ہاں...... اللہ کا شکر ہے۔''

''افشاں تم نے تو مجھے بدحواس ہی کر دیا تھا۔''

''میں خود بدحواس ہو گئی تھی ہارون۔ خدا کی قسم اتنا تیز بخار تھا کہ میرے ہوش و حواس خراب ہو گئے تھے ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ دیتی۔ انگارہ ہو رہا تھا اشعر۔''

ہارون نے مسکرا کر افشاں کو دیکھا اور پھر مسکراتا ہوا بولا۔

''سچ مچ بخار ہوا تھا اشعر کو یا پھر یہ ہمیں بلانے کا بہانہ تھا؟''

''نہیں، میں اتنی بے درد نہیں ہوں۔ میں تو آپ کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی کہ اللہ خیر کرے پریشانی کے عالم میں گاڑی چلائیں گے لیکن آپ یقین کریں بخار بہت تیز تھا۔ میری عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جب میں بدحواس ہو جاتی ہوں تو میری آنکھیں آپ ہی کی جانب اٹھتی ہیں۔''

''اور ہوش و حواس کے عالم میں؟'' ہارون نے شرارت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ افشاں مسکرا دی۔

''اس وقت بھی۔''

''چلو ٹھیک ہے...... اللہ کا شکر ہے...... میں ذرا لباس بدل لوں۔''

''ہاں ضرور، اچھا یہ بتائیے کیا بناؤں آپ کے لئے...... چائے یا کافی وغیرہ لیں گے؟''

''کیوں، کیا رت جگے کا ارادہ ہے جناب! آپ جو دیں گی وہ لے لیں گے۔''

''نہیں میں تو آپ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔''

''جی نہیں۔ اب تھوڑی دیر تک آپ کی قربت کے مزے لیں گے اور اس کے

بعد آرام کریں گے۔ البتہ ایک وعدہ آپ کو کرنا ہو گا میڈم!''

''جی فرمائیے۔''

''صبح کو ذرا دیر تک سونے دینا۔ واپس بھی جانا ہے۔ ابھی تو ٹھیک سے کام شروع بھی نہیں کیا تھا۔''

ہارون اپنی جگہ سے اٹھا تو جیب میں رکھی ہوئی پازیب چھن سے گونجی اور وہ چونک پڑا۔ بے اختیار اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پازیب نکال لی۔ افشاں نے اسے پازیب نکالتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور بولی۔

''دکھائیے ذرا...... مجھے دکھائیے...... میرے لئے لائے ہیں؟'' افشاں نے پازیب ہارون کے ہاتھ سے لے لی اور اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

''خدا کی پناہ، یہ تو کوئی اینٹیک چیز لگتی ہے۔ بہت پرانے طرز کی ہے۔ لیکن کتنی خوبصورت ہے۔ دوسری دکھائیں۔''

''ایک ہی ہے۔'' ہارون نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ایک...... کیوں؟''

''اب یہی پوچھے جاؤ گی یا کپڑے بھی دو گی رات کو پہننے کے لئے۔ صبح کو بتاؤں گا کہ یہ ایک کیوں ہے۔''

''اس میں بھی کوئی پراسرار راز چھپا ہوا ہے؟'' افشاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں یہی سمجھ لو۔''

''اوکے......'' افشاں نے پازیب ایک طرف سائیڈ بورڈ پر رکھ دی۔ یہ سائیڈ بورڈ ایک کھڑکی کی طرف رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ گئی اور الماری سے سونے کا لباس نکال کر ہارون کے پاس پہنچ گئی۔ ''جناب خود پہن لیں گے ناں؟''

ہارون نے مسکرا کر اسے دیکھا اور لباس لے کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

افشاں کی نگاہ اشعر کی جانب اٹھ گئی جو کروٹ بدل رہا تھا۔ وہ تیزی سے اشعر کے قریب پہنچی اور اس کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگی۔

صبح ہونے میں دیر ہی کتنی تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ اجالے کی جانب سفر کر رہا تھا۔ بیڈ روم میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ ماحول میں ابھی تک تاریکی کی کیفیت تھی کیونکہ افشاں نے سارے بیڈ روم کی کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے تھے۔ اس کا خیال

تھا کہ ہارون تھوڑی دیر تک سوتا رہے تو زیادہ اچھا ہے۔ بھلا صبح ہونے میں دیر ہی کتنی باقی رہ گئی تھی۔ ہارون اپنے بیڈ پر بے خبر سو رہا تھا اور دوسرے بیڈ پر افشاں اشعر کے ساتھ سو رہی تھی۔

پورے کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ گھڑی کی ٹک، ٹک ایک پراسرار آواز پیدا کر رہی تھی۔ پازیب اس سائیڈ بورڈ پر رکھی ہوئی چمک رہی تھی۔ لیکن اس وقت ایک پراسرار منظر دیکھنے والوں کی نگاہوں سے الگ ایک سنسنی خیز کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ سائیڈ بورڈ جو کھڑکی کے پاس رکھا ہوا تھا اس کھڑکی کا پردہ آہستہ آہستہ سرک رہا تھا اور روشنی کی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ پھر کھڑکی کا پٹ آہستہ آہستہ کھلنے لگا اور ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر افشاں نے کروٹ بدلی اور اس کا رخ کھڑکی اور سائیڈ بورڈ کی طرف ہو گیا۔ کھڑکی سے مدھم مدھم چھننے والی روشنی نے افشاں کی نیند میں تھوڑی سی الجھن پیدا کی تھی لیکن اچانک ہی چھن کی ایک آواز ہوئی اور افشاں پوری طرح جاگ گئی۔ اس نے دیکھا کہ سائیڈ بورڈ پر رکھی ہوئی پازیب نیچے گر پڑی ہے۔ اس نے تعجب سے اس گری ہوئی پازیب کو دیکھا اور پھر کھڑکی کی طرف اس کھڑکی کا پردہ بھی اس نے گرا دیا تھا اور کھڑکی بھی بند کر دی تھی۔ لیکن اس وقت کھڑکی کا پٹ بھی کھلا ہوا تھا اور ایک انتہائی خوفناک منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ ایک بالوں بھرا غیر انسانی سا ہاتھ تھا جو سائیڈ بورڈ پر گر جانے والی پازیب کو تلاش کر رہا تھا۔

لیکن پازیب سائیڈ بورڈ سے نیچے گری تھی اور یہ ہاتھ نیچے فرش تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں مکمل طریقے سے تو اس ہاتھ کو نہیں دیکھ پا رہی تھیں لیکن پھر بھی تھوڑا سا منظر نگاہوں میں آ رہا تھا۔ افشاں کی آواز ابھری۔

''کون ہے......؟ کون ہے؟''

اچانک ہی بالوں سے بھرا خوفناک ہاتھ نیچے جھکا۔ یہ ہاتھ ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا تھا اور سو فیصدی کوئی انسانی ہاتھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گری ہوئی پازیب اٹھا لی اور اس کے بعد کھڑکی میں غائب ہو گیا۔ افشاں کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکلی جسے اس نے فوراً ہی ہاتھ منہ پر رکھ کر بھینچ لیا۔ اسے اس خوف کے عالم میں بھی اشعر کا خیال آیا تھا جو گہری نیند سو رہا تھا اس لئے اس نے اپنی چیخ تک بھینچ لی تھی۔ لیکن وہ بری طرح بدحواس ہو کر مسہری سے اٹھی اور پاؤں الجھ جانے سے

گر پڑی۔ وہ دوبارہ پھر اٹھی اور گرنے کے سے انداز میں ہارون کی مسہری کے پاس پہنچی۔ ہارون چیخ کی آواز سن کر ہی جاگ گیا تھا۔ اچانک باہر سے ایک اور خوفناک چیخ سنائی دی اور اس کے بعد چیخوں کا طوفان آ گیا۔ کوئی اس طرح چیخ رہا تھا جیسے اس کی گردن دبا دی گئی ہو۔ وہ مسلسل چیخیں کسی عورت کی تھیں۔ ہارون ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''کون ہے...... کیا ہوا...... کون ہے؟ کون...... کون چیخ رہا ہے؟''

افشاں پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بول نہیں پا رہی تھی۔ بمشکل تمام اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ہارون نے اسٹینڈ سے گاؤن اٹھا کر پہنا اور پھر تیزی سے دوڑتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔ اس نے دروازہ کھولا اور پھرتی سے باہر نکل گیا۔ ادھر افشاں دہشت بھری نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر اسے بیٹے کا خیال آیا جو شاید کسی نشیلی دوا کے زیر اثر تھا۔ اسی لئے اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ افشاں نے جھک کر اسے غور سے دیکھا اور پھر یہ اندازہ لگا کر کسی قدر مطمئن ہو گئی کہ اشعر کی آنکھ نہیں کھلی ہے۔ البتہ باہر سے مدھم مدھم آوازیں ابھر رہی تھیں اور افشاں کا سارا وجود تنکے کی طرح لرز رہا تھا۔

کون ہے یہ...... یہ کون ہے؟...... وہ خوف زدہ انداز میں سوچ رہی تھی۔ مدھم مدھم آوازیں پھر نمایاں ہونے لگیں اور چند لمحوں کے بعد ہارون دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ رشیدہ کو سنبھالے ہوئے تھا جس کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح نڈھال تھی اور اس سے صحیح طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ افشاں خوف بھری نگاہوں سے رشیدہ کو دیکھنے لگی۔ ہارون نے آگے بڑھ کر تیز روشنی جلائی اور پھر اشعر کی طرف دیکھا اور افشاں سے بولا۔

''تم اسے سنبھالو، میں ابھی آیا۔''

یہ کہہ کر وہ پھرتی سے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔ افشاں کچھ دیر تک رشیدہ کو دیکھتی رہی۔ وہ خود اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو رشیدہ! بیٹھ جاؤ۔ تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟''

رشیدہ کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ بمشکل تمام وہ بولنے میں

کامیاب ہو سکی اور بولی۔

''خدا قسم بیگم صاحب! وہ جنات تھا۔ آپ مجھ سے جو قسم چاہو لے لو، وہ بالکل جنات تھا۔''

''کون؟ کس کی بات کر رہی ہو؟'' افشاں کی آواز خوف سے بیٹھی جا رہی تھی۔

''سو رہی تھی بیگم صاحب اپنے کمرے میں۔ کچھ گرنے کی آواز آئی تو جاگ گئی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو...... تو...... ہائے میرے مولا کیسے بتاؤں میں آپ کو۔''

''جیسے بتا رہی ہو ویسے بتاؤ۔'' افشاں نے دانت پیس کر کہا۔

''بیگم صاحبہ! خدا قسم چاروں ہاتھوں پیروں سے چل رہا تھا وہ۔ شیطانوں جیسی شکل تھی۔ سفید بھکا بھک۔ ہائے میرے مولا...... مجھے زور سے دھکا دیا اور بھاگ گیا۔ ہائے میں مر جاؤں۔''

''بھ...... بھ...... بھاگ گیا؟'' افشاں نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور پھر ہلکی سی آواز میں چیخ پڑی۔ کیونکہ دروازہ پھر کھلا تھا۔ لیکن دروازہ کھول کر اندر آنے والا ہارون ہی تھا۔ افشاں اسے دیکھنے لگی تو ہارون بولا۔

''جو کوئی بھی تھا بھاگ گیا۔''

''مگر تھا کون؟''

''یقیناً کوئی چور اچکا...... معمولی اٹھائی گیرا۔ آج کل نشے کے عادی لوگ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے گھروں میں گھس جاتے ہیں اور جو بھی ہاتھ لگتا ہے لے بھاگتے ہیں۔''

''نہیں صاحب! نہیں۔ خدا قسم وہ نشئی نہیں تھا۔'' رشیدہ نے کہا۔

''پھر کون تھا؟''

''مولا قسم، جنات تھا میں پکی بات کر رہی ہوں۔ جنات ہی تھا۔''

''اوہو...... تمہاری اس سے واقفیت تھی؟'' ہارون نے ماحول کے بھاری پن کو کم کرنے کی کوشش کر کے مذاق میں کہا۔

''آپ ہمارا یقین کر لو صاحب جی۔''

''اچھا بابا...... چلو ٹھیک ہے۔ جاؤ سو جاؤ...... جاؤ چلو آرام کرو۔ کیا عجیب رات ہے یار ذرا سی آنکھ لگ گئی تھی۔''

''صاحب جی جائیں ہم؟''

رشیدہ کی ہچکچاہٹ دیکھ کر ہارون بولا۔ ''ہاں...... ہاں جاؤ۔ دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ ہم لوگ تمہیں آواز نہیں دیں گے۔ کوئی بھی آہٹ ہو باہر نہیں نکلنا۔''

''اچھا جی......'' رشیدہ نے کپکپاتے لہجے میں کہا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔
افشاں ابھی تک خوفزدہ تھی۔ ہارون نے مسکرا کر کہا۔

''جی، اپنا پروگرام بھی بتا دیجئے گا آپ۔''

''ہارون! وہ اٹھائی گیرا نہیں تھا۔ تم نے اس ہاتھ کو نہیں دیکھا جو سائیڈ بورڈ پر کچھ ٹٹول رہا تھا۔ ہارون! وہ ہاتھ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت لمبا اور خوفناک۔''

''آپ جاگ رہی تھیں؟''

''نہیں، میں آہٹ سن کر جاگی تھی۔'' افشاں نے جواب دیا۔

''تو براہِ کرم اب سو جائیے۔ تم کو خدا کا واسطہ۔''

''تم اسے سنجیدہ نہیں لے رہے۔ میرا وہم ہی سمجھ رہے ہو۔ آخر وہ پازیب بھی تو لے گیا۔ تمہیں پتہ ہے نا اس کے بارے میں۔''

''جی ہاں پتہ ہے۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ کوئی معمولی اچکا تھا۔ جو ہاتھ لگا، لے بھاگا۔ چاندی کی وہ معمولی پازیب مجھے راستے میں پڑی ملی تھی۔ اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔''

''لیکن ہارون......''

''پلیز افشاں! دیکھو بس سورج نکلنے ہی والا ہے۔ تھوڑی سی نیند لے لینے دو مجھے پلیز۔ بڑی مہربانی ہوگی۔''

افشاں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اشعر کے پاس بستر پر جا کر لیٹ گئی۔
ہارون بھی اپنے بستر پر پہنچ گیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں نیند کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ افشاں کے خوف کو کم کرنے کے لئے اس واقعہ کو معمولی بنا کر پیش کیا تھا۔ وہ بڑی گہرائیوں میں سوچ رہا تھا۔ گزرنے والے مناظر آنکھوں میں آ رہے تھے۔ پازیب کی چھن چھن، سڑک پر دوڑنے والی لڑکی۔ آہ...... کیا ہو رہا ہے یہ...... کون تھی وہ؟ کون تھی؟ کیا ہو گیا ہے، کہیں کوئی خوفناک کہانی جنم نہ لے لے۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ساری رات کی جگار تھی۔ ذہن الگ پریشان تھا۔ پتہ نہیں وہ نیم غشی تھی یا گہری نیند...... حقیقت تھی یا خواب۔ اس کے چاروں طرف گہرا تاریک اندھیرا چھایا ہوا تھا اور نگاہوں میں آہستہ آہستہ ایک منظر ابھر رہا تھا۔ نیم تاریکی میں

لپٹا ہوا ایک کمرہ جس کے مدھم ملگجے نقوش اجاگر ہوتے جا رہے تھے۔ یہ اس کا بیڈ روم نہیں تھا جس میں وہ سو رہا تھا بلکہ ایک اچھا خاصا بڑا کمرہ تھا جس میں لمبے لمبے جالے لٹکے ہوئے تھے۔

کمرے کا ماحول بے حد دہشت ناک تھا۔ جگہ جگہ چمگادڑیں نظر آ رہی تھیں جو اپنی جگہ تبدیل کرتیں تو ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ بہت عجیب محسوس ہوتی۔ اچانک کوئی چمگادڑ زور سے پر پھڑ پھڑاتی اُڑی۔ دو موٹے بھدے پاؤں آگے بڑھتے نظر آئے۔ اور پھر کمرے کے ایک گوشے میں ایک سفیدی سی ابھری۔ وہ بہت خوبصورت حسین پاؤں تھے۔ کسی لڑکی کے پاؤں جن میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ ایک پاؤں میں ایک پازیب تھی دوسرا خالی تھا۔ پھر کچھ لمحے بعد دو بھدے بالوں بھرے ہاتھ آگے بڑھتے نظر آئے اور انہوں نے لڑکی کے خالی پاؤں میں پازیب پہنا دی۔ ایک انوکھی ہنسی سنائی دی۔ یہ ہنسی ہارون کی شناسا تھی۔ وہی ہنسی جو اسے درختوں کے درمیان سنائی دی تھی۔ آہ...... یقیناً یہ وہی ہنسی تھی۔ تاریکی میں چھن...... چھن، چھن کی آواز...... کہیں دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

جیسے ہی اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی...... چھن چھن کی آواز ایک دم خاموش ہو گئی۔
ہارون اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے منہ سے آہستہ سے آواز نکلی۔

''لاحول ولا قوۃ۔ اتنی سی دیر میں خواب بھی دیکھنے لگا۔ لیکن یہ خواب کیا ہی انوکھا خواب ہے۔ یہ کس طرح کے واقعات میرے اردگرد بکھر گئے ہیں؟ راستے کا سفر، اس لڑکی کا سایہ، پازیب کی جھنکار...... چلو باقی سب کچھ تو مان لیا جائے کہ ایک وہم، ایک تصور تھا جو خواہ مخواہ دل میں آ گیا ہے۔ لیکن وہ پازیب کیا چیز تھی...... اور پھر وہ بالوں بھرا ہاتھ؟ اس نے گردن گھما کر افشاں اور اس کے بعد اشعر کو دیکھا۔ دونوں گہری پُرسکون نیند سو رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی نگاہیں اس سائیڈ بورڈ پر پڑی تھیں جس پر رات کو پازیب رکھ دی گئی تھی اور اس کی عقب کی کھڑکی سے کسی بالوں بھرے ہاتھ نے پازیب اٹھا لی تھی۔ ہارون کو وہ ڈھیر یاد آیا جو رینگ رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کمرے کی پچھلی والی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پازیب چرانے والا کہاں سے اندر داخل ہوا اور کس طرح

اس نے کھڑکی کھول کر پازیب اٹھائی۔ یقیناً اس سلسلے میں کچھ نشانات تو ضرور ملیں گے۔ وہ کھڑکی کے پیچھے بیٹھ گیا اور جھک جھک کر دیکھنے لگا۔ پھر اسی طرح چلتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا اور دوسرے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی کچھ نہ ملا تو واپس آیا اور راہداری میں زمین پر نگاہیں دوڑانے لگا۔ وہ جھکا جھکا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ہی رشیدہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے رشیدہ کے حلق سے ایک خوفناک دھاڑ نکلی۔ یہ دھاڑ ایسی تھی کہ ہارون اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا اور اوندھا گر پڑا۔ دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے غصیلی نگاہوں سے رشیدہ کو دیکھا اور بولا۔

''تم پاگل ہوگئی ہو کیا؟ کیا مصیبت نازل ہوگئی ہے تم پر؟''

رشیدہ کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے بمشکل تمام خود پر قابو پایا اور بولی۔ ''صاحب جی! رات کی ڈری ہوئی ہوں۔ وہ بھی تو ایسے ہی دونوں ہاتھوں اور پیروں کے بل چل رہا تھا۔''

''رشیدہ تم واقعی پاگل ہوگئی ہو۔ وہ بھی میں ہی تھا۔'' ہارون بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ اسے ڈیوٹی پر واپس جانا تھا۔ رشیدہ یہاں رہے گی۔ اگر وہ دونوں ڈرتی رہیں تو مصیبت ہی آ جائے گی۔ رشیدہ نے چونک کر کہا۔

''صاحب جی آپ؟''

''ہاں..... تم نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے۔ سوتے سوتے اٹھتا ہوں اور چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلنے لگتا ہوں۔ یہ بات میں افشاں کو نہیں بتانا چاہتا تھا بلاوجہ پریشان ہوگی۔ لیکن رات کو تم نے وہ دھما چوکڑی مچائی.....''

''ہائے میرے مولا، وہ آپ تھے صاحب جی؟''

''ہاں، کہا ناں میں ہی تھا بس۔ افشاں کو نہیں بتانا چاہتا تھا مگر تم نے.....''

''لو صاحب جی! مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ رات میں ایسے کیوں چلتے ہیں۔ مگر صاحب جی آپ کی بات میری سمجھ میں آئی نہیں۔''

''رشیدہ بیگم! یہ ایک بیماری ہوتی ہے جسے میلیفیم کہتے ہیں۔ ذرا کام سے فرصت ہو جائے گی تو علاج کراؤں گا۔ اس وقت تک ڈرنا ورنا چھوڑ دو۔ میں تو تمہارے اوپر پورے گھر کو چھوڑ چکا ہوں اور تم ہو کہ اس طرح ڈر کر اور حالات خراب کر دیتی ہو۔''

''صاحب جی! مجھے نہیں معلوم تھا۔ آپ بے فکر رہیں۔ اب نہیں ڈروں گی میں۔ ارے ہاں..... مرد کی بچی ہوں..... لو، بھئی لو مجھے کیا معلوم تھا۔ پر صاحب مرد کی بچی ضرور ہوں پر عورت ہوں۔''

''ہاں..... ہاں، ٹھیک ہے۔ جاؤ ناشتہ تیار کرو۔ مجھے جانا ہے۔''

''جاتی ہوں صاحب جی! لو غضب ہو گیا۔ بلاوجہ ایسی دھما چوکڑی ہوگئی۔'' رشیدہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ہارون گہری سانس لے کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر جیب سے محدب شیشہ نکال کر زمین کا جائزہ لینے لگا لیکن کسی نشان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ بہرحال صبح تو ہو ہی چکی تھی۔ ہارون واپس آ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد افشاں بھی جاگ گئی۔ اشعر بھی جاگ گیا تھا۔ ماں نے اسے بتایا کہ رات کو پاپا واپس آ گئے ہیں تو اشعر خوشی سے اچھل پڑا۔

ہارون غسل خانے سے نکلا تو اشعر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''ہیلو پاپا..... ہاؤ آر یو؟''

''فائن بیٹے۔ آپ بتائیں۔''

''میں ٹھیک ہوں پاپا..... معمولی سا بخار ہو گیا تھا۔''

''ہوں..... بس سمجھ لیجئے آپ ہی کی وجہ سے آنا پڑا۔''

''کیوں پاپا..... میری وجہ سے کیوں؟''

''ماما نے فون کیا تھا کہ ہمارے بیٹے کو بخار ہو گیا ہے۔''

''نہیں پاپا! یہ تو میرا خیال ہے مناسب بات نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ ذمہ داری تو ہمیں ہر حالت میں پوری کرنی چاہئے۔ آپ ابھی تو گئے تھے حالانکہ پاپا ایسا نہ سمجھئے کہ آپ کے بغیر میرا دل لگتا ہے۔''

''بھئی واقعی ہمارے اشعر صاحب تو بہت بڑے ہو گئے ہیں۔ زبردست باتیں کرتے ہیں یہ۔''

''دیکھ لیجئے آپ۔ مجھ سے پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ نظر لگ گئی بس۔''

''اب جلدی سے ناشتہ لگا دیجئے افشاں بیگم! کیا بتاؤں ابھی تو کام شروع بھی نہیں ہوا ہے صحیح طریقے سے۔''

''مجھے پتہ ہے۔ ابھی ناشتہ لگواتی ہوں۔'' افشاں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''جی اشعر صاحب! تو یہ بیماری آخر کیسے آ گئی؟''
''بس پاپا! تھوڑا سا آپ کو مس کیا تھوڑا سا موسم کا اثر۔''
''ویری گڈ.....'' افشاں بیگم نے فوراً آ کر کہا۔ ''وہ رشیدہ بیگم ناشتہ لگا بھی چکی ہیں۔ پتہ نہیں انہیں یہ میلینیم، میلینیم کیا ہو گیا ہے۔''
''میلینیم؟''
''ہاں، آیئے ناشتے کی میز پر چلتے ہیں۔''
سب ناشتے کے کمرے میں پہنچ گئے اور افشاں ناشتہ سرو کرنے لگی۔ ہارون نے کہا۔
''میں سوچ رہا ہوں افشاں کہ ایک چوکیدار کا بندوبست کر دوں۔ کوئی ایسا بندہ مل جائے جو دن رات یہاں رہے تو ہم اسے رکھ لیتے ہیں۔''
''نہیں ہارون ایک خرچہ اور بڑھ جائے گا۔ معمولی تنخواہ پر تو نہیں ملے گا دن رات کے لئے چوکیدار۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب کچھ عرصے کے لئے باہر رہنا ہو گا۔''
''اللہ مالک ہے..... کام چلائیں گے ایسے ہی۔'' افشاں نے کہا اور ہارون خاموشی سے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ اشعر نے کہا۔
''آپ لوگ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ چند روز کی بات ہے۔ میں جوان ہو جاؤں گا تو گھر کی چوکیداری بھی کروں گا۔''
''ارے نہیں بیٹا! آپ چوکیداری کریں گے؟ آپ تو اس گھر کی عزت میں چار چاند لگائیں گے۔''
''ایک تو یہ محاورے ایجاد کرنے والوں نے لٹیا ڈبو دی ہے۔ پورے آسمان پر تو صرف ایک چاند ہے اور ہم لوگ بڑے آرام سے ہر چیز میں چار چاند لگا دیا کرتے ہیں۔''
''دیکھا آپ نے.....؟'' افشاں نے ہنستے ہوئے کہا۔
اسی وقت رشیدہ دوبارہ کمرے میں داخل ہو گئی۔
''وہ بی بی جی! کپڑے میلینیم ہو گئے.....''
''کیا ہو گئے؟''
''وہ..... نہیں جی..... نہیں جی۔ وہ رات کو سوتے میں چلنے کی بیماری..... کچھ نہیں

بی بی جی! میں تو گانے گا رہی تھی..... میلینیم..... میلینیم.....'' رشیدہ نے کہا اور ہارون نے بے اختیار ہنسی روکی۔ وہ رشیدہ کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔
''چلئے اٹھا جائے۔''
''ایک ایک چائے اور سہی۔''
''نہیں افشاں، اب میں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں ابھی کام شروع ہوا ہے۔ میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ رشیدہ! کپڑے کہاں رکھے ہیں؟''
''صاحب جی! آپ کے کمرے میں۔'' رشیدہ نے کہا۔
ہارون نے اندر جا کر کپڑے تبدیل کئے اور تھوڑی دیر کے بعد باہر آ گیا۔ افشاں اور اشعر اسے چھوڑنے آئے تھے۔ ہارون جیپ میں بیٹھ گیا تو افشاں نے اشعر سے کہا۔
''اشعر! پاپا کو خدا حافظ کہو بیٹے۔''
''خدا حافظ پاپا۔''
''خدا حافظ بیٹے۔ اب آپ بیمار نہیں ہوں گے۔ ٹھیک ہے؟''
''ہاں پاپا..... مگر اب اگر فلو کا وائرس لگ جائے تو کوئی کیا کرے پاپا، آپ بتایئے۔''
''خدا کی پناہ..... بھئی اس بقراط کو روکو۔ بقراط صاحب اس دور میں ہوتے تو ساری فراستی بھول جاتے۔ اچھا اب دیر ہو رہی ہے۔ چلتا ہوں۔ فون پر رابطہ رہے گا۔''
ہارون نے کہا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ افشاں اور اشعر ہاتھ ہلانے لگے۔ رشیدہ بھی پیچھے کھڑی تھی اور آہستہ آہستہ اس کے منہ سے آواز نکل رہی تھی۔
''میلانیم..... میلانیم..... نہیں مونی..... اُف توبہ.....''

پراسرار ویرانے میں جہاں اب پراسرار واقعات کا تعلق صرف ہارون سے نہ رہا تھا بلکہ کامران صاحب بھی اس چھن چھنا چھن سے آشنا ہو چکے تھے۔ مزدوروں نے اپنا کام شروع کر رکھا تھا۔ سورج پوری طرح آسمان پر چڑھ چکا تھا اور کامران بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ مزدوروں نے ایک بڑا سا بورڈ لگا دیا تھا جس پر سروے آف رورل ڈویلپمنٹ لکھا ہوا تھا۔ کامران ہر ایک کو ہدایت دے رہا تھا اور مزدور پھیل پھیل کر کام کر رہے تھے۔

اچانک کامران چونک پڑا۔ کچھ مزدور دوڑتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے کوئی خاص چیز دیکھ لی ہو۔ کامران گردن اٹھا کر ادھر دیکھنے لگا اور چند لمحوں کے بعد مزدور اس کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے چہرے جوش سے سرخ ہو رہے تھے۔ ایک مزدور نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

''سر جی! ادھر...... ادھر جی۔''

''کیا بات ہے شیر علی؟''

''صاحب جی! مزار نکلا ہے...... مزار نکلا ہے ادھر۔'' کامران نے چونک کر کہا۔

''مزار؟''

''ہاں جی۔ ادھر کھدائی کر رہے تھے، قبر نکلی ہے۔''

''اوہو...... کہاں؟ چٹان کے پیچھے؟''

''جی ہاں۔''

''آؤ، آؤ میرے ساتھ۔'' کامران نے کہا اور تیزی کے ساتھ اس طرف دوڑنے لگا۔ دوڑتا ہوا وہ اس چٹان کے عقب میں پہنچ گیا۔ مزدور خاصے فاصلے پر کھڑے ہو گئے تھے اور خوفزدہ نگاہوں سے ادھر دیکھ رہے تھے۔ کامران آگے بڑھا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں پکی قبر زمین سے نکلی تھی۔ اس قبر پر ایک برتن رکھا ہوا تھا جس

سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کامران نے حیرانی سے ادھر دیکھا اور پھر مزدور کی طرف رخ کر کے بولا۔

''شیر علی ادھر آؤ...... آدھر آؤ شیر علی۔''

مزدور ہچکچاتا ہوا ادھر آیا۔ اس کے انداز پر کامران کو غصہ آ گیا اور وہ غصیلے انداز میں بولا۔

''ادھر آؤ...... مرے کیوں جا رہے ہو یار!''

شیر علی اور قریب پہنچ گیا تو کامران نے دھوئیں والے برتن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خوشبو یہاں کس نے جلائی ہے؟''

''نہیں صاحب جی! خود بخود جلی ہے۔ خدا قسم آپ ان تمام کے تمام لوگوں سے پوچھ لو۔ خود بخود جلی ہے۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ دوسروں سے معلوم کرو۔''

''یقین کریں صاحب جی! ہم سب تو بھاگ گئے تھے۔ ہم یہاں کھدائی کر رہے تھے کہ یہاں یہ قبر نظر آئی۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے سر جی کہ یہ کوئی چوکور چٹان ہے۔ ہم اس کے کنارے صاف کرنے لگے تو یہ پکی قبر نکلی۔ صاحب جی! ہم نے کام روک دیا اور آپ کے پاس بھاگ نکلے اور پھر یہ برتن دیکھو اور یہ آگ دیکھو۔ یہ تو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے برتن صاحب جی آج کل کہاں ملتے ہیں۔ ہمارے پاس کہاں سے آئے جو ہم اس میں خوشبو جلاتے۔''

''کیا......؟'' کامران نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اب وہ غور سے اس برتن اور اس میں سے نکلنے والے دھوئیں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا قصہ ہے؟''

''صاحب جی! کوئی بہت بڑے بزرگ معلوم ہوتے ہیں یہ۔ آپ دیکھو کہ یہ خوشبو بھی خود بخود جل اٹھی۔ اب کیا کریں صاحب جی!''

''نہیں...... اگر یہ بزرگ ہیں تو ہم ان کا احترام کرتے ہیں۔ ادھر کام نہ کرو۔ انجینئر صاحب آ جائیں تب دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب جی!'' مزدور نے کہا اور کامران سکتے کے عالم میں کھڑا اس قبر کو دیکھتا رہا۔ دفعتہ کسی کی آواز سنائی دی۔

''انجینئر صاحب آ گئے...... انجینئر صاحب آ گئے۔''

کامران چونک کر اس طرف متوجہ ہوا۔ ہارون کی جیپ اسی طرف آ رہی تھی۔ اور پھر وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں کامران کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جیپ روکی اور نیچے اتر آیا۔

''السلام علیکم جناب!''

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو کامران؟''

''سر! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بتایئے اشعر کیسے ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔ اب بالکل ٹھیک ہے۔ تیز بخار ہو گیا تھا لیکن موسمی تھا۔ انجکشن وغیرہ لگ گیا، اب ٹھیک ہے۔ میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ تم بتاؤ سب ٹھیک ہے..... کام ہو رہا ہے؟'' ہارون کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔

''جی سر! کام ہو رہا ہے۔''

''کہاں بھئی! یہ سب تو ٹولیاں بنائے کھڑے ہیں۔ کیا قصہ ہے؟''

''سر! وہی بتانے جا رہا تھا میں۔ ذرا ادھر دیکھئے۔''

''اوہو..... یہ کیا ہے؟''

''یہ ایک قبر کھدائی میں برآمد ہوئی ہے اور سب سے حیران کن بات یہ ہے جناب کہ اس پر خوشبو والا برتن بھی نمودار ہوا ہے اور اس میں خوشبو بھی خود بخود ہی جل اٹھی ہے۔''

''اوہ، آؤ ذرا۔'' ہارون نے کہا اور قبر کے پاس پہنچ گیا۔ قبر پر رکھے بخور دان سے خوشبودار دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہارون غور سے اس قبر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... اس جگہ اور کھدائی نہیں ہو گی۔ جگہ تبدیل کر دو۔''

''بہت بہتر سر! نقشے میں تھوڑی سی تبدیلی کئے لیتے ہیں۔ پتہ نہیں کون بزرگ یہاں دفن ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... میں لباس تبدیل کر لوں۔ بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے کا بندوبست کرو۔''

''ٹھیک ہے سر! ابھی لیجئے۔'' کامران نے جواب دیا اور ہارون اپنے خیمے کی جانب چل پڑا۔ کامران دوسری طرف چل پڑا تھا جہاں کھانے کا بندوبست کیا جانے والا تھا۔

❁

پچھلی راتوں کی طرح آج رات ذرا مختلف تھی۔ مزدوروں کے خیموں میں مدھم مدھم روشنیاں جل رہی تھیں اور ایک سناٹا سا ہر طرف طاری تھا۔ کامران نے ہارون کے خیمے پر آواز دی تھی اور ہارون باہر نکل آیا تھا۔ رات کے کھانے وغیرہ سے بھی فراغت حاصل ہو چکی تھی۔ رات کو یہاں موسم کافی خوشگوار ہو جاتا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس چٹان تک پہنچ گئے جو ڈھلان کے کنارے پر تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ قبر پر رکھے بخوردان سے مسلسل دھواں اٹھ رہا تھا اور خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ دونوں چٹان پر جا بیٹھے۔ ہارون نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''یہ مزدور کچھ ڈرے سہمے ہوئے سے لگتے ہیں۔ آج گانا بجانا بھی نہیں ہو رہا ہے۔''

''جی سر! قبر دریافت ہونے کے بعد سے کافی ڈر گئے ہیں۔''

''ڈرنے کی بات تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کسی مسافر کی قبر ہو۔ جس کا دورانِ سفر انتقال ہو گیا ہو اور مجبوراً یہاں تدفین کر دی گئی ہو۔''

''سیدھے سادھے لوگ ہیں سر! ان کے لئے تو ویرانے میں قبر ہی کافی ہے۔ ویسے سر! آپ کو ایک بات بتاؤں ساری باتیں مانی جا سکتی ہیں لیکن وہ خوشبو دار برتن..... وہ شدید حیرانی کا باعث ہے اور اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ کوئی بڑی ہی بات ہے۔''

''بھئی کسی نیک آدمی کی قبر بھی تو ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے معجزے اکثر دکھاتا رہتا ہے اور یہ ظاہر کرتا رہتا ہے کہ نیکی کا پھل نیکی اور بدی کا بدی۔''

''جی سر! یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔''

''پھر بھی یہ خیال ان کے دل سے ہٹاؤ۔ کہیں کام متاثر نہ ہو۔''

''میں بھی مسلسل ترکیب سوچ رہا ہوں۔ ویسے سر! جگہ کافی گڑبڑ ہے۔ وہ چھن چھن ہی کافی تھی کہ قبر بھی نمودار ہو گئی۔ سر! میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ رات کا واقعہ آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔''

''رات کا واقعہ؟''

''جی سر! رات کو وہ آپ کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔''

''کیا یہ بے تکا مذاق نہیں ہے؟ ہمیں یہاں کام کرنا ہے اور تم اس جگہ کو اور

پراسرار بنائے دے رہے ہو۔ اگر ہم یہ واقعات بیان کر کے یہاں سے گلو خلاصی کرانا بھی چاہیں گے تو جانتے ہو ہمارے کیریئرز پر کیا اثر پڑے گا؟"

"نہیں سر! میں مذاق نہیں کر رہا۔ آپ یقین کیجیے! میں تو بری طرح ڈر گیا تھا۔"

"ہوا کیا......؟" ہارون نے سوال کیا اور کامران رات کا واقعہ اسے سنانے لگا۔

ہارون نے ابھی تک جان بوجھ کر کامران کو اپنے راستے کے سفر کی روداد نہیں سنائی تھی۔ وہ واقعات بھی معمولی تو نہیں تھے۔ ہلکے ہلکے انداز میں پراسرار واقعات کا آغاز ہو رہا تھا اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ صورتحال کہاں تک پہنچے۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا پھر بولا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کامران! کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ ہر لمحے کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں ہے۔ گھر جاتے ہوئے مجھے بھی عجیب و غریب حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"

ابھی ہارون نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کامران چیخ پڑا۔

"سر!...... سر! وہ دیکھیے...... وہ دیکھیے...... ادھر اس طرف۔" ہارون ایک دم چونک کر کامران کی طرف دیکھنے لگا۔ کامران جس طرف دیکھ رہا تھا اس کی نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ تب اس نے دیکھا کہ تاریک رات میں اس علاقے میں وہی شمع گردش کر رہی ہے۔ دونوں غیر اختیاری سی کیفیت کا شکار ہو گئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ روشنی مسلسل درختوں کے درمیان اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھی۔ پھر ہوا کے دوش پر ہلکی ہلکی چھن، چھن، چھن کی آواز بھی سنائی دی اور کامران کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"سر! وہی ہے۔"

"ہاں......" ہارون کی سرسراتی آواز ابھری۔

"چلیں سر؟" کامران نے حیرت و شوق اور دلچسپی سے کہا۔

"تم بتاؤ...... ہمت ہے؟"

"سر! کل تو میں اکیلا تھا۔ یہی بات ہے ہمت نہیں پڑی تھی۔ لیکن آج آپ موجود ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... آؤ دیکھیں۔"

"سر! پیدل چلیں گے؟"

"ہاں۔ آؤ تو سہی۔"

دونوں آگے بڑھ گئے اور ڈھلان طے کرنے لگے۔ فاصلہ اچھا خاصا تھا لیکن بہرحال وہ ان درختوں کے درمیان پہنچ گئے۔ اس دوران وہ روشنی غائب ہو گئی تھی اور مکمل خاموشی طاری تھی۔ یہ لوگ اس پراسرار ماحول میں آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک کوئی پرندہ ان درختوں سے چیختا ہوا اڑا اور دونوں بری طرح اچھل پڑے۔ پرندہ اڑتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہے تھے کہ اچانک پھر چھن چھن کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی کسی نوجوان لڑکی کی ہنسی۔ کامران نے بے قرار نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بار پھر اسے وہ روشنی نظر آ گئی اور وہ چیخا۔

"سر! وہ ادھر...... اس طرف دیکھیے...... وہ......"

"ہاں...... میں روشنی دیکھ رہا ہوں۔"

"وہ روشنی آگے بڑھ رہی ہے سر! ہم چلیں۔" ہارون نے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ روشنی سے فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا اور دو پاؤں نظر آ رہے تھے جن میں پازیبیں چھنک رہی تھیں۔ وہ کبھی رکتی، کبھی بھاگنے لگتی۔ یہ دونوں مسلسل اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اچانک ہی کامران کو ایک زوردار ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔

"ارے باپ رے......"

"سنبھل کر یار، اٹھو۔"

اس طرح گرنے میں دونوں کی توجہ روشنی کی جانب سے ہٹ گئی تھی۔ پھر جب ہارن نے کامران کو سیدھا کھڑا کیا تو روشنی غائب ہو چکی تھی۔ کامران کی نگاہیں پھر ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"وہ دیکھیے سر! وہ......"

"آؤ......" انہیں احساس بھی نہ ہو سکا کہ وہ اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد کب پرانے سہائے پور کے کھنڈرات کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ٹوٹے ہوئے کھنڈرات، اینٹوں کے ڈھیر سر اٹھائے کھڑے ہوئے تھے اور وہ ان کے درمیان ہکا بکا نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی مدھم چھاؤں نے اس بھوتوں کے شہر کو اچھا خاصا روشن کر رکھا تھا۔ ہر کھنڈر میں ایک دروازہ دہانے کی شکل میں نظر آتا تھا۔ وہ جس جگہ کھڑے تھے وہاں بھی ان کے بائیں سمت ایک ٹوٹی ہوئی عمارت منہ پھاڑے کھڑی

ہوئی تھی۔ بھیانک اینٹیں یوں لگ رہی تھیں جیسے نظر نہ آنے والی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی ہوں۔ عجیب وغریب شکلیں بنی ہوئی تھیں ان کھنڈرات کی۔

پہلے یہ کھنڈرات انہوں نے بڑی دور سے دیکھے تھے۔ لیکن اب وہ انہی کے درمیان موجود تھے۔ ہر طرف گہری اور بھیانک خاموشی طاری تھی۔ دفعتہً کامران کی سرسراتی آواز ابھری۔

''سر! ذرا سا ادھر دیکھئے...... ادھر مجھے اس ڈبے کے پاس روشنی نظر آئی ہے۔''

نجانے کہاں سے ان کے اندر یہ ہمت اور جرأت پیدا ہوگئی تھی۔ حالانکہ در و دیوار چیخ رہے تھے۔ زمین جیسے ہل رہی تھی۔ ایک ایسا بھیانک سناٹا جو انسان کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دے۔ اوپر سے تاروں کی چھاؤں، کانوں میں ایک ہلکی ہلکی چھنن چھنن کی آواز گونجتی ہوئی۔ لیکن وہ ہمت سے یہاں کھڑے ہوئے تھے۔ جس جگہ کامران نے ایک بار پھر روشنی کا دھبہ دیکھا تھا وہاں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اچھی خاصی عمارت تھی۔ غالباً یہاں موجود بہت سی عمارتوں سے صحیح سالم۔ ہارون کے قدم آگے بڑھے تو کامران نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''سر! کیا ادھر جا رہے ہیں؟''

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا اور کچھ دیر کے بعد وہ دروازے کے پاس آ کر رک گئے۔ مدھم سی روشنی انہیں اس ٹوٹے پھوٹے مکان کے اندر نظر آ رہی تھی۔ کامران نے آہستہ سے کہا۔

''یہ روشنی لرز رہی ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ وہ یہی شمع ہے۔ میرا خیال ہے وہ اسی گھر میں گئی ہے۔''

''اچھی خاصی عمارت ہے، دور سے نظر نہیں آئی۔''

''جی ہاں سر! یہاں بہت سے گھر سلامت ہیں۔ پتہ نہیں سہائے پور کی قدیم تاریخ کیا ہے سر! ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں یہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہئے تھیں۔ سرسری طور پر اس کا نام سنا تھا۔ ہم سمجھے کہ ہوگی کوئی ایسی ہی جگہ۔ لیکن یہ تو بڑا پراسرار علاقہ ہے۔''

ہارون کو لگ رہا تھا کہ کوئی پراسرار غیر مرئی قوت اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس نے کامران کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کامران نے پھر کہا۔

''سر! ویسے آپ کا کیا خیال ہے، سہائے پور کے ان کھنڈرات میں کوئی رہتا تو

نہیں ہوگا؟''

''ظاہر ہے یہاں انسان تو نہیں مل سکتے البتہ......''

''جی سر! بالکل۔'' کامران کی خوفزدہ آواز ابھری۔

''پھر کیا ارادہ ہے...... واپس چلیں؟''

کامران نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''سر! یہاں تک آئے ہیں تو تھوڑا سا تو اور آگے بڑھیں۔''

''گھر کے اندر؟''

''جی سر!'' کامران نے جواب دیا۔

''اور اگر کوئی یہاں رہتا ہو تو اس طرح کسی کے گھر میں گھس جانا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔''

''سر! آواز دیں۔ کیا خیال ہے آپ کا، ممکن ہے جواب ملے۔''

''ٹھیک ہے، آواز دو۔''

کامران نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر زور سے بولا۔

''کوئی ہے؟ ... یہاں کون رہتا ہے...... باہر آؤ...... کوئی ہے؟......''

کھنڈرات کے ہر در و دیوار سے کامران کی آواز واپس پلٹ پڑی اور دیر تک فضا میں ارتعاش رہا۔ کامران کچھ لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

''کون ہے مکان کے اندر...... جو کوئی رہتا ہے وہ باہر آ جائے۔''

اچانک ہی گیدڑوں کے چیخنے کی بہت سی آوازیں آئیں اور کامران نے خوفزدہ ہو کر ہارون کا بازو پکڑ لیا۔ گیدڑ اچانک بول پڑے تھے۔ آس پاس کہیں سے بھاگنے کی آوازیں ابھریں تو کامران بے اختیار خوفزدہ ہو کر گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چونکہ وہ ہارون کا بازو پکڑے ہوئے تھا اس لئے ہارون بھی اس کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔ دونوں غیر اختیاری طور پر اندر داخل ہو گئے تھے لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ایک بہت ہی بڑی اور کشادہ ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔ اینٹوں کے ڈھیر ڈیوڑھی کے در و دیوار سے جھانک رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دوسری طرف بھی دروازہ تھا جو کواڑوں کے بغیر تھا اور وہاں سے گھر کی چہار دیواری نظر آ رہی تھی جو ٹوٹی پھوٹی تھی۔ یہ خوفناک منظر بڑا عجیب وغریب تھا۔ چہار دیواری کے آخری حصے میں ایک دالان کے ستون کھڑے ہوئے تھے۔ غالباً ان میں کوئی کمرہ بھی تھا جس

کے دروازے سے روشنی چھن رہی تھی۔

بڑی پراسرار اور ہولناک کیفیت تھی۔ ہر طرف سے کوئی نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر سے گیدڑوں کی آوازیں ایک دم بند ہو گئی تھیں۔ یوں لگا تھا جیسے گیدڑوں کا کوئی غول چیختا ہوا وہاں سے گزرا ہو۔ کامران نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''کیا خیال ہے سر! آگے بڑھیں؟''

''روشنی تو ہے۔''

''یہ سرسراہٹ کیسی ابھری؟''

''ہوا تو نہیں چل رہی۔ نہ ہی یہاں کوئی درخت ہے جس کے پتے زمین پر سمٹ رہے ہوں۔''

''آؤ، آؤ آگے چلیں۔ دیکھیں کون رہتا ہے اس عمارت میں۔''

چنانچہ وہ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور اس دالان میں داخل ہو گئے۔ دیوانگی ہی کہی جا سکتی تھی۔ ورنہ اتنے پراسرار اور خوفناک ماحول میں ایک قدم آگے بڑھانا بھی ایک مشکل کام تھا۔ لیکن پتہ نہیں یہ ان کے اندر کی ہمت تھی یا پھر کوئی پراسرار اور غیر مرئی قوت جو انہیں اپنے پاس بلا رہی تھی۔ وہ دونوں دالان میں داخل ہو کر دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ دوسرے لمحے انہوں نے چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلتے ہوئے دیکھا اور دونوں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ دالان کا دروازہ کھل گیا تھا۔

''کون ہے...... کون ہے یہاں...... سامنے آؤ۔'' ہارون نے بے پناہ ہمت کر کے کہا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' ہارون نے کامران کا بازو پکڑا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ دروازے کے دوسری جانب ایک بہت بڑا ہال نظر آ رہا تھا جس میں پرانے طرز کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کارنس پر شمع روشن تھی۔ وہ اندر پہنچ کر چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگے کہ اچانک ایک زوردار اور بھیانک آواز کے ساتھ پیچھے کا دروازہ بند ہو گیا۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ کامران پلٹ کر دروازے کی طرف پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مضبوط دروازہ مضبوطی سے بند ہو گیا تھا۔ کامران نے گھبرا کر ہارون کو دیکھا اور بولا۔

''یہ...... یہ دروازہ بند ہو گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہماری واپسی کے راستے بند کر رہا ہو۔''

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند لمحات وہیں کھڑا رہا۔ کامران اس کے پاس پہنچ گیا اور وہاں رکھی ہوئی اشیاء کو دیکھنے لگا۔ شمع بھی اسی کارنس پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کارنس پر ایک کانسی کی رقاصہ کا مجسمہ بھی رکھا ہوا تھا جو رقص کی کیفیت میں تھی اور اس کے پیروں میں ننھی ننھی پازیبیں نظر آ رہی تھیں۔ کامران نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''سر! نکلئے بس یہاں سے...... میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

ہارون نے کامران کو دیکھا اور پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''آپ جانا چاہیں تو تشریف لے جائیے۔ میں کچھ دیر کے بعد آ جاؤں گا۔''

کامران نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہارون کو دیکھا اور بولا۔

''آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟''

''جی نہیں...... میں سپر مین ہوں۔ یار تم کچھ زیادہ ہنگامہ نہیں کر رہے؟ وہ دیکھو ایک اور دروازہ۔'' ہارون نے ایک طرف اشارہ کیا۔ سامنے ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر پردہ لہرا رہا تھا۔ کامران نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''خ...... خ...... خدا کی قسم سر! خدا کی قسم یہ دروازہ پہلے یہاں نہیں تھا۔ میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ یہ دروازہ پہلے یہاں نہیں تھا۔''

ہارون نے ایک گہری سانس لی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمرے کی ایک کھڑکی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ پرانا فرنیچر اندر سے صاف ستھرا تھا۔ اچانک پردے کے پیچھے سے ایک آواز آئی اور کامران کے حلق سے بھی ایک آواز نکل گئی۔

''ہے...... ادھر کوئی ضرور ہے...... میں نے آہٹ سنی ہے۔ آواز بھی سنی ہے۔''

ہارون پراسرار انداز میں خاموش تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر کوئی پراسرار کیفیت طاری ہو۔ وہ ایک لمحے تک سوچتا رہا پھر اس نے کامران کا ہاتھ پکڑا اور پھر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پردے کے پاس پہنچا اور پھر ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ یہ بھی کمرہ تھا لیکن خالی۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کمرے میں ٹوٹی ہوئی میز کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ایک طرف اوپر جانے کا راستہ تھا۔ ہارون کے منہ سے آواز نکلی۔

''ایک نیا راستہ۔''

''واپس چلئے سر! واپس چلئے...... بہت ہو گئی۔ یہ خوفناک آسیبی چکر ہے۔ ہم کسی......'' ابھی کامران نے اتنا ہی کہا تھا کہ اوپر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی

اور کامران نے ڈر کر ہارون کا بازو پکڑ لیا۔

''پلیز...... سر! واپس چلئے جناب!''

''آؤ...... اوپر چلتے ہیں۔ ممکن ہے جو کوئی یہاں ہو سیڑھیوں کے ذریعے اوپر پہنچ گیا ہو۔''

''نہیں سر! پلیز بات اب بہت خطرناک ہو گئی ہے۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔'' کامران نے گڑگڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور وہ...... جو کسی حسینہ دلنواز سے دوستی کا چکر تھا۔ کہہ رہے تھے ناں تم...... کہ عشق ہونا چاہئے چاہے کسی بھوتنی ہی سے کیوں نہ ہو۔''

''خدا کے واسطے سر! اس وقت یہ باتیں نہ کریں۔ میری بات کو مذاق نہ سمجھیں۔ یہ تو بہت بڑی گڑبڑ ہے۔''

''بڑی سادگی کی بات کر رہے ہو۔ تمہیں ان دروازوں کے بند ہونے کا خیال نہیں ہے۔ ہمارے پیچھے والا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ باہر کہاں سے جاؤ گے؟ تم اسے کھولنے کی کوشش بھی کر چکے ہو۔''

کامران کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''تت...... تو کیا ہم یہ دروازہ کھول نہیں سکتے؟ آپ بھی تو...... آپ بھی تو آیئے...... آیئے ناں!'' کامران نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔ اس کی حالت واقعی خراب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس پردے کی طرف بڑھا جو دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ لیکن جب اس نے پردہ ہٹایا تو پیچھے سپاٹ دیوار نظر آئی۔ کامران کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔

''دروازہ...... دروازہ...... دروازہ کدھر گیا؟ یہاں دروازہ نہیں ہے۔''

ہارون نے بھی یہ سپاٹ دیوار دیکھ لی تھی۔ وہ پردے کے قریب پہنچ کر دیوار کو ٹٹولنے لگا پھر بولا۔

''ہم یہیں سے تو گزر کر آئے تھے پھر دروازہ کہاں گیا؟''

''پھنس گئے ہیں ہم...... ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔ اب یہاں سے باہر نہیں نکل سکیں گے ہم۔ دروازہ ہی غائب ہو گیا۔''

''یوں لگتا ہے کامران جیسے کوئی ہمیں خاص جگہ لے جانا چاہتا ہے۔ واپسی کے راستے بند ہوتے جا رہے ہیں۔ آؤ اب اس زینے کی طرف چلتے ہیں۔ اب یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو اس پراسرار طلسم کا راز معلوم کر کے ہی دم لیں گے۔''

''دم باقی رہے تب کی بات ہے ناں...... کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس زینے سے اوپر پہنچیں تو زینہ ہی غائب ہو جائے۔''

''ہو سکتا ہے ایسا بھی ہو جائے۔ تم پھر بتاؤ یہاں کیا، کیا جائے؟ آرام کرو۔ دروازہ کھل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ......''

''ورنہ کیا......؟'' کامران نے گھگھیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جگہ تو بری نہیں ہے۔''

''دیکھئے سر! پلیز۔ آپ ان حالات میں بھی مذاق کر سکتے ہیں۔''

''یار کمال کر رہے ہو تم۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب ہے تو بتاؤ۔ میں بھی باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے دروازہ بند ہے۔ سامنے سپاٹ دیواریں ہیں۔ کون سے راستے سے باہر جانا چاہتے ہو؟ ہمارے سامنے بس یہ زینہ ہے جس سے اوپر چڑھنے کے بعد ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کہاں جا سکتے ہیں۔''

''ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ کوئی ہمیں کسی خاص جگہ لے جانا چاہتا ہے۔''

''ہاں...... یہ اندازہ ہے میرا۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے یہی کہا جا سکتا ہے۔''

''مم...... مم...... مگر کیوں...... کیا کہیں لے جا کر ہمیں ہلاک کر دیا جائے گا؟''

''یہ کام تو کسی بھی جگہ ہو سکتا ہے۔'' ہارون نے جواب دیا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ......''

''کمال کرتے ہو یار! میری اس گھر کے آسیبوں سے کوئی رشتے داری نہیں ہے جو میں تمہیں ان کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دوں۔''

''سر! آپ کا اطمینان مجھے حیران کر رہا ہے۔''

''دیکھو بات اصل میں یہ ہے کامران کہ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہم پھنس گئے ہیں۔ باہر گیدڑوں کی آوازیں، کھنڈرات، ٹوٹی پھوٹی عمارتیں، اتنا لمبا سفر...... یہ سب کچھ کیا ہے۔ ہم نے جان بوجھ کر یہاں تک قدم بڑھائے ہیں تو آگے بھی دیکھنا پڑے گا۔''

اسی وقت اوپر سے چھن چھن کی آواز سنائی دی۔ کامران ایک بار پھر اچھل کر ہارون سے لپٹ گیا۔ وہ لوگ آواز سنتے رہے۔ پھر ہارون نے کہا۔

''آؤ کامران...... اب یہاں آ پھنسے ہیں تو اب ڈرنے سے کام نہیں بنے گا۔ ہوش سنبھال کر اندر آؤ۔ اندازہ لگاؤ کہ اندر کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔''

''ڈر تو میں بھی نہیں رہا سر! بس جان نکل رہی ہے تھوڑی تھی۔'' کامران نے کہا۔ ہارون نے اس کا بازو تھپتھپایا اور بولا۔

''آؤ......''

اور اس کے بعد دونوں کے قدم سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ وہ ایک ایک سیڑھی طے کرتے ہوئے اوپر جا رہے تھے اور انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے نیچے سے وہ سیڑھیاں جتنی نظر آ رہی تھیں اتنی نہیں ہے۔ وہ اوپر کافی دور تک چلی گئی تھیں۔ کامران نے پھر سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ سیڑھیاں اتنی کہاں سے ہو گئیں؟''

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا اور سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ آخر سیڑھیاں ختم ہو گئیں اور دونوں ایک بوسیدہ کوریڈور میں داخل ہو گئے۔ یہاں کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ یہاں رک کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگے۔ پھر ہارون ایک کھلے دروازے کی طرف بڑھنے لگا اور اندر داخل ہو گیا۔ کامران ہر حالت میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد کسی نادیدہ ہاتھ نے سامنے رکھی ہوئی موم بتی روشن کر دی اور کامران چیخ پڑا۔

''کک......کون......کون ہے؟''

لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ البتہ جلتی ہوئی موم بتی نے ماحول روشن کر دیا تھا۔ ہارون میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی کہ وہ آگے بڑھا اور اس نے موم بتی اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ اسے ایک پرانا شمع دان نظر آیا اور وہ آگے بڑھ کر اس سے دوسری شمعیں جلانے لگا۔ کمرے میں خوب روشنی ہو گئی۔ یہاں ایک مسہری اور کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کامران نے تھکے تھکے انداز میں ہارون کو دیکھا اور بولا۔

''میں تو بیٹھتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

''بس میں یہاں ٹھیک ہوں...... جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''بیٹھو......بیٹھو...... میں اسے تلاش کر کے یہاں بھیج دیتا ہوں۔'' ہارون نے پُرمزاح لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف رخ کیا تو ہارون بے اختیار چیخ پڑا۔

''کک...... کیسے؟''

''اسی چھنن چھنن کو جس کے لئے تم یہاں تک آئے ہو۔''

''نن......نہیں......آپ کو خدا کا واسطہ، باہر نہیں جائیے۔''

''یار تم ہو کیا چیز؟ کبھی تو تم شیر بننے کی کوشش کرتے ہو اور کبھی بالکل ہی گیدڑ بن جاتے ہو۔'' دفعتہً ہی ہارون اپنی جگہ خاموش ہو گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''کامران! تم نے پچھلی رات یہاں گزاری ہے کیا تم نے پہلے گیدڑوں کی آوازیں سنیں؟''

''گگ......گیدڑوں کی؟'' کامران نے گھگھیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں تھوڑی دیر پہلے ہم نے کتنی گیدڑوں کی آوازیں سنی تھیں۔ جبکہ نہ تو ہمیں اس علاقے میں کوئی گیدڑ نظر آیا اور نہ ہی......''

''میں نے بھی نہیں سنیں...... ایک بار بھی نہیں سنیں۔''

''یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہے یار! اس کا کوئی پس منظر ضرور ہے۔''

''پس منظر کیا ہو سکتا ہے؟''

''کچھ بھی...... نجانے کیوں میرا ذہن بھی کچھ بھٹک رہا ہے۔ یہ آسیبی چکر بھی ہو سکتا ہے اور......''

''اور کیا......؟''

''اور کوئی انسانی چکر بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی یہ نہ چاہتا ہو کہ اس علاقے میں کوئی ایسا پروجیکٹ تیار ہو۔''

اچانک ہی ایک پراسرار موسیقی کی آواز فضا میں منتشر ہوئی اور کامران اچھل پڑا۔

''سنئے...... سنئے...... یہ...... یہ......''

ہارون نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔ آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ہارون نے کامران کی طرف دیکھا اور بولا۔

''چل رہے ہو...... میں باہر جا رہا ہوں۔''

''چل رہا ہوں۔'' کامران نے بادل نخواستہ کہا اور ہارون کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہارون دروازے سے باہر نکل آیا۔ موسیقی کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ ہارون اس کی سمت کا اندازہ لگانے لگا اور پھر دونوں کوریڈور میں آگے بڑھنے لگے۔ یہ دونوں تھوڑی دور پہنچے ہوں گے کہ آواز بند ہو گئی اور ایک خوفناک سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں رک

گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بائیں سمت ایک کمرے کا دروازہ ہے۔ ہارون نے اس دروازے کو دیکھا اور بولا۔

''موسیقی کی آواز اسی طرف سے آرہی تھی۔''

''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔'' کامران نے کہا۔

''آؤ......''

دونوں کمرے کی طرف بڑھ گئے اور پھر ہارون نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ یہاں بھی موم بتی جل رہی تھی۔ اس موم بتی کے سوا اس کمرے میں کچھ نہیں تھا۔ دفعتہً ہی باہر سے ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ یہ ایک مردانہ چیخ تھی۔ اور پھر کسی کے فرش پر گرنے کی آواز بھی ابھری۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ کامران کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ خود بھی دہشت زدہ انداز میں چیخا اور پھر کمرے سے نکل بھاگا۔ ہارون بھی اس کی اس کیفیت پر چونک پڑا۔ اس نے اسے زور سے آوازیں دیں۔

''رک جاؤ کامران...... رک جاؤ...... رکو۔'' مگر کامران دوڑا چلا گیا تھا۔ ہارون نے اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی تھی۔ کامران برق رفتاری سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ آوازیں ایک دم بند ہو گئیں لیکن کامران دوڑا جا رہا تھا اور پھر وہ اچانک لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ لیکن نیچے گرتے ہی وہ پھر اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہارون بھی اب آہستہ آہستہ بدحواس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پھرتی سے دوڑتا ہوا نیچے آیا اور پھر ایک جگہ اس کا پاؤں بھی لڑکھڑا گیا۔ گرنے سے بچنے کے لئے اس نے ایک دیوار کا سہارا لیا مگر وہ دیوار نہیں دروازہ تھا جو کھل گیا۔ ہارون سنبھلتے سنبھلتے اندر جا گرا۔ یہ بھی کوئی کمرہ ہی تھا جس میں پراسرار خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

کمرے میں سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر تصویریں لگی ہوئی تھیں جو پرانی تھیں۔ جن میں سے ایک تصویر ایک نوجوان لڑکی کی تھی۔ لیکن صرف اس کا بدن نظر آ رہا تھا۔ انتہائی متناسب اور حسین بدن۔ دوسری تصویر ایک بوڑھے آدمی کی تھی جو دیہاتی لباس میں ملبوس تھا۔ ہارون کی نگاہیں قرب و جوار میں بھٹکنے لگیں۔ یہ تصویریں آئل پینٹ سے بنائی گئی تھیں اور ان کا رنگ بتاتا تھا کہ یہ کافی پرانی ہیں۔ لیکن نجانے کیوں لڑکی کا چہرہ دھندلا سا گیا تھا۔ کوئی ایسا رنگ اس پر پھیر دیا گیا تھا جس سے اس کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ بدن نمایاں تھا۔ ہارون کی نگاہ اس کے پیروں پر

پڑی تو اسے لڑکی کے پیروں میں پازیبیں نظر آئیں۔ ہارون کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ پازیبیں اس کے لئے اجنبی نہیں تھیں۔

دفعتہً ہی اس نے تصویر میں اس لڑکی کے پیروں کو متحرک دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک ہنسی کی آواز بھی سنائی دی اور یہ ہنسی...... یہ ہنسی اجنبی نہیں تھی۔ پہلے بھی دو تین بار وہ یہ ہنسی سن چکا تھا۔

ایک ایسی ہنسی جسے سن کر دماغ سنسنا جائے۔ اور پھر اسے لڑکی کے پاؤں متحرک نظر آئے۔ وہ تصویر کے فریم میں آگے بڑھ رہی تھی اور ہارون پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی فریم کے اندر اندر دور ہوتی چلی گئی چھن، چھن، چھن کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ لڑکی ایک دھندلا نقطہ نظر آئی۔ آخر میں فریم سادہ رہ گیا۔ ہارون نے اس دوسری تصویر کی طرف دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ عمر رسیدہ شخص اسے گھور رہا ہے اور اس کے چہرے کے نقش تبدیل ہو رہے ہیں۔ ہارون پھرتی سے وہاں سے پلٹا اور کامران کو آوازیں دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ اس وقت اسے اور کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔ کامران کے بارے میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہت بری کیفیت میں ہے۔ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ باہر نکلا اور اس کے بعد اس خوفناک اور کھنڈر نما عمارت سے بھی باہر نکل آیا۔

سر پر تاروں بھرا آسمان بدستور پھیلا ہوا تھا۔ اینٹوں کے لاتعداد ڈھیر قرب و جوار میں سینکڑوں بگڑی ہوئی شکلیں بنا رہے تھے۔ کہیں وہ برفانی انسان کی طرح نظر آتے، کہیں کسی بھیڑیے کی شکل میں۔ ہارون کے حلق سے زوردار آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ کامران کو پکار رہا تھا۔ پھر کافی فاصلے پر اسے کامران دوڑتا ہوا نظر آیا اور ہارون نے اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔ وہ بدن کی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اور بہرحال اس نے تھوڑی دیر بعد کامران کو جا لیا۔ اس نے پیچھے سے آواز دی۔

''کامران...... کامران...... بات سنو! ہارون ہوں میں۔ کہاں بھاگ رہے ہو؟''

''ارے باپ رے......'' کامران نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ہارون نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔

''یہ میں ہوں...... خبردار، ڈرنا مت۔''

''ڈرتا کون ہے سر! یہ آپ خود دیکھ لیجئے۔''

''چلو، چلو...... سنبھالو اپنے آپ کو۔'' کامران کا سانس اس کے سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ خود ہارون کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔ نجانے کس طرح گرتے پڑتے انہوں نے یہ ڈھلوان عبور کی اور بلندی پر پہنچ گئے۔ بدن کی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ ہارون کامران کو لئے ہوئے اپنے خیمے میں آ گیا۔ کامران خیمے کے بستر پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا تھا۔ ہارون اس کے برابر بیٹھ گیا۔ بمشکل تمام انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کامران نے آہستہ سے کہا۔

''سوری سر!...... سوری......''

''کیا خیال ہے...... دیکھا تم نے یہ روحانی محبوبہ کیا حیثیت رکھتی ہے؟''

''میرے سارے خاندان کی توبہ۔ بتایئے پہلا عشق اس طرح ناکام ہو جائے تو انسان کی زندگی میں کیا رہ جاتا ہے؟''

''گڈ! خوشی کی بات ہے کہ تم اس حالت میں بھی ایسی بکواس کر سکتے ہو۔''

''ہارون صاحب ستیاناس ہو گیا ساری لطافتوں کا۔''

''ایسا کرو اپنے خیمے میں اگر خوف محسوس کر رہے ہو تو یہیں سو جاؤ۔''

''نہیں جناب! بہادر آدمی ہوں۔ اگر بہادر نہ ہوتا تو ہارٹ فیل ہی ہو گیا ہوتا۔''

ہارون نے کامران کو اس کے خیمے تک پہنچایا تھا اور پھر خود اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔ اپنے آپ کو کتنا ہی سنبھالتا اور سمجھاتا لیکن جو حالات پیش آئے تھے وہ ایسے نہیں تھے کہ انہیں نظرانداز کیا جا سکے۔ اس کے سارے وجود میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ یہ سب کیا ہے...... کیا ہے یہ سب کچھ؟ میں نے تو کبھی اپنے آپ کو ان پراسرار واقعات میں نہیں الجھنے دیا جو میری زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور جنہوں نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کسی نہ کسی شکل میں میرے سامنے آتے رہے۔ لیکن میں نے ان پر توجہ نہیں دی۔ پھر یہ سب کیا ہے؟

اس نے پوری سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا تو اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا۔ اس طرح کے ویرانے اور کھنڈرات ان نظر نہ آنے والی ارواح کا مسکن ہوتے ہیں جو بہرحال اپنا ایک وجود تو رکھتی ہیں۔ ان کے قصے اور کہانیاں ہزاروں لوگ سناتے ہیں۔ جن کا ان سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا وہ انہیں صرف دلچسپ کہانیاں سمجھتے ہیں۔ اور جو کبھی ان حالات سے دوچار ہو جاتے ہیں انہیں حقیقت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

ہارون کی اپنی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ تو نہیں تھا لیکن یہ ایک بہت بڑی سچائی تھی کہ بذاتِ خود وہ ایک معمہ تھا۔ ایک ایسا معمہ جسے وہ خود بھی کبھی حل نہیں کر سکا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات اس کے ذہن میں چرخی کی طرح چلنے لگے۔ لیکن اس چرخی کی گھرر...... گھرر نے دماغ کو سلا دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو گیا۔

صبح کو ذرا دیر سے ہی آنکھ کھلی تھی۔ باہر مزدوروں کی ہنگامہ آرائیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بہت اچھے ساتھی تھے اس کے یہ مزدور وغیرہ بھی۔ انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور خود بخود کام کرنے لگے تھے۔

ہارون نے باہر آ کر یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں تشویش کی لہر بیدار ہو گئی۔ کامران موجود نہیں تھا۔ وہ جلدی سے کامران کے خیمے کی جانب بڑھا اور اسی وقت کامران اپنے خیمے سے برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے بدن کے گرد کھیس لپیٹا ہوا تھا۔

''خیریت دیوداس؟'' ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں باس۔ تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔''

''اوہو......'' ہارون نے آگے بڑھ کر کامران کا بخار چیک کیا اور پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، بخار ہے۔ دوا لی؟''

''نہیں...... ابھی سوچ رہا ہوں کہ ایک دو سلائس لے کر دوا کھا لوں۔ فرسٹ ایڈ بکس تو ہے ہی میرے پاس۔ لیکن آپ جانتے ہیں سر! کہ یہ دوا والا بخار نہیں ہے۔''

''ہاں...... یہ عشق کا بخار ہے۔''

''کوئی بڑی بات نہیں کہنا چاہتا سر! لیکن اتنا ضرور کہہ رہا ہوں کہ اب زندگی میں کبھی دوبارہ عشق یا کسی محبوبہ کا نام نہیں لوں گا۔ ماں باپ نے اگر شادی کر دی تو ان کی مہربانی ہے ورنہ خود کبھی ایسا کام نہیں کروں گا۔''

ہارون بے اختیار ہنس پڑا پھر بولا۔

''چلو ٹھیک ہے...... جو کچھ کھاؤ اس کا تھوڑا سا حصہ مجھے بھی دے دینا۔ میں نے بھی چائے وغیرہ نہیں پی۔ منہ ہاتھ دھو لوں۔''

''ٹھیک ہے سر! میں یہ دیکھنے نکلا تھا کہ ہمارے ان ساتھیوں نے کام شروع کر دیا یا نہیں؟''

''یہ ہیرے ہیں جنہیں خوش بختی نے ہمیں دے دیا ہے۔ دیکھو بڑی باقاعدگی

سے کام ہو رہا ہے۔''

''جی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن بہرحال یہ بھی آپ ہی کی تربیت ہے۔''

''میں چائے کے لئے خود کہہ دیتا ہوں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''نہیں سر! میری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا اپنے آپ کو سزا دے رہا ہوں بیمار سمجھ کر، بیمار کہہ کر۔''

تھوڑی دیر کے بعد ناشتہ وغیرہ کر کے وہ باہر نکل آئے۔ اوورسیئر انہیں کام کی تفصیل بتانے لگا پھر اس نے کہا۔

''سر! کامران صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔''

''ہاں موسمی بخار ہے۔''

''رات کو مزدوروں نے ایک اور ہی کہانی سنائی ہے۔ اصل میں آپ کو بشیر شاہ کے بارے میں تو معلوم ہے، نمازی پرہیزگار آدمی ہے۔ خود بھی وظیفے وغیرہ پڑھتا رہتا ہے۔ اس نے سب کو ڈھارس دے کر سنبھال لیا ہے۔ بلکہ اب تو ان لوگوں کے اندر زیادہ ہمت پیدا ہو گئی ہے اس لئے اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''کیوں ..... کیا ہوا؟'' ہارون نے متحیرانہ انداز میں سوال کیا۔

''بشیر شاہ میرے پاس آیا تھا۔ اس نے تھوڑی سی تفصیل بتائی باقی تفصیل ہم اکرام سے پوچھتے ہیں۔''

اکرام ان لوگوں کا ڈرائیور تھا۔ اس نے اشارہ کیا تو وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں اکرام! ذرا بشیر شاہ والی بات بتاؤ۔''

''جی سر! وہ ہوا یہ کہ بشیر شاہ رات کو تہجد پڑھنے اٹھتا ہے۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ پھر جب اس نے سلام پھیرا تو اسے اس قبر کے پاس ایک روشنی سی محسوس ہوئی۔ جب اس نے غور سے دیکھا تو یہ روشنی اس قبر پر رکھے ہوئے برتن سے اٹھ رہی تھی جس سے خوشبو بلند ہو رہی ہے اور ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ برتن یہاں لا کر کس نے قبر پر رکھا؟ قبر تو مزدوروں کی کھدائی سے نمودار ہوئی تھی لیکن برتن یہاں جتنے لوگ موجود ہیں ان میں سے کسی نے نہیں رکھا۔ بہرحال سب کے دل میں اس مزار شریف کا احترام تھا اور ہے۔ بشیر شاہ خاموشی سے اس روشنی کو دیکھتا رہا اور پھر اسے ایک سایہ سا آتا ہوا نظر آیا۔ بشیر شاہ کے کہنے کے مطابق وہ سایہ سفید لباس میں موجود تھا۔ سایہ قبر کے قریب پہنچا اور اس کے بعد روپوش ہو گیا۔

بشیر شاہ نے یہ بات کسی اور کو بتائی اور بس اس کے بعد مزدوروں میں یہ بات پھیل گئی۔ لیکن خود بشیر شاہ ہی نے ان کا خوف دور کر دیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے اور اس احترام کا آغاز اس طرح سے ہو گیا ہے کہ سروے میں وہ قبر کی جگہ چھوڑ دی گئی ہے اور اس مزار کا احترام کیا گیا ہے۔ چنانچہ صاحب مزار کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ مزدوروں کے اندر عقیدت پیدا ہو گئی ہے اور بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ سب آپس میں چندہ کر کے قبر کے گرد چہار دیواری بنوا دیں گے اور اس کا مکمل احترام کریں گے۔''

ہارون ایک گہری سانس لے کر کامران کو دیکھنے لگا تھا۔ بہرحال اس نے اکرام وغیرہ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ کامران نے دوا کھا لی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا بخار اتر گیا اور وہ دونوں کام کی نگرانی کرنے لگے۔ دوپہر ہوئی۔ کھانا پکانے والے مزدور کھانا تیار کر چکے تھے۔ چنانچہ گھنٹی بجا دی گئی۔ کامران اور ہارون ایک ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں کچھ چھاؤں تھی۔ کامران نے کہا۔

''کیا کہتے ہیں آپ سر! پچھلی رات کے بارے میں؟''

''زندگی میں پراسرار واقعات اپنا ایک مقام رکھتے ہیں کامران! ہمیں ہر حالت میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہوش و حواس، عقل و دانش اور نظر آنے والی اس دنیا کے علاوہ ایک ایسی پراسرار دنیا کا وجود ضرور ہے جس کی ہر بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔ ہم اس زندگی کو مافوق الفطرت کہتے ہیں لیکن ہزاروں بار ہمیں اس زندگی کا وجود مل چکا ہے۔ یہ سب کچھ جو پیش آ رہا ہے اتفاق نہیں ہے۔ نہ ہی اسے ہم وہم کہیں گے۔ تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ یہاں سے گھر جاتے ہوئے مجھے کیا واقعات پیش آئے؟''

''جی سر! آپ بتا رہے تھے اس وقت۔ لیکن ہم کسی اور ہی چکر میں پڑ گئے۔ کیا واقعات پیش آئے تھے آپ کو؟''

''میں اشعر کی بیماری کے خیال سے سخت پریشان تھا اور تیزی سے جیپ دوڑا رہا تھا کہ چھن چھن کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔'' پھر ہارون نے وہ پورا واقعہ پازیب کے ملنے اور اس کے غائب ہو جانے تک کا سنایا۔ کامران کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''سر! اگر بقیہ ساری باتیں وہم بھی سمجھ لی جائیں تو آپ یہ بتائیے کہ آخر وہ

پازیب تو ہوش و حواس کے عالم میں آپ کے پاس آئی تھی؟"

"ہاں، میں بھی ساری باتوں کو وہم سمجھ لیتا کامران! لیکن پازیب کافی دیر تک میرے پاس رہی اور پھر اسے جبری حاصل کر لیا گیا۔ افشاں کا کہنا تھا کہ وہ ایک بالوں بھرا خوفناک ہاتھ تھا جس نے کھڑکی کھول کر پازیب اٹھائی۔ پازیب نیچے گری تو وہ ہاتھ ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا اور آخر کار پازیب لے گیا۔ بڑی عجیب و غریب بات تھی۔

"سر! خدا کے فضل سے ہم لوگ مسلمان ہیں اور بہت سے مسئلے ہمارے مذہب کے سہارے ہی ٹل جاتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ ہندو مذہب سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ہم ہندومت کی باتوں کو مانتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ واقعات بڑے سنسنی خیز ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے ماضی میں کوئی ایسی کہانی پوشیدہ ہو جو ان واقعات کی توجیہہ کر دے۔"

ہارون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مثلاً یہ کہ کوئی میری جنم جنم کی ساتھی ہو۔ پچھلے جنم میں ہم دونوں کا ملاپ نہ ہوا ہو اور وہ جنم جنمان سے مجھے تلاش کرتی پھر رہی ہو؟" ہارون نے قہقہہ لگایا اور کامران بھی ہنسنے لگا۔

"اسی لئے تو میں نے کہا تھا ناں کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور اللہ کے فضل سے ایسی کسی فضول بات پر یقین نہیں کرتے۔"

"میرا ماضی کامران! میرا ماضی ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور کے لچھے کی مانند ہے جس کا کوئی سرا آج تک میرے ہاتھ نہیں آیا۔ میں مختصر تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں تاکہ آئندہ کے معاملات ذہن میں آ سکیں۔ ایک چھوٹے سے علاقے میں ایک گھر تھا جہاں میں نے ہوش سنبھالا۔ اس گھر میں چار افراد تھے۔ بابا حمایت علی، چچی جان جن کا نام رقیہ تھا۔ شمسہ اور عنایت ان کے علاوہ میں تھا۔ حمایت علی چچا کہیں نوکری کرتے تھے۔ رقیہ چچی ایک مہربان اور مشفق ماں تھیں۔ شمسہ اور عنایت میرے بہن بھائی۔ جب تک ہوش و حواس نہیں جاگے تھے تو کوئی احساس نہیں تھا۔ لیکن جب سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ چچا حمایت علی ایک سخت گیر آدمی تھے۔ نہ صرف اپنے گھر میں بلکہ محلے بھر میں ان کا رعب بیٹھا ہوا تھا۔ گلی میں نکلتے تو بچے کھیلتے کھیلتے گھروں میں جا نکلتے۔ وہ بڑے آرام سے کسی

بھی بدتمیزی کرنے والے بچے کی پٹائی کر دیا کرتے تھے اور بچی بات یہ تھی کہ پڑوس کے لوگ کبھی ان کی کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔

لیکن میرے سامنے وہ اس طرح با ادب رہتے تھے جیسے وہ میرے باپ نہ ہوں، میں ان کا باپ ہوں۔ حالانکہ انہوں نے کبھی یہ بات نہیں کہی تھی کہ وہ میرے باپ ہیں۔ بس میں انہیں چچا حمایت علی کہتا تھا۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ باپ کیا ہوتا ہے اور چچا کیا ہوتا ہے۔ ان کا رویہ اتنا ہی مشفقانہ تھا میرے ساتھ۔ میری ہر ضد پوری کی جاتی تھی۔ میرا ہر خرچ اٹھایا جاتا تھا۔ گھر میں سب سے اچھے کپڑے پہنتا تھا میں۔ سب سے اچھا کھانا کھاتا تھا میں۔ جبکہ شمسہ اور عنایت جو حمایت علی چچا کے بیٹی اور بیٹا تھے میری طرح نہیں رہتے تھے۔ خاص طور سے عنایت۔ بس یہ سمجھ لیا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ اس کی تو زندگی تلخ تھی۔

حمایت علی چچا میری بھی کسی غلطی کا غصہ اس پر اتارا کرتے تھے۔ کیا مجال جو مجھ سے انہوں نے کبھی سخت لہجے میں بات کی ہو۔ بس ہارون میاں، ہارون میاں کہتے ہوئے ان کی زبان خشک ہو جاتی تھی اور وہ مجھے میری کسی بری سے بری بات پر کچھ نہیں کہا کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ جب میں نے ہوش و حواس سنبھالے تو مجھے ایسا لگا جیسے میں اس گھر کا کوئی ایسا کردار ہوں جس کی سب عزت کرتے ہیں۔ عنایت یقیناً مجھ سے جلتا ہو گا لیکن میرے ہی سلسلے میں اسے کتنی ہی بار مارا گیا تھا کہ پھر اس کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ مجھ سے کچھ کہے۔ البتہ میں یہ دیکھتا تھا کہ وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہتا ہے۔ میرا اس کا کوئی ساتھ نہیں تھا۔ البتہ شمسہ ایک مشفق اور مہربان بہن کی مانند تھی۔ میرا ہر طرح خیال رکھنے والی۔

پھر سکول میں داخلہ کرایا گیا۔ میں جس سکول میں پہنچا وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کا سکول تھا۔ چچا حمایت کی یہ اوقات نہیں تھی کہ وہ مجھے اتنے اچھے سکول میں داخلہ دلائیں لیکن میرے سارے اخراجات اٹھائے جاتے تھے۔ عنایت نے بھی ایک بار دبی زبان سے کہا تھا کہ وہ بھی اسی سکول میں داخلہ لینا چاہتا ہے تو چچا کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا تھا اور انہوں نے اسے خوب برا بھلا کہا تھا۔ اور کہا تھا کہ خبردار جو آئندہ کبھی اس نے میری برابری کرنے کی کوشش کی۔

کامران! یوں زندگی کے شب و روز گزرتے۔ پھر ایک دن چچا حمایت علی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ان کی لاش ہی گھر میں آئی۔ جو کیفیت سب کی ہوئی تھی وہی میری

بھی ہوئی تھی۔ لیکن آخر ہم سب نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ میں نے میٹرک پاس
کر لیا تھا اور میں نے پیش کش کی کہ میں ملازمت کر لوں۔ ورنہ گھر کا نظام کیسے چلے
گا؟ چچی جان نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس دوران شمسہ کا ایک رشتہ آیا تھا اور
شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔ لڑکے والے بہت اچھے لوگ تھے۔ چچا جان کے
چالیسویں کے بعد شمسہ کے ہونے والے سسر آئے اور انہوں نے کہا کہ اب ظاہر ہے
شادی دھوم دھام سے تو نہیں ہو سکتی۔ یہ تو فرض پورا کرنے والی بات ہے۔ جوان بیٹی
کو گھر پر بٹھائے رکھنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ شربت کے پیالے پر نکاح کر لیا
جائے اور وہ شمسہ کو ساتھ لے جائیں گے۔

ایسا ہی کیا گیا۔ چھ سات افراد آئے۔ شربت کا پیالہ تو خیر نہیں ہوا ان کی بہت
اچھی خاطر مدارات کی گئی اور شمسہ کا نکاح ہوا اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ عنایت اب اچھا
خاصا آوارہ گرد ہو گیا تھا۔ چچی جان کی تو کوئی بات ہی نہیں سنتا تھا وہ۔ چچی جان بیمار
رہنے لگیں۔ میرے معاملات کس طرح چل رہے تھے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی
تھی۔ پھر ایک دن چچی جان کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ انہوں نے مجھے بلایا
اور کہا۔

''زندگی اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ کون کب چلا جائے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔
تمہاری ایک امانت میں تمہارے سپرد کرنا چاہتی ہوں بیٹے۔ سامنے والے ٹرنک کے
صندوق سے لکڑی کی ایک صندوقچی نکال لو۔''

میں نے حیرت سے اس صندوق کو دیکھا۔ پتہ نہیں اس صندوقچی میں کیا تھا۔ چچی
جان نے مجھے چابی دی اور میں نے ٹرنک کھول کر وہ صندوقچی نکال لی۔ بڑی
خوبصورت بنی ہوئی تھی۔ اور اس میں بہت ہی اعلیٰ درجے کا تالا لگا ہوا تھا۔ چچی جان
نے کہا۔

''اس تالے کی چابی نہیں ہے میرے پاس۔ یہ صندوقچی تمہاری امانت ہے
میرے پاس۔ اس میں بہت کچھ ہے تمہارے لئے۔ جب تمہاری عمر اکیس سال ہو
جائے گی تو تم اسے کھول لینا۔ یہی ہدایت ہے۔''

میں نے چچی جان سے کہا کہ یہ تو کوئی طلسمی کہانی معلوم ہوتی ہے تو انہوں نے
کہا۔ ''نہیں بیٹے! یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے، کہانی نہیں۔ لیکن اگر تمہیں ہماری ذات
سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی تو بس یوں سمجھ لینا کہ یہ ہماری خواہش ہے کہ اکیس

سال سے پہلے یہ کبھی نہ کھولنا۔ میں یہ صندوقچی تمہیں کبھی نہ دیتی۔ حمایت علی بھی کبھی
نہ دیتے کیونکہ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اسے اکیس سال سے پہلے تمہارے حوالے نہیں
کیا جائے گا۔''

''کس سے وعدہ کیا تھا چچی جان؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

لیکن اس بات کا چچی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ
ساری رام کہانی عنایت بھی سن رہا ہے۔ وہ تو مجھ سے ہمیشہ سے جلتا تھا۔ میں نے
صندوقچی وہیں صندوق میں رکھ دی اور چچی جان سے وعدہ کیا کہ ان کے حکم کے
مطابق ہی اسے کھولوں گا۔ صندوق میں تالا لگا دیا گیا تھا۔ لیکن دوسری ہی رات عنایت
نے وہ تالا توڑ کر صندوقچی اڑا لی۔ وہ ایک پرچہ لکھ کر صندوق پر رکھ گیا تھا جس پر لکھا
تھا۔

''میرے پیارے بھائی اور میری پیاری اماں! مجھے تو تم پیاری ہو لیکن میں یہ
بات جانتا ہوں کہ کوئی مجھے پیار نہیں کرتا۔ ہر شخص کو اپنا مستقبل بنانے کا اختیار حاصل
ہے اماں! وہ صندوقچی جو اکیس کے بعد کھولنی تھی لئے جا رہا ہوں۔ ذرا کھول کر دیکھوں
گا کہ کیا ہے اس میں۔ اگر میرے مطلب کی کوئی چیز ہوئی تو آرام سے استعمال میں
لے آؤں گا اور نہ ہوئی تو یہ صندوقچی کہیں دریا وغیرہ میں پھینک دوں گا۔ کیونکہ یہ
ہارون کی امانت ہے اور ہارون وہ ہے جس نے زندگی بھر میرے حقوق پر ڈاکہ ڈالا
ہے۔ جا رہا ہوں اماں! سمجھ لینا کہ ابا کی طرح میں بھی چلا گیا۔ دنیا سے نہ سہی
تمہارے گھر سے۔''

عنایت کا یہ خط چچی جان کے لئے بم دھماکے سے کم نہ ثابت ہوا اور اس بم
دھماکے سے ان کے پرخچے اڑ گئے۔ اسی رات ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور ان
کا بھی انتقال ہو گیا۔ شمسہ کا شوہر شمسہ کو لے کر دوبئی چلا گیا تھا۔ وہ وہیں کام کرتا تھا۔
بہرحال میں نے تدفین کی اور اب اس گھر میں، میں اکیلا رہ گیا تھا۔ صندوقچی بھی
غائب ہو گئی تھی۔ میں اب اس گھر میں بالکل تنہا تھا۔ شمسہ کا پتہ بھی نہیں تھا میرے
پاس۔ خاصے دن میں نے اس گھر میں گزارے۔ اسی دوران میری ملاقات حاجی عطا
سے ہوئی۔ حاجی عطا ایک ٹھیکیدار تھے۔ بے چارے پڑھے لکھے نہیں تھے۔ ٹھیکیداری
کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خوب نوازا تھا۔ نجانے کیوں مجھ پر ریجھ گئے۔ بس
سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ بڑے پیار سے میرے پاس پہنچے اور مجھ سے کہا۔

"بیٹے! میری بات پر یقین نہیں کرو گے تم، تمہاری شکل میرے چھوٹے بھائی سے ملتی جلتی ہے جسے میں نے تعلیم کے لئے ملک سے باہر بھیجا تھا لیکن وہاں وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ میں اسے بہت چاہتا تھا۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے بیٹے۔ اگر تمہارے پاس وقت ہو تو مجھ سے مل لیا کرو۔"

کچھ ایسا لہجہ اختیار کیا تھا حاجی عطا نے کہ میرا دل بھی پسیج گیا۔ میری ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور پھر میرے تمام کوائف جاننے کے بعد حاجی عطا نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے پاس ہی چلا آؤں۔ انہوں نے میرے تمام معاملات سنبھال لئے اور میرا تعلیمی سلسلہ جاری ہو گیا۔

حاجی عطا صاحب نے میرے تمام اخراجات اٹھانے شروع کر دیئے تھے لیکن ایک بات میں تمہیں بتاؤں کامران! کہ یہاں بھی میں اسی کیفیت کا شکار رہا۔ حاجی عطا صاحب یہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ لائے تھے کہ میری شکل وصورت ان کے بھائی سے ملتی جلتی ہے لیکن کبھی مجھے یہ شواہد نہیں ملے کہ ان کا کوئی چھوٹا بھائی تھا اور کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ کوئی اس کی تصویر ان کے پاس تھی اور نہ کوئی نشانیاں جو یہ ظاہر کرتیں کہ ان کا کوئی چھوٹا بھائی تھا۔ جو لوگ اتنی محبت کرنے والے ہوتے ہیں وہ تو ایک ایک چیز سنبھال کر رکھتے ہیں۔ نہ اس کا کوئی لباس نہ کوئی اور نشانی۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک دن سوال کر دیا تو حاجی عطا صاحب نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "ہاں، میرے بھائی! میں نے اس کی کوئی چیز نشانی کے طور پر نہیں رکھی۔ اس لئے کہ میرا دل بہت کمزور ہے۔ اس کی کوئی بھی چیز میرے سامنے آتی تو میں دیوانہ ہو جاتا۔ اس لئے اس کی ہر نشانی مٹا دی گئی۔"

میں خاموش ہو گیا تھا، بات وزن دار تھی۔ میرا تعلیمی سلسلہ جاری رہا اور دوران تعلیم ہی میری ملاقات افشاں سے ہوئی۔ افشاں ایک غریب لڑکی تھی اور اتفاقیہ حالات میں مجھ سے ٹکرائی تھی۔ لیکن پھر اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ افشاں کے والد مرزا غیاث بیگ بیمار آدمی تھے۔ ایک دن راستہ چلتے ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بے چارے برے حالات کا شکار ہو گئے۔ میں انہیں لے کر ہسپتال گیا۔ وہاں میں نے ان کی بھرپور خبر گیری کی۔ اور اس دوران افشاں مجھے ملی۔ وہ میری شکر گزار تھی۔ بعد میں مرزا غیاث بیگ سے میرے بڑے اچھے تعلقات ہو گئے اور پھر ان کے حالات میری نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ ادھر افشاں مجھ سے محبت

کرنے لگی تھی۔ میں خود بھی اسے بے حد پسند کرتا تھا۔

آخر کار میں نے سول انجینئرنگ کا کورس کر لیا اور ایک دن بالکل مشینی انداز میں حاجی عطا صاحب نے مجھے صفورہ طاہر علی سے ملایا۔ صفورہ کے والد طاہر علی صاحب لندن میں رہتے تھے۔ صفورہ کا پورا ننھیال یہیں پر تھا۔ حاجی عطا صاحب نے صفورہ کی تعریفیں کرتے ہوئے کہا کہ اس سے اچھی لڑکی مجھے روئے زمین پر نہیں ملے گی صفورہ پراسرار نقوش کی مالک ایک خوبصورت لڑکی تھی لیکن میرے دل میں افشاں اتر چکی تھی۔ جب حاجی عطا صاحب نے بتایا کہ طاہر علی صاحب مجھے دیکھنے آ رہے ہیں تو میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں صفورہ سے شادی نہیں کر سکتا۔

حاجی عطا صاحب پریشان ہو گئے تھے۔ ان کی اس پریشانی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ ان کی پریشانی کا انداز ایسا نہیں تھا جیسے یہ معاملہ ان کی ذات سے تعلق رکھتا ہوں۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے ان کی ڈور بھی کہیں اور سے ہلائی جا رہی ہو۔

البتہ صفورہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ ہنستی مسکراتی میرے پاس پہنچ گئی۔

"تو تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟" لندن کی پروردہ لڑکی نے بے باکی سے کہا۔

"ہاں صفورہ۔"

"نہیں مائی ڈیئر! اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو مگر میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

"کاش، میں تمہارے اس مذاق میں شریک ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

"سنو! میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ اگر کوئی فضول تصور تمہارے ذہن میں ہے تو اسے دل سے نکال دو۔ مجھے نہیں جانتے تم۔ لندن میں میری ایک باقاعدہ آرگنائزیشن ہے۔ ہم لوگ جرائم پیشہ نہیں ہیں لیکن میری آرگنائزیشن کے تمام افراد تفریح پسند ہیں اور ہم لوگ ہر قسم کی تفریحات کر لیتے ہیں۔ کسی کو بے وقوف بنانا، کسی کو قلاش کرنا، کسی کو کوئی نقصان پہنچانا۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔"

میں ہنس کر خاموش ہو گیا تھا۔ حاجی عطا صاحب نے بھی مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے صفورہ سے شادی کرنا ہو گی۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ حاجی صاحب! آپ نے میری تعلیم پر اخراجات کئے ہیں۔ ایک ایک پائی واپس کر دوں گا آپ کی۔ آپ بالکل بے فکر

رہیں۔ لیکن میری ذات پر تسلط جمانے کی کوشش نہ کریں۔

بہرحال میں نے افشاں سے شادی کر لی اور ادھر مرزا غیاث بیگ کے ساتھ ان کے گھر میں آ گیا۔ پھر مرزا غیاث بیگ کا بھی انتقال ہو گیا۔ میں ملازمت کرنے لگا تھا۔ اور پھر مجھے قدرت نے ایک بیٹے سے نوازا۔ ہم لوگوں نے وہ گھر چھوڑ دیا جو کرائے کا تھا اور میں آہستہ آہستہ بہتر حالات کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں تک یہ کہانی آتی ہے۔ صفورہ اکثر لندن سے آ جاتی ہے۔ دو بار وہ مجھے ملی تھی اور ہر بار دھمکیاں دی تھیں اس نے مجھے۔ لیکن میں نے اس کی دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اور اب یہ دلچسپ اور پراسرار واقعات پیش آئے ہیں۔''

کامران حیرت سے ہارون کی صورت دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''سر! اگر میں یہ کہوں کہ آپ کی تو ساری زندگی ہی پراسرار ہے تو غلط نہیں ہو گا۔ کیا عجیب و غریب زندگی ہے آپ کی۔ یعنی آپ یہ نہیں جانتے کہ آپ کے والدین کون ہیں۔ [illegible] تھے۔ سارے کھیل بگڑ گئے۔''

''ہاں، بس وہ ایک صندوقچی [illegible] جسے عنایت لے بھاگا تھا۔''

''سر! ہو سکتا ہے کہ اس میں آپ کی زندگی ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کا ماضی اور آپ کی اصلیت چھپی ہوئی ہو۔''

''اب اس میں جو کچھ بھی چھپا ہوا ہو، ظاہر ہے مجھے نہیں مل سکتا۔''

''سر! آپ نے عنایت کو تلاش بھی نہیں کیا؟''

''میں جانتا ہوں وہ کہیں دور ہی نکل گیا ہو گا۔ اس کی فطرت سے میں اچھی طرح واقف تھا اور اس نے اپنے خط میں صاف لکھ دیا تھا کہ اگر اسے اس صندوقچی سے کچھ نہ ملا تو وہ اسے ضائع کر دے گا۔''

''صرف ایک بات اور بتائیے، وہ صفورہ طاہر کہاں گئی؟''

''نہیں معلوم۔ البتہ حاجی عطا کے بارے میں مجھے پتہ چلا کہ وہ بھی اپنا کاروبار ختم کر کے ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کہاں، یہ نہیں پتہ چل سکا۔''

''آپ نے کہا تھا کہ صفورہ آپ کو ایک دو بار ملی تھی۔''

''ہاں ۔۔۔ وہ مجھے تلاش کرتی ہے۔ دوسری بار جب وہ مجھے ملی تھی تو میری شادی بھی ہو چکی تھی اور اشعر میری زندگی میں آ چکا تھا۔ اسے اس بات کا پتہ چل گیا۔ میرے پاس آئی اور بولی۔

''سنو! اتفاق کی بات ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ لیکن میری توہین کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے جو چاہا حاصل کر لیا۔ لیکن تم نے میری زبردست توہین کی ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اس توہین کو بھول جاؤں۔ لیکن نجانے کیوں تم مجھے بار بار یاد آ جاتے ہو۔ جب بھی یورپ سے یہاں آتی ہوں تو تم مجھے یاد آ جاتے ہو اور میں تمہیں تلاش کرتی ہوں۔ دیکھو! تلاش کس طرح کر لیتی ہوں۔ البتہ ایک بات میں تمہیں بتاؤں میرے تمہارے درمیان ایک ادھار چل رہا ہے اور میں یہ ادھار ضرور وصول کر لوں گی۔ تمہیں چاہئے کہ ہر صبح سب سے پہلے میری موت کی دعا مانگا کرو۔ کیونکہ میری زندگی ایک دن تمہاری زندگی میں طوفان لائے گی۔ اس دن کا انتظار کرو۔ میں کوشش کر رہی ہوں۔''

''صفورہ! تمہارے دل میں میرے لئے جو کچھ بھی ہے کاش وہ نہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اس حوالے سے جو حاجی عطا صاحب نے ہمارے درمیان پیدا کیا تھا۔ تم مجھے دوست کی حیثیت سے قبول کر لیتیں۔ تم نے مجھے چیلنج کیا ہے لیکن میں تمہیں نہ تو چیلنج کرتا ہوں۔ تمہارے چیلنج کو قبول کرتا ہوں بلکہ درخواست کرتا ہوں میں تم سے کہ مجھے نظر انداز کر دو۔ تم مجھ سے کہیں زیادہ صاحب حیثیت ہو۔ میں تو بس ایک سول انجینئر ہوں۔ درمیانہ درجے کی زندگی گزارنے والا۔ میں تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکوں گا۔ تم بہت بڑے لوگ ہو۔''

''ہو سکتا ہے ۔۔۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک شرط پر۔''

''شرط ۔۔۔؟''

''ہاں ۔۔۔''

''وہ کیا؟''

''اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ اپنے بچے اور بیوی کو چھوڑ دو۔ جتنی دولت انہیں چاہو دے دو۔ میں تمہیں وہ دولت دوں گی۔ میرے ساتھ یورپ چلو۔''

''اتنی بڑی بے وقوفی کی بات ہے کہ میں اس پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر ایک دن رونے کے لئے تیار رہنا۔'' اس کے بعد اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔'' ہارون نے جواب دیا۔

''آپ کی زندگی تو واقعی ایک انوکھی داستان ہے۔''

''ہاں یار! اور ان انوکھی داستانوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔''

''ویسے سر! ایک بات بتایئے؟''

''ہاں پوچھو؟''

''اس لڑکی نے آپ کے دل پر کوئی اثر ڈالا؟''

''کس لڑکی نے؟''

''چھن، چھن، چھن۔''

''ہاں، بہت برا اثر ڈالا ہے۔ جس جنجال میں ہم پھنس گئے تھے اس سے جو اثر پڑ سکتا ہے وہ پڑا ہے میرے اوپر۔''

''میں تو آپ یقین کیجئے بڑا خوفزدہ ہوں۔''

''اور میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''نہیں سر! آپ اس جگہ خوفناک عمارت میں بھی بڑے نڈر نظر آ رہے تھے۔ اتنے خوف زدہ نہیں تھے آپ، جتنی میری مٹی خراب ہو رہی تھی۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''سوری سر!...... وہ جو یہ مصرعہ ہے کہ باز آئے ایسی الفت سے، اٹھا لو پاندان اپنا۔'' کامران نے کہا اور ہارون نے ایک قہقہہ لگایا۔

کام تو بہرحال جاری تھا ہی، درمیان میں یہ عجیب و غریب داستان شروع ہو گئی تھی۔ اس جگہ کے بارے میں تو خیر یہ بات طے تھی کہ انتہائی پراسرار ہے۔ مزدور تک متاثر ہو گئے تھے لیکن ان کے متاثر ہونے کی وجہ دوسری تھی۔ وہ اس قبر سے بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے اور اس کا احترام کرنے لگے تھے۔ لیکن اس رات تو انہوں نے کمال ہی کر دیا۔ ظاہر ہے زندہ رہنے کے لئے تھوڑی بہت تفریح کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ یہاں ماحول ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ٹپے اور گانوں کی بجائے اس رات انہوں نے باقاعدہ قبر کی دھلائی کی تھی۔ سر شام جب کام ختم ہو گیا تو اپنے منصوبے کے تحت پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر قبر کے پاس پہنچ گئے اور خوب اچھی طرح اس کی دھلائی کی۔

انہوں نے کامران سے فرمائش بھی کی کہ کسی قریبی آبادی سے اگر بتیاں خرید کر لی جائیں۔ بہرحال انہوں نے رات کو قوالیاں شروع کر دیں۔ قوال بھی انہی میں سے کچھ بن گئے تھے۔ ٹین کی بالٹی، تھالی اور پانی کا مٹکا ساز بنائے گئے لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ جو پانچ افراد قوالیاں گا رہے تھے وہ بالکل قوال ہی معلوم ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ قوالی کے فن سے انہیں خاصی واقفیت ہے۔ کامران پوری طرح اس ماحول سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ ایک کھلنڈرا قسم کا نوجوان تھا۔ زندگی سے بھرپور۔ ہارون کا بہترین ساتھی اور بہترین دوست۔ شام کو جب مزدوروں نے اپنا کام شروع کیا تو وہ خود بھی اس میں مصروف ہو گیا۔ اور پھر زبردستی وہ قوالی کی محفل میں ہارون کو بھی لے گیا۔ خوب لطف آ رہا تھا۔ ہارون کو اچانک گھر کا خیال آیا۔

اشعر کی خیریت معلوم نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ آیا۔ کامران کو اس نے اپنے اٹھنے کی اطلاع نہیں دی تھی اور کامران ویسے بھی قوالیوں میں مست تھا۔

بالکل اتفاقیہ طور پر وہ ڈھلانوں کے کنارے پر پہنچ گیا تھا اور پھر اس نے موبائل

فون پر افشاں سے رابطہ قائم کیا۔ فوراً ہی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

''خیریت تو ہے...... کہاں مصروف ہو گئے آپ...... فون بھی نہیں کیا۔''

''نہیں افشاں...... وہ جو کہتے ہیں ناں کہ آتش شوق کو بھڑکاتا۔ تم سے دوری کے مزے لے رہا ہوں۔''

''جی ہاں! جناب تو مزے ہی لے رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے پورا پورا۔'' افشاں کی طنزیہ آواز آئی۔

''واقعی یقین ہے یا مذاق کر رہی ہو؟''

''چھوڑیئے۔''

''بابا! اگر کوئی بات ہے تو تم نے فون کیوں نہیں کر لیا؟''

''منع نہیں کیا تھا آپ نے مجھے۔''

''ارے نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ جو ہے نا کہ لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ اشعر کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''سکول بھیجا تھا آج؟''

''ہاں، سکول کا ناغہ تو اس نے ایک دن بھی نہیں کیا۔''

''اور کوئی خاص بات؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔ البتہ رشیدہ نجانے کیوں خوفزدہ رہنے لگی ہے۔ وہ اس واقعہ سے ابھی تک متاثر ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا اوٹ پٹانگ بکتی رہتی ہے کہ اس نے ایک چوپائے کو دیکھا تھا، جو انسان تھا۔''

''رات کو اس کی غذا ہلکی کر دو۔ پتلی مونگ کی دال کھائے گی تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔''

جواب میں افشاں ہنس پڑی تھی پھر اس نے کہا۔ ''اب کب چکر لگے گا؟''

''یار! ذرا سنجیدگی سے تھوڑا سا کام کر لوں، پھر آؤں گا۔''

''آپ اطمینان سے اپنا کام کیجئے۔ یہاں کی فکر نہ کریں۔ البتہ اگر روز نہ سہی تو دوسرے تیسرے دن تو فون کر ہی لیا کریں۔''

''اوکے افشاں! اور کوئی خاص بات تو نہیں ہے؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

ہارون نے فون بند کر دیا اور پھر اتفاقیہ طور پر ہی اس کی نظر گہرائیوں کی طرف اٹھ گئی۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے یہ بات طے کر لی تھی کہ اب اس چکر میں نہیں پڑیں گے۔ خواہ مخواہ کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ کامران بھی ارواحِ خبیثہ پر یقین نہیں رکھتا تھا اور ہارون بھی اس سے الگ نہیں رہا تھا۔ لیکن اس وقت ماحول ذرا بدلا ہوا تھا۔ وہاں چراغ کی ایک لو نہیں بھڑک رہی تھی بلکہ لگ رہا تھا کہ ایک پوری چوپال بیٹھی ہوئی ہے۔ پانچ چھ لالٹینیں روشن تھیں اور انسانی سائے نظر آ رہے تھے۔ البتہ جگہ وہی سہائے پور کے بلکہ پرانے سہائے پور کے کھنڈرات تھے۔ ہارون اس طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت اس پر کوئی سحر طاری نہیں ہوا تھا۔ لیکن تجسس سب سے بڑا سحر ہوتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ اس وقت وہ پراسرار چھنن چھنن نہیں تھی بلکہ کچھ لوگ سنجیدگی سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

کیا کرنا چاہئے؟ اور پھر وہ اپنے تجسس کو روک نہیں سکا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے اس وقت وہاں کچھ اور لوگ موجود ہوں۔ نیا سہائے پور بہرحال یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ اس محفل کا راز جاننا چاہتا تھا۔ کامران کو ساتھ لینا مناسب نہیں تھا، بات گڑبڑ ہو جاتی۔ اس کے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ فاصلہ کافی تھا۔ لیکن اس نے پرواہ نہیں کی اور خاصی تیز رفتاری سے یہ فاصلہ عبور کر کے کھنڈرات کے علاقے میں داخل ہو گیا۔

اس وقت وہ زیادہ مضبوط دل کے ساتھ اس طرف آ رہا تھا کہ یہاں اس محفل میں اس چھنن چھنن کا راز مل جائے۔ دور سے اسے کم افراد نظر آئے تھے۔ قریب پہنچا تو اس نے کوئی پینتیس چالیس کے قریب افراد کو دیکھا۔ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ حقے گڑگڑا رہے تھے۔ لالٹینیں اونچے اونچے پتھروں پر رکھی گئی تھیں جو اینٹوں کے ڈھیر سے بنائے گئے تھے۔ جو لوگ وہاں موجود تھے وہ اچھے خاصے لوگ تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ عورتیں بھی تھیں۔ دو تین بچے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی خاص سلسلے میں وہاں جمع ہوئے ہوں۔

ہارون ہمت کر کے ایک ایک قدم آگے بڑھتا رہا۔ وہاں موجود لوگوں نے گردنیں اٹھا کر اسے دیکھا اور ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے رہے لیکن کسی نے ہارون سے کچھ نہیں کہا تھا۔

پھر ہارون کی نگاہ ایک طرف اٹھی۔ چار پانچ افراد لکڑیاں چن رہے تھے۔ پاس

ہی ایک ارتھی رکھی ہوئی تھی جس پر لیٹے ہوئے مُردے کو پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ غالباً وہاں کسی چتا کے جلانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ اب ہارون کو یقین ہو گیا کہ یہ نئے سہائے پور کے لوگ ہیں جو اس جگہ کو شمشان گھاٹ تصور کرتے ہوں گے اور یہاں اپنا مُردہ جلانے کے لئے لائے ہیں۔ ہارون کو اب یہ خیال آیا کہ اصل میں یہ کھنڈرات نئے سہائے پور کے لوگوں کا شمشان گھاٹ ہیں۔

لکڑیاں چنی جا رہی تھیں۔ گھی کے کنستر پاس رکھے ہوئے تھے۔ اور اس کے بعد ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ ہلکی ہلکی نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دی اور پھر ایک طرف سے چار پانچ مرد اور دو تین عورتیں نمودار ہوئیں۔ وہ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو پکڑے ہوئے تھے۔ چیخیں لڑکی ہی کی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

''بھگوان کی سوگندھ...... بھگوان کی سوگندھ...... میں نہیں گئی تھی اس کے ساتھ۔ میں نے اس کے ساتھ پھیرے نہیں لئے تھے۔ مجھے مت جلاؤ...... مجھے مت جلاؤ۔''

''چپ رہ ری...... حرام جادی۔ ٹھاکر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے تُو چیخ و پکار مچا رہی ہے حرام ...ں ...۔ گھر سے بھاگی تھی۔ ماتا پتا کے منہ کالے کئے تھے اور جس کے ساتھ پھیرے لئے تھے اب اس کا جیون نہیں رہا تو اس سے بھاگ رہی ہے تُو۔ تجھے ستی ہونا پڑے گا بھی......''

''کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے...... اسے ...کر سامنے آؤ۔'' ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے بھاری بھرکم آدمی نے کہا جس کی بھنویں اور مونچھیں سفید تھیں۔ باقی چہرہ سفاچٹ۔ لڑکی کو گھسیٹ کر اس طرف لایا گیا۔ سفید مونچھوں والے نے کہا۔

''ادھر آ...... چندر بدن...... قریب آ میرے۔''

''دہائی ہے ٹھاکر...... دہائی ہے۔ بھگوان کی سوگندھ میں اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ یہ میرا پتی نہیں ہے۔ بھگوان کی سوگندھ ٹھاکر صاحب...... میری جان بچا لیجئے۔''

''چندر بدن! سارے ثبوت ہیں ہمارے پاس کہ تُو رتھ بیرے سے پریم کرتی تھی اور تُو اسی کے ساتھ نکل گئی تھی۔ تیرے ماتا پتا تجھے تلاش کرتے رہ گئے لیکن تُو نہیں ملی۔ پھر بستی کے قانون کے مطابق رتھ بیرے کی تلاش میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ پر رتھ بیرے نے جنگ کی اور مارا گیا۔ موت تو ویسے بھی اس کا مقدر تھی کیونکہ اس نے بستی کی لڑکی کو دھوکہ دے کر بھگا دیا تھا۔ بہر حال پھر تُو بھی دنگادری سے ہاتھ آئی۔ رتھ بیرے بھی تو وہیں ہوا کرتا تھا۔''

''نہیں ہوتا تھا...... بھگوان کی سوگندھ...... نہیں ہوتا تھا۔ وہ میرا پتی نہیں تھا۔ بھگوان کی سوگندھ وہ میرا پتی نہیں تھا۔ نہ وہ مجھے لے کر بھاگا تھا...... میں تو...... میں تو ایک شہری بابو کے ساتھ چلی گئی تھی...... شہری بابو کے ساتھ چلی گئی تھی۔ دیکھو...... دیکھو...... ادھر دیکھو، وہ دیکھو...... وہ کھڑا ہے میرا پتی ٹھاکر صاحب! وہ دیکھو، وہ کھڑا ہے میرا پتی۔'' لڑکی نے کہا اور اس کے ساتھیوں نے ہارون کی جانب چھلانگ لگا دی۔

ہارون جو اس انوکھے ڈرامے کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا بری طرح چونک پڑا۔ خوبصورت لڑکی دوڑتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ بتا دو ناں انہیں بھگونتی...... بتا دو انہیں کہ میں تمہاری دھرم پتنی ہوں۔ انہیں بتا دو ورنہ یہ مجھے اس کے ساتھ آگ میں ستی کر دیں گے۔ یہ مجھے ستی کرنے کے لئے لائے ہیں۔ مجھے بچا لو بھگونتی، مجھے بچا لو......''

سب کی نگاہیں ہارون کا جائزہ لینے لگیں۔ خود سفید مونچھوں والا آدمی اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمبی مونچھوں والا لمبا چوڑا آدمی تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں والا۔ اس نے آگے بڑھ کر لالٹین اٹھائی اور ایک ایک قدم چلتا ہوا ہارون کے پاس پہنچ گیا۔ چندر بدن، ہارون سے چمٹی ہوئی تھی اور مسلسل چیخ چیخ کر کہے جا رہی تھی۔

''ہائے بھگونتی تم آ گئے...... دیکھ لو انہیں بتا دو بھگونتی...... مجھے بچا لو...... تمہیں بھگوان کا واسطہ۔''

ہارون کے اوپر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ بات اب سمجھ میں آ رہی تھی۔ کسی بستی کی رہنے والی تھی یہ لڑکی۔ کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لیکن رتھ بیر نامی آدمی کا نام اس سلسلے میں لیا جا رہا تھا۔ رتھ بیر مر چکا تھا اور اسے ستی کیا جا رہا تھا اس کے ساتھ۔ ایک نوجوان لڑکی کی زندگی بچانے کے لئے تھوڑا سا ایثار کرنا ضروری تھا۔ لیکن اگر اس کے بدلے میں خود اس کی گردن کاٹ دی جاتی تو کیا ہوتا؟ وہ پورے ہوش و حواس میں تھا۔ چندر بدن کے لمس نے اسے ایک ہلکی سی لرزش کا شکار کر دیا تھا۔

''میرا نام ٹھاکر بل بیر سنگھ ہے لڑکے! کیا کہہ رہی ہے یہ؟ بتائے گا تُو اس بارے میں؟''

اور اچانک ہی ہارون کے دل میں یہ عزم پختہ ہو گیا کہ نتیجہ کچھ بھی نکلے میں اس لڑکی کی جان ضرور بچاؤں گا۔ وہ ایک دم آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے

تیار ہو گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے سفید مونچھوں اور سفید بھنوؤں والے نے کہا۔

''بولتا کیوں نہیں...... کیا یہ تیری دھرم پتنی ہے؟''

''ہاں ٹھاکر صاحب! یہ غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی۔'' ہارون نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اور چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں ابھرنے لگیں۔ لڑکی خوشی بھری آواز میں بولی۔

''بھگوان تمہیں سکھی رکھے...... بھگوان تمہارا جیون بنائے رکھے۔ بول دے، سچ بول دے اس کے سامنے۔''

ہارون نے ایک نگاہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ سانولے سلونے رنگ کی ایک سترہ اٹھارہ سال کی نوجوان لڑکی تھی۔ جوانی کی آگ میں تپتا ہوا چہرہ، انتہائی دلکش نقوش۔ ان میں سب سے حسین اس کی آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں جو ایک نگاہ میں دل میں اتر جائیں۔ لیکن اچانک ہی ہارون کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ یہ آنکھیں...... یہ آنکھیں تو اس کی شناسا ہیں۔ ان آنکھوں کو تو اس نے پہلے بھی دیکھا ہے...... اور پھر اس کی نگاہ اس کے بدن سے اترتی ہوئی اس کے پیروں تک پہنچ گئی۔ لڑکی کے دونوں پیروں میں پازیبیں موجود تھیں۔ چاندی کی خوبصورت پازیبیں اور ان پازیبوں سے ہارون کی گہری شناسائی تھی۔ ایک پازیب تو کچھ وقت تک اس کی ملکیت رہ چکی تھی۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا۔ ٹھاکر بل بیر سنگھ نے پھر سوال کیا۔

''بولتے کیوں نہیں...... کیا یہ تمہاری دھرم پتنی ہے؟''

''ہاں...... ہاں...... یہ میری بیوی ہے۔'' ہارون نے بے اختیار کہا اور ایک بار پھر سبھا میں بہت سی آوازیں گونج اٹھیں۔

''مگر گجراج...... گجراج تو کہتا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ پھیرے لئے ہیں۔''

''جھوٹ کہتا تھا وہ...... وہ مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک جنگل بیاباں میں رکھا ہوا تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑا رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ پھیرے لے لوں۔ پر میں نے کہہ دیا تھا گجراج جیون دے دوں گی...... تیرے ساتھ پھیرے نہیں لوں گی۔ تب یہ آ گیا اور میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس مصیبت سے بچا اور میں نے اس کے ساتھ پھیرے لے لئے۔ پریمی ہے یہ میرا...... پریمی ہے۔''

''مگر یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ ہماری بستی کا منش نہیں ہے۔ یہ ہمارے ساتھ

نہیں رہ سکتا۔ سن رے...... اپنی دھرم پتنی کا ہاتھ پکڑ اور جتنی جلدی ہو یہاں سے دور نکل جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے قبیلے کے لوگ تجھے مار ڈالیں...... جا چلا جا...... یہاں سے چلا جا......'' ہارون نے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ ہارون نے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں میں بے اختیار مسکراہٹ دیکھی تھی۔ وہ چھن چھن کرتی ہارون کے ساتھ جا رہی تھی اور بستی کے لوگ اپنی جگہ کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔

ہارون ایک سناٹے کے سے عالم میں چلا جا رہا تھا۔ ابھی تک اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج تھیں...... بس...... ایک عمل ہو گیا تھا اور وہ اس عمل کے تحت آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر کھنڈرات نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ہارون نے ایک دم سے صورتحال کو محسوس کیا۔ ہارون نے لڑکی کی طرف رخ کیا اور بولا۔

''رک جا...... کون ہے تو؟''

وہی کھنکتی ہوئی شریر ہنسی ہارون کے کانوں میں ابھری جو اگر کسی ویرانے میں کسی روح کے حلق سے آزاد نہ ہوتی تو یقیناً دل کو مٹھی میں جکڑ لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ لڑکی پہلے آہستہ سے ہنسی پھر زور سے اور پھر ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ چہرے کے نقوش اس قدر دلکش ہو گئے کہ ہارون کو اپنا دل ڈانواں ڈول ہوتا محسوس ہوا۔ انسان حسن پرست ہے۔ دلکش چیز دل کو دیکھ کر وہ یہی آرزو کرتا ہے کہ وہ اس کی ملکیت بن جائیں۔ بس کچھ دل موہ لینے والی چیزیں اسے متاثر کرتی ہیں۔ بس یہی کیفیت اس لڑکی کی تھی۔ جوانی ویسے ہی دلکش ہوتی ہے۔ اس پر یہ چندر بدن جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، سانولے سلونے رنگ اور ایسے نقوش کی مالک کہ کچھ کہا نہ جا سکے۔ ہارون کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''جب ہنس چکو تو مجھے اس ہنسی کی وجہ بھی بتا دینا اور سن، بیٹھ جا۔ یہ پائل اتار دے۔''

لڑکی ہنستے ہنستے رکی اور پھر بولی۔ ''کیوں؟''

''بے وقوف لڑکی چھن چھن کی آواز میرے کیمپ والوں نے سنی تو سب میرے پیچھے لگ جائیں گے۔''

لڑکی پھر ہنسی اور ہنستے ہنستے بے اختیار ہو گئی۔ ہارون ایک ٹھنڈی سانس لے کر کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے گھورتا رہا۔ جب وہ ہنس چکی تو ہارون نے کہا۔

اب اتار دے نا یہ پائل۔"

"اتارے دیتی ہوں۔"

وہ جھکی اور زمین پر بیٹھ گئی۔ لباس خاص ہندوانہ طرز کا تھا۔ ویسے ہی گھٹنوں گھٹنوں تک تھا۔ بیٹھنے سے اور اوپر اٹھ گیا اور اس کا صندلی بدن خاصا نمایاں ہو گیا۔ ہارون کو اپنے سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ لڑکی نے بڑی الہڑ ادا کے ساتھ اپنی دونوں پازیبیں اتار کر ہاتھ میں لے لیں اور پھر انہیں پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

"دوں گی نہیں تمہیں۔"

"تو ہے کیا مصیبت.....کون ہے؟"

"چندر بدن ہے ہمارا نام۔ بس اور کیا بتائیں تمہیں۔ پتا کا نام ہری دوارے ہے اور ماتا کا نام کام وتی۔"

"میں نے تیرا شجرۂ نسب نہیں پوچھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تو میرے گلے کیوں پڑ گئی؟"

"ارے دیکھا نہیں تھا تم نے، وہ سسرے ہمیں اس بھتنے کے ساتھ ستی کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ہم اس کی دھرم پتنی ہیں۔ بھگوان کی سوگندھ کوئی دھرم پتنی وتنی نہیں ہیں ہم اس کی۔ پاپی ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کہتا تھا کہ ہم پھیرے کر لیں اس کے ساتھ۔ زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا۔ بے ہوش کر دیا تھا اس نے ہمیں۔ پتہ نہیں کتنی دور لے گیا تھا۔ قید رکھا اس نے ہمیں۔ کہتا تھا کہ پھیرے لو ہمارے ساتھ۔ پر ہم نے بھی کہہ دیا پاپی، سب سے آسان کام جیون دے دینا ہے۔ ہم جیون دے دیں گے پر پھیرے نہیں کریں گے تیرے ساتھ۔ اور پھر بستی کے لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور اس نے بستی والوں کو یہ بتایا کہ اس نے ہمارے ساتھ پھیرے لے لئے ہیں۔ ہم اس کی دھرم پتنی ہیں۔ پر ہم نے ان سے کہا کہ ہم نے اس کے ساتھ پھیرے نہیں لئے ہیں۔ ہم نے کسی اور کے ساتھ پھیرے لے لئے ہیں جو ہمارا پریمی تھا۔

بستی والے نہ مانے۔ وہ بھتنا گجراج بستی والوں کی قید میں تھا۔ بستی والے پکڑ کر پنچائت میں لا رہے تھے کہ وہ ان کے بیچ سے بھاگ نکلا اور پھر ایک بلندی سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے نیچے گرا اور مر گیا۔ یہ لوگ اس کا انتم سنسکار کر رہے تھے

اور ہمیں بھی اس کے ساتھ ستی کر رہے تھے۔ یہ کہہ کر کہ ہم اس کی دھرم پتنی ہیں۔ ہم تمہیں بھگوان کی سوگندھ کھا کر بتاتے ہیں کہ ہم اس کی دھرم پتنی نہیں تھے۔ نہ ہی ہم نے اسے اپنے شریر کو چھونے دیا۔ پر کیا کرتے۔ کسی اور کو تو کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ صرف تم ہی نظر آئے تھے ہمیں تو ہم نے کہہ دیا کہ تم ہمارے پتی ہو۔"

"اوہ.....اب کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا.....اتنے برے ہیں ہم کیا؟" وہ منہ بنا کر بولی۔

"ارے بری کی بچی، میں شادی شدہ ہوں۔ بچہ ہے میرا ایک۔" ہارون نے کہا اور وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ ہنسی تو جیسے اس کے ہونٹوں پر ہی رکھی رہتی تھی۔ خوب ہنسی۔ خوب ہنسی۔ پھر بولی۔

"سو.....پھر کیا ہے۔ ہم تمہاری دھرم پتنی کی سیوا کریں گے۔ تمہارے بچے کی سیوا کریں گے۔ رکھ لو ناں ہمیں۔"

"تو آ تو سہی۔ دیکھوں گا کہ تجھ سے کیسے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ ارے ہاں ایک بات تو بتا۔"

"پوچھو۔"

"یہ تو چھن چھن.....چھن چھن کرتی کیوں پھر رہی تھی؟ تیرے ہاتھ میں چراغ کی لو تھی اور تو میرے چکر میں پڑی ہوئی تھی۔ کیا اس وقت بھی تیرا یہی ارادہ تھا کہ مجھے اپنا پتی بنائے؟ اور پھر جب میں اپنے گھر واپس جا رہا تھا تو راستے میں تو مجھے کیوں ملی تھی؟ اور تیری پازیب گر پڑی تھی۔"

ہارون نے یہ کہہ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ حیران نگاہوں سے ہارون کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ کب کی باتیں کر رہے ہو تم؟"

"اچھا.....اب کب کی باتیں کر رہا ہوں۔"

"یہاں اس کیمپ میں تو میری جان نہیں جلاتی رہی؟ اور وہ کون تھا جس کا ہاتھ بالوں بھرا تھا۔"

"ارے واہ.....واہ.....ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ کوئی اور ہو گی وہ۔"

"کوئی اور.....؟"

"تو اور کیا؟"

''مگر یہ پازیب، ایک پازیب میرے پاس تھی۔ تیرے پیر سے گر گئی تھی۔'' ہارون نے کہا لیکن وہ حیرانی سے ہارون کو دیکھتی رہی۔ ہارون نے زور سے گردن جھٹکی اور پھر بولا۔

''چل آ...... آ جا۔'' اور وہ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ آخر کار راستہ ختم ہوا۔ مزدور گہری نیند سو چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ بالکل اتفاقیہ طور پر ہارون اس طرف چلا جہاں وہ مزار دریافت ہوا تھا۔ مزار سے سو گز کے فاصلے پر وہ اچانک ہی رک گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ ہارون نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیوں...... آ جا...... کیا بات ہے؟''

''نن...... نہیں...... ادھر...... ادھر نہیں۔''

''کدھر......؟''

''ادھر...... ادھر......'' وہ زمین کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

بات ہارون کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور بولا۔ ''کیوں...... کیا مصیبت ہے؟ آ جا......''

لڑکی نے تھوڑا سا فاصلہ کاٹا اور اس کے بعد ہارون کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اس کے خیمے تک آ گئی۔ یہاں آنے کے بعد ہارون کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اب تک جو کچھ ہوا ہے عالم خواب میں ہوا ہے۔ مزدور آرام کر رہے تھے۔ کامران بھی یقیناً اپنے خیمے میں ہی ہوگا۔ یہ کیا ہوا...... یہ کیا کر کے آ گیا میں؟ اب اس بلا کا کیا کروں؟ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کوئی انسان ہے یا پھر روح۔ اب تک جو حالات پیش آئے تھے وہ تو اسی طرح کے تھے کہ وہ روح ہی لگ رہی تھی۔ لڑکی پہلے سے اس کے پیچھے پڑ گئی تھی یا پھر ابھی یہ اتفاق ہوا ہے یہ فیصلہ کرنا ایک مشکل کام تھا۔ مزدور جب اسے اس کے خیمے میں دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔ کیا کرے وہ اس کا۔

وہ آگے آگے چلتا ہوا ایک پتھر کی طرف بڑھ گیا اور پھر پتھر پر بیٹھ گیا۔

''بیٹھو...... کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟''

''چندر بدن ہے ہمارا نام۔''

''چندر بدن یہ بتاؤ کہ تم میرے پیچھے کیوں لگ گئیں؟''

''پھر وہی بات کہہ رہے ہو۔ ہم کہاں لگے تمہارے پیچھے اور ہم کیا کرتے۔ اور کوئی ترکیب نہیں تھی جل جاتے کیا اس کے ساتھ چتا میں؟ ستی ہو جاتے اس کے ساتھ جو ہمارا پتی نہیں تھا۔''

''مگر بابا! تم نے میرا نام کیوں لے دیا؟''

''وہاں کوئی اور تھا جس کا نام لیتے؟ کون کہتا کہ اس نے ہمارے ساتھ پھیرے کئے ہیں؟ تم نے دیا کی ہمارے اوپر اور کہہ دیا کہ ہاں ہم تمہاری دھرم پتنی ہیں۔ سو بچ گئے ہم۔ ورنہ جیتے جی مارے جاتے۔''

''چندر بدن دیکھو...... میں یہاں کام سے آیا ہوں۔ میں تمہیں رات کو یہاں رہنے کی اجازت دے دیتا ہوں۔ اس کے بعد تم اور کہیں اپنا ٹھکانہ کر لینا۔ آؤ...... اٹھو میرے ساتھ آؤ۔ کسی کی آنکھ کھل گئی تو وہ ہمیں یہاں بیٹھا دیکھ کر عجیب سے انداز میں سوچے گا۔''

وہ باول نخواستہ ہارون کے پیچھے چل پڑی۔ ہارون اسے اپنے ساتھ اپنے خیمے میں لے گیا۔

''یہاں آرام سے سو جاؤ اور جب تک میں تمہیں آواز نہ دوں باہر مت نکلنا۔''

''ٹھیک ہے......'' اس نے معصومیت سے کہا اور ہارون کے اشارے پر بستر کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے پازیبیں سرہانے رکھیں اور پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ بالکل بچوں کا سا انداز تھا۔ ہارون باہر نکل آیا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا ذہن جکڑا ہوا ہو۔ کیا کر بیٹھا ہے...... نتیجہ کیا ہوگا؟ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بہرحال وہ اسی پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بدن پر تھکن اور کاہلی سی سوار ہو رہی تھی۔ یہ نیند نہ پوری ہونے کی علامت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اور پھر اسی وقت آنکھ کھلی جب کسی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ چونک کر اچھل پڑا۔

کامران اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر محبت کے آثار تھے۔ آنکھوں میں ہمدردی تھی۔ ہارون سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو کامران بولا۔

''خیریت...... کیا ہو گیا تھا؟''

''کہاں......؟'' ہارون نے چونک کر پوچھا۔

''یہاں باہر کیوں سو رہے تھے سر آپ؟''

''وہ..... بس ذرا.....'' ہارون جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وقت دیکھا، ماحول دیکھا۔ بہت زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ کامران نے جلدی سے کہا۔

''نہیں، ابھی سارے مزدور نہیں جاگے۔ سات بجے ہیں صرف۔ رات کو مزدوروں کے ساتھ ہلا گلا رہا اور پھر نجانے کیوں نیند کا غلبہ ہوا تو میں اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔ صبح کو خیال آیا کہ رات کو میں آپ سے ملا نہیں ہوں سر! تو بس جلدی سے آپ کی تلاش میں آپ کے خیمے کی جانب چلا۔ مگر ادھر آپ نظر آ گئے۔''

''خیمے میں داخل ہوئے؟''

''نہیں۔'' کامران نے اس سوال پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی دھن میں کہنے لگا۔

''سر! ویسے آپ یقین کیجئے یہ مزار کسی صاحب کرامات بزرگ کا ہے۔ ایک عجیب سا ذہنی اور روحانی سکون ملتا ہے یہاں۔ رات کو تو اچھی خاصی قوالیاں ہو رہی تھیں۔ شغل ہاتھ آ گیا ہے۔ مزدور بھی خوش ہیں۔''

ہارون نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اسے پتہ تھا کہ وہ اندر موجود ہی ہے۔ اب اس کے لئے کیا، کیا جائے؟ ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا پھر اس نے سوچا کہ کامران کو اپنا ہمراز بنا لینا مناسب ہے۔ ظاہر ہے بات چھپی نہیں رہ سکے گی۔ اب یہ مصیبت کس طرح ٹلے گی یہ نہیں معلوم تھا۔ کامران کم از کم مشورہ تو دے سکتا ہے۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''رات کو یار میں عجیب و غریب حالات کا شکار ہو گیا ہوں۔''

''میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے سو رہے ہیں..... کیسی تکلیف میں رات گزری ہو گی۔ ابھی صبح کو آ گئے تھے یا رات ہی''

''نہیں تقریباً یہ سمجھ لو کہ آدھی کے بعد سے میں یہیں پر ہوں۔''

''مگر کیوں؟''

''وہی تو بتا رہا ہوں یار! رات کو جب تم لوگ اس شغل میں مصروف تھے میں نے بہت سی روشنیاں دیکھیں اور ان کی جانب چل پڑا۔''

ہارون نے کامران کو ساری تفصیل بتائی اور جب آخر میں یہاں پہنچا کہ وہ یہاں خیمے میں سو رہی ہے تو کامران بری طرح اچھل پڑا۔

''ارے..... بب..... باپ رے..... کس..... سو رہی ہے آپ کے خیمے میں؟''

''ہاں..... کامران! جو کچھ ہوا ہے وہ بے اختیاری میں ہوا ہے۔ حقیقت یہی ہے

کہ اس وقت میرے دل میں صرف انسانی ہمدردی تھی۔ وہ لوگ اسے زندہ آگ میں جلا رہے تھے۔ تمہیں پرانی ہندو رسموں کے بارے میں تو معلوم ہو گا ہی۔ شوہر کے مر جانے پر بیوی کو ستی کر دیا جاتا تھا۔ کہیں وفا پرست بیوی خود شوہر کی چتا میں جل بھن جاتی تھی اور اس کے اس طرح جل مرنے کو بہت بڑا کام سمجھا جاتا تھا۔ کہیں وہ جلنا نہیں چاہتی تھی تو اسے زبردستی چتا میں جھونک دیا جاتا تھا۔ یہ ظالمانہ رسم محمد بن قاسم نے ختم کرائی۔ لیکن پرانے عقیدے کے ہندو اب بھی بہت سی رسومات پوری کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دیوی دیوتاؤں کا مسئلہ ہی کچھ اور ہے۔ اخبارات میں کبھی کبھی خبریں پڑھتے رہتے ہو گے کہ فلاں سادھو نے ایک بچے کو زندہ جلا دیا یا اس کی کھوپڑی کاٹ کر کچھ کر ڈالا۔ رات کو اگر میں اس کی زندگی نہ بچاتا تو وہ لوگ اسے آگ میں ڈال دیتے۔''

''مگر سر! ایک بات تو بتائیے۔'' کامران نے کسی قدر خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''کیا وہ زندہ ہے..... میرا مطلب ہے کوئی ایسا وجود جسے ہم دیکھتے رہے ہیں..... وہ روح تو نہیں ہے؟..... تو سر..... تو سر پھر سہائے پور کے ان پرانے کھنڈرات میں جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آیا وہ کیا تھا؟''

کامران کے سوال پر ہارون چونک پڑا۔ نجانے کیوں کچھ دیر کے لئے وہ لمحات ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

''بے شک اپنی جگہ ایک پراسرار ماحول تھا۔ لیکن کامران! یہ سب کچھ کیا تھا..... کیا تم اس کی کوئی توجیح کر سکتے ہو؟''

''سر! بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا؟''

''بس وہیں ڈھلوانوں کے اختتام پر جہاں سہائے پور کے قدیم کھنڈرات شروع ہوتے ہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے سر! ان لوگوں نے اپنی یہ سبھا رات میں کیوں لگائی تھی؟ اگر انہیں ایسا ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا تو وہ سہائے پور میں کر سکتے تھے۔ میرا مطلب ہے نئے سہائے پور میں۔''

''ایک بات میں تمہیں بتاؤں کہ ہندو آبادی بڑی محدود ہے۔ وہ لوگ اسے شمشان گھاٹ میں لائے تھے جلانے کے لئے اور وہیں سبھا بنی ہوئی تھی۔''

''میرے حلق سے یہ بات نہیں اترتی سر! اب یہ بتائیے اسے کیسے چھپائیں گے

مزدوروں سے؟ یا مزدوروں سے کیا کہیں گے؟''

''یہی تو پریشانی کی بات ہے...... میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں۔ کامران تم ایک کام کر سکتے ہو۔''

''بتایئے، بتایئے سر!''

''اسے خاموشی سے جیپ میں بٹھا کر یہاں سے لے جاؤ۔ اس سے پہلے کہ مزدور جاگیں تم اسے شہر لے جاؤ اور کسی بھی جگہ منتقل کر دو۔''

کامران سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''سر! آپ کے لئے میں جان دینے کو تیار ہوں۔ میں اسے اپنے گھر لے جا سکتا ہوں۔ گھر والوں سے کچھ بھی کہہ دوں گا۔ مگر اس کا حلیہ وغیرہ کیسا ہے؟''

''ہندو لباس پہنے ہوئے ہے اور وہ بھی قدیم قسم کا۔''

''یہیں گڑ بڑ ہو جائے گی سر! راستے میں لے جاتے ہوئے بھی اگر پولیس وغیرہ مل گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ چھپ کر جیپ کی پچھلی سیٹوں کے درمیان لیٹ جائے۔''

''اگر آپ یہ مناسب سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے سر! ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔'' کامران ایک جانثار دوست تھا۔ ہمیشہ ہی وقت پر کام آنے والا۔

''آؤ......''

''نن...... نن...... نجانے کیوں سر! میرے دل پر ایک خوف سا چھایا ہوا ہے۔ اگر وہ کوئی روح نکلی تو......''

''یار! جو حال میرا ہوگا، وہی تمہارا ہوگا۔ اب تم اتنا ایثار کر رہے ہو میرے لئے تو ہمت بھی کر لو۔''

''ٹھیک ہے سر! آیئے۔''

دونوں خیمے کی جانب بڑھ گئے۔ ہارون کا دل خود بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جو ہوا تھا وہ بالکل اتفاقی طور پر ہو گیا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ بہرحال وہ خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ کامران بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لیکن ہارون کے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ وہ بستر پر موجود نہیں تھی۔ خیمے میں البتہ ایک دھیمی دھیمی سی خوشبو رچی ہوئی تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا

سکتا تھا۔ خیمہ اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ کوئی وہاں چھپ جائے۔

ہارون نے بے اختیار کہا۔ ''نکل گئی شاید...... آؤ باہر دیکھیں۔''

وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے ڈھلان تک آ گئے۔ دور دور تک خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ سہائے پور کے کھنڈرات، اینٹوں کے ڈھیر بدصورت اور بدنما نظر آ رہے تھے۔ دور دور تک وہاں کوئی انسانی وجود موجود نہیں تھا۔ دونوں سکتے کے عالم میں وہاں کھڑے رہے۔ اچانک ہی ہارون نے ایک گہری سانس چھوڑی اور بولا۔

''خدا کا شکر ہے خود بخود جان چھوٹ گئی۔''

کامران پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''سر! کیا کہتے ہیں اب آپ؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا وہ کوئی روح تھی؟ آپ نے تو اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ شکل و صورت کیسی تھی؟ میں نے تو دیکھی بھی نہیں۔''

''کامران! خدا تمہیں نہ دکھائے۔ جوان آدمی ہو، پاگل ہو جاؤ گے اسے دیکھ کر۔''

''خ...... خ...... خدا کی قسم سر! کیا بہت خوبصورت تھی؟''

''میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں کہ اتنی حسین، اتنی دلکش کہ شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جا سکے۔ چندر بدن ہے اس کا نام۔''

''پھر تو واقعی گڑبڑ ہو گئی۔''

''مگر یہ سب کیا تھا کامران؟''

''سر! روحوں کا کھیل۔'' کامران نے جواب دیا۔

''تو وہ ایک روح تھی؟''

''سو فیصدی سر! سو فیصدی۔ آپ نے جو واقعات سنائے ان پر غور کر لیجئے۔ یہ وہی لڑکی ہے نا جس کی پازیب سڑک پر رہ گئی تھی اور آپ اسے اٹھا کر گھر لے گئے تھے۔''

''اس بات کو کیا کہتے ہو کہ اگر وہ کوئی روح تھی تو اس کے پاؤں سے پازیب نکل کر کیسے گر پڑی؟ دماغ چکرا دینے والی بات ہے، آؤ۔''

ہارون نے کہا اور ایک بار پھر وہ واپس خیمے میں آ گئے۔

''ایک خوشبو سی محسوس کر رہے ہو؟''

''میں خود بھی اس کے بارے میں آپ سے کہنے والا تھا کہ یہ خوشبو کیسی ہے۔''

''یہ اسی کے بدن کی خوشبو ہے کامران۔ یہ خوشبو اس کے بدن سے آ رہی تھی۔''

کامران سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''انوکھی خوشبو ہے...... اور میں یہ بات جانتا ہوں کہ ایسی کوئی خوشبو آپ استعمال نہیں کرتے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں آئی تھی اور یہ ساری کہانی کوئی وہم نہیں ہے۔''

''کیا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو؟ میں وہاں گیا تھا، پورے ہوش و حواس کے عالم میں گیا تھا۔ وہاں وہ سجا لگی ہوئی تھی۔ شمشان گھاٹ تھا۔ لکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ کسی کے کنستر پاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک ارتھی تھی جس پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ سب کا سب جوں کا توں تھا اور وہ میرے پاس آ گئی تھی اور مجھے اپنا شوہر کہا تھا اور اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ میں اس کی بات کی تصدیق کر دوں۔ ورنہ وہ لوگ اسے میری نگاہوں کے سامنے آگ میں جھونک دیتے۔ تم خود سوچو کامران اس کے علاوہ اور کیا، کیا جا سکتا تھا؟''

''نہیں ..... میں آپ کی اس بات سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔'' کامران نے کہا۔

اس کی نگاہیں خیمے میں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ تبھی اچانک اس کی نگاہیں اس بستر پر پڑیں جس پر بقول ہارون کے وہ لڑکی لیٹی تھی اور وہ اچھل پڑا۔ پھر وہ جلدی سے بستر کی جانب بڑھا تو ہارون نے کہا۔

''خیریت ..... کیا بات ہے؟''

لیکن کامران نے کوئی جواب دیئے بغیر وہ تکیہ الٹ دیا جس کے نیچے چاندی کی دو پازیبیں موجود تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہوئے ہارون نے ان پازیبوں کو دیکھا اور جلدی سے ان کے قریب پہنچ گیا۔

''ہاں ..... دیکھا یہ اس کی یہاں موجودگی کا ثبوت ہے۔ اس وقت پازیبیں اس نے پیروں سے اتار کر ہاتھ میں لے لی تھیں اور یہ بات میں نے اس سے کہی تھی کہ چھن چھن کی آواز کے ساتھ مزدور جاگ جائیں گے۔ یعنی اس وقت جب رات کو

میں اسے لے کر یہاں تک آیا تھا۔ بعد میں اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے یہ پازیبیں تکیے کے نیچے رکھ دی ہوں گی۔ وہ انہیں یہاں چھوڑ گئی۔''

کامران خاموشی سے کھڑا ان پازیبوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے انہیں چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہارون آگے بڑھا اور اس نے دونوں پازیبیں اٹھا لیں۔ پھر وہ بولا۔

''میں پورے وثوق سے یہ بات کہتا ہوں کہ یہ وہی پازیبیں ہیں جن میں سے ایک مجھے اس لڑکی کے پاؤں سے گر کر سڑک پر ملی تھی۔ یعنی اس وقت جب میں اشعر کو دیکھنے اپنے گھر جا رہا تھا۔''

''سر! صورتحال بہت پیچیدہ ہے۔ میری تو عقل نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اصل میں یہی سوچ رہا تھا کہ درختوں کے درمیان گردش کرنے والی لڑکی کوئی آوارہ روح ہے جو وہاں بھٹک رہی ہے۔ کسی ہندو لڑکی کی روح جس کا نام چندر بدن ہے۔ مگر اب یہ پازیبیں دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کہانی سچ ہی ہے اور وہ لڑکی آپ کے ساتھ آئی تھی۔''

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں یار!'' ہارون نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

''نہیں سر! میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ پھر وہ صبح ہی صبح غائب کہاں ہو گئی؟ جبکہ بقول آپ کے اس کے بستی والے اسے ستی کر دینا چاہتے تھے۔''

''بات بڑی الجھ گئی ہے۔''

''ایک بات اور سر! اگر آپ پسند کریں۔''

''ہاں ہاں بولو۔''

''مزدوروں کو کام پر لگانے کے بعد ہم لوگ ذرا ادھر چلیں گے۔ میں ایک چیز کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''کیا؟''

''آپ نے کہا تھا کہ وہاں رات کو ایک چتا تیار کی گئی تھی۔ ذرا چل کر یہ دیکھتے ہیں کہ اس شمشان گھاٹ میں اس مُردے کو جلایا گیا یا نہیں جس کا نام آپ نے گجراج بتایا ہے۔''

''اوہ ..... ویری گڈ ..... بڑا اچھا سوچا تم نے۔ واقعی اسے دیکھنا چاہئے۔'' ہارون نے آمادگی ظاہر کر دی۔

پھر دونوں خیمے سے باہر نکل آئے۔ رفتہ رفتہ مزدور جاگنے لگے تھے۔ ناشتے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ بڑی باقاعدگی سے ہر کام ہوتا تھا۔ کچھ لوگوں کی ذمہ داری صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کی ہوتی تھی۔ ضرورت پڑنے پر چائے وغیرہ بھی تیار کیا کرتے تھے وہ۔ یہ آفس کے ہی لوگ تھے اور اس طرح کی ڈیوٹی ہمیشہ ہی سرانجام دیا کرتے تھے۔ ہارون نے خاص طور سے یہی طریقہ کار رکھا تھا کہ جو ناشتہ مزدور کرتے وہی ناشتہ وہ، کامران اور بڑے رینک کے اسٹاف کے لوگ کیا کرتے تھے تاکہ مزدوروں کو مساوات کا احساس رہے اور کوئی اعتراض نہ ہو۔ یہ صرف اسی نے کیا تھا۔ ورنہ باقی یونٹ اپنے طور پر اپنی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی طے تھی کہ ان کے اور مزدوروں کے درمیان اچھے تعلقات نہیں تھے۔ جبکہ یہاں صورتحال یہ تھی کہ جب بھی ہارون کو ایسے سروے پر بھیجا گیا اس نے بہترین طریقے سے اپنا کام سرانجام دیا اور بالکل صحیح وقت پر اعلیٰ حکام کو رپورٹ پیش کر دی۔

دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جاتا تھا۔ البتہ اس سے ایک فائدہ ہوتا تھا کہ کھانا سب کے لئے اچھا ہی پکتا تھا۔ ابھی تک تو اس کا انتظام کر کے لایا گیا تھا۔ لیکن آگے چل کر یقینی طور پر کچھ چیزیں خریدنے کے لئے آس پاس کی بستی کا رخ کرنا پڑتا۔ نیا سہائے پور بہرحال اتنے فاصلے پر نہیں تھا کہ وہاں تک نہ پہنچا جاتا۔ یہ کام کوئی بھی کر سکتا تھا۔ خاص طور سے اکرام جو ڈرائیور تھا۔ بہرحال اس کے بعد انہوں نے اوورسیئر کو ہدایت کی اور سارا کام بخیر و خوبی ہونے لگا۔

مزدوروں نے کہیں سے تلاش کر کے کچھ جنگلی پھول حاصل کر لئے تھے جو انہوں نے مزار پر چڑھا دیئے تھے۔ بڑی عقیدت مندی سے یہاں فاتحہ خوانی کی جاتی تھی۔ بہرحال جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ہارون نے جیپ سنبھال لی۔ کامران بھی اس کے برابر میں بیٹھا اور کچھ دیر بعد جیپ ڈھلان میں اتر گئی۔ وہ لوگ سست روی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کھنڈرات کی جانب جا رہے تھے۔ خاص طور سے ہارون کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔

اگر وہ لڑکی نظر آ جائے تو اس کا پیچھا کیا جائے اور اس سے پوچھا جائے کہ وہ بھاگ کیوں گئی؟ اس کا بھاگ جانا خاصا پراسرار تھا۔ بہرحال راستے میں وہ بالکل نظر نہیں آئی اور وہ لوگ تھوڑی دیر کے بعد ان کھنڈرات تک پہنچ گئے۔ ہارون کو رات کی وہ جگہ یاد تھی جہاں ہندوؤں نے سبھا لگائی ہوئی تھی۔ وہاں چارپائیاں بھی بچھی ہوئی

تھیں اور بیٹھنے کے لئے مونڈھے وغیرہ بھی رکھے گئے تھے۔ اچھی خاصی تعداد تھی۔ ٹھاکر بل بیر سنگھ نامی شخص بھی وہاں موجود تھا۔ لیکن اس وقت ان لوگوں کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ہارون کی نگاہیں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں جہاں چتا بنائی گئی تھی۔

لیکن کیسی چتا...... کہاں کی چتا...... لاش جلنے کے نشانات تو خیر تھے ہی نہیں لیکن وہاں کسی چتا کا بھی وجود نہیں تھا۔ ہارون پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ بار بار جگہیں تبدیل کر رہا تھا اور دور تک دیکھتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کامران! یہی جگہ ہے...... بالکل یہی جگہ ہے۔ تم یقین کرو میں سو فیصدی اپنی یادداشت پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں......''

''مگر جناب! یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے...... اور میں جو ایک خاص بات دیکھ رہا ہوں اس پر آپ نے غور بھی نہیں کیا۔''

''کون سی خاص بات؟''

''نہیں اسی جگہ تو ہم لوگ اس رات بھی آئے تھے۔ وہاں، اس جگہ، دیکھیں وہ سامنے، وہ دیکھیں جو ایک ابو الہول جیسی شکل کا اینٹوں کا ایک ڈھیر نظر آ رہا ہے وہ مکان اینٹوں کے عقب میں ہی تو تھا جس کے دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ دیکھیں! ذرا غور کریں، کہاں ہے وہ مکان؟''

ہارون کو بھی یاد آ گیا اور یہ دیکھ کر وہ بھی انگشت بدنداں رہ گیا کہ وہاں کوئی ایسا مکان نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہارون وہاں رکا اور چیزوں کا جائزہ لیتا رہا لیکن کہیں کوئی کسی قسم کا نشان نہیں ملا تھا۔

''خدا کی پناہ...... یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔ اب کیا کریں؟''

''واپس چلیں جناب! یہ سب آسیبی چکر ہے۔ مت پڑیں اس آسیبی جھمیلے میں۔ کہیں کوئی بڑی مصیبت ہی نہ بن جائے۔'' کامران نے کہا اور ہارون نے گردن ہلا دی۔ دونوں جیپ میں بیٹھ کر واپس چل پڑے تھے۔

❁

صفورہ طاہر اس کہانی کا ایک اہم کردار ہے۔ حاجی عطا نے چاہا تھا کہ ہارون کی شادی صفورہ سے ہو جائے لیکن ہارون اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اس نے حاجی عطا کا یہ حکم قبول نہیں کیا۔ شاید مان لیتا لیکن بنیادی وجہ افشاں تھی جسے ہارون چاہنے لگا تھا۔

صفورہ ویسے تو مختلف مزاج کی لڑکی تھی اور صحیح معنوں میں اسے ہارون سے کوئی عشق وغیرہ نہیں ہوا تھا البتہ ہارون اسے پسند ضرور آیا تھا۔ لیکن جب ہارون نے اسے مسترد کر دیا تو صفورہ دنگ رہ گئی۔ اسے اپنا پندارِ حُسن ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ تو یہ سوچتی تھی ہمیشہ کہ اس کی مالی حیثیت، اس کا حُسن و جمال ایسا ہے کہ کوئی بھی اس کی قربت حاصل کرنا باعث فخر سمجھے گا۔ وہ اپنے اس غرور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ متعدد بار کئی لڑکوں نے اس کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کی اور صفورہ نے انہیں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ بہت سے لڑکے اس کے بارے میں دل میں قدر رکھتے تھے لیکن صفورہ کو ان کی پرواہ نہیں تھی۔ پھر وہ پہاڑ تلے آئی۔ ہارون نے اسے ٹھکرا دیا اور افشاں سے شادی کر لی۔

صفورہ تلملاتی رہی۔ اس کے ذہن میں ہارون کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھ آیا۔ وہ سوچنے لگی کہ ہارون کو اس طرح ملیا میٹ کر دے گی کہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔ لیکن اس دوران اسے لندن جانا پڑ گیا۔ اس کے والدین نے وہاں پر اپنی رہائش کا بندوبست کیا تھا اور صفورہ کو ان کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ وہ دل میں آتشِ غضب لئے لندن چلی گئی۔ پھر لندن کی فضاؤں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ وہاں کی رنگینیوں میں گم ہو گئی۔ لیکن دل میں انتقام کا شعلہ کبھی سرد نہیں ہوا۔ جب بھی اسے وطن یاد آتا تھا تو اس کے دل میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی تھی۔ کچھ بھی نہیں کرنا، صرف اور صرف ہارون کو خوشیوں سے محروم کرنا ہے۔ وہ ہارون کی زندگی نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ تو بس اسے اس منزل پر لے آنا چاہتی تھی جہاں ہارون ایڑھیاں رگڑتا رہے۔ خوشیوں کو ترستا رہے اور وہ اسے خوش نہ رہنے دے۔

لندن میں بہت سے لڑکے اور لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ سب کے مشاغل الگ الگ تھے۔ لیکن ہری پرشاد ایک ایسا ہندو لڑکا تھا جس سے اس کی گہری دوستی ہو گئی۔ لیکن یہ دوستی گناہ کی حد تک نہیں پہنچتی تھی۔ البتہ ہری پرشاد اس کے لئے دل میں بہت کچھ رکھتا تھا۔ پھر ایک دن لندن کے شہر لیک ڈسٹرکٹ میں پکنک کا پروگرام بنا اور ہری پرشاد نے اپنے دل میں گناہ کا ایک منصوبہ بنا لیا۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں تھے۔ لندن کی آزاد فضاؤں میں اور مغرب کی تہذیب میں رچے بسے یہ لوگ گناہ کی ہر منزل کو زندگی کا راستہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہاں ہر طرح کی رنگ رلیاں شروع ہو گئیں۔

صفورہ کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔ ہری پرشاد نے اس سے کہا۔

''آؤ...... وہ ادھر جو پہاڑی علاقے پھیلے ہوئے ہیں وہاں بڑے خوبصورت غار ہیں۔ میں نے ایک بار دیکھے تھے۔ اجنتا اور الورہ کی مثال مل جاتی ہے یہاں۔ آؤ...... میں تمہیں دکھاؤں۔''

صفورہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ ہری پرشاد اسے دھوکہ دے کر اس علاقے میں لے گیا اور پھر ایک غار میں جا کر اس نے صفورہ سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''اگر یہاں رہ کر بھی تم پاکیزگی کا دعویٰ کرتی ہو تو پھر تمہاری زندگی ہی بیکار ہے۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''وہی صفورہ! جو ایک نوجوان کا ایک نوجوان لڑکی سے مطالبہ ہو سکتا ہے۔''

''میں نے کتنی ہی بار محسوس کیا ہے ہری پرشاد کہ تم اچھے آدمی ہونے کے باوجود کبھی کبھی پٹڑی سے اتر جاتے ہو۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری صفورہ۔ کون کہتا ہے کہ میں اچھا آدمی ہوں۔ سوائے میرے۔'' ہری پرشاد ہنسا پھر بولا۔ ''میرا مطلب یہ ہے کہ برائی تو صرف تخلیق کر لی جاتی ہے۔ دو انسانی جسموں کا ملاپ برائی تو نہیں ہے۔ اگر یہ برائی ہوتا تو دنیا میں اس کا رواج ہی نہ ہوتا۔''

''فضول باتوں سے گریز کرو۔ اگر تم اس مقصد کے تحت یہاں آئے ہو تو ناکام رہو گے۔''

''نہیں صفورہ! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ یہ غار کسی کے علم میں نہیں ہے۔ کوئی ادھر نہیں آئے گا۔ اگر تم نے شرافت سے میری بات نہ مانی تو میں سر پر پتھر مار کر تمہیں زخمی کر دوں گا۔ اور اس کے بعد اپنا مقصد پورا کر لوں گا۔ مجھے تمہاری ہوش مندی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد تمہاری تقدیر ہے کہ اگر تم زندہ بچ گئیں۔ بلکہ نہیں، اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہیں زندہ چھوڑنا میرے لئے مشکل ہو گا۔''

''بس، چلو آؤ پھر کوشش کر لو۔'' صفورہ نے ہری پرشاد کو چیلنج کر دیا۔ ہری پرشاد کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ اس کے شیطانی ارادے اس کے چہرے پر ٹنگے ہوئے تھے۔ وہ وحشت کا شکار ہو گیا تھا اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ کر ہی بیٹھے گا۔ لیکن صفورہ کی فطرت میں بھی ایک درندگی بسی ہوئی تھی۔ وہ عام لڑکی نہیں تھی۔

زندگی میں اس نے جو کچھ بھی کیا تھا اپنی پسند اور اپنی مرضی سے کیا تھا۔ اور اس وقت اس کی وحشت بھی ابھر آئی تھی۔ ہری پرشاد سمجھتا تھا کہ وہ ایک تندرست و توانا نوجوان ہے۔ ایک معمولی سی لڑکی با آسانی اس کے قابو میں آ جائے گی۔ لیکن جب اس نے صفورہ پر جھپٹا مارا تو صفورہ اس کی زد سے بچنے کی بجائے اس کے بالکل سامنے آ گئی اور اس کے بعد اس کا الٹا ہاتھ ہری پرشاد کے منہ پر پڑا۔ یہ ناقابل یقین سی بات تھی۔ ہری پرشاد کے دونوں ہونٹ کٹ گئے اور اس کے منہ سے بھل بھل خون بہہ نکلا۔

خون دیکھ کر اس پر دیوانگی سوار ہو گئی اور اس بار اس نے صفورہ پر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ اپنی دانست میں وہ صفورہ کو رگیدنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن یہاں بھی اسے شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ صفورہ نے اس کی گردن میں قینچی ڈال لی تھی اور اس کے بعد ہری پرشاد کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ صفورہ نے اس طرح اسے جکڑ لیا تھا کہ اس کی گردن بری طرح دب گئی تھی۔ صفورہ کی گرفت کچھ ایسی خطرناک تھی کہ ہری پرشاد اس سے کسی بھی طرح چھٹکارہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل پڑی تھیں۔ غار میں چونکہ ماحول نیم تاریک تھا اس لئے صفورہ خود بھی یہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ ہری پرشاد کی موجودہ کیفیت کیا ہے۔

وہ اس وقت ہری پرشاد کو بدترین شکست سے دوچار کرنا چاہتی تھی لیکن صورتحال بالکل ہی مختلف ہو گئی۔ ہری پرشاد کے حلق سے دو تین بار آوازیں نکلیں۔ وہ اپنی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا۔ لیکن صفورہ نے کچھ ایسی گرفت ڈالی ہوئی تھی کہ ہری پرشاد کو آزادی نہ مل سکی اور کچھ دیر بعد ہری پرشاد کی جدوجہد ختم ہو گئی۔ اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ صفورہ جو پوری قوت سے اسے سنبھالے ہوئے تھی ہنس کر بولی۔

''کیوں ہری پرشاد، بس! اتنے ہی طاقتور مرد تھے تم...... خبردار اس کے بعد آئندہ کسی لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف دھمکیاں دینے اور مجبور کرنے کی کوشش کی۔ تم نے مجھے سمجھا کیا تھا۔''

پھر اس نے ہری پرشاد کو چھوڑ دیا اور ہری پرشاد دھڑام سے نیچے گر پڑا۔

صفورہ کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پھر اس نے زور سے آنکھیں بھینچ کے گردن جھٹکی اور جھک کر ہری پرشاد کو دیکھنے لگی۔ پہلے تو وہ یہی سمجھی کہ وہ مکر کر رہا ہے۔ پھر خیال بدلا اور سوچا کہ شاید بے ہوش ہو گیا ہے۔ پھر اس نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ

کر اسے جھنجھوڑا۔

''اٹھو...... اٹھ جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کروں گی۔ چلو اٹھ جاؤ۔''

لیکن ہری پرشاد نہ اٹھا۔ صفورہ نے جھک کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ہری پرشاد کا جسم سرد ہوتا جا رہا ہے۔ تب اس نے اس کی ناک کے سامنے ہاتھ رکھ کر اس کے تنفس کا جائزہ لیا اور تنفس نہ پا کر ایک دم خوفزدہ ہو گئی۔ ہری پرشاد مر چکا تھا۔

اس نے وحشت زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور دل میں سوچا کہ یہ کیا ہوا؟ اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ لڑکے لڑکیوں کو یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہری پرشاد کے ساتھ اس طرف آئی ہے۔ صفورہ خوف کی شدت سے گنگ رہ گئی تھی۔ لندن کے قانون میں اس کے لئے معافی نہیں تھی۔ ماں باپ کی مرضی کے خلاف وہ یہاں کی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گئی تھی لیکن دل کے اندر عزتِ نفس کا ایک تصور موجود تھا۔ چنانچہ وہ ان غلاظتوں میں نہیں ڈوبی تھی جن میں یورپ ڈوبا ہوا تھا۔ ہری پرشاد اس لئے اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن اب اس کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ بچنا مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔ اس نے سوچا اور پھر وحشت زدہ ہو کر واپسی کے لئے مڑی تو پیچھے سے ایک آواز آئی۔

''ٹھہرو......''

یہ آواز ہری پرشاد کی نہیں تھی۔ صفورہ کے بدن کا سارا لہو خشک ہو گیا۔ غار میں کوئی اور بھی ہے...... اور اگر کوئی ہے تو اس نے یقیناً صفورہ کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ صفورہ کی پلٹنے کی ہمت تک نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ قدموں کی چاپ سن رہی تھی اور اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پھر عقب سے ایک ہاتھ اس کی پشت پر آیا۔

''ڈرو نہیں...... میری طرف گھوم جاؤ۔'' آواز نے کہا لیکن صفورہ کی پھر بھی ہمت نہ ہوئی تو وہی آواز پھر بولی۔

''اچھا چلو...... باہر چلو...... باہر چل کر بات ہو گی...... چلو۔'' اس نے صفورہ کو پیچھے سے دھکیلا تو صفورہ کے قدم اٹھ گئے۔ اس کا پورا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔

''میری طرف دیکھو......'' آواز بھاری اور پاٹ دار تھی۔ وہ گھومی تو اس نے ایک

لمبے تڑنگے سادھو کو دیکھا جس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔ پوری پیشانی چندن سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، لمبی داڑھی اور لمبے لمبے بال۔ لیکن پورا چہرہ بے حد جاندار تھا۔ یہ شخص صفورہ کے لئے بالکل اجنبی تھا۔

''میرا نام ٹنڈن گوپال ہے۔ یہاں میرا ایک ادارہ ہے۔ میں لوگوں کو کالا جادو سکھاتا ہے۔ انگریزوں میں میرا کالا جادو بہت مقبول ہے اور میں نے جادو میں کمال حاصل کیا ہے۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لڑکی! یہاں پر غار میں مجھے تین دن کا چلّہ کرنا تھا۔ میں یہاں خاموشی سے ایک تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا چلّہ کشی کر رہا تھا کہ تم یہاں آ گئیں۔ بہت کم لوگ ادھر کا رخ کرتے ہیں چونکہ لندن کی فضا میں یہ غار بھوتوں کے غار کہلائے جاتے ہیں۔''

ٹنڈن گوپال ہنسا اور پھر بولا۔

''اور انگریزوں سے زیادہ توہم پرست اور کوئی قوم نہیں ہے۔ بہرحال لڑکی میرا چلّہ تو پورا ہو چکا تھا اور مجھے تھوڑے وقت کے بعد یہاں سے نکلنا تھا۔ لیکن تمہاری بہادری نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں خود بھی ایک بہادر آدمی ہوں اور دلیری کو پسند کرتا ہوں اور دلیری بھی ایک لڑکی کی۔ تم مجھے ایک عام لڑکی نہیں معلوم ہوتیں۔ یہاں میرے سینکڑوں شاگرد ہیں جو مجھ سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ میں اتنا ہی سکھاتا ہوں انہیں جتنا ان کے لئے اور میرے لئے دونوں کے لئے مناسب ہو۔ لیکن تم جیسی لڑکی میرے نزدیک عام لڑکی نہیں ہوتی۔ تم اگر چاہو تو میرا سہارا، میری پناہ حاصل کر سکتی ہو۔ دوسری صورت میں جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ بالکل سچ ہے۔ تم یہی سوچ رہی ہو نا کہ اب تمہارا بچنا مشکل ہے۔ لندن کا قانون تمہیں موت کی سزا دے گا اور بالکل ایسا ہی ہو گا۔ لندن کا قانون یہ نہیں دیکھے گا کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا کرنے کی کوشش کی تھی۔

بے وقوف لڑکی! یہاں یہ سب کچھ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہاں کسی کی زندگی لینے کا عمل معاف نہیں کیا جائے گا اور اس کا نتیجہ صرف موت ہے۔'' اس شخص نے یہ الفاظ اس انداز میں کہے تھے کہ صفورہ کو محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی گردن دبا رہا ہو۔ پھر وہ بولا۔

''پھانسی کا پھندہ، بجلی کی کرسی، زہریلا انجکشن۔''

''نہیں ..... میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے بچاؤ۔ خدا کے لئے بچاؤ..... خدا کے

لئے مجھے بچاؤ۔''

صفورہ وحشت آمیز لہجے میں چیخی۔ سامنے والے شخص کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

''بی بی، کیسی باتیں کرتی ہو۔ اس دور میں ہر شخص اپنے لئے، صرف اپنے لئے کام کرتا ہے۔ خدا کے لئے کون کسی کا کام کرتا ہے ..... بہرحال تمہیں اس مشکل سے بچانے والا ایک ہی شخص ہے۔ جانتی ہو کون؟''

صفورہ آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ بولا۔

''ٹنڈن گوپال ..... صرف ٹنڈن گوپال۔''

صفورہ نے پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولی۔

''آپ میرے رازدار بھی بن چکے ہیں۔ حالانکہ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن بس وہ مر گیا۔ آہ ..... میری مدد کیجئے ..... پلیز ..... پلیز .....''

''نہیں بے بی! اس دور میں پلیز کا لفظ صرف بے وقوف بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پلیز کہہ کر آسانی سے بے وقوف بنا لیا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک بے مقصد لفظ ہے۔ اس کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ دوسرے کو بے وقوف بنایا جا سکے۔ کیا سمجھیں؟''

''مم ..... مم ..... مگر مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' یہ بات تو آپ جانتے ہیں کہ میرے ہاتھوں یہ قتل صرف اس لئے ہوا ہے .....

''جانتا ہوں ..... جانتا ہوں ..... وہی چیز جسے تم عزت اور آبرو کہو گی۔ ایسی ہی بات ہے ناں۔ تمہارا مقصد صرف اتنا ہی ہو گا ناں کہ تم اپنی آبرو پر کوئی حرف برداشت نہیں کرو گی۔''

''ہاں، یہ سچ ہے۔ زندگی اسی وقت تک جینے کے قابل ہوتی ہے جب تک انسان اپنی نگاہ میں سرخرو رہے۔ ایک شخص میری انا کو ٹھیس پہنچانے کا باعث بنا ہے۔ اس نے مجھے ٹھکرا کر میرے اندر انتقام کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میری زندگی میں صرف ایک ہی داغ ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اپنے وجود پر ہزاروں داغ لگا لوں۔''

''بہت جذباتی باتیں کرتی ہو چلو ..... یہ اور اچھی بات ہے کہ تمہارے دل میں کسی کے لئے نفرت اور انتقام کا جذبہ ہے۔ اسے رفع کرنے کے لئے بھی مجھ جیسا ہی

کوئی شخص تمہیں درکار ہے یعنی ٹنڈن گوپال۔''

''آپ براہ کرم مجھے جلدی سے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا جس کے تحت آپ میری مدد کو آمادہ ہوسکیں؟'' صفورہ نے کہا۔

''سب سے پہلے تم مجھے گرو بناؤ گی۔ اپنا استاد..... اپنا اتالیق۔ کیا سمجھیں؟ ٹنڈن گوپال کی چیلی بنو گی تم۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں میں نے خود اپنا چیلا بننے کی پیشکش کی ہے۔ ورنہ لوگ تو میرے قدموں میں آ کر پڑ جاتے ہیں کہ گرو مہاراج دیا کیجئے ہم پر۔ ہمیں اپنے سائے میں لے لیجئے۔ لیکن بس تمہاری شخصیت مجھے بھا گئی ہے۔ تم ایک دلیر لڑکی ہو۔ ایسی دلیر لڑکیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ کیا سمجھیں؟''

''تو پھر آپ مجھے اپنی چیلی بنا لیجئے۔''

''خوب سوچ سمجھ کر بات کرو۔''

''ہاں..... میں سوچ سمجھ کر بات کر رہی ہوں۔ مگر میری زندگی تو بچ جائے گی ناں؟''

''ہاں..... کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔''

''تو پھر جلدی کیجئے گرو مہاراج!''

''ٹھیک ہے..... آنکھیں بند کر لو'' ٹنڈن گوپال نے کہا اور صفورہ نے ایک لمحے کے لئے اسے مشکوک انداز میں دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ٹنڈن گوپال آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

''خبردار، آنکھیں نہ کھولنا، جیسے میں کہوں ویسے ہی کرتی رہنا۔''

صفورہ نے گردن ہلا دی۔ پھر اس نے کہا۔

''زبان باہر نکالو..... تمہیں امرت رس چاٹنا ہے۔''

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''ہر چیز جان کر تم میری چیلی بنو گی؟ کام تمہارا ہے، نہ کہ میرا۔ دوسری بار اگر تم نے مجھ سے کوئی سوال کیا تو میں تم سے ایک ہی بات کہوں گا کہ بھاڑ میں جاؤ۔''

''نہیں، نہیں..... آپ ایسا نہ کریں۔ میں تیار ہوں۔'' صفورہ نے کہا اور اپنی لمبی سی زبان باہر نکال لی۔ تب سامنے کھڑے ہوئے ٹنڈن گوپال نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر تھوکا اور اسے صفورہ کی زبان سے لگا دیا۔ صفورہ کو ایک گھناؤنا احساس ہوا تھا۔ انتہائی بدبودار چیز اس کی زبان سے لگی تھی۔ لیکن ٹنڈن گوپال نے کہا۔

''بس زبان اندر کر لے..... خبردار..... امرت رس کا ایک قطرہ باہر نہ گرنے پائے۔''

صفورہ کی طبیعت ایک دم بگڑنے لگی تھی۔ اس کے سارے وجود میں بدبو پھیل گئی تھی۔ ٹنڈن گوپال اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ صفورہ نے اس نمکین اور بدبودار شے کو نجانے کس طرح حلق سے اتارا۔ اس کے منہ کا مزہ شدید خراب ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''یہ کیا تھا مہاراج؟''

''سوال نہیں..... سوال نہیں..... تم نے گرو دکھشنا دے دی ہے۔ اب یہیں رکو۔ میں تمہارا بندوبست کر کے آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور واپس پلٹ کر اس غار میں داخل ہو گیا جہاں ہری پرشاد کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

''ستیاناس ہو خدا کرے اس ہری پرشاد کا۔ کتا میرے ہی ہاتھوں مرنا تھا۔ مگر غلط بھی تو نہیں کیا میں نے۔ میں اسے اس حد تک تو نہیں جانے دے سکتی تھی نا۔ اب دیکھو نجانے کیا ہوتا ہے۔ وہاں سب لوگ ہم دونوں کی واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر میں وہاں اکیلی پہنچوں گی تو وہ مجھ سے سوال کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی کو مجھ پر شبہ بھی ہو جائے۔ خدایا، پھر میں کیا کروں گی؟ پھر تو میں گرفتار ہو جاؤں گی۔ مجھے جیل میں رکھا جائے گا اور اس کے بعد مجھ پر مقدمہ چلے گا اور سزائے موت..... وہ ایک بار پھر تھر تھر کانپ اٹھی۔ بری حالت ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ حلق تک کوئی چیز داخل کر لے۔ اس غلاظت کو باہر نکال دے جو اس کے اندر اتر گئی تھی۔ نجانے کمبخت نے کیا چٹا دیا تھا۔

پھر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور اس کی نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے دل کو جو دھکا لگا تھا وہ ناقابل برداشت تھا۔ اسے چکر سا آ گیا۔ اس کے سامنے ہری پرشاد غار کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ چکرائے ہوئے دماغ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی اور ڈولنے لگی۔ تبھی اسے ایک آواز سنائی دی۔

''نہیں..... میں ہری پرشاد نہیں، ٹنڈن گوپال ہوں۔ کالے جادو کا ماہر ٹنڈن گوپال۔'' آواز بھی ٹنڈن گوپال ہی کی تھی۔ وہ سکتے میں رہ گئی۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ میں کالا جادو جانتا ہوں۔ میں ہری پرشاد کے شریر میں داخل ہو گیا ہوں اور اب میں ہری پرشاد کی حیثیت سے تمہارے ساتھ چلوں

گا۔ تم ان لوگوں کے پاس جاؤ گی۔ یہاں سے وہ واپسی کا سفر طے کریں گے۔ تم اپنے گھر چلی جانا، میں ہری پرشاد کی حیثیت سے اپنی جگہ چلا جاؤں گا اور اس کے بعد ہری پرشاد جائے بھاڑ میں۔ وہ کہاں گیا، کیسے گیا یہ کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن تمہاری گردن آزاد ہو جائے گی۔ تمہیں کوئی الزام نہیں دے سکے گا۔''

صفورہ حیرت اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بدن ہری پرشاد کا ہی تھا اور اس کے اندر ٹنڈن گوپال تھا۔ ٹنڈن گوپال نے کہا۔

''اب دیر مت کرو...... بہت دیر ہو گئی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ایک دوستانہ رویہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ اپنے چہرے سے خوف کی علامت بالکل ہٹا لو۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کس کی مجال ہے جو ٹنڈن گوپال کی موجودگی میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکے۔ اور اب تو تم امرت رس چاٹ چکی ہو۔ اور سو فیصدی ٹنڈن گوپال کی ساتھی ہو۔''

صفورہ کو ایک بار پھر اس غلیظ شے کا خیال آ گیا لیکن وہ بالکل نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ غلیظ شے کیا تھی۔ لیکن بہرحال اس کی طبیعت اب بھی اندر سے متلائی متلائی ہو رہی تھی۔ پھر وہ ہری پرشاد یعنی ٹنڈن گوپال کے ساتھ واپس چل پڑی۔ لندن شہر میں رنگ رلیاں منانے والے مستیوں کی گود سے نکل آئے تھے۔ بے خود اور سرشار تھے۔ اسے بھی ایسی ہی نگاہوں سے دیکھا گیا جن میں شریر بے باکی چھپی ہوئی تھی۔ کچھ جملے بھی کسے گئے لیکن صفورہ نے برداشت کیا۔

آخر کار واپسی کا سفر طے ہوا۔ ٹنڈن گوپال ہری پرشاد کی حیثیت سے چلا گیا۔ صفورہ اپنے گھر واپس آ گئی۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ باقاعدہ بیمار پڑ گئی۔ اس حادثے کے احساس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اور پھر ٹنڈن گوپال نے اسے جو امرت رس چٹایا تھا اس نے بھی اس کے وجود میں ایک عجیب سی بے کلی پیدا کر دی تھی۔ تین چار دن گزر گئے۔ ان دوستوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ماں باپ یہی سمجھے کہ سیر و سیاحت میں کچھ زیادہ مشقت اٹھا ڈالی ہے۔ کچھ زیادہ تھک گئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی سرسری ہی سی توجہ دی۔

اس طرح کئی دن گزر گئے۔ ہری پرشاد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی کہ اس کی گمشدگی کا کوئی چرچا ہوا کہ نہیں۔ لیکن پانچویں دن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فون کسی اور نے ہی اٹھایا تھا۔ نرم زنانہ لہجہ سنائی دیا۔

''میں صفورہ طاہر سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھ سے ان کی بات کروا سکتی ہیں؟'' فون ریسیو کرنے والی ایک ملازمہ تھی۔ اس نے صفورہ کو آ کر بتایا۔

''کوئی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

صفورہ فون پر آ گئی اور اس نے کہا۔ ''ہیلو......''

جواب میں ٹنڈن گوپال کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو...... گرو بول رہا ہوں۔ ٹنڈن گوپال۔''

نجانے کیوں صفورہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ہیلو...... گرو مہاراج...... میں صفورہ بول رہی ہوں۔''

''خوشی ہوئی۔ پتہ بتا رہا ہوں تمہیں...... جو پتہ بتا رہا ہوں وہاں پہنچ جاؤ۔ یہ میرا آشرم ہے جہاں میں لوگوں کو کالا جادو سکھاتا ہوں۔ طریقہ بتاتا ہوں تمہیں، اس طریقے سے تمہیں آشرم میں آنا ہے۔''

صفورہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

''پتہ بتایئے گرو جی......''

اور ٹنڈن گوپال اسے پتہ بتانے لگا۔

سروے کا کام بدستور جاری تھا۔ خوف کی کوئی بات نہیں تھی۔ کام تو بہرحال ہو ہی رہا تھا۔ اگر یہ لوگ اس چکر میں نہ پڑتے اور ادھر جو ہو رہا تھا وہ ہونے دیتے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ یہی بات مزدوروں کے درمیان واپس آنے کے بعد کامران نے کہی۔ وہ بولا۔

''ویسے ہارون صاحب! ہم نے خود ہی ان معاملات میں زیادہ گھسنے کی کوشش کی اور الجھنوں میں پھنستے گئے۔ تمام پرانے بزرگ یہی کہتے آئے ہیں کہ ویرانے میں ایک الگ دنیا آباد ہوتی ہے اور یہاں کی کہانیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے دور رکھا جائے۔

دفعتہً ہارون کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ ایک دم بولا۔

''ٹھیک کہتے ہو کامران! اب اور اس سے زیادہ کیا چھان بین کی جائے؟ اس بات میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں رہا ہے کہ یہ سب آسیبی چکر۔ وہ مجھے اتنے فاصلے پر نظر آئی اور میں تجسس میں دوڑا چلا گیا۔ پھر اس کے بعد دوسرے واقعات ہوئے۔ میرے گھر تک میرا پیچھا کیا گیا۔ اور وہ لڑکی مجھے راستے میں ملی تھی۔ مجھے سسکتی ہوئی ملی اور باولِ نخواستہ میں نے صرف ایک انسانی زندگی بچانے کے لئے اپنے آپ کو اس کا شوہر بھی کہہ دیا۔ بس میں اسی لئے اسے یہاں تک لایا تھا کہ اس کی جان بچ جائے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں دن کی روشنی میں اس سے سوالات کروں گا۔ اس وقت تو ظاہر ہے مجھ پر بھی بدحواسی ہی طاری تھی۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ کیا مسئلہ ہے۔ مگر وہ غائب ہو گئی اور اس کے بعد حیرت کی بات یہ دیکھو کہ ہمیں یہاں اس کی موجودگی کے نشانات بھی ملے۔ جبکہ وہاں سے وہ گھر تک غائب تھا۔''

''باپ رے باپ..... یہاں سے تو سروے کرنے کے بعد بھاگ نکلنا چاہئے۔

مزدوروں کو اس کی بھنک نہ ملنے دیجئے گا۔ ورنہ کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائیں گے۔ زندہ انسانوں سے تو لڑنا سیکھ لیا گیا ہے لیکن اب ان آسیبی قوتوں سے کون لڑ سکتا ہے؟''

''بالکل ٹھیک..... ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ وہ جب میرے ساتھ آ رہی تھی تو میں اس مزار کی طرف سے گزرنے لگا مگر وہ ادھر نہیں آئی۔'' ہارون نے کہا اور کامران چونک پڑا۔

''کیا واقعی.....؟''

''ہاں..... میں واقعات کو سنسنی خیز بنا کر پیش نہیں کر رہا۔ میں خود ان واقعات سے الجھا ہوا ہوں۔ صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ میرے لئے آگے چل کر مصیبت نہ بن جائیں۔''

''مگر سر! اس سے تو ہمیں بڑی ڈھارس ملتی ہے۔''

''ڈھارس.....؟'' ہارون نے سوالیہ نگاہوں سے کامران کو دیکھا۔

''جی سر! یہ تو خیر طے شدہ بات ہے کہ یہ مزار شریف کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا ہے۔ ہم اس کے بہت سے شواہد دیکھ چکے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اس کا احترام بھی کیا ہے۔ مزدوروں کو بھی اس سے بڑی عقیدت ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے ہماری ساری بلائیں ان بزرگ کی کرامت سے دور ہو سکتی ہیں۔ ہم ان کا نام نہیں جانتے لیکن ہمیں ان کی یہاں موجودگی پر بڑا اطمینان ہے۔''

''بالکل ٹھیک.....'' ہارون نے جواب دیا۔

بہرحال یہ بات طے ہو چکی تھی کہ یہ سب کسی روح کا چکر ہے۔

کام جاری تھا۔ بڑی سنسنی خیز کیفیت پیدا ہو گئی تھی لیکن صرف دو افراد کے لئے۔ مزدور تو اپنے کام میں مگن تھے۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے اوور سیر کی نگرانی میں کام جاری رکھے ہوئے تھے اور مزار سے ان کی عقیدت بھی بے پناہ تھی۔ کام ختم کرنے کے بعد سب نہاتے دھوتے، پھر اجتماعی طور پر فاتحہ خوانی کی جاتی۔ اس کے بعد کھانا پینا۔ رات کو محفل جم جاتی اور وہ گاتے بجاتے رہتے۔ اس طرح وہ مگن تھے۔

رات کے کھانے کے بعد اچانک ہی کامران نے کہا۔

''وہ پازیبیں کہاں ہیں؟''

''میں نے رکھی ہوئی ہیں۔''

''دیکھنا چاہتا ہوں۔''

"آؤ۔۔۔" ہارون نے کہا اور کامران کو لے کر اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔
پازیبیں اس نے بڑی احتیاط سے اپنے بکس میں رکھی ہوئی تھیں۔ بکس کھول کر اس نے پازیبیں نکالیں اور کامران حیرت اور دلچسپی سے ان کی خوبصورت بناوٹ دیکھنے لگا۔ اس نے انہیں آہستہ سے بجایا تو چھن۔۔۔ چھن کی مدھر آواز فضا میں گونج اٹھی۔

"بند کرو یار۔۔۔ یہ آواز میرے اعصاب کشیدہ کرتی ہے۔"

"بہت خوبصورت آواز ہے۔ آپ پازیبوں کی ان خوبصورت بناوٹ کو دیکھ رہے ہیں؟" کامران نے کہا۔

"ہاں، کیوں۔۔۔؟"

"زیادہ معلومات تو نہیں رکھتا اس بارے میں لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ دور میں اس طرح کے زیور نہیں بنتے۔ خالص چاندی کی ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بالکل میلی نہیں ہوئی ہیں۔ جبکہ چاندی اگر رکھی رہ جائے تو کالی ہو جاتی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ کتنی پرانی ہو سکتی ہیں یہ؟"

"خیر میں اب کوئی ماہر آثار قدیمہ تو ہوں نہیں کہ زیورات دیکھ کر ان کی عمر کا اندازہ لگا سکوں۔ لیکن چیف بات ہے بڑی انوکھی اور دلچسپ۔ قصے کہانیوں میں تو اس طرح کی باتیں پڑھ لی جاتی ہیں لیکن حقیقی زندگی میں اگر کسی ایسے واقعے سے سامنا کرنا پڑ جائے تو نانی ہی یاد آ جاتی ہے۔"

"تمہیں تو شاید اپنے خاندان کی ساری بوڑھیاں ہی یاد آ گئی تھیں۔ پہلے تو بڑے متجسس تھے کہ مجھے بھی اس حسینہ کو دکھا دو اور اب ایسی ہوا کھسکی ہے۔"

"بالکل صحیح کہہ رہے ہیں چیف! حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتی۔ واقعی میری ہوا تو واقعی کھسک گئی ہے۔ بڑے خوفزدہ کر دینے والے واقعات ہیں۔ ویسے چیف یہاں کتنا عرصہ لگ جائے گا؟"

"اصل میں یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اس میں اس پروجیکٹ کا سروے کرنے کے بعد ان کھنڈرات تک کے راستوں کو دیکھنا ہے۔ کیونکہ پروجیکٹ کی وسعتیں وہاں تک پھیل جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میری رپورٹ کے بعد فوری طور پر یہاں کھنڈرات کی صفائی کا کام بھی شروع ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام بھی میری ہی نگرانی میں دے دیا جائے۔ ویسے ایک بات بتاؤں کامران! ضرورت سے زیادہ مستعدی اور وفا شعاری بھی بعض اوقات نقصان دیتی

ہے۔ اب تمام مشکل کام میرے سپرد کیے جاتے ہیں۔"

"اعتماد بھی تو کیا جاتا ہے چیف! کتنے ایسے آدمی ہیں جنہیں آپ کی طرح عزت دی گئی ہے؟" کامران نے کہا پھر بولا۔

"اب ان پازیبوں کا کیا کریں گے؟"

"نہیں۔۔۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں کریں گے۔ ویسے میں انہیں گھر بھی نہیں لے جانا چاہتا کیونکہ اس ایک پازیب کا قصہ تو میں بتا چکا ہوں۔"

"چیف! یہ بات آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس طرح کی چیزیں گھر پر نہیں رکھی جانی چاہئیں۔"

کامران اور ہارون بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر کامران نے اجازت طلب کر لی تھی۔ کیونکہ خاصی رات ہو گئی تھی۔ کامران تو اپنے خیمے میں چلا گیا اور ہارون خیمے سے باہر آ کر خاموشی سے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ مزدور بھی کچھ سو رہے تھے کچھ جاگ رہے تھے۔ ابھی ہارون پتھر پر بیٹھا ہی تھا کہ موبائل فون پر اشارہ موصول ہوا۔ اس نے جلدی سے اسے جیب سے نکال لیا۔ سی ایل آئی پر نمبر دیکھا تو افشاں کا فون نمبر تھا۔ اس نے جلدی سے ریسیور کان سے لگا لیا۔

"میں افشاں بول رہی ہوں۔۔۔ ہارون صاحب ہیں؟"

"نہیں ہوں گے تو کہاں جائیں گے؟"

"کہاں غائب ہیں جناب! فون تک نہیں کیا۔"

"میں نے سوچا جدائی کی لذت سے لطف اندوز ہوا جائے۔"

"اچھا، تو آپ لطف اندوز ہو رہے تھے؟"

"ہاں، یاد کر رہا تھا تمہیں اور اشعر کو۔"

"ویسے تو مجھے آپ پر اعتماد ہے لیکن سنا یہی ہے کہ مرد جب بہت زیادہ محبت کا اظہار کرنے لگے تو سمجھ لو کہ اس کے پس منظر میں کچھ ہے۔ یعنی دال میں کالا ہے۔" افشاں نے کہا اور ہنس پڑی۔

"یہاں تو دال بھی نہیں ہے جس میں کالا ہو۔"

"کہانی تو بڑی اچھی سنا لیا کرتے ہیں آپ۔ میرے ذہن میں وہ پازیب چھنچھنا رہی ہے۔"

"پازیب۔۔۔؟" کامران چونک پڑا۔

''جی ہاں ..... وہ اکلوتی پازیب۔

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

''جناب اصلی بات بتا دیجئے، وہ پازیب کس کی تھی؟''

ہارون ہنس پڑا پھر بولا۔ ''ایسا کرتا ہوں پازیب والی کو تمہارے پاس بھیجے دیتا ہوں۔ وہ خود آ کر تمہیں اس پازیب کے بارے میں بتا دے گی۔ اور ہو سکتا ہے وہ اس کے ساتھ آئے جو اس اکلوتی پازیب کو کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر نکال لے گیا تھا۔ اور رشیدہ بیگم ہو..... ہو کرتی رہ گئی تھیں۔''

''ارے باپ رے..... رشیدہ کی تو اب بھی حالت خراب رہتی ہے۔ میرے کمرے میں سونا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ میں بڑی ڈسٹرب ہوتی ہوں۔ مگر وہ کہتی ہے کہ نہیں جاؤں گی بیگم جی۔ اور اگر آپ نے مجھے اپنے کمرے سے نکال دیا تو خدا قسم گھر بھاگ جاؤں گی۔''

''سونے دو..... سونے دو..... بڑے کام کی عورت ہے۔ جتنا اعتبار میں اس پر کرتا ہوں کسی اور پر نہیں رکھتا۔ خیر..... حضرت کیسے ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے..... بس ان کی بقراطیت سے خوف آتا ہے کبھی کبھی۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرتا ہے کہ میں کانپ کر رہ جاتی ہوں۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔''

''آمین۔''

''اور..... کام جاری ہے؟''

''ہاں.....''

''یار کبھی کبھی تمہارے اس کام سے مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ دنیا کے مرد صبح کو آفس جاتے ہیں شام کو گھر واپس آ جاتے ہیں اور پھر ان کا بقیہ وقت ان کے بیوی بچوں کا ہوتا ہے۔'' افشاں نے کہا۔

''افشاں! میری زندگی سے تم واقف ہو۔ آج کی بات نہیں کر رہا۔ ہمیشہ اپنی اوقات سے بڑھ کر سوچا ہے۔ یقین کرو جب بچہ تھا اسی وقت سے حمایت علی مرحوم نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ گھر میں اتنے سارے لوگ تھے، سب کے ساتھ اٹھا بیٹھ ہوتی رہتی تھی۔ لیکن مجھے وہ عزت، وہ احترام دیا جاتا تھا کہ میں اپنے آپ کو کوئی بہت ہی سپر چیز سمجھنے لگا تھا۔ بس وہیں سے دماغ خراب ہو گیا اور میں اپنی حقیقت کی

تلاش میں نکل پڑا اور آج تک اسی تلاش میں ہوں۔''

''کیا چاہتے ہیں جناب؟''

''افشاں! میں ایک بہت ہی خوبصورت اور اعلیٰ درجے کی زندگی چاہتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میرے پاس ایک عالیشان گھر ہو۔ نوکر چاکر ہوں، گاڑی ہو، ڈرائیور ہو۔ میرے بیٹے کے بارے میں لوگ یہ کہیں کہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا۔ یہ آرزو میرے دل میں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آرزو کی تکمیل کبھی ہو گی یا نہیں۔ جس طرح میرا ماضی تاریکی میں رہا ہے نجانے اس ماضی کے بارے میں، میں کیا کیا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ یہ خواب میرے تحت الشعور میں موجود ہیں لیکن ان میں سے کون سا خواب سچا ہے میں یہ نہیں جانتا۔''

''ایک بار پہلے بھی آپ نے اپنے ان خوابوں کا تذکرہ کیا تھا لیکن آپ نے کبھی مجھے اپنے خواب سنائے نہیں۔''

''یقین کرو..... مجھے ان میں سے ایک خواب بھی یاد نہیں رہتا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میرے اندر ایک لہر سی اٹھتی ہو۔ وہ خواب میرے ذہن میں جاگتے ہیں۔ وہ خواب مجھے بہت برتری کا احساس دلاتے ہیں اور اس کے بعد ایک دھوئیں کی شکل میں سمٹ کر پھر تحت الشعور کے سوراخ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں بڑی الجھن اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ وہ خواب مجسم ہو کر میرے سامنے آ جائیں یا کم از کم مجھے اس حد تک یاد آ جائیں کہ میں انہیں ایک شکل دے سکوں بس نہ جانے کیوں مجھے یاد نہیں آتے۔ ان کی شکلیں بدلی ہوئی ہوتی ہیں۔''

''خدا آپ کی یہ الجھن دور کرے۔ بہت بار میں نے آپ کو یوں الجھے ہوئے دیکھا ہے۔ ان دنوں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے؟''

''نہیں، ان دنوں تو میں بس تمہارے خواب دیکھ رہا ہوں۔''

''ہائے، خواب دیکھنے والے قریب کیوں نہیں آ جاتے؟'' افشاں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''دیکھو یہ لہجہ مت اختیار کرو۔ رات زیادہ ہو چکی ہے۔ بڑا لمبا سفر ہے۔ صبح تک ہی پہنچوں گا لیکن پہنچ جاؤں گا۔''

''ارے نہیں..... نہیں بھئی..... سوری..... سوری۔ میں یہ نہیں چاہوں گی کہ آپ اس تنہا رات میں سفر کریں۔ لیکن پھر بھی دو چار دن کے بعد چکر تو لگا لیجئے گا۔''

''ہاں کیوں نہیں...... بس ذرا کام پر قابو پالوں۔ اچھا سوتے ہیں۔''

''خدا حافظ۔'' افشاں نے کہا اور ہارون نے موبائل بند کر دیا۔ بہت دور تک خلاؤں میں نگاہیں دوڑاتا رہا۔ پھر اس کا دل بے اختیار چاہا کہ ان ڈھلانوں میں جھانک لے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ اول تو وہ جس جگہ اس وقت بیٹھا ہوا تھا اس جگہ سے ڈھلانوں کا فاصلہ زیادہ تھا۔ پھر وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ روشنی اسے نظر آ گئی یا کوئی اور کھیل ہو گیا تو خواہ مخواہ رات کی نیند بھی جائے گی اور کہیں واقعی یہ ساری ہنگامہ آرائی کبھی اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ چنانچہ وہ اپنے خیمے کی جانب چل پڑا۔ تنہا خیمہ، بستر۔ تیاریاں کر کے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن افشاں سے ہونے والی باتیں دماغ میں چکرا رہی تھیں۔

❁

صفورہ پر ایک بے اختیاری سی طاری تھی۔ ٹنڈن گوپال نے جو پتہ بتایا تھا وہ اس نے ذہن نشین کر لیا تھا اور اس وقت اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جو حکم اسے دیا گیا ہے اس کی تعمیل اس پر فرض ہے۔ چنانچہ اس نے تیاریاں کیں۔ گھر میں کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی ایک آزاد گھرانے کی فرد تھی چنانچہ وہ گاڑی لے کر چل پڑی اور مختلف راستے طے کرتی ہوئی ایک طویل فاصلہ عبور کر کے آخر کار اس علاقے میں پہنچ گئی جہاں کارخانے اور فیکٹریاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی کرینیں، ہیوی ٹرک اور دوسری چیزیں آ جا رہی تھیں۔ وہ اس شفاف سڑک پر آگے بڑھتی رہی اور آخر کار اسے وہ جگہ نظر آ گئی۔ ایک سڑک دور تک اترتی چلی گئی تھی اور اس کا اختتام ایک وسیع و عریض فارم ہاؤس جیسی جگہ پر ہوا تھا۔

فارم ہاؤس کا عظیم الشان احاطہ خوبصورت درختوں سے سجا ہوا تھا۔ ایک قطار میں ایک دوسرے سے سر جوڑے ہوئے یکساں بلندیوں والے درخت جو اس قدر شاداب تھے کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انہی درختوں نے اس پورے احاطے کو گھیرا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ جب اس کی گاڑی اس دروازے پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بے شمار گاڑیاں دیوار سے منہ لگائے کھڑی ہوئی ہیں۔ درمیان میں ایک گول دروازہ تھا اور اس دروازے پر دو ننگ دھڑنگ سادھو نما لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ انگریز تھے۔ سفید چمڑی والے۔ لیکن وہ گیروا لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے گلے میں مالائیں پڑی ہوئی

تھیں۔ ان میں سے ایک نے اسے دیکھا اور بولا۔

''ہاں کہو بی بی جی، کیا بات ہے؟'' وہ بڑی صاف اُردو بول رہا تھا۔

''ٹنڈن گوپال جی نے مجھے طلب کیا ہے۔''

''کیا تمہارا نام صفورہ ہے؟''

''ہاں...... صفورہ طاہر۔''

''جاؤ، اندر جاؤ۔ پہلی بار آئی ہو؟''

''ہاں......''

''آگے جاؤ گی تو تمہیں تین راستے ملیں گے۔ سیدھا راستہ دھرم شالہ تک جاتا ہے۔ داہنی طرف کا راستہ کرم بھوگ اور بائیں طرف کا راستہ گرو جی کی طرف جاتا ہے۔ اگر انہوں نے تمہیں بلایا ہے تو تمہیں آگے جا کر بائیں طرف والا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے......'' صفورہ نے کہا۔

اندر پہنچی تو اسے ایک عظیم الشان جگہ نظر آئی۔ پھولوں کے کنج اتنے حسین کہ انسان دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔ ہر طرف ایک انتہائی خوبصورت منظر نظر آ رہا تھا۔ صفورہ کے قدم خودبخود آگے بڑھتے رہے۔ سرخ بجری پر چلتے ہوئے وہ اس عظیم الشان عمارت کے دروازے پر پہنچ گئی جو بہت بڑے احاطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ نجانے کیوں اسے یہ اعتماد تھا کہ اس کا ہر قدم صحیح اٹھ رہا ہے۔ آگے ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ وہ اس ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ یہاں بہت سے لوگ سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے

وہ سب بڑی عقیدت سے سامنے ایک مسند پر بیٹھے ہوئے ٹنڈن گوپال کی باتیں سن رہے تھے۔ ایک پجاری نے فوراً ہی آگے بڑھ کر کہا۔

''بیٹھ جائیے دیوی جی...... بیٹھ جائیے......'' اور وہ بادل ناخواستہ ان لوگوں کے درمیان بیٹھ گئی جو ٹنڈن گوپال کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے چند افراد کے چہرے اس نے غور سے دیکھے۔ وہاں لندن میں مختلف علاقوں اور مختلف جگہوں کے لوگ نظر آ جاتے تھے اور اب ان کی اچھی خاصی شناخت ہو گئی تھی۔ تیکھے نقوش والا وہ شخص جو صفورہ کے برابر بیٹھا ہوا تھا یقینی طور پر فرانسیسی تھا۔ سامنے ایک اور شخص نظر آ رہا تھا جو جرمن تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان سب کے

سر گھٹے ہوئے تھے اور سروں کے بیچ میں ایک چوٹی ابھری ہوئی تھی۔ مردوں کے سر گھٹے ہوئے تھے۔ عورتیں البتہ عام لباس میں ہی تھیں۔ لیکن سب کی سب اس طرح گردن جھکائے بیٹھی تھیں جیسے انہیں ٹنڈن گوپال سے بڑی عقیدت ہو اور ٹنڈن گوپال کہہ رہا تھا۔

''سجنو اور سجنیو! بھگوان نے اس سنسار پر جو تصویریں اتاری ہیں ان سب کے رنگ نئے نئے ہیں۔ تم لوگوں نے اپنے طور پر اپنے آپ کو بدل لیا ہے ورنہ بھگوان نے تو سب کو ایک ہی روپ دیا ہے اور وہی روپ امر ہے۔ تم اپنے آپ کو چاہے کتنا ہی بدل لو لیکن رہو گے وہی کے وہی۔ سنسار میں دو طاقتیں ہیں اور سنسار باسی ان طاقتوں کو نام دے چکے ہیں۔ سب سے بڑی چیز ہے شکتی۔ تم بھگوان کی دی ہوئی شکتی کو مانتے ہو۔ بھگوان ہی نے شکتی دے کر ایک ایسا وجود سنسار میں بھیج دیا ہے جسے بدی کا روپ کہا جاتا ہے۔ یعنی شیطان۔ پر میری ایک بات سنو، تخلیق تو وہ بھی بھگوان ہی کی ہے۔ بھگوان نے اپنے نیک ساتھیوں کو تو کوئی طاقت، کوئی قوت نہیں دی لیکن اس نے اس مہان تخلیق کو بڑی مہانتا دی۔ اب یہ اپنا فیصلہ ہوتا ہے کہ تم کون سی مہانتا قبول کرتے ہو۔

میں تمہیں موقع دیتا ہوں کہ سوچو اور اگلے بدھ کو مجھے آ کر بتاؤ کہ تم نے کیا فیصلہ کیا۔ اب تم اٹھ سکتے ہو۔''

سب کے سب اٹھے اور اتنی تعداد ہونے کے باوجود اس خاموشی سے باہر نکل گئے کہ کوئی آواز نہ ہوئی۔ تب صفورہ آگے بڑھی اور ٹنڈن گوپال کے پاس پہنچ گئی۔

''میں آ گئی ہوں گرو جی...... میں آ گئی ہوں۔''

ٹنڈن گوپال نے اسے نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس راستے سے سیدھی چلی جاؤ دیوی۔ میں ٹنڈن گوپال نہیں ہوں۔''

''کیا...... ؟'' صفورہ اچھل پڑی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا۔ سارے کا سارا ٹنڈن گوپال جیسا۔ مگر آواز ٹنڈن گوپال کی نہیں تھی۔ اس آواز کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی۔

''مم...... مم...... مگر کیا آپ گرو مہاراج کے جڑواں بھائی ہیں؟''

''راستہ وہ ہے...... ابھی تمہیں سوال کرنے کا حق نہیں ملا ہے۔ جاؤ۔'' اس نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ صفورہ حیرت سے کھڑی دیکھتی رہی پھر اس نے یہی

مناسب سمجھا کہ آگے بڑھ جائے۔ اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔ ایک چوڑی راہداری تھی جس کا اختتام اس جیسے ہال پر ہوا تھا جہاں سے وہ نکلی تھی۔ لیکن یہاں بھی اس نے بیس پچیس افراد کو دیکھا جو مختلف آسن جمائے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی الٹا کھڑا ہوا تھا اور کوئی گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا تھا۔ کسی کا انداز کچھ تھا تو کسی کا کچھ۔ اور سامنے ہی ٹنڈن گوپال ایک بڑی کرسی پر بیٹھا ان کی نگرانی کر رہا تھا۔

صفورہ آگے بڑھ گئی اور پھر وہ ٹنڈن گوپال کے پاس پہنچ گئی۔

''میں آ گئی ہوں ٹنڈن گوپال مہاراج۔''

ٹنڈن گوپال نے اسے نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور پھر بائیں طرف اشارہ کر کے بولا۔

''میں ٹنڈن گوپال نہیں ہوں...... تم ادھر چلی جاؤ۔''

صفورہ ایک عجیب سی پریشانی کا شکار ہو گئی تھی۔ اتنے سارے ٹنڈن گوپال کہاں سے آ گئے۔ وہ حیرانی سے ادھر دیکھنے لگی پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

''مم...... مم...... میں کیا آگے...... آگے......''

''جاؤ...... مجھے میرا کام کرنے دو۔ میں ان لوگوں کو کالے جادو کا درس دے رہا ہوں۔ یہ وہ ہیں جو اپنی تیسری پینی میں ہیں۔ اور اس کے بعد یہ اپنا اپنا سفر ناپیں گے۔ تم جاؤ۔''

وہ وہاں سے بھی آگے بڑھ گئی۔ آخر کار وہ ایک ایسے ہال میں پہنچی جہاں ایک انتہائی خوفناک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہ اس بھیانک مجسمے کو دیکھ کر لرز سی گئی۔ بھیانک مجسمہ کوئی بیس فٹ اونچا تھا اور اس میں جگہ جگہ سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بے حد خوفناک تھیں۔ ٹنڈن گوپال اس کے سامنے خاموش ہاتھ جوڑے بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں بھی ایک پجاری نے آ کر کہا۔

''بیٹھ جائیے دیوی جی! مہاراج تپسیا کر رہے ہیں۔''

''کیا یہ مہاراج ٹنڈن گوپال ہیں، اصلی والے؟'' صفورہ نے بچوں جیسے انداز میں پوچھا اور اس شخص نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اشارہ کر کے بولا۔

''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔''

اور صفورہ بیٹھ گئی۔ وہ ٹنڈن گوپال کو دیکھ رہی تھی جس کے سامنے ایک بڑا سا

برتن رکھا ہوا تھا۔ اس برتن میں کوئی سرخ سرخ چیز موجود تھی۔ ایک ایک بوند اس برتن میں بلندی سے ٹپک رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیا تھا۔ صفورہ نے اوپر نگاہیں اٹھائیں تو اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ لمبی چوڑی جسامت کا ایک سیاہ فام تھا۔ جس کی گردن پچھلی کھال تک کٹی ہوئی تھی اور خون کے قطرے وہیں سے بہہ رہے تھے۔ صفورہ کے پورے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے یوں لگا جیسے اس کے اعصاب ختم ہو گئے ہوں اور اب وہ اٹھ بھی نہ سکتی ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اس اوپر ٹنگی ہوئی لاش کو دیکھتی، کبھی برتن میں ٹپکتے ہوئے خون کو۔

آخر کار ٹنڈن گوپال کا کام ختم ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر جھک کر ڈنڈوت کی، پھر صفورہ کی طرف مڑا۔

''آ گئیں دیوی..... اچھے سے پر آئیں۔ آؤ تمہیں پرشاد دی جائے۔ آؤ، میرے پاس آؤ۔''

صفورہ جو پہلے اٹھنے کی کوشش کر چکی تھی، پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور اس بار اسے کامیابی ہو گئی۔ لیکن اس کے قدم پیچھے جانے کی بجائے آگے بڑھے اور وہ ٹنڈن گوپال کے پاس پہنچ گئی۔

''ہاتھ پھیلاؤ۔'' ٹنڈن گوپال نے کہا اور صفورہ نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا دیا۔

''نہیں..... یہ سچائیوں کا، نیکیوں کا ہاتھ ہے۔ اپنا دوسرا ہاتھ پھیلاؤ، جسے الٹا ہاتھ کہتے ہیں۔ ہر کام الٹا، ہر چیز الٹی۔'' ٹنڈن گوپال بھیانک انداز میں ہنسا۔ صفورہ نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو ٹنڈن گوپال نے پانچوں انگلیاں سامنے والے برتن میں ڈبو دیں اور پھر ان میں سے گاڑھا گاڑھا خون نکال کر صفورہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''جانتی ہو کیا ہے یہ؟''

''خ..... خ..... خون ہے..... خون.....'' صفورہ نے خوف کے عالم میں کہا۔

''نہیں پگلی..... یہ امرت جوتی ہے۔ سمجھ رہی ہے نا تو، امرت جوتی۔ چل سیدھے ہاتھ کی انگلی سے اسے آہستہ آہستہ چاٹ لے۔''

''چ..... چچ..... چاٹ لوں؟'' صفورہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تو ٹنڈن گوپال نے گھور کر اسے دیکھا۔

''کیوں آئی ہے یہاں؟''

''آپ نے بلایا تھا گرو جی..... آپ نے بلایا تھا۔''

''میں نے کیا بتایا تھا اس دن تجھے جس دن تو مجھے وہاں غاروں میں ملی تھی۔''

''آپ نے..... آپ نے..... آپ نے اپنے اس آشرم کے بارے میں بتایا تھا جہاں آپ کالا جادو سکھاتے ہیں۔''

''دیکھ لڑکی مجھے بہت زیادہ سیدھی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ نہ ہی ایسی بے وقوف لڑکیاں جو میرے حکم کو نہ مانیں۔ میں تجھے ایک بات بتاؤں، گیارہ سو چیلے بنانے ہیں مجھے..... گیارہ سو..... اور جب میرے گیارہ سو چیلے پورے ہو جائیں گے اور شیطان مہاراج کو اپنے یہ گیارہ سو چیلے دے دوں گا تو پھر مجھے وہ امر شکتی مل جائے گی جس کے لئے میں نجانے کب سے کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے تیرے اوپر ایک احسان کیا ہے۔ بندہ مار دیا تھا تو نے ایک، کیا سمجھی۔ ہری پرشاد آج بھی اپنے گھر سے غائب ہے اور اس کے گھر والوں نے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی ہے۔ کام کیا ہے میں نے تیرے لئے۔ اسی لئے تیرے اوپر شبہ نہیں گیا کسی کا۔ ہری پرشاد کی حیثیت سے میں اس کے گھر تک پہنچا۔ اس کے کمرے میں سونے کے لئے لیٹا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بات تجھ تک ہی پہنچ سکتی تھی۔ اس کی لاش آج بھی وہیں غار میں پڑی ہوئی ہے۔ ایک ٹیلی فون کی ضرورت ہے پولیس کے لئے اور لاش مل جائے گی اور اس کی گردن پر تیرے ہاتھوں کے نشانات بھی ملیں گے۔ باؤلی اس دن تو نے میرا چیلا بننے کے لئے میرا تھوک چاٹا تھا۔ سمجھ رہی ہے نا، تھوک چاٹا تھا تو نے میرا..... تیرے شریر میں وہ پہنچ چکا ہے جو میرے بدن کا ایک حصہ تھا۔ وہ بھی دکھا دوں گا تجھے کہ وہ کیا تھا۔ چل اسے چاٹ لے تاکہ تیرے اندر بھی شکتی پیدا ہو جائے۔''

صفورہ کی جان نکلی جا رہی تھی لیکن اس وقت وہ جس ماحول میں تھی اس میں اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ کئے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے وہ راز مل گیا تھا جس نے آج تک اس کی طبیعت خراب کر رکھی تھی۔ ٹنڈن گوپال نے اس کی ہتھیلی پر کیا چیز رکھی تھی جسے چاٹنے کے بعد وہ آج تک اپنے جسم کے اندر پیدا ہو جانے والی گھن سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس کی انگلی ہتھیلی کی جانب بڑھی، خون میں ڈوبی اور اس نے ابکائیاں لیتے ہوئے پہلی انگلی چاٹ لی۔ دوسری اور پھر تیسری اور اس کے بعد اس کے اندر کی کیفیت بحال ہوتی چلی گئی۔ باقی خون اس نے زبان سے ہی چاٹ لیا تھا اور اس

طرح چٹخارے لے رہی تھی جیسے کوئی بہت ہی لذیذ شے اس کے وجود میں اتر گئی ہو۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی لیکن خون چاٹتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر، ٹھوڑی وغیرہ پر خون لگ گیا تھا اور اس وقت وہ ایک عجیب شیطانی شکل کی مالک نظر آ رہی تھی۔ ٹنڈن گوپال مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''ہاں، اب ہوئی نا بات۔ تیرے شریر پر جو یہ کپڑے ہیں ناں یہ تجھے بہت سی باتیں جاننے سے روک دیں گے۔ یہ جو جسم [illegible] رکھا ہوا ہے وہ اور تو ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ بتا کیا شیطان کے اس سروپ نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں؟''

''نہیں مہاراج۔''

''تجھے اس کے سامنے رقص کرنا ہوگا۔ اور میں تجھے بتاؤں کہ تیرے شریر میں جو میرا تھوک پہنچا ہے اس نے تو بڑا کام دکھایا ہے۔ چل شروع ہو جا۔ یہ شیطان کو تیری پہلی دکھشنا ہوگی۔''

خون [illegible] میں اتر چکا تھا اور صفورہ اب کسی طلسم کا شکار ہو گئی تھی۔ نہ اسے خون سے گھن آ رہی تھی اور نہ اس ماحول سے اس کے دل میں کوئی خوف باقی رہا تھا۔ اس نے لباس اتار دیا اور ٹنڈن گوپال اسے حریص نگاہوں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''بہت سندر ہے تو..... بہت سندر ہے [illegible] بڑی چارمنگ [illegible] مگر ہم شیطان کے چیلوں کے درمیان ایک رشتہ ہوتا ہے اور یہ رشتہ [illegible] کا نہیں، آتما کا ہوتا ہے۔ میرے اور تیرے درمیان آتما کا رشتہ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دیکھ تیرے شریر سے کیا چیز نکل رہی ہے۔''

صفورہ نے اپنے بدن کو دیکھا۔ اس کے مسامات منہ [illegible] رہے تھے۔ دنیا کا حیرت انگیز واقعہ تھا یہ۔ کسی انسانی جسم کے مسامات اس طرح بڑے نہ ہوئے ہوں گے جس طرح اس وقت اس کے مسامات ایک عجیب و غریب شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ پھر اس نے ان سوراخوں سے ننھے ننھے انسانی چہرے نمودار ہوتے دیکھے اور اس کے حلق سے وحشت بھری چیخیں نکل گئیں۔ وہ چہرے جو بڑے چیونٹے کے برابر تھے مکمل نمودار ہوئے اور زمین پر کود گئے۔

یہ چھوٹے چھوٹے انسانی بچے تھے جن کی تعداد سینکڑوں کے قریب تھی۔ یہ سب اس کے جسم سے برآمد ہوئے تھے۔ زمین پر گرنے کے بعد وہ لوٹیں لگانے لگے۔ ٹنڈن گوپال آگے بڑھا۔ اس نے چٹکی سے اٹھا کر ایک بچے کو ہتھیلی پر رکھا اور ہتھیلی

صفورہ کے سامنے کر دی۔ وہ سو فیصدی ایک انسانی بچے کی طرح تھا۔ پورا چہرہ، پورے ہاتھ پاؤں مگر چہرے پر ایک شیطانی عمل نظر آ رہا تھا۔ ٹنڈن گوپال نے اس طرح کئی بچے اپنی ہتھیلی پر رکھے اور وہ اس کی ہتھیلی پر اچھلنے کودنے لگے۔

''جانتی ہے یہ کیا ہے؟ تیرے شریر میں میرا تھوک۔ یہ تو بہت چند ہیں۔ تیرے بدن میں میرے بہت سے بیر رہنے لگے ہیں۔ سن، میں تجھے کالے جادو کے کچھ جاپ بتاؤں گا۔ تین جاپ کر لے تو۔ کیونکہ زیادہ کالے جادو جاننا عام آدمی کے لئے برا ہوتا ہے۔ یا تو وہ جو سارا جیون میرے ساتھ رہے میں اس کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ رکھے رہوں گا اور اگر ایسا نہ ہو تو کوئی بھی کالا جادو جاننے والا کسی بڑے کالے جادوگر کے سامنے نقصان اٹھا جائے گا۔ اچھا یہ بتا تیرے دل میں کوئی ایسا جذبہ ہے جس کی منو کامنا ہے تیری؟ جسے تو ہر قیمت پر پورا کر لینا چاہتی ہو؟''

صفورہ نے کچھ لمحے سوچا پھر جلدی سے بولی۔

''ہاں [illegible] ہے۔''

''تیرا کوئی دشمن جس نے تیرے ارادوں کو یا تیرے گھر بار کو یا تیرے کسی جاننے والے کو نقصان پہنچایا ہو اور تیرے من میں یہ خیال ابھرا ہو کہ اگر تجھے شکتی حاصل ہو گئی تو تم اس سے بدلہ لے لی۔''

''ہاں [illegible] ہے۔''

اسے ہارون یاد آ گیا تھا جس نے اسے ٹھکرا دیا تھا اور اسے ٹھکرا کر ایک معمولی سی لڑکی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیا تھا۔ صفورہ یہ داغ دل میں لئے لندن چلی آئی تھی۔ اگر وہ اپنے وطن میں ہوتی تو یقیناً ہارون کو کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا چکی ہوتی اور اس کے لئے چاہے اس نے کوئی بھی ذریعہ استعمال کیا ہوتا۔ لیکن لندن آنے کے بعد اس کی یہ خواہش سلگتی چنگاری کی شکل میں راکھ تلے دب گئی تھی۔ اور جب راکھ ہٹ جاتی ہے تو چنگاریاں ابھر آتی ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ بھڑک اٹھتی ہیں اور اس وقت اس کے دل میں بدلے کی وہی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔

''وہ ہے [illegible] وہ ہے [illegible] اس کا نام ہارون ہے..... اس نے میرے پندارِ حسن کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ جس معمولی لڑکی کے لئے اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا وہ میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تو سن..... گرو دکھشنا تم دے چکی ہو۔ ہم ان لوگوں سے بڑے خوش ہوتے

ہیں جو ہماری بات مان لیں۔ پہلا جاپ تُو آنے والے منگل سے کرے گی۔ تین دن کا ہوگا۔ ساری رات تجھے یہاں مہان دہنی کے سامنے بیٹھ کر یہ جاپ پڑھنا ہوگا۔ پھر میں تجھے ایک دوسرا جاپ بتاؤں گا اور اس کے بعد یہ سارے بیر تیرے قبضے میں ہوں گے جو تیرے شریر کے اندر ہیں۔ اس سے زیادہ میں تجھے اور کچھ نہیں دے سکتا۔ ان سے تو بڑے بڑے کام لے سکتی ہے۔ اور میری ایک بات اور سن لے۔ بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے انسان کو عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ تُو ایک اچھے خاندان کی مسلمان لڑکی ہے اور تجھے اپنا گھربار بھی قائم رکھنا ہے۔ ایسی شکل میں کوئی بڑا قدم مت اٹھانا، کوئی جلد بازی مت کرنا۔ یہ میری ہدایت ہے تجھے۔''

''جی مہاراج..... ان کا کیا کروں؟''

''جانے دے انہیں۔ میرے پاس چھوڑ دے۔ یہ میری اور تیری اولادیں ہیں۔ ارے ابھی بھاگ جائیں گے یہ..... یہ سب میرے بیر ہیں..... سمجھ رہی ہے ناں۔ بیر ہیں یہ سب میرے۔ ٹھیک ہے..... چل اب تو مجھے میرا کام کرنے دے اور واپس اپنے گھر جا۔

صفورہ یہاں سے باہر نکلی۔ ایک جگہ پانی دیکھ کر رکی، دو گھونٹ پانی پینا چاہتی تھی مگر پانی میں اپنا چہرہ دیکھا تو چہرے پر خون لگا ہوا نظر آیا۔ اس نے وہ خون صاف کیا اور پھر اس پراسرار آشرم سے باہر نکل آئی۔ لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہوائیں ہلکی ہوگئی ہوں۔ زمین نیچی ہوگئی ہو۔ اس کی گاڑی کی رفتار ہوا کی طرح تھی۔ ایسا ہلکا ہلکا وجود لگ رہا تھا اسے اپنا جیسے پتہ نہیں اس نے کیا پالیا ہو۔

گھر پہنچ گئی۔ کسی کو اس نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ بس ایک خوشگوار تاثر میں ڈوبی رہی۔ پھر رات ہوگئی اور وہ غسل خانے میں داخل ہوگئی۔ اسے اپنے مسامات کا خیال آیا اور وہ جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ کیسی حیرت انگیز بات تھی۔ اس کے جسم سے وہ ننھے ننھے بچے..... مائی گاڈ..... مائی گاڈ..... اس نے اپنے مسامات پر ہاتھ پھیرا اور نجانے کیوں اسے اس طرح یہ ہاتھ پھیرنا اچھا لگا۔ کوئی دو ڈھائی منٹ تک وہ یونہی ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر اچانک ہی اسے بدن کے اس حصے کے مسامات کھلتے ہوئے محسوس ہوئے اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔ ننھے ننھے انسانی وجود جن کی تعداد تین تھی، اس کے جسم سے نمودار ہو رہے تھے۔ پھر وہ اچھل کر باہر آگئے اور اس کے ہاتھ کی کلائی پر بیٹھ گئے۔ صفورہ کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیلی

ہوئی تھیں۔ وہ انہیں چہرے کے قریب کر کے دیکھنے لگی۔ بڑے چیونٹوں کے برابر یہ ننھے ننھے بچے اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ صفورہ نے آہستہ سے کہا۔

''ہیلو.....'' اور جواب میں اسے باریک باریک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جن میں اسے ہیلو..... ہیلو کہا جا رہا تھا۔ صفورہ خوشی سے دیوانی ہوگئی۔

''تم..... تم بول سکتے ہو؟''

''ہاں..... ہم بول سکتے ہیں۔''

''کون ہو تم.....؟''

''تمہاری اولاد۔'' تینوں نے بیک وقت جواب دیا۔

''اولاد.....؟''

''ہاں..... تمہارے بیر۔''

''تم مجھ سے ہر طرح کی باتیں کر سکتے ہو؟''

''ہر طرح کی۔''

''تم کہاں رہتے ہو؟''

''اسی سنسار میں ہواؤں کے بیچ۔ مگر تمہارا یہ خوبصورت گھر ہمیں اچھا نہیں لگتا۔''

''مطلب یہ..... کہ تم''

''ہاں..... ہم اپنا ٹھکانہ خود تلاش کر لیتے ہیں۔''

''اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم گرو مہاراج کے پاس سے کہاں چلے گئے تھے؟''

''وہ ہم نہیں تھے..... ہم تو لاکھوں کی تعداد میں تمہارے شریر میں ہیں اور اب جب تک تم کہو گی ہم تمہارے پاس رہیں گے اور اس کے بعد چلے جائیں گے۔''

''کہاں.....؟''

''یہیں سنسار میں..... فضاؤں میں..... ہواؤں میں..... خلاؤں میں۔''

''اوہ مائی گاڈ..... گویا تم واپس نہیں آؤ گے۔ اور اگر میں اسی طرح بدن پر ہاتھ پھیر کر دوبارہ ایسا ہی کرنا چاہوں تو؟''

''تو ہم..... میرا مطلب ہے ہمارے بہن بھائی اور آ جائیں گے۔ وہ باہر آنے کے بعد واپس اندر نہیں جاتے۔''

''اوہ..... یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہاری تعداد کبھی میرے بدن میں ختم نہیں ہوگی؟''

"یہ مہان گرو کے بتانے کی بات ہے۔ ہم اس بارے میں نہ جانتے ہیں نہ بتا سکتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم میرے لئے کیا کیا کچھ کر سکتے ہو؟"

"یہ بھی ہم نہیں جانتے۔ جب تمہیں ہم سے کوئی کام ہو تو تم بتانا، ہم تمہیں بتا دیں گے کہ وہ کام ہم کر سکتے ہیں یا نہیں۔"

صفورہ گردن ہلا کر خاموش ہوگئی۔ وہ ایک عجیب سی خوشی کے عالم میں تھی۔ بالکل اس طرح جیسے کسی کو کوئی انوکھا کھلونا دستیاب ہو جائے۔ لیکن کسی ننھے سے بچے کی سب سے پہلی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اپنے یہ کھلونے وہ اپنے دوستوں کو دکھائے اور ان سے داد حاصل کرے، ان کے چہرے پر اپنی برتری کا احساس دیکھ سکے کہ دیکھو اس کے پاس کتنا اچھا کھلونا ہے۔ صفورہ بچوں کے سے انداز میں سوچ رہی تھی اور وہ تینوں ننھے ننھے وجود آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اور پھر وہ خاموشی سے دروازے سے باہر نکل گئے۔ صفورہ نے کسی خیال کے تحت چونک کر ادھر دیکھا اور انہیں نہ پا کر دھک سے رہ گئی۔ ایسے جیسے اس کا اپنا کوئی بچھڑ گیا ہو۔

تھوڑی دیر تک وہ اسی احساس کا شکار رہی۔ پھر اچانک ذہنی قوتیں واپس آ گئیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے زور سے سر کو جھٹکا اور اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ یہ کیا حماقت ہے۔ وہ سب طلسمی کھیل تھا۔ وہ بچے جادوئی حیثیت رکھتے تھے بلکہ گرو نے کہا تھا کہ وہ ان کے بیر ہیں۔ صفورہ بیر ویر وغیرہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس اپنے بدن سے پھوٹنے والی ان کونپلوں کو دیکھ کر اسے حیرت کا احساس ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد تھوڑی سی محبت کا۔ لیکن اب اس نے خود اپنے آپ پر نفرین کی۔ یہ کیا حماقت ہے۔ میں ایسے کسی عمل کو ایک جذباتی حیثیت دے رہی ہوں جس کا عام زندگی میں کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ تو میری تقدیر کا ایک حصہ ہے جو عجیب و غریب ہے۔ مگر کیا غلیظ صورتحال تھی۔ اس کمبخت نے وہیں انہی غاروں میں مجھے اپنا تھوک چٹایا تھا۔ سوچ کر ہی ابکائی آنے لگتی تھی۔

لیکن کالے جادو کے بارے میں تھوڑی بہت جو معلومات اسے حاصل ہوئی تھیں وہ اسی طرح کی تھیں کہ سب سے پہلے اس میں ایمان کھونا پڑتا ہے۔ غلاظتیں اپنانی پڑتی ہیں۔ میں تو جان بوجھ کر اس چکر میں نہیں پڑی۔ میں نے جان بوجھ کر تو سب کچھ نہیں کھویا۔ وہ تو اتفاق تھا جو میں وہاں جا نکلی تھی۔ واقعی ہری پرشاد نے میری

عزت پر حملہ کیا تھا۔ اگر میں آسانی سے اس کے قابو میں آ جاتی تو پامال ہو جاتی۔ ویسے بھی وہ ہندو دھرم سے تعلق رکھتا تھا۔ مارا گیا کمبخت میرے ہاتھوں اور اس کے بعد یہ نٹذن گوپال سامنے آ گیا اور میں اس کے جال میں پھنستی چلی گئی۔

مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ اس نے میری آبرو پر حملہ نہیں کیا اور اب جو کچھ میں سیکھ رہی ہوں، آہ میرا خیال ہے میں اس سلسلے میں کافی آگے نکل گئی ہوں۔

پھر اسے نٹذن گوپال کا وہ آشرم یاد آیا۔ لندن جیسے دنیا کے جدید ترین شہر میں یہ سب کچھ بھی ہے۔ لیکن پھر اسے کچھ لوگوں کی کہی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ جتنی توہم پرست یہ انگریز قوم ہے اتنی کوئی نہیں ہے۔ اس کی زندگی میں توہمات کا بڑا دخل ہے۔ واقعی اندازہ بھی ہو رہا تھا۔ وہ سارے کے سارے سر گھٹائے چوٹی رکھے وہاں بیٹھے ہوئے کالے جادو کا جاپ کر رہے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نٹذن گوپال جو کالے جادو کی ایک نسل تیار کر رہا ہے یہ نسل انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوگی۔ اس سے انسانوں کو کیا کیا نقصان پہنچیں گے۔

نجانے وہ کب تک ان سوچوں میں ڈوبی رہی اور پھر اس کے ذہن میں ہارون ابھر آیا۔ بے شک اس نے ہارون سے عشق نہیں کیا تھا۔ حاجی عطا نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ بہت بڑی شخصیت کی مالک تھی اور ہارون ایک معمولی سا انسان۔ اس کا تو خیال تھا کہ اگر اس کی انگلی دنیا کے کسی بھی انسان کی طرف اٹھ جائے تو وہ پوری خوشی کے ساتھ اس کے قدموں میں آ گرے گا۔ وہ اتنی ہی اعلیٰ حیثیت کی مالک تھی۔ شکل و صورت، جسامت، خوش لباسی، دولت مندی اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ لیکن اس احمق نے ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے اس معمولی سی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور اب میں نٹذن گوپال سے سب کچھ سیکھنے کے بعد ایک مرتبہ وطن واپس ضرور جاؤں گی اور وہاں جا کر اس کو ملیامیٹ کر دوں گی۔ اس کی زندگی کو تہہ و بالا کر دوں گی۔ میں ایسا کروں گی اور میں ایسا کر سکتی ہوں۔

وہ آخری احساس دل میں بسا کر گہری نیند سو گئی۔ اور پھر اس کی خوابوں کی دنیا آباد ہو گئی جس میں اس کا اپنا وطن اور اس میں ہارون اور اس کی بیوی افشاں تھی......

افشاں سے بات کرنے کے بعد ہارون کس حد تک پُرسکون ہو گیا تھا۔ خیمے میں آ لیٹا اور اسے نیند آ گئی۔ بہت دیر تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی لیکن پھر خاص بات ہوئی۔ کچھ آوازیں ہوئی تھیں اور پھر ہارون ایک دم چونک پڑا تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ خاموشی کا راج تھا۔ خیمے میں مدھم روشنی جل رہی تھی۔ یہ روشنی ہارون نے جلا کر رکھی تھی۔ ویسے تو وہ اندھیرا کر دیا کرتا تھا لیکن ان دنوں جن حالات سے گزر رہا تھا انہیں دیکھتے ہوئے وہ تھوڑی سی روشنی کر دیتا تھا۔ اس کی نگاہیں خیمے میں چکرانے لگیں اور فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کی نیند بے مقصد نہیں ٹوٹی تھی۔ ایک انسانی ہیولا تھا جو اس صندوق کے قریب بیٹھا ہوا تھا جس میں اس کا مختلف سامان رکھا ہوا تھا۔ اسی صندوق میں دونوں پازیبیں بھی تھیں جو چندر بدن بستر پر چھوڑ گئی تھی۔

اس پراسرار وجود کے ہاتھوں میں وہ دونوں پازیبیں بھی تھیں اور وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی ہارون کو وہ لمحات یاد آ گئے جب ایک بالوں بھرا ہاتھ اکلوتی پازیب کو اٹھا لے گیا تھا۔ ہارون ایک دم اٹھ گیا۔ اس نے اپنا تکیے کے نیچے رکھا ہوا ریوالور نکال لیا۔

''خبردار...... تم ریوالور کے نشانے پر ہو۔ اگر ذرا بھی جنبش کی تو گولی چلا دوں گا۔''

اس نے پلٹ کر ہارون کو دیکھا اور مدھم روشنی میں ہارون نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ انتہائی بھیانک چہرہ تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پازیبیں تھیں اور وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے ہارون کو دیکھ رہا تھا۔

''چور ہو تم...... چور۔ ابھی میں اپنے آدمیوں کو بلاتا ہوں اور تمہیں گرفتار کرا دیتا ہوں۔''

''ناہی نواب جی...... ناہی...... ایسا نہ کرو تو اچھا ہے۔ میرے لئے نہیں، تمہارے لئے نواب جی۔ تم ہمارے مائی باپ ہو۔''

''مگر تم کون ہو......؟''

''گجراج ہے ہمارا نام مہاراج...... آپ ہم پر گولی چلاؤ گے، دھمک ہو گی ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کیونکہ ہم تو پہلے ہی بگڑے ہوئے ہیں۔ ہم جیوت کہاں ہیں مہاراج۔ ہمیں تو مرے ہوئے بھی بڑا سے بیت گیا۔''

''بکواس کر رہے ہو تم۔''

''ناہی نواب جی...... ناہی۔ ہمارا کام ہو ہی گوے۔ ہم ایکا لینے آت سوای ہمیں مل گئیں۔ بڑے پریم سے دی تھیں ہم نے اپنی پریمیکا کو۔ اسے بھی بڑی اچھی لگی تھیں۔ پر بگڑ گئی سسری۔ تمہارے پھیر میں پڑ گئی یا کسی اور پھیر میں پڑ گئی۔ ہم کا جانت۔ مہاراج! ہمارا کام کھراب مت کرو...... اب تم جاگ ہی گئے ہو تو ہم بھی تم سے اپنے من کی بات کر لیں۔''

''میں کہتا ہوں تم کون ہو؟''

''بتایا نا آپ کو مہاراج...... گجراج ہیں ہم۔ ہم نے پھیرے کئے تھے اس کے ساتھ۔ جھوٹ بولت رہی سسری کہ ہم اس کے پتی ناہی رہے۔ ارے اوہی چندر بدن کی بات کرت ہیں۔''

ہارون چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے کچھ واقعات یاد آ رہے تھے۔ وہ سبھا میں جس میں چندر بدن کو ستی کیا جا رہا تھا وہاں گجراج کا نام بھی لیا گیا تھا۔ ہارون کی رگ تجسس بھڑک اٹھی۔ اب یہ کہانی کسی حد تک سامنے آ رہی تھی تو وہ بلاوجہ کے خوف سے اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

''دیکھو گجراج! مجھے بتاؤ۔ بات کیا ہوئی تھی؟''

''ارے ہم کا بتائیں مہاراج! ہمارے قبیلے کی تھی۔ بڑی پسند تھی وہ ہمیں۔ ہم نے اس سے کہا کہ ہم سے پھیرے کر لے ناہی باز آئی۔ ہم اٹھئی لے گئے۔ اور مہاراج پھر آپ نے ہمارا سارا کام کھراب کر دیا ہے۔ بڑے ہیں آپ مائی باپ۔ بہت بڑے ہیں۔ پر چھوٹن کی بھی عجت ہوتی ہے مہاراج! دیکھو جو بیت گیا سو بیت گیا۔ اب ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ تم نے اس دن اسے ستی ہونے سے بچا لیا مہاراج۔ ای تو تم ہی جانت رہو کہ تم اُو کے پتی ناہی رہو۔ پھیرے تو ہمارے ساتھ

بھی نہیں ہوئے اس کے پر کرلیں گے مہاراج! ہمارا شریر کا نہیں آتما کا رشتہ ہے اس سے۔ مہاراج! ہماری آتما بھٹکتی رہے گی اگر آپ نے اسے ہمارے حوالے نہ کر دیا۔ اسی لئے جیے مہاراج! آپ ان کا کا کرت رہو۔" اس نے پازیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ٹھیک ہے ..... لے جاؤ..... میں تمہیں اس سے نہیں روکوں گا مگر تمہاری کہانی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آ جائے گی مہاراج..... آگے چل کر آ جائے گی۔ ہم جات رہیں۔ سور نہ مچانا۔ کچھ ناہی ملے گا تمہیں۔ یہ پے جی ہے اس کے لئے ہم ادھر آئی رہے اور تمہارا کوئی سامان ہمارے مطبل کا نہیں ہے۔ جے رام جی کی۔"

اس نے کہا اور سیدھا کھڑا ہوکر خیمے کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ ہارون پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی پلکیں جھکی جا رہی ہیں۔ اور پھر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک خواب کی سی کیفیت اس پر طاری تھی۔ اور نجانے کب وہ حالات اور ماحول سے بے خبر ہو گیا۔ جاگا اس وقت جب باہر بھرپور طریقے سے کام شروع ہو چکا تھا۔

خود کامران ہی اس کے خیمے میں آ گھسا تھا اور اس نے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔

"خیریت تو ہے سر! آپ کو بخار ہو رہا ہے۔ پتہ ہی نہیں چل سکا مجھے تو۔ بہت دیر ہو گئی تو مجبوراً آپ کے خیمے میں داخل ہوا۔ خیمے کا پردہ کھلا ہوا تھا۔ آپ کے انداز میں بے ترتیبی تھی اور یہ ریوالور..... یہ ریوالور بستر سے نیچے پڑا ہوا تھا۔ خیریت تو ہے؟"

"ایں....." ہارون نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کامران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بخار کیوں آ گیا سر؟"

"نہیں یار! کوئی ایسی بات نہیں۔ بس تھکن سمجھ لو۔ کچھ بھی سمجھ لو۔ بعد میں بتاؤں گا تمہیں۔"

"سر میرا خیال ہے آپ کو میڈیسن لے لینی چاہئے۔"

"ہاں..... دو گالیاں لے لیتا ہوں۔ باہر کام شروع ہو گیا؟"

"جی سر! جاری ہے مگر....."

"کچھ نہیں کامران..... ناشتہ کراؤ یار۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔ دو گولیاں، ایک کپ چائے اور اس کے بعد ہلکا سا ناشتہ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں سر! ناشتہ کر لیجئے۔ خالی پیٹ میں آپ کو گولیاں نہیں دوں گا۔"

"چلو یونہی سہی۔" ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے آپ کو نہایت پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب رفتہ رفتہ اسے رات کی باتیں یاد آتی جا رہی تھیں۔ وہ کامران کے علاوہ کسی کو دوست نہیں سمجھتا تھا۔

بہرحال ناشتے کے بعد وہ باہر نکل آیا اور کام کا جائزہ لینے لگا۔ مزدور بڑی خوشی کے ساتھ اپنے اپنے کام کر رہے تھے۔ ویسے بھی کامران کا یونٹ کامران پر بھرپور اعتماد کرتا تھا۔ نہ مزدوروں کو کبھی کامران سے شکایت ہوئی نہ کامران کو ان سے۔ کام جس رفتار سے جاری تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جو وقت انہیں دیا گیا ہے اس سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہو جائے گا۔ لیکن ہارون کو یہ سوچتے ہوئے کئی بار احساس ہوتا کہ وہ اس علاقے سے جلدی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس علاقے کے اسرار نے اس کے پاؤں جکڑ لیے تھے اور وہ پوری طرح اس بارے میں معلومات حاصل کئے بغیر اس علاقے کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

چندر بدن سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ افشاں سے محبت کرتا تھا۔ اس کا بیٹا اشعر اسے چاہتا تھا لیکن چندر بدن نے اپنا ایک عکس ضرور چھوڑ دیا تھا اس کے دل و دماغ پر اور وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ وہ حسین لڑکی اگر کوئی روح ہے تو اس سے کیا چاہتی ہے۔

دوپہر تک کام ٹھیک ٹھاک ہوتا رہا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آج صبح ہی آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیرتے پھر رہے تھے جو اس وقت کافی گہرے ہو گئے تھے اور اس بات کے امکانات تھے کہ شاید بارش ہو جائے۔ دوپہر کو کھانے کی چھٹی ہوئی تو کامران نے اس کے لئے کھانا تیار کیا۔

"باہر بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ بڑی خوبصورت ہوا چل رہی ہے۔" ہارون نے کہا اور دونوں مزار سے کچھ فاصلے پر ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں جا بیٹھے جہاں انہوں نے کھانا کھایا۔

"میرے ذہن میں تجسس جوں کا توں ہے۔ بس اخلاق اور احترام مجبور کر رہا ہے کہ انتظار کروں ورنہ میں آپ کی رات کی حالت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔

میرا اندازہ ہے کہ یہ سب کچھ بلاوجہ نہیں ہوا ہوگا۔“

ہارون کچھ لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

”دیکھو کامران! میں ایک بات تمہیں بتا دوں۔ اپنی طرف سے کوئی حاشیہ آرائی کر کے میں اس معاملے کو مزید پُرتجسس نہیں بنانا چاہتا۔ جو واقعات جس انداز میں پیش آتے ہیں میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ تم خود بھی بہت سی باتوں کے رازدار ہو۔“

”سر! میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ مجھے کوئی جھوٹی کہانی سنائیں گے۔“

”ہاں...... ویسے یہ بات طے ہے کامران کہ ہم لوگ یہاں کسی باقاعدہ آسیبی چکر میں پھنس گئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ جب ہم لوگ یہاں سے اپنا کام ختم کر کے چلے جائیں گے تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ لیکن جب میں حالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ بات ذرا کچھ آگے نکل گئی ہے۔ میں ہندو عقیدے کو بالکل نہیں مانتا۔ نہ کبھی اس بات کو تسلیم کروں گا کہ زمانۂ قدیم سے میرا کوئی تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ بے شک میرے ماضی کا کچھ حصہ تاریک ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا تعلق زمانۂ قدیم کے کسی ہندو گھرانے سے نکلے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قیامت تک نہیں مانوں گا۔ یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔ توہمات ہیں۔ چندر بدن کا جہاں تک معاملہ ہے تو ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ہندو دھرم دیوی اور دیوتاؤں کے چکر میں پڑ کر لاتعداد قصے کہانیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

وہاں آتماؤں کا تصور ہے اور بہت سے شوہد ایسے ملے ہیں کہ ان کے ہاں کی روحیں بھٹکتی ہیں۔ اچھی ہوں یا بری یہ ایک الگ بات ہے۔ کیونکہ جو واقعات پیش آ چکے ہیں مجھے اس بات کا پورا پورا اندازہ ہے کہ سہائے پور میرا مطلب ہے قدیم سہائے پور میں کوئی ایسی کہانی ضرور چھپی ہوئی ہوگی جو اس طرح کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ میں نے تمہیں ستی کی اس رسم کے بارے میں بتایا۔ کم از کم تم نے یہ تو دیکھ لیا کہ کچھ شواہد ملے جن سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ چندر بدن کی روح ہمارے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے اور پھر میں نے ایک انسانی زندگی بچانے کے لئے اس کا شوہر ہونا قبول کر لیا تھا۔ اب اس کے لئے مجھے کیا نتائج بھگتنے پڑیں گے یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن جہاں تک تم میری سوچ پوچھتے ہو تو اس وقت بھی صرف نیک نیتی میرے ذہن میں تھی۔ جس کی وجہ سے میں نے اسے اپنی بیوی مان لیا تھا۔ اور اب بھی میرے دل

میں اس کے لئے کوئی الگ مقام نہیں ہے۔ خیر اتنی تمہیدیں اس لئے کہہ رہا تھا کہ میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ یہ بخار وغیرہ غالباً اس بات کا نتیجہ نہیں ہے۔ کوئی موسمی عمل بھی ہو سکتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔“

”بالکل سر! بالکل۔“

”میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ نہ ہی اس کہانی میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب اشعر بیمار ہوا تھا اور افشاں نے مجھے فون کیا تھا تو میں یہاں سے بدحواسی کے عالم میں چل پڑا تھا تو راستے میں مجھے چندر بدن نظر آئی۔ اب تو میں اس کا نام اس انداز میں لے سکتا ہوں کہ چندر بدن مجھے نظر آئی۔ وہاں بھی میں نے اسی انسانی تجسس کے تحت جیپ روک لی۔ پھر جو واقعات پیش آئے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہاں مجھے پازیب ملی۔ یہ وہی پازیب تھی جو اس کے پاؤں سے کھل کر گر پڑی تھی۔ ذرا سوچو اور غور کرو۔ اگر وہ کوئی مادی وجود نہ ہوتا تو پازیب اس کے پاؤں سے نہیں نکل سکتی تھی۔ فرض کرو یہ بھی کوئی کھیل تماشہ تھا تو میں پازیب اٹھا کر لے گیا اور وہ میں نے ایک سائیڈ ریک پر رکھ دی جس کے عقب میں ایک کھڑکی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی یا اسے کھولا گیا تھا۔ لیکن ایک بالوں بھرے ہاتھ نے وہ پازیب اٹھائی۔ میری ملازمہ رشیدہ نے عجیب الخلقت وجود کو وہاں دیکھا اور بے ہوش ہو گئی۔ خیر اس طرح آئی ہوئی پازیب چلی گئی۔ اس کے بعد چندر بدن بستر پر لیٹتے ہوئے وہ پازیب، دونوں پازیبیں بستر پر چھوڑ گئی جو تم نے دریافت کیں۔ تم خود سوچ سکتے ہو کہ میرے پاس بھلا ایسی کسی چیز کا کیا وجود ہو سکتا ہے۔ وہ پازیبیں میں نے صرف اس لئے رکھ دی تھیں کہ بعد میں ان کے بارے میں تحقیقات کریں گے۔ رات کو میں خاصی دیر تک باہر بیٹھا رہا۔ افشاں سے موبائل فون پر باتیں کیں پھر خیمے میں آ کر لیٹ گیا اور سو گیا۔ وقت کا مجھے اب بھی اندازہ نہیں ہے نجانے کون سا وقت ہوا تھا وہ جب مجھے کچھ آہٹیں سنائی دیں اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو آسکرو لیمپ کی روشنی میں مجھے ایک انسانی وجود نظر آیا ایک بھیانک چہرہ جو اس صندوق کے پاس موجود تھا جس میں پازیبیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے صندوق کھول لیا تھا اور دونوں پازیبیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ میں نے ریوالور لے کر اسے للکارا تو اس نے کہا کہ نہیں بابو جی ہماری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم یہ پازیبیں لینے آئے ہیں جو ہم

نے بڑی چاہت سے چندر بدن کو دی تھیں۔ بابو جی! آپ ان کا کیا کرو گے...... پر یہ ہمارا پریم ہیں۔ وہ چار اور باتیں کیں اس نے اور اس کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ اگر میں اس پر گولیاں چلاؤں گا تو بے کار ہیں کیونکہ وہ تو بہت پہلے مر چکا ہے صاف صاف اور کھلی بات تھی اور اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی عام چور نہیں ہے۔ کیا سمجھے؟...... وہ پازیبیں لے گیا اور پھر نجانے کب مجھ پر ایک غشی سی طاری ہو گئی۔ میں اسے نیند نہیں کہہ سکتا۔

اب کم از کم یہ پراسرار قوتیں اتنا کچھ تو کر ہی سکتی ہیں۔ کامرن حیرت سے منہ پھاڑے ہارون کی یہ داستان سن رہا تھا پھر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کک...... کک...... کیا وہ پازیبیں غائب ہو گئیں؟''

''ہاں...... ظاہر ہے وہ لے گیا......'' کامرن نے خاموش ہو کر گردن جھکا لی تھی۔ دیر تک وہ سوچتا رہا پھر بولا۔

''ان تمام باتوں میں ایک بات تو ثابت ہوئی ہے سر! وہ یہ کہ یہ آسیبی چکر مادی عمل کے ساتھ جاری ہے۔ روحوں وغیرہ کے بارے میں یہ سنا ہے کہ وہ صرف ایک دھواں ہوتی ہیں۔ پازیبوں کا کھوں وجود صرف یہ ہی چیز ایسی ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ یہ خالص روحی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ ملاوٹ ہے۔ ایک ذرا سی گڑبڑ ہو گئی سر......''

''کیا......'' ہارون نے سوال کیا۔

''آپ اس پر گولی چلا دیتے۔''

''تو پھر......'' ہارون حیرت سے بولا۔

''پتہ تو چلتا کہ ریوالور کی گولی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے یا نہیں۔''

''نہیں کامران! بڑی حماقت ہوتی یہ۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے کھل کر مجھے تفصیل بتا دی تھی حالانکہ صندوق میں کچھ اور چیزیں بھی موجود تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان میں کسی چیز کو چھونے کا تصور بھی نہیں رکھتا تھا اور یہ بھی سوچو دوست کہ اگر میں گولی چلا دیتا تو گولی چلانے کی آواز تو ہوتی نا کم سے کم۔ اسے لگتی یا نہ لگتی یہ ایک الگ بات تھی۔ مزدور جاگ اٹھتے، صورت حال دریافت کرتے۔ انہیں جھوٹی سچی کہانیاں سنانی پڑتیں۔ ایک اچھا خاصہ مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔

''بس میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ کچھ سامنے تو آتا۔''

''سامنے تو آئے گا کامران...... اب میں یہ نہیں کہتا کہ تم میرے ساتھ ساتھ دم چھلے کی طرح لگے رہو۔ میں بالکل نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے شاید یہی میری فطرت کا ایک حصہ ہو۔ کیونکہ ماضی میں کوئی ایسا واقعہ پیش ہی نہیں آیا جو میرے لئے اس قدر حیران کن ہوتا۔ میں اپنے تجسس کو باز نہیں رکھ سکوں گا۔ مجھے یہ پتہ ضرور چلانا پڑے گا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے۔''

''مطلب......؟'' کامران نے پوچھا۔

''اب میں نئے سہائے پور جاؤں گا جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے میں دیکھوں گا کہ وہاں کی کیا کیفیت ہے۔ کس طرح وہاں کے لوگ رہتے ہیں۔ پرانے سہائے پور کے بارے میں وہ کیا جانتے ہیں۔ یہ ساری تفصیلات معلوم کروں گا۔''

''تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ سر! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان حالات میں تنہا چھوڑ دوں۔'' کامران نے کہا اور ہارون مسکرانے لگا۔

صفورہ پوری طرح ٹنڈن گوپال کے جال میں پھنس چکی تھی۔ ٹنڈن گوپال کا وہ آشرم بہت مشہور ہو چکا تھا۔ بے شمار افراد جانتے تھے کہ وہ سفلی علوم کی آماجگاہ ہے اور وہاں کالے جادو کا راج ہے۔ لیکن ابھی کوئی ایسا قابل اعتراض کام اس آشرم سے منسوب نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے مقامی حکومت اس کے خلاف کوئی ردعمل ظاہر کرتی۔ اپنے طور پر تحقیقات بھی ہوئی تھیں لیکن یا تو یہ ٹنڈن گوپال کا سفلی علم تھا کہ اس نے اس تحقیقات کے راستے بند کر دیئے تھے اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو پائی تھی۔ یا پھر یہ بھی تھا کہ کالا علم سیکھنے والے کچھ ایسے صاحب اختیار لوگ بھی تھے جو اس ادارے کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی اس کے سلسلے میں تحقیقات کبھی نیکیٹو نہیں ہو سکی تھیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ حکومت انگلینڈ اس قسم کے معاملات کو ملکی آزادی اور شہری آزادی کے اصولوں سے منسلک کر دیتی تھی۔

یعنی یہ کہ وہ چیز جس سے براہ راست کوئی جرم منسلک نہ ہو جاری رکھی جا سکتی ہے کوئی ایسی خصوصی شکایت اس ادارے کے بارے میں حکومت کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی ٹنڈن گوپال ویسے بھی ایک انتہائی شاطر آدمی تھا اور سچی بات یہ کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک مضبوط بنیاد پر یہ کام شروع کر رکھا تھا جیسا کہ اس نے چند الفاظ میں صفورہ کو بتایا تھا کہ اسے گیارہ سو چیلے درکار ہیں جس سے اس کی امر شکتی کو مضبوط سہارا حاصل ہوگا اور اسی بنیاد پر وہ چیلے بنا رہا تھا۔ اپنے کسی بھی شاگرد کو اس نے اتنا جادو نہیں سکھایا تھا کہ وہ جرم کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ یہ بھی وجہ تھی کہ وہ بچا ہوا تھا۔

بہرحال اس کا یہ ادارہ زبردست طریقے سے چل رہا تھا اور مضافاتی علاقے میں یہ فارم ہاؤس یا آشرم بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ویسے اس طرح کے چھوٹے موٹے کام وہ کر دیا کرتا تھا جیسے صفورہ کو اس نے بہت بڑی مشکل سے نکال لیا تھا۔ ہری پرشاد،

صفورہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ لندن میں اس قسم کی کوئی کوشش جو ہری پرشاد نے صفورہ کے سلسلے میں کی تھی۔ بڑا تعجب شمار نہیں ہوتی تھیں لیکن صفورہ کے اپنے معاملات مختلف تھے۔ وہ ظاہر ہے اپنے وجود کو اس طرح کسی ناپسندیدہ شخص کے ہاتھوں پامال نہیں کرنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے ہری پرشاد کو ہلاک کر دیا۔

ٹنڈن گوپال نے فوری سہارے کے تحت ہری پرشاد کے جسم کو اس کے اہل خاندان تک صحیح سلامت پہنچایا اور اس کے بعد خود اس بدن سے نکل کر اپنے بدن میں واپس پہنچ گیا جبکہ ہری پرشاد کے بارے میں صفورہ کو علم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا ایسے محفوظ معاملات تھے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہری پرشاد کی موت میں کسی اور کا ہاتھ ہوگا۔ صفورہ کے دوستوں میں ہری پرشاد کی موت سے تھوڑے سے افسوس کا ماحول پیدا ہوا لیکن اس کے بعد کون کسی کے چکر میں پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ سب معتدل ہو گئے۔ جہاں تک صفورہ کا تعلق تھا وہ ایک الگ ہی زندگی گزارنے لگی تھی۔ وہ آشرم جاتی اور وہاں مختلف معمولات میں حصہ لیتی۔

اس دوران ٹنڈن گوپال سے اس کی ایک آدھ بار ملاقات ہوئی تھی البتہ ایک مہینے میں تین بار اسے شیطانی مجسمے کے سامنے رقص کرنا پڑا تھا۔ ٹنڈن گوپال نے اسے بتایا تھا کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلی جائے اسے مہا کال کو رقص کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا کیونکہ اسی میں کالے جادو کی زندگی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ کچھ نہ رہے گی بلکہ اس کے نقصانات کا آغاز ہو جائے گا کیونکہ اس کے وجود میں بہت سے بیر جا چھپے ہیں جن کی غذا ہی رقص ہے اور اسی سے وہ اپنی جسمانی بقا حاصل کرتے ہیں۔ یہ غذا انہیں نہ ملے تو پھر وہ اپنے مسکن کو چاٹنا شروع کر دیتے ہیں یعنی اندر سے انسانی جسم کے ہر حصے کو اور انسان شدید اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بہرحال وہ چھپ چھپ کر جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ساری رات اسے آشرم میں ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور مرض اسے لگ چکا تھا جب بھی وہ تنہا ہوتی، اپنے جسم کے کسی حصے کو مل مل کر اس سے ایک آدھ بیر پیدا کرتی اور اس کے بعد گھنٹوں اس بیر سے گفتگو کرتی رہتی تھی۔ اس کی زندگی میں یہ ایک اہم ترین مشغلہ بن چکا تھا۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن ہارون کا خیال اور اس کے لئے دل میں ایک نفرت کا احساس بھی اس کی زندگی کا ایک حصہ ہی تھا۔ وہ اپنے کالے جادو کی تکمیل چاہتی تھی پھر اس

دن اس نے ٹنڈن گوپال سے ملاقات کی۔ ٹنڈن گوپال اب اس کے لئے ایک گرو کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے ٹنڈن گوپال سے کہا۔

''گرو مہاراج! آپ نے مجھے جو کچھ دیا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ کالے جادو کو کچھ اور زیادہ سیکھوں۔''

''دیکھو لڑکی! یہ بات تو تم بھی جانتی ہو اور میں تمہیں بتا بھی چکا ہوں کہ اس آشرم کے قیام کا مقصد کالے جادو کا فروغ نہیں ہے۔ اگر میں سنسار باسیوں کو اس علم کا ماہر بنا دوں تو ہو گا کیا۔ ہر طرف مارا ماری پھیل جائے گی۔ بے شک مہا کال یہ چاہتا ہے کہ انسان انسانوں کو نقصان پہنچائیں۔ سنسار میں برائیاں زیادہ سے زیادہ پھیلیں لیکن اس کا بھی کوئی طریقہ کار ہوتا ہے۔ جہاں تک تمہارے کالے جادو سیکھنے کا تعلق ہے تو دیکھو تمہارے اندر ایک شکتی پیدا ہو چکی ہے۔ تمہارے شریر میں لاکھوں بیر ہیں۔ تمہارے یہ بیر تمہارے چھوٹے موٹے کام کر سکتے ہیں کبھی تم ان سے کوئی کام لے کر دیکھو۔ وہ تمہارا کام کریں گے۔ ہاں گرو دکھشنا تمہیں مستقل دینا پڑے گی۔ مہا کال کے مجسمے کے سامنے یہ رقص۔ تم ان بیروں سے بھی سوالات کر سکتی ہو۔ یہ تمہیں ان کا جواب دیں گے۔ جب تک ہمارے آس پاس موجود ہو، آشرم آتی رہو۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں کوئی تحفہ اپنے چیلوں کو دینا چاہتا ہوں۔ میرے جو چیلے میرے آس پاس ہوا کرتے ہیں وہ یہ تحفے لے جاتے ہیں اور ان کے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بس وقت کی دین ہوتی ہے باقی اور کچھ نہیں۔'' صفورہ خاموش ہو گئی تھی ویسے بھی وہ کالے جادو کی ماہر بن کر دنیا میں کوئی اپنا خاص مقام نہیں چاہتی تھی۔

ماں باپ بے پناہ دولت مند تھے اور سب کچھ موجود تھا ان کے پاس۔ چنانچہ دل کی بھری ہوئی تھی۔ تنہا کھیلنا زندگی کے معمولات میں سے تھا۔ بس ایک چھوٹا سا روگ ہارون کا لگا بیٹھی تھی۔ ہارون سے بھی عشق و محبت کا معاملہ نہیں بلکہ اس کا اس سے انتقام کا رشتہ تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ایسے شخص کو جس نے اسے ٹھکرا دیا ہے اس طرح نیچا دکھائے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے۔ ادھر تو وہ اپنے معمولات میں مصروف تھی اور ادھر ایک دن طاہر علی رات کو جاگے تو صفورہ کہیں باہر سے واپس آئی تھی وہ سکتے میں رہ گئے۔ اس وقت گھڑی ساڑھے چار بجا رہی تھی۔

صفورہ کو انہوں نے مکمل طور پر آزادی دی تھی۔ لیکن رات کو ساڑھے چار بجے وہ شدید بے چین ہو گئے۔ سمجھ دار آدمی تھے۔ اس وقت انہوں نے بیٹی کو ٹوکنا مناسب

نہیں سمجھا پتہ نہیں کس عالم میں ہو۔ لیکن دوسرے دن اپنی مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر انہوں نے دروازے کے چوکیدار سے رجوع کیا۔ یہ ان کے اپنے وطن کا آدمی تھا جسے وہ اپنے وطن سے ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے اسے الگ لے جا کر پوچھا۔

''رفیق خان! ایک بات مجھے بتاؤ تمہاری ڈیوٹی اکثر رات کی ہوتی ہے۔''

''ہمیشہ ہم تو رات کی ڈیوٹی دیتے ہیں صاحب!.....''

''رفیق! یہ صفورہ رات کو عام طور سے کس وقت واپس آتی ہے۔''

''صاحب جی! عام طور پر تو زیادہ سے زیادہ دس گیارہ بجے لیکن مہینے میں تین چار دفعہ رات بھر غائب ہوتی ہیں۔ کبھی صبح چھ بجے کبھی پانچ بجے کبھی ساڑھے چار بجے۔ پچھلی رات کو بھی ساڑھے چار بجے آئی ہیں۔''

''کوئی اور اس کے ساتھ ہوتا ہے۔''

''نہیں صاحب جی! کسی اور کو آج تک نہیں دیکھا۔''

''کوئی اور ایسی بات جو تمہارے علم میں ہو۔''

''بالکل نہیں صاحب جی.....''

''اس نے تم سے کوئی ایسی بات کہی تو نہیں کہ اس کے دیر سے آنے کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔''

''آج تک نہیں صاحب جی!''

''جو کچھ میں نے تم سے پوچھا ہے وہ بھی کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔'' طاہر علی نے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب جی! آپ اطمینان رکھیں۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔ اس شام ڈنر پر انہوں نے صفورہ کو غور سے دیکھا۔ تجربے کار آدمی تھے۔ یہ جائزہ لے رہے تھے کہ صفورہ کی جسمانی حالت میں کوئی تغیر تو رونما نہیں ہوا ہے۔ لندن کی آزاد فضائیں کسی بھی حادثے کا سبب بن سکتی ہیں۔ یہ حادثہ اہل لندن کے لئے نہیں ہوتا لیکن باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے جو اپنی اوقات نہیں بھول جاتے، اپنی اقدار کو اس غیر ملکی ماحول میں پامال کرنے کے لئے نہیں لاتے۔ بلکہ اس تشویش کا شکار رہتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں اس آزاد ماحول میں رچ بس کر ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ انسانی زندگی کے معیار ہی کتنے ہیں۔ بنانے کو انسان تاج محل بنا لے اور اس کی

کہانیاں پھیلاتا پھرے لیکن حقیقت یہی ہوتی ہے کہ ان چند سانسوں کا خراج ایک وہی زندگی ہے جسے اپنے سماج اور اپنے معاشرے میں کوئی مقام حاصل ہو۔

طاہر علی بے شک ایک آزاد خیال نسان تھے لیکن اس قدر بھی نہیں کہ بیٹی کو فاحشہ بنا دیں۔ صفورہ کے جسمانی نقوش اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ وہ اپنے اخلاقی راستوں سے ہٹ چکی ہے۔ اپنے تمام تر تجربات کی بنیاد پر انہوں نے اس کا جائزہ لیا اس کی چال ڈھال پر بھی غور کیا۔ جسم کے وہ حصے جہاں سے بہت سی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے بالکل معتدل پائے تو کافی حد تک مطمئن ہوئے لیکن لندن کے آزاد ماحول میں بیٹی کی پرورش ایک بہت ہی مشکل مرحلہ تھی۔ اس بات کا انہیں اندازہ تھا اسی رات انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔

''صفورہ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔''

''خیریت ...... آپ مجھ سے میری بیٹی کے بارے میں میری رائے پوچھ رہے ہیں۔'' بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں سنجیدہ ہوں۔''

''بھئی آرام سے رہ رہی ہے، کوئی بات نہیں ہے، خوش ہے، کھاتی پیتی، پہنتی اوڑھتی ہے۔ اپنے طرز پر ایک اچھی زندگی گزار رہی ہے۔''

''میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ نیرہ بیگم! زمانہ جدید میں یہ باتیں فرسودہ سمجھی جاتی ہیں جو میں تم سے کر رہا ہوں لیکن مسئلہ یہی ہے کہ ہم اسی فرسودہ ماحل میں جینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ فرسودہ ماحول ہی ہمارا مستقبل ہے۔ بے شک اپنا وطن چھوڑ کر لاکھوں کیا بلکہ کروڑوں افراد کی طرح ہم لوگ بھی دریار غیر میں زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اپنے اقدار کو چھوڑ کر ان لوگوں میں رنگ جانا میرا خیال ہے نہ تمہاری یہ خواہش ہے اور نہ میری۔''

''خدا نہ کرے ان کا اور ہمارا مذہب الگ الگ اقدار کا حامل ہے۔ ان سے ہم کہاں میل کھاتے ہیں۔ ان کے درمیان اپنے طور پر تو زندگی گزارنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن ان کی اپنی زندگی کبھی بھی نہیں اپنائی جا سکتی۔''

''یہی میں کہنا چاہتا ہوں نیرہ بیگم! میں آپ کو کوئی الزام نہیں دیتا لیکن میرا خیال ہے ہم دونوں نے صفورہ کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا جس انداز میں ہمیں سوچنا چاہئے۔''

''کوئی بات ہوئی ہے کیا ...... مجھے بتایئے تو سہی۔''

''نہیں ...... خدا کے فضل سے بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ ابھی کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ہو سکتی ہے نیرہ بیگم ...... صفورہ کس وقت گھر واپس آتی ہے۔ آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔''

''بارہ ساڑھے بارہ بجے سے زیادہ ...... کلب جاتی ہے ...... دوستوں اور سہیلیوں میں وقت گزارتی ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو قابل اعتراض ہوتی۔''

''ہو سکتی ہے نیرہ بیگم ...... ہو سکتی ہے۔''

''اچانک ہی آپ کو یہ خیال کیسے آ گیا ......؟''

''اس لئے کہ میں نے اسے رات کو ساڑھے چار بجے گھر واپس آتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کے بعد معلومات حاصل کی ہیں تو پتہ چلا ہے کہ مہینے میں دو تین بار وہ ساری رات گھر سے غائب رہتی ہے۔''

''ڈسکو غیرہ چلی جاتی ہو گی ...... یہاں تو اس قسم کی تفریحات بے پناہ ہیں۔''

''یہ لفظ ہو گی جو ہے نا نیرہ بیگم ...... ہمیشہ سے ایک خوفناک لفظ ثابت ہوا ہے۔ ہم جس معاملے کو سنگین سمجھتے ہیں اسے لاپرواہی کا یہ لفظ دینا میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ایک سنگین جرم ہے ...... ہمیں اس لفظ سے گریز کرنا چاہیے ...... ایک ہی بیٹی ہے ہماری ...... لفظ ہو گی جو ہے نا یہ غلط ہے وہ کیا کرتی ہے، کیسے رہ رہی ہے، کیا کھاتی ہے، کیا پیتی ہے، اس کی صحت کیسی ہے، اس کے دوست کیسے ہیں، اس کے مشاغل کیا کیا ہیں۔ ہمیں ہماری بیٹی کے بارے میں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔''

''آپ نے پہلے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی ہے ...... ضرور کوئی خاص ہی وجہ ہے۔''

''بالکل خاص وجہ نہیں ہے ...... میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ اگر مہینے میں دو تین راتیں گھر سے غائب رہتی ہے تو کہاں رہتی ہے۔''

''تو اس سلسلے میں آپ اس سے بات کر لیجئے۔''

''بھول کر بھی مت کرنا ...... اگر انسان کوئی غلط عمل کرتا ہے تو اس کے بارے میں کبھی سچ نہیں بولتا۔''

''ہوں ...... تو پھر ......؟''

''میرا خیال ہے مجھے اس کے لئے کوئی خاص تحقیق کرنا ہو گی۔''

''تو کیجیے......ضرور کیجیے۔''

''میں نے آپ سے صرف اس لیے یہ سوال کیے ہیں نیرہ بیگم کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی اہم بات معلوم ہو...... لیکن اب ایک بات کا خیال رکھیے۔ اسے ذرہ برابر اس بات کا شبہ نہ ہونے پائے کہ ہم نے اس کے بارے میں ایسی کوئی بات کی ہے۔''

''اطمینان رکھیے آپ...... میں کبھی اس سے اس بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہوں گی۔'' نیرہ بیگم نے کہا۔ طاہر علی حالانکہ خاصی مصروف شخصیت کے مالک تھے لیکن نجانے کیوں اس مسئلے کو انہوں نے اس طرح چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ ایک خاص آدمی سے رابطہ قائم کیا اور اسے ہدایات دیں۔

''تمہیں تمہارے اس کام کا معقول معاوضہ دیا جائے گا...... یہ تھوڑی سی رقم ایڈوانس رکھو اور باقی تمہیں بعد میں ملے گی...... کام یہ کرنا ہے کہ ایک گاڑی پر میرے گھر کے دروازے پر رہو...... اتنے فاصلے پر کہ کسی کو تمہارے اوپر کوئی شبہ نہ ہو سکے...... صفورہ میری بیٹی ہے جانتے ہو تم اسے......''

''جی سر! اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''اس کا تعاقب کرو...... اس کے مشاغل معلوم کرو اور مجھے اس کے بارے میں رپورٹ دو۔''

''ٹھیک ہے سر! آپ مطمئن رہیں۔'' طاہر علی کے مقرر کیے ہوئے شخص نے مستعدی سے کہا اور طاہر علی کسی قدر مطمئن ہو گئے۔ ہر چند کہ بیٹی کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی۔ صفورہ اپنے وطن میں بھی ایک اچھے کردار کی مالک ثابت ہوئی تھی۔ بلکہ حاجی عطا نے تو اس کے لئے ایک بہت ہی مناسب رشتے کا بھی بندوبست کیا تھا لیکن وہ رشتہ طے نہیں ہو سکا تھا۔ طاہر علی ایک انتہائی دولت مند آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کے لئے رشتوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ بے فکر ہو گئے تھے اور ویسے بھی انہیں بیٹی کی شادی کرنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

اگر اس رات بھی صفورہ اتنی دیر سے گھر نہ آتی تو شاید وہ صفورہ پر غور بھی نہ کرتے۔ لیکن اب انہیں ذرا سی تشویش ہو گئی تھی۔ معاملہ کلیئر ہو جائے تو سب ٹھیک تھا۔ مقررہ شخص نے انہیں دس دن کے اندر تین رپورٹیں دی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ عام طور سے صفورہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ جن میں چند لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں۔ ڈسکو کلب وغیرہ جاتی ہے وہاں وہ لوگ رنگ رلیوں میں مصروف رہتے ہیں لیکن

کچھ حدود کے اندر اندر۔ اس نے ابھی تک صفورہ کے اندر کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جس سے یہ اندازہ ہو کہ اس کا کوئی مخصوص بوائے فرینڈ ہے اور وہ اس سے بہت زیادہ فری ہے۔ اس شخص نے کہا۔

''سر! میں نے بہت گہری نگاہوں سے مس صفورہ کا جائزہ لیا ہے بلکہ میں نے ان کے لئے ایک آدھ دوست سے خود بھی دوستی قائم کر لی ہے اور بڑی احتیاط کے ساتھ ان کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ دوستوں کا یہی کہنا ہے کہ یہ پرانے خیالات کی مالک لڑکی بس رقص و موسیقی کی حد تک ہی ہے۔ کوئی بھی اس کی قربت حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ دس دن کی رپورٹ تھی۔ لیکن گیارھویں دن جب صفورہ صبح ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچی اور ناشتے کی میز پر آئی تو اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں اور چہرے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رات بھر نہیں سو سکی ہے۔ بلکہ اس کے اندر ایک ایسا انوکھا کھویا کھویا پن تھا جسے خاص طور سے محسوس کیا گیا۔

طاہر علی صاحب نے اس سے تو کوئی سوال نہیں کیا لیکن اپنے مطلوبہ آدمی کو انہوں نے ٹیلی فون کیا تو اس کی آواز سنائی دی۔

''سر! میں آپ کو خود بھی تھوڑی دیر کے بعد فون کرنے والا تھا۔ انتظار کر رہا تھا کہ آپ اپنے آفس پہنچ جائیں۔''

''کوئی خاص بات۔''

''جی سر......!'' اس نے جواب دیا اور طاہر علی اپنے بدن میں سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے کہا۔

''کیا بات ہے...... مجھے بتاؤ تو سہی......''

''سر! میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔'' اس شخص نے کہا۔

''ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتے۔''

''مناسب نہیں ہو گا سر!''

''ٹھیک ہے...... تھوڑی دیر کے بعد میں آفس پہنچ جاؤں گا...... تم ٹیلی فون کر کے میرے آفس آ جاؤ۔''

''بہت بہتر......'' طاہر علی الجھنوں میں ڈوب گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی تیاریاں کیں اور آفس چل پڑے۔ انہیں صفورہ کی آج کی کیفیت کا احساس تھا۔ عام دن تو جیسے تھے ویسے ہی تھے لیکن آج وہ کافی ڈھیلی ڈھیلی سی تھی اور آج ہی ان کے

جاسوس نے انہیں یہ عجیب و غریب اطلاع دی تھی۔ بہرحال وہ آفس پہنچ گئے اور چند ہی منٹ کے بعد مطلوبہ شخص کا ٹیلی فون آ گیا۔

''سر! میں آنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ...... انتظار کر رہا ہوں۔'' کچھ دیر کے بعد وہ شخص طاہر علی کے پاس پہنچ گیا۔

''تم نے مجھے سخت پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔''

''نہیں سر! بات اس سے بھی زیادہ پریشانی کی ہے۔''

''کیوں ...... کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ۔''

''سر! مس صفورہ کو پچھلی رات ایک ایسی جگہ جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے جو لندن جیسے شہر میں بدنام ترین جگہ تصور کی جاتی ہے ...... لندن کے قدیم اور جدید باشندے اس جگہ کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس جگہ سے برائیاں پھوٹتی ہیں۔''

''کیا ......؟'' طاہر علی کا دل دھک سے ہو گیا۔

''جی سر ...... !''

''کون سی جگہ ہے وہ ...... کیا تم اس گندے بازار کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو جہاں ......''

''نہیں سر نہیں ...... سوری ...... گندہ بازار بہرحال جسم فروشی کا علاقہ ہے ...... وہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے اسے کھلم کھلا بے راہ روی کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن مس صفورہ جس جگہ گئی تھیں وہ تو بس ......''

''یار کمال ہے تم مجھے کہانیاں سنا رہے ہو ...... تمہیں میری کیفیت کا اندازہ نہیں ہے کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں ...... یہ کہانیاں سنانے کا وقت ہے ......؟''

''نہیں سر! میں خود بھی سخت پریشان ہوں۔''

''میرے باپ بتا تو سہی ...... کون سی جگہ ہے وہ ......؟''

''سر! وہ ایک آشرم ہے ...... جہاں کالا جادو سکھایا جاتا ہے ...... اس آشرم کا سربراہ ٹنڈن گوپال نامی شخص ہے ...... ٹنڈن گوپال لندن میں شیطان کی طرح مشہور ہے ...... اس نے کالا جادو سکھانے کا آشرم کھولا ہوا ہے ...... وہاں لندن کے امراء اور روساء، غریب غرباء، جرائم پیشہ ہر طرح کے لوگ کالے جادو کو سیکھنے کے لئے جایا

کرتے ہیں ...... سر! حکومت برطانیہ بھی اس آشرم کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی ...... کئی بار اس کے خلاف کارروائیوں کی کوشش کی جا چکی ہے لیکن ٹنڈن گوپال کے اس آشرم میں برطانیہ کے اتنے بڑے بڑے لوگ وہاں جاتے ہیں اور ان کے مفادات وہاں سے منسلک ہیں کہ حکومت اس آشرم کا کچھ بگاڑ نہیں پاتی ...... ٹنڈن گوپال دھڑلے سے یہ گندا علم عام کر رہا ہے۔''

''مگر مقصد کیا ہے اس کا ......؟''

''نہیں سر! مقصد کوئی بھی نہیں جانتا ...... پراسرار ماحول ہے وہاں کا ...... اس نے بڑے پیمانے پر یہ چکر چلا رکھا ہے۔''

''اس آشرم سے کالا جادو سیکھ کر نکلنے والوں نے تو لوگوں کو بڑے نقصانات پہنچائے ہوں گے۔''

''ابھی تک اس بارے میں کوئی رپورٹ سامنے نہیں آئی لیکن ظاہر ہے سر گندے علم سیکھنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ گندگی کو فروغ دیا جائے۔''

''خیر تم صفورہ کی بات کرو۔''

''محترمہ صفورہ شام کی تیاریوں کے بعد سیدھی آشرم گئی تھیں اور اس کے بعد انہوں نے ساری رات وہیں گزاری ہے ...... صبح کو وہ لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے باہر نکلیں ...... کار بھی انہوں نے بڑی غلط چلائی ...... کئی دفعہ تو مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھیں گی ...... بہرحال وہ گھر پہنچ گئیں اور خدا کا شکر ہے کہ زندہ سلامت رہیں ...... اب یہ بات میں دعوے سے نہیں کہہ سکتا سر! کہ وہ مستقل وہاں جاتی ہیں یا یہ صرف اتفاق تھا۔''

''اتفاق کیسے ہو سکتا ہے ...... جس انداز سے تم یہ بتا رہے ہو کہ وہ وہاں گئی تھی اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جگہ اس کی گہری شناسائیوں کی جگہ تھی۔''

''جی سر! بالکل ......''

''خیر! تم اب دن رات اس کی نگرانی جاری رکھو میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔'' اور پھر اسی رات طاہر علی نے نیرہ بیگم سے بات کی۔

''نیرہ! مجھے اپنا سنگھاسن ڈولتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ ...... میری سمجھ میں تو ایک لفظ نہیں آیا آپ کی باتوں کا۔''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری کشتی ڈول رہی ہے۔''

''اب بھی نہیں سمجھی۔''

''تو تم پاگل ہو۔'' طاہر علی جھنجھلا کر بولے۔

''ہو سکتا ہے ...... مگر سنگھاسن، کشتی کچھ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میں صفورہ کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔''

''کیا ......؟''

''اسے ایک ایسی جگہ جاتے ہوئے دیکھا جا رہا ہے جو یہاں کی بدنام ترین جگہ ہے ...... کیا وہ کالا جادو سیکھنا چاہتی ہے ......؟''

''کالا جادو ....''

''ہاں ....''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ...... آپ کس بنا پر یہ بات کہہ رہے ہیں۔''

''یہاں ایک آشرم ہے جس کا سربراہ ایک ٹنڈن گوپال نامی شخص ہے اور وہ یہ آشرم چلاتا ہے۔''

''یہ تو بڑی خوفناک بات ہے ...... میں اس سے پوچھوں گی کہ وہ وہاں کیوں جاتی ہے۔''

''نہیں ...... نہیں بالکل نہیں ...... اگر تم نے اس سے پوچھ لیا تو کام خراب ہو جائے گا۔''

''تو پھر کیا کریں ......؟''

''کچھ سوچنا ہو گا نیرہ ...... کچھ سوچنا سمجھنا ہو گا ...... اصل میں سب سے بڑی برائی ان مغربی ممالک میں یہی ہے کہ یہاں فحاشی، بدکاری، برائی بالکل عام ہے اور وہ اس لئے کہ یہاں اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارے اقدار، ہمارے حالات، ہمارا مذہب ان سے بہت مختلف ہے۔ ان کا اپنا مذہب بھی بہت اعلیٰ تھا کیونکہ یہ بھی بہرحال اہل کتاب ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی کی کتاب بالکل بدل ڈالی ہے اور اسے تہذیبی ترقی کا نام دے دیا ہے۔ بہرحال ہمیں اس سے بحث نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس وقت بہت بڑی مصیبت کا شکار ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''سوچئے ...... خدا کے لئے سوچئے ...... میں تو عورت ہوں، ظاہر ہے میرا ذہن بھی محدود ہے اور میرے وسائل بھی ...... آپ ہی کوئی مناسب فیصلہ کیجئے۔''

''ہاں ...... سنجیدگی سے یہ فیصلہ کرنا ہو گا۔'' طاہر علی نے جواب دیا۔ طویل عرصے سے لندن میں رہ رہے تھے۔ بہت سے وسائل بنا لئے تھے۔ کاروبار اپنی جگہ اکلوتی بیٹی کے لئے ہی بعد کے سارے معاملات تھے۔ تفصیلات سن کر دل ایک دم سے خراب ہو گیا تھا۔ تاہم حوصلے سے کام لیا اور ٹنڈن گوپال کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو مقرر کر دیا۔ دولت اگر خرچ کی جائے تو کون سا کام نہیں ہو جاتا حالانکہ ٹنڈن گوپال ویسے بھی مشہور آدمی تھا۔ اس کی رپورٹ جیسا کہ طاہر علی صاحب کو ملی تھی وہ یہی تھی کہ لندن کے بااثر حلقوں میں اس سے نفرت کی جاتی ہے اور اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا لیکن اس کے وسائل اس قدر بے پناہ ہیں کہ کوئی اسے نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا۔ یہ رپورٹ دو آتشہ ہو گئی۔ جب لوگوں نے طاہر علی کو خبر دی۔

''ٹنڈن گوپال ایک بدکار شخص ہے ...... جادو ٹونے کرتا ہے ...... لوگ اسے اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کے لئے بھاری رقمیں ادا کرتے ہیں ...... وہ ان رقموں سے اپنے آشرم کو شاندار کر رہا ہے ...... رقومات دے کر اس نے بہت سے غنڈے پال رکھے ہیں جو اسے نقصان پہنچانے والوں کو زندگی تک سے محروم کر دیتے ہیں ...... سرکاری حلقوں میں اس کے بارے میں بڑی تشویش پائی جاتی ہے ...... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت بڑی گڑبڑ کرا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے آشرم میں جانے والوں کا آخر کار کوئی دین دھرم نہیں رہتا ...... وہ بے دھرم ہو جاتے ہیں اور صرف کالی دیوی کو مانتے ہیں جو دنیا کی برائیوں کی جڑ ہے ...... مرد اور عورتوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے ...... سب ایک حمام میں ننگے ہیں۔''

طاہر علی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑے جا رہے تھے۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں آخر کار انہوں نے نیرہ بیگم سے کہا۔

''اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے نیرہ کہ تم جس قدر جلد ممکن ہو سکے صفورہ کو لے کر وطن واپس چلی جاؤ۔ میں وہاں سارے انتظامات کیے دیتا ہوں۔ بعد میں، میں اپنے کاروبار کو سمیٹوں گا۔ دو ہی صورتیں ہیں یہاں پر یا تو میں ایسے ذمے دار لوگوں کو متعین کر دوں گا جو میری غیر موجودگی میں میرے کاروبار کو میری ہی طرح سنبھالیں پھر میں یہاں کا چکر بھی لگایا کروں گا۔ فی الحال تم ایسا کرو کہ کوئی بہتر بہانہ کر کے

اسے لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔ کچھ وقت بعد میں بھی پہنچ جاؤں گا۔"
"اتنی جلدی کیوں کر رہے ہیں۔" نیرہ بیگم نے پوچھا۔
"تمہیں بتایا جا چکا ہے پھر بھی ایک احمقانہ سوال کر رہی ہو...... جس شیطان کے جال میں یوں پھنس گئی ہے اس کے جال میں پھنسنے کے بعد لوگ اپنا دین و ایمان اپنا سب کچھ ہار بیٹھتے ہیں۔ وہ شیطان اپنی شیطانی چالوں سے اپنے چیلوں کو شیطان کا چیلہ بنا دیتا ہے اور پھر ان سے نجانے کیا کام لیتا ہے۔ بہرحال یہ بہت ضروری ہے۔ میں اپنا برسوں کا لگا بندھا کام چھوڑ کر بلاوجہ ہی وطن واپس نہیں بھاگ رہا۔"
"وہ تیار ہو جائے گی......؟" نیرہ نے سوال کیا۔
"بالکل تیار نہیں ہو گی...... اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے...... سفر کی تیاریاں میں کیے دیتا ہوں...... تمہارا سامان بھی پہلے سے ایئر پورٹ پہنچا دوں گا...... تم دونوں ماں بیٹیاں وہاں جاؤ اور جہاز میں بیٹھ کر وطن واپس چلی جاؤ...... میں حاجی عطاء صاحب کو فون کر کے تمام تیاریاں مکمل کر لینے کی ہدایت کیے دیتا ہوں۔" طاہر علی صاحب نے کہا اور یہ بیگم تیار ہو گئیں۔

بہت ہی خفیہ طریقے سے تمام انتظامات کیے گئے۔ بڑا نازک مسئلہ تھا اگر صفورہ کو اس کی بھنک مل جاتی تو یہ لازمی امر تھا کہ وہ انکار کر دیتی کہیں چھپ جاتی یا کچھ اور کرتی۔ اسے ہر قیمت پر یہاں سے نکال لے جانا تھا۔ صفورہ واقعی ان معاملات سے بے خبر تھی۔ اس کے اپنے مشاغل بدل چکے تھے۔ اب لندن کے آشرم میں اس کے بہت سے ملاقاتی بن گئے تھے۔ دوست بھی بدلتے جا رہے تھے۔ اپنے پرانے دوستوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ بس آشرم میں خوش رہتی تھی۔ یہاں اسے کالے جادو کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی جا رہی تھیں۔ کیا ہی جنتر منتر سیکھے تھے اس نے اور اس پر تجربے بھی کرتی رہتی تھی پھر اس دن وہ رات کو گھر آئی تو نیرہ بیگم جاگ رہی تھیں اور انہوں نے ایک کارڈ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔
"وطن سے آیا ہے...... میری ایک بہت ہی عزیز سہیلی جس کا میرا بچپن سے ساتھ تھا کی بیٹی کی شادی ہے اور وہ پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ میں وہاں جاؤں۔"
"آپ بھی کیا باتیں کرتی ہیں ممی! اپنے قریبی رشتہ دار ہوں کوئی ایسی بات ہو جس میں جانے کا کوئی مقصد بھی ہو تب تو ٹھیک ہے ورنہ اتنا لمبا فاصلہ طے کر کے جانا تو بالکل بے معنی سی بات ہے۔" نیرہ بیگم خاموش ہو گئیں۔ یہ ایک جائزہ تھا جو انہوں

نے لیا تھا۔ یہاں طاہر علی صاحب کی بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ اگر صفورہ سے کہا جائے تو وہ تیار ہی نہیں ہو گی آزاد اور سرکش لڑکی ہے۔ کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے۔ گھر سے غائب بھی ہو سکتی ہے پھر اس شام منصوبے کے مطابق جب وہ جانے کے لئے تیاریاں کر رہی تھی اچانک ہی نیرہ بیگم نے کہا۔
"صفورہ! کہاں جا رہی ہو۔"
"کلب ممی......!"
"تمہیں ذرا میرے ساتھ چلنا ہے۔"
"کہاں......؟" صفورا نے پوچھا۔
"صفورا! کبھی کبھی تم زیادتی نہیں کرنے لگتی ہو میرے ساتھ۔"
"کیسی زیادتی ممی...... کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے...... کیا، کیا ہے میں نے۔ مجھے بتائیے تو سہی......؟"
"میں ایک بات کہہ رہی ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے...... اب بیٹھ کے وضاحت کروں۔" صفورا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کوئی خاص پروگرام نہیں تھا آج کا۔ بس ایسے ہی وقت گزاری کے لئے کلب جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ مسکرا کر بولی۔
"نہیں ماما! ٹھیک ہے...... چلئے نہیں پوچھتی آپ سے...... جہاں دل کرے چلیں۔" نیرہ بیگم نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی تھی۔ انہی الفاظ کی منتظر تھیں وہ۔ بہرحال خوش ہوئیں اور اس کے بعد انہوں نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ صفورا کو ساتھ لے کر ایئر پورٹ چلی گئیں۔ ایئر پورٹ کا نام سن کر صفورا نے کہا۔
"سمجھ گئی...... سمجھ گئی...... ضرور کوئی آ رہا ہے...... لیکن جب وہ ایئر پورٹ میں اندر داخل ہوئی تو وہ حیران رہ گئی۔
"مما...... کیا ہم کہیں جا رہے ہیں؟"
"تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گی۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......" بورڈنگ کارڈ وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے نیرہ بیگم لاؤنج میں پہنچیں اور اس کے بعد وہاں سے جہاز تک تو صفورہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔
"ممی! اب تو مجھے کم از کم یہ معلوم ہونا چاہیے......"

"آؤ ..... بتا دوں گی۔" نیرہ بیگم نے سرد لہجے میں کہا۔ اب انہیں ایک سخت فرض سرانجام دینا تھا۔ صفورا بادل نخواستہ ہی شکار ہوئی تھی۔ پھر جب جہاز نے فضا کی جانب سفر کیا تو وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔

"آخر ہم جا کہاں رہے ہیں۔"

"اپنے وطن ....." نیرہ بیگم نے جواب دیا۔

دو دن پرسکون گزر گئے۔ ان دو دنوں میں ہارون اور کامران نے مل کر کافی کام نمٹا لیا۔ اوورسیئر اور دوسرے ٹیکنیکل افراد بھی محنت سے اپنا کام کر رہے تھے پھر کامران نے کہا۔

"میرا خیال ہے سر! اتنا کام کر چکے ہیں اور ہم نے ایسا گراؤنڈ بنا دیا ہے کہ اب ہم تین چار دن تک مصروف بھی رہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"ہاں ..... میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا ویسے تم نے محسوس کیا ہے کہ پازیبیں چلے جانے کے بعد حالات خاصے پرسکون ہیں۔"

"جی سر.....!"

"ویسے کیا خیال ہے کامران! ایک دوست کی حیثیت سے تم سے مشورہ کر رہا ہوں۔ ہمیں اس سلسلے میں مزید آگے بڑھنا چاہیے یا نہیں۔"

"سر! وہ جو کہتے ہیں کہ تجسس بھی ایک شراب کی مانند ہے جس کا نشہ مشکل ہی سے چھوٹتا ہے۔ جو واقعات پیش آ سکتے ہیں، اگر ان کی تردید نہ ہوئی تو کیا آپ سکون سے رہ سکیں گے۔ کم از کم میں تو نہیں رہ سکتا۔" ہارون ہنسنے لگا پھر بولا۔

"یار! میری تو زبردستی کی بیوی کا معاملہ ہے پتہ نہیں چندربدن، گجراج کے لئے ستی ہونا پسند کرے گی یا نہیں ..... ویسے ایک بات کہوں کامران، گجراج نے تو اس رات یہ اعتراف کر لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن چندربدن نے آج تک اپنے آتما ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔"

"سوچتے رہیے ہارون صاحب ..... سوچتے رہیے اور سوچتے ہی رہیں گے اگر صورت حال کی وضاحت نہ ہوئی۔"

"ویسے یار! تم بھی مزے کے آدمی ہو۔" ہارون نے کامران کو دیکھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

"کیوں سر ..... !"

''جب مجھ پر آ پڑتی ہے تو دم دبا کر بھاگ جاتے ہو ورنہ اس طرح دلچسپی کا اظہار کرتے ہو جیسے مجھ سے زیادہ تمہیں ان معاملات سے دلچسپی ہو۔''

''سر! ایک بات بتاؤں آپ کو، دلچسپی تو مجھے واقعی ہے لیکن میں ذرا کمزور دل واقع ہوا ہوں۔''

''تو پھر بولو......''

''میرا خیال ہے ہمیں اپنے ارادوں کو ملتوی نہیں کرنا چاہیے۔ سہائے پور ویسے بھی ایک کام کی جگہ ہے جب ہم ان ڈھلانوں سے اتر کر پرانے سہائے پور میں کام کریں گے تو پھر ہمارا تعلق نئے سہائے پور سے ضرور رہے گا اور ویسے بھی سر ابھی تک تو ہماری شہر سے لائی ہوئی چیزیں چل رہی ہیں لیکن خوراک اور دوسری اشیاء کی ضرورت کے لئے ہمیں آخر کار نئے سہائے پور سے رجوع کرنا ہوگا۔ اگر ہم پہلے ہی سے واقفیت حاصل کر لیں تو کیا حرج ہے۔''

بہرحال ہارون نے کامران کو مکمل طور پر مستعد اور تیار پایا تو اس کا بھی موڈ بن گیا۔ ابھی تک اس نے افشاں کو اپنے ان پراسرار معاملات کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہاں اس رات جو واقعہ پیش آیا تھا وہی افشاں اور رشیدہ کے لئے کافی تھا۔ اگر مزید اسے کچھ بتا دیا جاتا تو صورت حال کافی خراب ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے پچھلی رات بھی افشاں سے گفتگو کی تھی اور یہی کہا تھا کہ حالات پرسکون چل رہے ہیں۔ کام ہو رہا ہے اور وہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جیپ تیار ہوئی تو کامران نے آ کر اسے اطلاع دی اور ہارون بھی تیار ہو گیا پھر ان کی جیپ ڈھلانوں کی جانب چل پڑی۔ نئے سہائے پور جانے کے لئے پرانے سہائے پور کے کھنڈرات سے گزرنا ضروری ہوتا تھا۔ ڈھلان عبور کرنے کے بعد درختوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہی درختوں کی دوسری طرف سہائے پور تھا۔ دن کی روشنی میں بھی یہ کھنڈرات نہایت بھیانک منظر پیش کر رہے تھے۔ کامران نے متاثر لہجے میں کہا۔

''شہر کا شہر تباہ ہو گیا...... لازمی بات ہے کہ اس کی تباہی کا کوئی پس منظر ہوگا۔ ویسے کیسا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ کبھی ان کھنڈرات کے درمیان بھی زندگی ہوگی۔ یہاں لوگ چلتے پھرتے ہوں گے۔ دکانیں لگتی ہوں گی۔ بازار سجتے ہوں گے۔ سہائے پور کی خوبصورت حسینائیں یہاں چہلیں کرتی ہوں گی۔ آج یہ کس قدر سنسان اور ویران پڑا ہے۔ آپ یقین کریں سر! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ابھی ان کھنڈرات کے

درمیان سے بے شمار لوگ نمودار ہو جائیں گے اور ہم سے پوچھیں گے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اس پر ایک عجیب سے سحر کی کیفیت طاری تھی۔ کامران نے بھی ہارون کو خاموش پایا تو خاموشی ہی اختیار کر لی۔ اچھے خاصے وسیع و عریض علاقے میں یہ کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے اور پھر ان کا اختتام ہو گیا اور وہ دور سے نئے سہائے پور کو دیکھنے لگے۔ اس اختتام کے فوراً بعد سہائے پور کی عمارتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ ابتداء میں سرسبز و شاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان پھیلی ہوئی پگڈنڈیاں ناگوں کی طرح لہراتی ہوئی نجانے کہاں سے کہاں چلی جاتی تھیں۔ کامران نے کہا۔

''سر! یہاں کوئی باقاعدہ سڑک نظر نہیں آتی۔''

''وہ، ادھر دیکھو...... اس طرف...... اس طرف۔'' ہارون نے اشارہ کیا۔ کافی فاصلے پر اکا دکا ٹرک اور دوسری گاڑیاں جاتی ہوئی نظر آئیں۔

''ظاہر ہے ہم جس علاقے سے آئے ہیں وہ عام راستے سے ہٹ کر کافی فاصلے پر ہے۔ یہاں سڑکیں ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔''

''ہمیں انہی پگڈنڈیوں سے گزر کر سہائے پور تک پہنچنا ہوگا۔'' کامران نے کہا۔

''ہاں...... پگڈنڈیاں اتنی چوڑی ہیں کہ جیپ آسانی سے ان پر اپنا سفر طے کر سکتی ہے۔'' جیپ اس وقت خود ہارون ڈرائیو کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک پگڈنڈی منتخب کی اور جیپ اس پر آگے بڑھا دی۔ تھوڑا اور فاصلہ طے کرنے کے بعد آبادی نظر آنے لگی۔ اکا دکا انسان ان کھیتوں پر کام کر رہے تھے جنہوں نے گردنیں اٹھا اٹھا کر جیپ کو دیکھا پھر پگڈنڈی کے اختتام پر سپاٹ میدان شروع ہو گئے۔ یہاں بھی کچھ لوگ کھیت میں کام کر رہے تھے۔ یہاں ہارون نے جیپ روکی اور ایک آدمی کو اشارے سے بلایا۔ وہ شخص نیاز مندی سے ہارون کے پاس پہنچ گیا۔

''سلام بابو جی!''

''سلام بھائی! سہائے پور یہی ہے۔''

''ہاں جی...... سہائے پور یہی ہے۔''

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ یہاں کوئی مسافر آتا ہے تو کہاں ٹھہرتا ہے؟''

''بابو لال کی سرائے میں۔ سب سے بڑی سرائے وہی ہے۔''
''بتاؤ گے کس طرف ہے......؟''
''وہ جو اوپر لال پتھر کا مینار نظر آ رہا ہے وہی بابو لال کی سرائے ہے۔''
''بہت بہت شکریہ تمہارا......''
''سلام جی! جائیں......؟'' اس شخص نے کہا۔
''ہاں...... اپنا کام کرو۔'' جیپ وہاں سے آگے بڑھ گئی تو کامران نے کہا۔
''بالکل صحیح طریقہ کار ہے...... ہمیں سب سے پہلے اپنے کسی ٹھکانے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو حالات معلوم کرنے کے لئے ہم اپنے گھر سے باہر نکلے ہیں، انہیں جاننے میں ہمیں کافی وقت صرف کرنا ہو گا۔''
''اس میں کیا شک ہے۔'' ہارون نے جواب دیا۔ بابو لال کی سرائے کافی بڑی تھی۔ وہاں تک آتے ہوئے انہوں نے سہائے پور کی آبادی کو دیکھا تھا۔ آبادی بہت کم تھی۔ جگہ جگہ کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان میں اکا دکا دکانیں بھی تھیں۔ ایک باقاعدہ بڑا بازار بھی تھا۔ بابو لال کی سرائے کا احاطہ بھی کافی وسیع و عریض تھا۔ یہاں کمرے بنے ہوئے تھے وہ بھی کچی پکی چھتوں کے بنے تھے۔ بابو لال دبلے پتلے بدن کا مالک لیکن بہت خوش اخلاق آدمی تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے ان کا خیر مقدم کیا اور بولا۔
''شہر سے آئے ہو بابو صاحب جی......؟''
''ہاں...... بابو لعل ہے تمہارا نام......؟''
''یہ حرام جادے بستی والے ہمیں بابو لعل، بابو لعل کہتے ہیں...... ہمارا نام بابو لعل نہیں ہے بابو جی...... بلکہ ہمارا نام ہے لعل بابو...... اماں پیار سے میرا لعل کہتی تھیں اور ابا بابو...... بس مل کر لعل بابو ہو گیا۔ ویسے اصلی نام ہمارا شبراتی ہے۔''
''مسلمان ہو......''
''اللہ کا کرم ہے جی...... نماز بھی پڑھتے ہیں روزے بھی رکھتے ہیں۔''
''بابو لعل ایک کمرہ دے دو ہمیں کرائے پر۔''
''جی صاحب جی...... دونوں ساتھ ہی رہو گے۔''
''ہاں......''
''بڑا اچھا کمرہ ہے ہمارے پاس......'' بابو لعل نے کہا اور ایک کمرے میں ان

لوگوں کو پہنچا دیا۔ کمرہ اچھا خاصا وسیع تھا۔ سہائے پور کی آبادی کے لحاظ سے بس ٹھیک ٹھاک تھا۔ روشن اور ہوا دار تھا۔
''ٹھیک ہے بابو جی......!''
''ہاں لعل بابو! کتنے پیسے۔''
''صاحب جی! جو آپ دیں گے ہم خوشی سے لے لیں گے...... مہمانوں سے تو پیسے مانگنے میں بھی شرم آتی ہے...... پر کیا کریں، روزی ہے۔ اللہ نے یہی روزی لکھی ہے ہماری۔''
''پھر بھی کیا لیتے ہو تم دوسروں سے۔''
''بیس روپے روز جی۔''
''یہ رکھو...... ایک ہفتے کے پیسے رکھ لو...... کھانے پینے کا جو بھی حساب ہوا کرے گا، وہ الگ۔''
''ٹھیک ہے بابو جی! بہت بہت شکریہ آپ کا۔'' لعل بابو نے پیسے لے کر شلوکے کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔
''اب یہ بتائیے صاحب جی کہ چائے بنائیں یا لسی پلائیں؟ گھر کی جمی ہوئی دہی بھی ہے اور چائے کا سارا سامان بھی۔''
''چائے ہی پئیں گے ہم لوگ۔''
''شہری بابو چائے ہی پیتے ہیں۔'' بابو لعل نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ کامران گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔
''ویسے زندگی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ویسے آبادی بہت چھوٹی سی ہے۔''
''ہاں...... ہے تو چھوٹی سی ہی۔''
بابو لعل چائے بنا کر لے آیا تھا۔ بڑی اچھی چائے تھی۔ ہارون نے اس سے کہا۔
''لعل بابو! یہاں ان کھنڈرات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو جو پرانے سہائے پور کے ہیں؟''
''بس اتنا جانتے ہیں صاحب جی کہ سو سال پہلے یہ سارے کھنڈرات آباد تھے۔ مگر یہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ پھر صاحب جی کوئی آفت آئی تھی۔ کوئی بیماری پھیل گئی تھی۔ زمین ہلی تھی یا کوئی اور چکر تھا۔ ہر آدمی الگ الگ بات کرتا ہے۔ لیکن سہائے پور کی ساری آبادی ختم ہو گئی تھی۔ بعد میں آس پاس کے لوگ یہاں آ کر جمع

ہوئے اور یہاں آ کر آباد ہو گئے کیونکہ تھوڑے ہی فاصلے پر پانی بھی ہے اور اچھی فصلیں بھی ہوتی ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں صاحب جی انسان کو اس کی ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں تو بستیاں آباد ہو جاتی ہیں۔ سہائے پور نیا نہیں ہے۔ پرانے لوگ جو ادھر ادھر رہ گئے تھے اور تباہی کے وقت سہائے پور میں نہیں تھے وہ یہاں آ گئے ہیں۔ آپ کیا ان کھنڈرات پر کچھ معلوم کر رہے ہو صاحب جی؟'' لعل بابو خاصا ذہین آدمی تھا۔

''تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''نہیں صاحب جی! تھوڑے دن پہلے کچھ بندے ادھر آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ سہائے پور پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں بھی نانا غلام حسین کے پاس بھیج دیا تھا۔''

''نانا غلام حسین؟''

''ہاں بابو جی۔ آپ کو شاید اس بات پر تعجب ہو۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ایک بار نانا غلام حسین کو اخبار والوں نے بھی چھاپا تھا وہ جو کیا کہتے ہیں، ہمیں کہنا نہیں آتا۔ وہ جو انگریزی میں بولتے ہیں۔''

''انٹرویو۔''

''وہی...... وہی......''

''کیوں...... ایسی کیا بات ہے نانا غلام حسین میں؟''

''صاحب جی! شاید وہ ہمارے پورے ملک کے سب سے زیادہ عمر والے آدمی ہیں۔ ان کی عمر کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ خود انہیں بھی نہیں معلوم۔ نجانے کب کب کی باتیں بتاتے ہیں۔ دونوں بڑی جنگیں انہوں نے نہ صرف دیکھی ہیں بلکہ جب پہلی جنگ ہوئی تھی تو وہ بال بچوں والے تھے بلکہ ان کے بال بچے بھی جوان ہو چکے تھے۔''

''اوہ...... تب تو واقعی کافی عمر ہوئی ان کی۔'' کامران نے کہا۔

''سب سے بڑی بات یہ ہے جی کہ آج بھی سو جوانوں کے جوان ہیں۔ سیدھے چلتے ہیں۔ اپنے سارے کام خود کرتے ہیں۔ آنکھیں بھی ٹھیک کام کرتی ہیں۔ آپ دیکھو گے تو سوچو گے ہی نہیں کہ اتنی عمر والے ہیں۔''

''مل سکتے ہیں ان سے؟''

''آتے ہی ہوں گے جی...... بس شام ڈھلی اور وہ پہنچ گئے۔ یہیں بیٹھتے ہیں ہمارے پاس۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ہم ذرا سہائے پور کی سیر کر لیں۔''

''کر لو جی...... کر لو...... سو گز اِدھر، سو گز اُدھر...... اور کیا رکھا ہے سہائے پور میں۔''

لعل بابو کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ سہائے پور واقعی بہت چھوٹی آبادی تھی لیکن صاف ستھری اور خوبصورت۔ وہ واپس اسی سرائے میں پہنچ گئے اور پھر شام کو چار بجے سرائے کی صفائی وغیرہ ہوئی، چار پائیاں وغیرہ بچھ گئیں۔ لوگ آنا شروع ہوئے۔ اور پھر نانا غلام حسین آ گئے۔ دور ہی سے انہیں آسانی سے پہچان لیا گیا تھا۔ لعل بابو نے خاص طور سے ان لوگوں سے ان کا تعارف کرایا اور مسکرا کر بولا۔

''بس نانا جی...... آپ کے بچے ہیں۔ کہتے تھے نانا جی سے ملنا ہے، بات چیت کرنی ہے۔''

''ہاں...... ہاں...... سمجھ گیا، پرانے سہائے پور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئے ہوں گے۔ ارے بھائی ان شہری بابوؤں کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ اپنے مطلب کے لئے سب کچھ کرتے ہیں۔''

''نہیں نانا صاحب...... ہم آپ کی بھی ہر خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ویسے واقعی اللہ نے آپ کو بڑی اچھی صحت دی ہے۔''

''لگا دو...... لگا دو، نظر لگا دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے۔ لگا دو نظر۔''

''نہ...... نہ...... نہ...... ہم بھلا کیوں لگائیں گے آپ کو نظر۔''

''چلو چھوڑو، مذاق کر رہا ہوں۔ پرانے سہائے پور کے بارے میں ہی پوچھنا چاہتے ہو نا؟''

''ہاں...... چاہتے تو ہیں۔''

''بس...... کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔ تم یہ سمجھ لو کہ بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو کھوپڑی میں نہیں آتیں۔ انسان سنتا ہے اور سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ کیا سچ ہے کیا جھوٹ۔ ویسے تم پرانے سہائے پور کے کھنڈرات کے بارے میں معلومات حاصل کر کے کیا کرو گے؟''

''آپ کو سچی بات بتانے میں کوئی دقت تو محسوس نہیں ہو رہی نانا صاحب! اصل

یں آپ یوں سمجھ لیں کہ وہاں کچھ ایسے پراسرار واقعات [illegible] ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کھنڈرات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم گورنمنٹ کے لوگ ہیں اور وہاں کچھ تعمیراتی سلسلے میں نشانات وغیرہ لگا رہے تھے کہ کچھ ایسے معاملات پیش آ گئے۔''

''تب تو پھر میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔''

''جی فرمایئے......؟''

''میں تو خیر تمہیں پرانے سہائے پور کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات بتا ہی دوں گا لیکن تم گلزاری سے ضرور مل لو۔''

''گلزاری کون!؟''

''اگر واقعات پراسرار ہیں تو پھر گلزاری ہی تمہیں صحیح طریقے سے بتا سکے گا۔''

''گلزاری کہاں رہتا ہے؟''

''پرانے سہائے پور میں۔''

''کیا......؟'' ہارون اور کامران دونوں اچھل پڑے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی پھر ہارون نے پریشان لہجے میں کہا۔

''مگر وہاں تو کوئی آبادی نہیں ہے۔''

''ہاں...... آبادی تو نہیں ہے پر رام گلزاری وہیں رہتا ہے۔ سسرا انسان ہے یا بھوت، ابھی تک پتہ ہی نہیں چل سکا۔''

''تو رام گلزاری ہمیں ان واقعات کے بارے میں کیا بتا سکے گا؟''

''بہت کچھ بتائے گا وہ تمہیں۔ تم دیکھو گے تو تمہیں بہت پراسرار لگے گا۔''

''تو پھر آپ ہمیں ان کا پتہ دیجئے۔''

''ارے پتہ کیا بتا دیں، ہم خود چلیں گے تمہارے ساتھ۔ تمہیں چھوڑ کر آئیں گے اس کے پاس۔ وہ تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔''

ہارون کو نجانے کیوں ایک عجیب سے خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کامران کو دیکھا تو کامران بولا۔

''ٹھیک ہے باس! اگر نانا صاحب ہمیں وہاں لے جا رہے ہیں تو ظاہر ہے ہمیں وہاں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔''

''بالکل نہیں...... تم اس سے ملو، اس سے بات کرو۔ دیکھو گے تو ہنسی نکل جائے

گی تمہاری۔

پھر نانا غلام حسین ان دونوں کو واپس ان کھنڈرات تک لے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر ان کی عمر اتنی ہی تھی تو ان کی صحت کو قابل رشک کہا جا سکتا تھا۔ اچھا خاصا لمبا فاصلہ طے کیا تھا انہوں نے اور پھر وہ کھنڈرات کے ایک ایسے حصے میں پہنچ گئے جہاں ایک نہایت اونچی دیوار کھڑی ہوئی تھی۔ دیوار کے پیچھے ایک کٹیا بنی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ یہاں نہیں آئے تھے۔ ان کی نگاہیں کھنڈرات میں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔

نانا غلام حسین نے کہا۔

''ارے او رام گلزاری...... مہمان آئے ہیں تیرے سنا۔ لے، میں تیرے مہمانوں کو یہاں تک پہنچانے جا رہا ہوں۔ ان کا کام کر دینا۔ جو یہ کہہ رہے ہیں بتا دینا۔''

جواب میں کٹیا سے ایک ایسا آدمی نکلا کہ ان دونوں کا وہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہا۔ اس کی کھوپڑی بہت بڑی تھی اور بدن نہ ہونے کے برابر تھا۔ سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں۔ سوکھی ٹانگیں۔ ایک ایک پسلی صاف دیکھی جا سکتی تھی کیونکہ اس نے صرف نچلے بدن پر دھوتی پہن رکھی تھی۔ مکروہ سی شکل کا مالک تھا بالکل۔ انسان سے زیادہ ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ نانا غلام حسین کو دیکھ کر مسکرایا۔

''پھر کوئی مصیبت لے آئے میرے لئے نانا جی؟''

''ارے مصیبت کے بچے! مہمان تو اللہ کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ تُو خود بھی تو یہی کہتا رہا ہے۔ مگر تیری بھی تو عادت ہی ہے۔ پہلے ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔''

''میں چارپائی بچھاتا ہوں بھیا جی! بیٹھ جاؤ۔''

''ہم چلتے ہیں۔''

''بیٹھو نانا جی! کچھ جل پانی۔'' رام گلزاری بولا۔

''نہیں بس ٹھیک ہے...... اچھا تم لوگ بیٹھو۔ کل شام کو سرائے میں ہی ملاقات ہو گی۔''

نانا غلام حسین واپس چلے گئے۔ رام گلزاری نے ایک چارپائی بچھا دی تھی۔ اس پر دری اور چادر بچھائی اور بولا۔

''بیٹھ جاؤ بابو جی! غریب کی کٹیا میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا۔ بکری

کا دودھ بھی رکھا ہوا ہے اور ہرے ہرے بیر بھی۔ کھاؤ گے؟"

"نہیں رام گلزاری...... مگر تمہاری یہ کیفیت ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یہ سب کیسے ہوا ہے؟" ہارون کی دلچسپیاں ابھر آئی تھیں۔ وہ ایک کٹے ہوئے درخت کے ٹھنے پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا۔

"بس جی اپنی اس حالت کے بارے میں کیا بتائیں۔ یوں سمجھ لیجئے، یہیں سارا جیون بیتا ہے۔ سسرے چھوڑ کر بھاگنے والے بھاگ گئے۔ پر اپنی جنم بھومی کو کون چھوڑتا ہے۔ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ ماتا پتا نے نام رکھا رام گلزاری۔ پورا پریوار تھا ہمارا۔ چاچا جی بڑے عیاش اور خود غرض آدمی تھے۔ زمین کے لالچ میں انہوں نے ہمارے پتا جی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود ہماری زمینوں وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ صاحب جی! میری عمر اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ جائیداد پر قبضہ کرنے کے بعد میرے چاچا نے مجھے اور میری ماں کو مار پیٹ کر سہائے پور سے نکال دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر ہم نے ادھر کا رخ کیا تو وہ ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔

میری ماں مجھے لے کر [illegible] کے گاؤں پہنچ گئی۔ وہاں میرے باپ کے دوست نے ہمیں سہارا دیا۔ پتا جی کا دوست رام [illegible] ایک بہت ہی اچھا اور ایماندار آدمی تھا اور اس نے صحیح معنوں میں دوستی کا حق ادا کر دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے قد کا آدمی تھا۔ اس لئے سب اسے ٹنگو، ٹنگو کہتے تھے۔ چاچا ٹنگو سادھوؤں اور سنتوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ نئے گاؤں میں ایک میلہ ہر سال لگا کرتا تھا اور دور دور سے سادھو اس میلے میں آتے تھے۔ چاچا ٹنگو بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ اس میلے میں جاتا تھا اور وہ جب بھی جاتا مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔ پتہ نہیں کون سا مہینہ تھا، میلے میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے کہ ہمارا چاچا اپنے تین چار ساتھیوں کے ساتھ ہمارے گھر میں گھس آیا۔ ہم نے اس کی خاطر تواضع کرنے کی کوشش کی تو اس نے بڑے سخت لہجے میں میری ماں سے کہا کہ وہ اسی وقت اپنی جائیداد سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دے اور ایک کاغذ پر انگوٹھا لگا دے۔

میری ماں جانتی تھی کہ میرا چاچا بہت ظالم آدمی ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تو وہ ظالم کہیں مجھے بھی اسی طرح قتل نہ کر دے جس طرح اس نے میرے پتا جی کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ اس خوف سے انہوں نے

ان کاغذوں پر انگوٹھے لگا دیئے۔ میری ماں کا خیال تھا کہ کاغذات پر انگوٹھے وغیرہ لگوانے کے بعد وہ ظالم ہمارا پیچھا چھوڑ کر چلا جائے گا مگر اس کا تو ارادہ ہی کچھ اور تھا۔ چنانچہ اس نے جائیداد کے کاغذات اپنے ساتھیوں کے حوالے کر کے انہیں روانہ کر دیا اور اپنے بارے میں کہا کہ وہ ایک دن ٹھہر کر جائے گا۔ مجبوراً ماتا جی اور چاچا ٹنگو کو اس کی خاطر مدارات کرنی پڑی۔

رات ہوئی تو سب اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے۔ لیکن دوسری صبح میرے لئے قیامت سے کم نہیں تھی۔ میرے اس سنگدل چاچا نے رات میں نجانے کس لمحے میری ماں کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا تھا اور خود فرار ہو گیا تھا۔ میں بہت رویا پیٹا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد اس بھری پری دنیا میں چاچا ٹنگو کے علاوہ میرا کوئی نہیں تھا۔

اس کے بعد کچھ اور سمے گزر گیا۔ میں اب جوان ہو گیا تھا اور چاچا ٹنگو کے کام میں ان کی مدد کرتا تھا۔ لیکن ایک لمبی مدت گزرنے کے بعد بھی جب مجھے اپنے ماتا اور پتا جی کی موت کا خیال آتا تو غصے اور انتقام کے جوش سے میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت میں گاؤں پہنچ کر اپنے قاتل چاچا کو ٹھکانے لگا دوں۔ لیکن چاچا ٹنگو ہمیشہ مجھے سمجھا بجھا کر اس ارادے سے باز رکھتا اور کہتا بیٹا! ابھی تیرے انتقام لینے کا وقت نہیں آیا ہے۔

بہر حال میلے کے سلسلے میں چاچا ٹنگو کے معاملات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی اسی سرگرمی سے میلے میں حصہ لیا کرتا تھا لیکن مجھے ان میلے ٹھیلوں سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ایک سال جب کہ چیت کا مہینہ تھا اور میلہ شروع ہونے میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے میں نے موقع غنیمت سمجھا اور چاچا ٹنگو سے گاؤں جانے کی اجازت لے لی۔ یہی سہائے پور تھا اور اس وقت آباد تھا۔ میرے بہت اصرار کرنے کے بعد چاچا ٹنگو نے میرے سنگدل چاچا کے بارے میں معلومات بتا دیں لیکن ساتھ ہی یہ قسم بھی لے لی کہ ابھی میں صرف اس سے مل کر آ جاؤں اور بدلہ وغیرہ لینے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے بھی سوچا کہ بہر حال ابھی جاؤں تو سہی دیکھوں کہ وہاں کے حالات کیا ہیں۔ چاچا کے معمولات کا پتہ کر آؤں اور اس کے بعد کسی مناسب موقع پر جا کر اس ظالم کا خاتمہ کر دوں۔

چنانچہ میں نے بھی چاچا ٹنگو سے وعدہ کر لیا اور دوسرے ہی دن صبح میں نے

گھوڑے پر زین کسی اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میرا گھوڑا بہت سمجھدار اور وفادار تھا۔ میں جب بھی اسے اس کا نام لے کر پکارتا وہ میرے پاس پہنچ جاتا۔ روانگی سے پہلے چاچا ٹنگو نے ایک بار پھر مجھے صبر سے کام لینے کی تاکید کی اور میں انہیں اطمینان دلا کر روانہ ہو گیا۔

سہائے پور وہاں سے تقریباً تیس میل دور تھا جہاں میں اس وقت رہتا تھا۔ میں جب سہائے پور سے آیا تھا تو اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے سہائے پور کا راستہ بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن میں نے چاچا ٹنگو سے پتہ پوچھ لیا تھا اور انہوں نے مجھے پتہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ میں گاؤں سے باہر نکلنے کے بعد نہر کے ساتھ ساتھ چلتا جاؤں۔ پھر جہاں کھجوروں کا ایک جھنڈ نظر آئے وہاں سے نہر کا راستہ چھوڑ کر دائیں ہاتھ کی طرف سڑک پر مڑ جاؤں۔ یہ کچی سڑک ہے اور اس جگہ سے سہائے پور دو میل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور جب نہر کے راستے چلتے چلتے کھجوروں کے درختوں کے پاس پہنچا تو میں دائیں سمت کچی سڑک پر مڑ گیا۔

آخر کار اس سڑک پر سفر کرتا ہوا میں سہائے پور پہنچ گیا۔ مگر اس دوران میں کافی تھک چکا تھا۔ تھوڑی دیر ستانے کے خیال سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ابھی میں دوبارہ چلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ادھر سے ایک دبلے پتلے بدن کا ایک ادھیڑ عمر آدمی گزرا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے میں نے اسے آگے جا کر پرنام کیا مگر اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب میں نے اس سے اپنے چاچا کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہم ایک بہت بڑے سرخ گھر کے پاس کھڑے تھے۔

''یہ ہے تمہارے چاچا کا گھر۔'' اس نے کہا اور اپنی راہ چلا گیا۔ اپنے قاتل چاچا کی شاندار حویلی دیکھ کر میرے دل میں نفرت کا جذبہ اور شدید ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ شخص میرے پتا جی کو قتل کر کے اور ساری جائیداد ہتھیا کر اب اس کے بل بوتے پر عیش کر رہا ہے۔ یہ حویلی اصولی طور پر میری ہے اور اس کے ساتھ ہی اور بہت کچھ۔ لیکن میرے مال پر دوسرے عیش کر رہے ہیں اور میں ایک وسیع جائیداد کا مالک ہونے کے باوجود مفلسی اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔

میرے دل میں نفرت کا جذبہ بڑھتے بڑھتے غصے اور جوش کی شکل اختیار کر گیا۔ لیکن پھر مجھے چاچا ٹنگو سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے

جذبات پر قابو پاتے ہوئے دروازے پر دستک دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور وہ میرے سامنے آ گئی۔ اس نے قدم باہر نکالے۔ شاید وہ کہیں جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹپٹا گئی مگر میں اسے گھورے جا رہا تھا۔ تم لوگ یقین کر لو کہ یوں تو سنسار میں بڑی بڑی حسین لڑکیاں بکھری پڑی ہیں مگر میں نے اپنی زندگی میں کوئی اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ شرما سی گئی پھر اس کی چاندی کی گھنٹیوں جیسی آواز ابھری۔

''کون ہو تم اور کس سے ملنا چاہتے ہو؟''

''میرا نام رام گلزاری ہے اور میں اپنے چاچا سے ملنا چاہتا ہوں۔''

میرا نام سن کر لڑکی کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے چونک کر گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لئے مجھے لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر دوسرے لمحے وہ واپس مڑ کر جانے لگی۔

''سنو، ذرا میری بات سنو۔'' میں نے اسے پکارا تو وہ رک گئی۔

''تم نے میرا نام تو پوچھ لیا مگر اپنا نام نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس گھر سے اس کا کیا تعلق ہے؟ لیکن اس کی من موہنی صورت پہلی ہی نگاہ میں میرے دل میں اترتی چلی گئی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے تاکہ اس سے دوبارہ ملاقات کی صورت نکالی جائے۔ کچھ لمحے تک وہ سوچتی رہی پھر اس کے بعد اس نے کہا۔

''میرا نام انامیکا ہے۔''

''بڑا سندر نام ہے۔''

''ویسے پیار سے مجھے لوگ رتنا کماری کہتے ہیں۔''

''لو...... یہ اس سے بھی زیادہ سندر نام ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس پڑی۔ پھر واپس گھر میں داخل ہو گئی۔ شاید اس نے اندر جا کر میرے آنے کے بارے میں کسی کو بتایا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد اندر سے ایک بوڑھا آدمی نکلا جو ملازم معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا۔

''آؤ جی..... اندر آ جاؤ۔'' اس نے حویلی کا دروازہ کھول کر مجھے وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ مالک ابھی آتے ہیں۔

کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بڑا سا ایک تخت رکھا ہوا تھا جس پر ایک سفید

چادر بچھی ہوئی تھی اور تین گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ تخت کے سامنے کئی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنے چچا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد میرے بائیں ہاتھ کی جانب سے ایک دروازہ کھلا۔ یہ وہ دروازہ نہیں تھا جس سے بوڑھا ملازم باہر گیا تھا۔ ایک عمر رسیدہ شخص جس کے خدوخال سے نحوست ٹپک رہی تھی بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی تیز نگاہوں سے مجھے گھورا اور بولا۔

''کیا تم میرے بھتیجے رام گلزاری ہو؟'' اس نے سرد اور ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

''ہاں..... میرا نام رام گلزاری ہے۔'' میں نے بھی سرد لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... یہاں کیوں آئے ہو؟''

''اپنی جائیداد واپس لینے جسے تم نے ناجائز طریقے سے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔'' میں نے بتایا اس وقت واقعی میرا ارادہ اس طرح کی باتیں کرنے کا نہیں تھا لیکن جس انداز میں اس نے میرا استقبال کیا تھا اس نے ایک بار پھر میرے غصے کو ابھار دیا تھا۔

''ہوں.....'' چاچا نے ایک گہری سانس لی پھر بولا۔ ''ابھی تم تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرو۔ ابھی ان باتوں کے لئے کافی وقت پڑا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف مانگ لینا۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے نزدیک یہ جملے بڑے محبت بھرے لہجے میں ادا کئے تھے مگر اس کے چہرے کی سختی اور تلخی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں تمہاری ان میٹھی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔

بہرحال چاچا نے یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد رخ بدلا اور پلٹ کر اسی دروازے سے اندر چلا گیا۔ میں نے یہاں بیٹھ کر ستانے کی سوچی پھر نہ جانے کیوں میرے دل میں لیٹنے کا خیال آیا اور میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک میں اس تخت پر کروٹیں بدلتا رہا پھر مجھے نیند آ گئی۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک کسی نے میرا کندھا زور زور سے ہلاتے ہوئے مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ رتنا کماری تھی۔ وہ پریشان چہرہ بنائے مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے ہوشیار دیکھ کر وہ جلدی سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔

''کیا بات ہے رتنا.....؟'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بھگوان کے لئے تم جلدی سے یہاں سے چلے جاؤ'' اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں..... خیریت..... کیا بات ہے؟ کوئی خطرہ ہے ادھر میرے لئے؟ یہ میرے چاچا کا گھر ہے اور میں جب تک چاہوں یہاں رہ سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم بھی اب انجان نہیں ہو گے۔ میرے پتا جی نے تمہارے ماتا پتا کو.....''

''تمہارے پتا جی.....؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں..... میں تمہارے چاچا کی بات کر رہی ہوں۔''

''اوہو..... اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے پتا ہیں؟''

''ہاں.....'' اس نے سر جھکا کر اس طرح کہا جیسے کسی بڑی تکلیف دہ بات کا اقرار کر رہی ہو۔

''اوہ.....'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر میں نے کہا۔ ''اور تمہیں اندیشہ ہے کہ جو سلوک تمہارے پتا نے میرے ماتا پتا کے ساتھ کیا ہے کہیں وہی سلوک میرے ساتھ بھی نہ کریں۔''

''اندیشہ نہیں..... بلکہ یقین ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟''

''مگر ایک بات بتاؤ رتنا جی! تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیسے ہو گئی؟ میرا خیال ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ وہ واحد شخص جو تمہاری عیش و آرام کی زندگی کو چھین سکتا ہے وہ بھی تمہارے پتا جی کے ہاتھوں ختم ہو سکتا ہے۔ اور تمہیں کبھی یہ خطرہ ہی نہ رہے گا کہ کوئی تم سے یہ مال و جائیداد واپس لے سکتا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے گلزاری کہ تم اتنے عقلمند اور ہوشیار ثابت نہیں ہوئے جتنا میں نے تم کو سمجھا تھا۔'' وہ بھی کچھ غصے میں آ گئی۔ پھر وہ بولی۔

''نفرت اور انتقام نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم کر دی ہیں۔ تم کھوٹے اور کھرے میں پہچان نہیں کر سکتے۔ مجھے اگر تمہاری زندگی عزیز نہ ہوتی تو خود اپنے لئے خطرہ مول لے کر تمہیں یہاں سے جانے کا مشورہ دینے کی بجائے اپنی میٹھی باتوں سے لبھا کر تمہیں یہاں رہنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی۔''

وہ ایک لمحے کے لئے اس طرح رک گئی جیسے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر بولی۔

''مگر میرا خیال ہے کہ اس بدگمانی میں تمہارا اتنا زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے تمہیں ایک ظالم باپ کی بیٹی سے کوئی اچھی توقع نہیں ہو سکتی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے تمہاری بات سے غصے میں آ کر اپنے آپ پر قابو کھو بیٹھی تھی جس کے لئے مجھے افسوس ہے۔ تم بہت سے حالات سے واقف نہیں ہو اس لئے تمہارا لہجہ اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ مگر گلزاری! حقیقت یہ ہے کہ تم جو آج تک زندہ رہے ہو تو اس میں تھوڑی بہت میری کوششوں کا بھی دخل ہے وقت کم ہے۔ اس لئے میں تفصیل میں تو نہیں جا سکتی لیکن تمہاری بدگمانی کو دور کرنے کے لئے کچھ حالات بیان کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

جس سے تمہارے پتا جی کا قتل ہوا اس سے میں بہت چھوٹی تھی۔ پھر تمہارے جانے کے بعد یہ خبر سننے میں آئی کہ تمہاری ماتا جی بھی قتل کر دی گئی ہیں۔ تب بھی میرے بچپن کے سادہ اور معصوم ذہن میں ایک افسوس کے علاوہ دوسرا خیال نہیں آیا۔ لیکن اب سے چند سال پہلے جب میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی مجھ پر پہلی بار اس راز کا انکشاف ہوا کہ میرے تایا اور تائی کو قتل کرنے والا اور کوئی نہیں میرا اپنا پتا ہے۔

وہ ایک چاندنی رات تھی اور ہم بہت سی سہیلیوں نے چاندنی رات میں کھیتوں سے گنے توڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پتا جی رات کو مجھے باہر جانے کی بہت کم اجازت دیتے تھے۔ میں ان سے پوچھنے کے لئے ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دور ہی سے باتوں کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ پتا جی اپنے دوست سروپ شرما سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی باتوں سے مجھے یہ افسوس ناک راز معلوم ہوا کہ پہلے میرے تایا اور پھر میری تائی کو قتل کرنے والا وہ انسان ہے جسے میں اب سے پہلے بہت محترم اور مشفق سمجھتی تھی۔ غصے اور شرم سے میری گردن جھک گئی۔ میں نے اپنی دوستوں سے بہانہ کر کے انہیں ٹال دیا اور پھر اپنے کمرے میں بند ہو کر پڑ گئی۔ اس رات مجھے نیند بھی نہیں آئی۔ بار بار جب یہ خیال آتا تھا کہ میرا اپنا باپ دو انسانوں کا قاتل ہے تو خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی تھی۔

صبح جب میں حسب معمول بیدار نہیں ہوئی تو پتا جی میرے کمرے میں آئے۔ انہوں نے میری طبیعت کے بارے میں پوچھا اور میں جو غصے میں بھری ہوئی بیٹھی تھی، جوش میں آ کر گزشتہ رات کی تمام گفتگو بیان کر گئی۔ وہ میرے منہ سے یہ سب باتیں سن کر بہت پریشان ہوئے۔ میں نے ان سے ان کی اس درندگی کی وجہ دریافت کی۔ پہلے تو وہ ٹالنے کی کوشش کرتے رہے پھر میرے بہت اصرار پر انہوں نے بتایا کہ ایک

مرتبہ وہ گاؤں سے باہر گئے تھے تو ان کے بڑے بھائی یعنی تمہارے پتا جی نے میری ماتا جی کی عزت لوٹی تھی۔ واپس آ کر جب انہیں یہ معلوم ہوا تو انہوں نے تمہارے پتا جی کو قتل کر دیا۔''

''یہ بکواس ہے...... جھوٹ ہے...... بہتان ہے۔ میرے پتا جی نے کبھی زندگی میں شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور پھر یہ ذلیل حرکت تو کیا وہ اس کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔'' میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

''رام گلزاری! پہلے میری بات غور سے سن لو۔'' انامیکا نے سنجیدگی سے کہا پھر بولی۔ ''بعد میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پتا جی نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے جھوٹ بولا ہے۔ اب میں ہر وقت اس بات کی ٹوہ میں رہنے لگی تھی کہ کسی طرح مجھے تمام واقعات کا تفصیل سے پتہ چل جائے۔

ایک رات ایسا ہوا کہ آدھی رات گزرنے کے بعد میری آنکھ کھلی۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں پانی پینے کے لئے کمرے سے باہر نکلی۔ پانی کے مٹکے صحن میں رکھے ہوئے تھے اور صحن میں جانے کے لئے پتا جی کے کمرے کے آگے سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں نے ان کے کمرے میں روشنی دیکھی اور تجسس سے مجبور ہو کر دروازے کے قریب دبے پاؤں پہنچ کر کان لگا دیئے۔ پتا جی اپنے دوست سے سرگوشی میں بات کرتے ہوئے تمہارے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

یہ باتیں سن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں اسی وقت ان کے کمرے میں گھس گئی اور جوش کے عالم میں پتہ نہیں کیا کچھ کہا میں نے۔

پتا جی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ انہوں نے کئی دن تک مجھے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ میرا کہنا تھا کہ اگر انہوں نے تمہیں بھی قتل کرنے کا ارادہ کیا تو میں فاقے کر کے اپنی جان دے دوں گی۔ آخر کار پتا جی کو میری بات ماننی پڑی اور میں نے ان سے تمہاری سلامتی کا وعدہ لے لیا۔ اب میں اکثر تمہارے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ میں نے تمہیں بہت بچپن میں دیکھا تھا۔ تمہاری صورت تک میرے ذہن میں محفوظ نہیں تھی۔ لیکن میرے تصور نے تمہاری ایک مورتی تراش لی تھی۔

دوپہر جب میں نے اچانک تمہیں اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو ایک لمحے کے لئے مجھے حیرت ہو گئی کہ تم ہو بہو وہی تھے جیسا میں تمہیں اپنے خوابوں میں دیکھتی رہی

تھی۔ میں بہت خوش تھی اور اس خیال سے مجھے اطمینان تھا کہ شاید پتا جی مجھ سے میرے وعدے کا پاس کر کے تمہیں تمہاری جائیداد واپس کر دیں۔ لیکن ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ان کے دوست کو ان کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا ہے اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ پتا جی کو اس کی ضرورت کب اور کیوں محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر میں تمہاری طرف بھاگی کہ اس سے پہلے کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائیں تمہیں یہاں سے واپس جانے پر آمادہ کرلوں۔''

میں انامیکا کی باتیں سن کر دل ہی دل میں اپنی غلط فہمی اور بدگمانی پر پشیمان ہو رہا تھا۔ پھر خود اس کی زبان سے ڈھکے چھپے انداز میں اقرار محبت سن کر میرے اپنے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس وقت اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لوں۔ مگر یہ وقت ایسی باتوں کے لئے نہیں تھا۔ میں نے اس سے بڑی ندامت کے ساتھ اپنی بدگمانی کے لئے معافی چاہی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ میں تب تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ نہ کرے۔ آخر اس نے اگلے بدھ کو گاؤں سے باہر کھجوروں کے جھنڈ کے پاس نہر کے کنارے ملنے کا وعدہ کرلیا اور میں اس کی ہدایت پر برق رفتاری سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا۔

دو دن انتظار کرنا پڑا اور حقیقت یہ ہے کہ محبت کے دو دن دو سال سے کم نہیں ہوتے۔ آخر کار بدھ آ گیا۔ میں چچا ننگو سے قریب کے گاؤں کے ایک میچ میں جانے کا بہانہ کر کے اجازت لے کر چل پڑا۔ اب میرا رخ کھجوروں کے اس جھنڈ کی جانب تھا۔ میں نے یہ لمبی مسافت بڑی برق رفتاری سے طے کی تھی اور دن کے ایک بجے کے قریب منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی مگر انامیکا یا رتنا کماری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ہم نے کسی خاص وقت کا تعین نہیں کیا تھا۔ رتنا کماری یا انامیکا نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ دوپہر کو گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر آنے کی کوشش کرے گی۔ میں انتظار کرتا رہا۔ دوپہر گزری، سہ پہر ہو گئی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ آخر کار جب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نے مایوس ہو کر واپسی کا ارادہ کرلیا۔

ابھی میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا ہی تھا کہ چھ سات گھوڑے سوار اچانک کھجوروں کے جھنڈ سے نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار موجود

تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

میں غیر مسلح تھا اور معاملہ ایک دو سے نہیں بلکہ ایک دم چھ سات آدمیوں سے مقابلے کا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی بات ماننے ہی میں عافیت سمجھی۔ کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو سختی سے ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا۔ وہ مجھے گھیرے میں لئے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے اور کچھ ہی دیر کے بعد میں ایک مرتبہ پھر اپنے چچا کی سرخ حویلی دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس مرتبہ میں اس کے بیرونی حصے کی نہیں بلکہ عقبی حصے کی طرف جا رہا تھا۔

حویلی کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر انہوں نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ جو شبہ میرے ذہن میں ان سواروں کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا اب وہ یقین میں بدل گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ مجھے اپنے ظالم چچا کے حکم سے پکڑ کر لایا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ انہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں آج رتنا کماری سے ملنے آ رہا ہوں۔ رتنا نے محبت کے پردے میں بے وفائی تو نہیں کی ہے؟ لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ میں نے خود ہی اپنے غلط خیال کی تردید کر دی۔ معاملہ کچھ بھی ہو لیکن نتیجہ میرے سامنے تھا کہ میں اس کمرے میں قید تھا۔ چنانچہ پہلے یہاں سے رہائی کی تدبیر کرنی چاہئے۔ یہ سوچ کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا مگر اس کمرے کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جسے وہ لوگ باہر سے بند کر گئے تھے۔

پھر میری نظر دروازے پر بنے ہوئے لکڑی کے روشندان پر پڑی جو فرش سے دس بارہ فٹ اونچا تھا۔ اگر میں کسی طرح اس روشندان تک پہنچ جاؤں تو با آسانی دوسری طرف نکلا جا سکتا ہے۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کے کونے میں موٹی سی پرانی چادر پڑی ہوئی تھی جو غالباً جانوروں کا چارہ وغیرہ لانے میں استعمال ہوتی تھی۔ اچانک مجھے ایک خیال سوجھا اور میں نے اس چادر سے کئی پٹیاں پھاڑ کر انہیں ایک دوسرے سے منسلک کر لیا۔ ایک موٹی رسّی تیار ہو گئی۔ روشندان میں ایک سلاخ بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے رسّی کو روشندان کی طرف پھینکا اور آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد اس کا ایک سرا سلاخ کی دوسری جانب نکال کر کھینچنے میں کامیاب ہو گیا اور میں نے دوسرے سرے سے پھندہ بنا کر اس کو نیچے کھینچا اور پھندہ تنگ ہوتے ہوئے سلاخ میں مضبوطی سے بندھ گیا۔

بہر حال اس کے بعد میں رسّی کے سہارے روشندان تک پہنچا۔ وہاں تک پہنچنے

کے بند اس کے باہر نکلنا کچھ زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ البتہ اوپر سے بارہ فٹ نیچے
کودنا خاصا مشکل کام تھا۔ لیکن یہاں بھی میں نے رسی ہی سے سہارا لیا اور اسے
کمرے سے نکال کر باہر کی جانب لٹکا کر نیچے اتر آیا۔ قید سے آزاد ہو کر مصلحت کا
تقاضا یہی تھا کہ میں فوراً یہاں سے نکل بھاگوں لیکن نوجوان خون جوش میں آچکا تھا۔
مجھے چچا کی اس کمینگی پر شدید غصہ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جانے سے پہلے اسے تھوڑا
سا سبق دینا ضروری ہے۔

میں نے چچا کی تلاش میں کئی کمرے دیکھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ پوری
حویلی خالی پڑی ہوئی تھی۔ میری چچی اور انامیکا بھی غائب تھیں اور وہ بوڑھا ملازم بھی
کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کئی کمرے دیکھنے کے بعد میں ایک بند کمرے کی طرف بڑھا تو
مجھے اس کے اندر سے کسی کے سسکیاں لے لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔

دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ میں نے کنڈی کھول کر اندر قدم رکھا ہی تھا
کہ مجھے اناميکا کی شکل نظر آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر
وہ پہلے تو حیرت زدہ ہوگئی اور اس کے بعد آگے بڑھ کر مجھ سے بری طرح لپٹ گئی۔
میں نے غور سے اسے دیکھا، اس کے بکھرے ہوئے بال اور روتی ہوئی سرخ آنکھیں،
ملگجے کپڑے دیکھ کر میری ساری غلط فہمیاں صابن کی جھاگ کی مانند بیٹھ گئیں۔ اس نے
درد بھرے لہجے میں کہا۔

"مجھے بچالو...... مجھے بچالو رام گلزاری! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آج
معلوم نہیں پتا جی کو کس طرح یہ پتہ چل گیا کہ میں تم سے ملنے والی ہوں۔ ماتا جی صبح
سے ماسی کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ پتا جی نے نہ صرف یہ کہ مجھے ان کے ساتھ نہیں جانے
دیا بلکہ ان کے جاتے ہی مجھے اس کمرے میں بند کر دیا۔ دوپہر کو میرے پاس آئے
اور غصے میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے آج رام گلزاری کو ملنے کے
لئے بلایا ہے؟

مجھے تو غصہ آ گیا اور اسی طیش کے عالم میں، میں نے انہیں بتا دیا کہ میں تم سے
محبت کرتی ہوں اور سدا کرتی رہوں گی۔ انہوں نے مجھے بہت مارا پھر اپنے دوست کو
بلا کر کہا کہ گاؤں کے پنڈت جی سے بات کر کے میری شادی کرا دیں۔ اس کے بعد
انہوں نے ایک آدمی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ کوئی اچھی سی مہورت
نکلوا لی جائے اور دھرم داس سے شادی کر دی جائے جو پڑوس کے گاؤں کے پٹواری کا

لڑکا ہے اور بہت دن سے اس کا پتا میرا رشتہ مانگ رہا تھا۔

بہرحال جب انہوں نے یہ بات کہی تو میں نے بھی غصے میں آ کر چیختے ہوئے
صاف کہہ دیا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اور اگر انہوں نے زبردستی کی تو میں زہر کھا کر مر
جاؤں گی اور وہ میری لاش ہی دھرم داس کے سپرد کر سکیں گے۔ پتا جی نے یہ سن کر
مجھے اور مارا اور جب مار مار کر تھک گئے تو کمرے کی کنڈی باہر سے لگا کر چلے گئے۔
ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے کہ اگرچہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن اگر میں نے ان
کے حکم کے آگے سر نہیں جھکایا تو وہ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں گے۔"

یہ کہہ کر رتنا کماری سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔

"نہیں...... تم فکر مت کرو اناميکا! اگر بھگوان نے چاہا تو وہ کبھی اپنی من مانی نہیں
کر سکیں گے۔ میں بھی تمہیں بہت چاہتا ہوں اور تمہارے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ چچا
نے جو میرے اور میرے والدین کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ تم بھی جانتی ہو لیکن میں
نے محض تمہاری محبت کی خاطر یہ سوچا تھا کہ اگر چاچا خوشی سے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ
میں دے دیں گے تو میں ان سے انتقام لینے کا خیال دل سے نکال دوں گا۔ لیکن اب
اگر وہ تمہاری شادی زبردستی کسی اور سے کرنا چاہتے ہیں تو میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں
گا۔ جان کی بازی لگا دوں گا۔ لیکن تمہیں میرا ساتھ دینا پڑے گا۔"

"میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا؟" رتنا کماری
نے بڑے عزم سے کہا۔

"تمہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تمہارے پتا
جی راضی خوشی تمہاری شادی میرے ساتھ نہیں کریں گے۔ میں چاہوں تو تمہیں پانے
کے لئے انہیں مقابلے کے لئے بھی للکار سکتا ہوں مگر میں تنہا ہوں جبکہ بہت سے
بدمعاش اور غنڈے تمہارے پتا جی کے ساتھی ہیں۔ بھگوان کی سوگندھ مجھے اپنی زندگی
کی کوئی پرواہ نہیں۔ مرتے مرتے بھی دو چار کو ساتھ لے جاؤں گا مگر اس میں خون
خرابہ ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں جس کے بعد
تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف شادی پر مجبور کر دیا جائے گا یا پھر تم جان دے دو گی۔
ہم دونوں مر جائیں گے لیکن ہمارے دشمن زندہ رہیں گے۔ یہ بات مجھے گوارہ نہیں
ہے۔ بہترین تدبیر یہ ہے کہ ہم یہاں سے دور چلے جائیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں
تمہارے پتا کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ پھر ہم دونوں شادی کر لیں گے اور ایک نئی زندگی کا

آغاز کر دیں گے۔"

رتنا کماری ہچکچانے لگی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا کہ اس طرح اس کے اور اس کے خاندان پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔

"کچھ بھی ہو رتنا کماری! تمہارے باپ کو دنیا والے کتنا ہی باعزت سمجھیں مگر اس نے جو کچھ کیا ہے وہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی اور بھگوان بھی جانتا ہے۔ یہ جرم بہت سنگین ہے۔ ہم گھر سے بھاگ کر کوئی گناہ نہیں کرنے جا رہے بلکہ شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہ پاپ نہیں ہے۔"

آخر کار رتنا کماری میرے سمجھانے بجھانے پر میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی۔

بہر حال ہر طرح سے خطرہ تھا۔ اس نے چند جوڑی کپڑے اور زیور وغیرہ لینے چاہے مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رتنا کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مجھے دولت کی طمع ہے۔ بہر حال اس کا اثر میرے چچا پر بھی پڑ سکتا تھا۔ وہ تیار ہو کر آ گئی اور میں اسے ساتھ لے کر دروازے سے نکلا تو میں نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اپنے گھوڑے کی طرف رخ کیا۔ میرا گھوڑا برق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ رتنا کماری کو میں نے ساتھ بٹھایا ہوا تھا۔ کھجوروں والے جھنڈ کے پاس پہنچ کر میں نے اپنے گھوڑے کا رخ ایک دوسرے راستے کی جانب پھیر دیا۔ میں اس راستے کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا البتہ میرے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ جیسے ہی میرے چچا کو ہم دونوں کے فرار کا علم ہوگا وہ قدرتی طور پر یہ سوچے گا کہ میں اسے لے کر اپنے گاؤں گیا ہوں اور پھر وہ ہمارا تعاقب کرے گا۔ اسے یہ خیال نہیں آئے گا کہ ہم کوئی دوسرا راستہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

بہر حال ہمارے سامنے ایک نئی منزل تھی۔ چچا ننگو کے دیئے ہوئے پیسے میرے پاس موجود تھے۔ چنانچہ ان سے بھی میرا کام چل سکتا تھا۔

بہر حال ہم رات بھر سفر کرتے رہے۔ راستے میں ایک دو چھوٹی چھوٹی آبادیاں ملیں مگر ہم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح کے قریب ہم ایک بڑے گاؤں میں پہنچ گئے۔ تھکن کے مارے برا حال تھا۔ گاؤں کے ابتدائی سرے پر ایک مندر نظر آیا تو ہم اس مندر میں داخل ہو گئے۔ وہاں کے پجاری کو بتایا کہ ہم دونوں پتی پتنی ہیں اور کچھ عزیزوں سے ملنے جا رہے ہیں۔ بہر حال میں نے بس یونہی جانے بوجھے بغیر ایک بستی کا نام لے دیا تھا۔ تلسی بستی کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ بس نام

سنا تھا اس کا۔ اتنا معلوم تھا کہ وہ شمال میں کسی طرف واقع ہے اور ہم شمال ہی کی جانب سفر کر رہے تھے۔

بہر حال پجاری نے ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اس نے مندر ہی کے ایک حصے میں ہمیں ٹھہرا دیا۔ کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا۔

یہاں کچھ وقت آرام کر کے ہم آگے چل پڑے۔ اس طرح دو راتیں اور ایک دن کا سفر کرنے کے بعد ہم ایک اور گاؤں میں داخل ہو گئے۔ کچھ وقت اسی گاؤں میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ گاؤں کی آدھے سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی۔ دوسری قوموں کے لوگ بھی یہاں آباد تھے۔ ہم نے گاؤں کے ایک پنڈت کے ہاں قیام کیا اور ایک دو دن رہنے کے بعد جب میں نے محسوس کیا کہ پنڈت اوم پرکاش بہت شریف اور ہمدرد آدمی ہے تو اسے اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔ اوم پرکاش نے سارے حالات سن کر بڑے افسوس کا اظہار کیا مگر ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اس طرح گھر سے بھاگ کر ہم نے کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔

"بہر حال اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ گاؤں والوں کو یہی بتاؤں گا کہ میرے دور کے رشتے دار ہو اور میں نے تمہیں یہاں بلا لیا ہے۔ پھر میں کوئی اچھی مہورت دیکھ کر تمہارا بیاہ کر دوں گا۔"

اگلے ہفتے نہایت خاموشی اور سادگی کے ساتھ اوم پرکاش نے ہمیں پتی پتنی کے بندھن میں باندھ دیا۔ میری اور رتنا کماری کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ہماری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو چکی تھی۔ پنڈت اوم پرکاش خود برہم چاری تھا اور اپنے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں شادی کے بعد اپنی جھونپڑی بنا لوں لیکن پنڈت نے ہمیں اس کی اجازت نہیں دی۔ وہ ہم سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرنے لگے تھے۔

کچھ دن کے بعد چوکیداری کی نوکری دلوا دی۔ حالانکہ اس گاؤں میں چوری چکاری کا تو کوئی ڈر نہیں تھا پھر بھی گاؤں والے ایک چوکیدار رکھنا چاہتے تھے۔ دوسرا چوکیدار بیمار ہو کر مر گیا تھا۔ پنڈت اوم پرکاش کے مکان سے کچھ دور اسی گلی میں ایک بہت عمر رسیدہ بزرگ رہا کرتے تھے جنہیں گاؤں کے لوگ بابا جلالی...... بابا جلالی کہا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ان کے قبضے میں مؤکل ہیں جن سے وہ ہر کام لے سکتے ہیں۔ ان کا روحوں سے بھی رابطہ

قائم ہے اور اکثر روحیں ان کے پاس آتی رہتی ہیں۔ آبادی کا ہر شخص خواہ وہ کسی دین دھرم سے تعلق رکھتا ہو ان کا بے حد احترام کرتا تھا، انہیں بڑی عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جب وہ کبھی راستے سے گزرتے تو لوگ خاموشی سے کھڑے ہو جاتے، انہیں سلام کرتے اور جب وہ آگے بڑھ جاتے تو وہاں سے ہٹتے۔ وہ خود بھی بہت نیک طبیعت کے انسان تھے۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کی گزر اوقات کا ذریعہ کیا ہے۔ بس ان کا زیادہ تر وقت کلام پاک کی تلاوت میں گزرتا تھا۔ ہر شخص جو بھی ان کے پاس پہنچ جاتا وہ اس کی ہر طرح سے مدد کر دیا کرتے تھے چاہے وہ اس کی مالی مدد ہو یا کچھ اور۔ ان کے بارے میں تفصیلات نے مجھے بھی ان کا عقیدت مند بنا دیا تھا۔ اس گلی میں ایک ہندو بنئے کی دُکان بھی تھی جسے سارے لوگ لالہ جی کہتے تھے۔ لالہ جی کا گھر ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام کوشل ہے۔ میں نے کوشل کو دیکھا۔ اچھی خوبصورت لڑکی تھی۔ چند ہی دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوشل گلی میں آتے جاتے مجھے خاص نگاہوں سے دیکھتی ہے۔

پہلے تو میں نے خیال نہیں کیا لیکن جب کافی دن گزر گئے اور کوشل کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تو مجھے کچھ احساس ہوا۔ ایک دن میں نے بھی اسے غور سے دیکھا اور مجھے اس کی آنکھوں میں وہی جذبات نظر آئے جنہیں دنیا والے عشق و محبت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں اس کی نگاہوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا کیونکہ مجھے اپنی منظورِ نظر مل چکی تھی اور شادی کے بعد میرا یہ پیار ایک والہانہ محبت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں بھلا کسی اور کی نگاہوں کی کیا گنجائش تھی۔ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں کوشل کے انداز کو کسی اور نے محسوس کر لیا تو بدنامی اور رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔ میرا دل چاہا کہ میں کسی بھی طریقے سے اسے اس خطرناک راستے پر چلنے سے روک دوں۔

پھر ایک رات میں گاؤں کا گشت لگاتے ہوئے اپنی گلی سے گزرا تو لالہ جی کے گھر کے سامنے ایک سائے کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو میں کچھ سمجھ نہ پایا کہ یہ کون ہے لیکن اندھیرے میں چوڑیوں کی جھنکار نے مجھے چونکا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کوشل ہے۔

''خیریت کوشل..... کیا کر رہی ہو یہاں؟ اس وقت تو تمہارے آس پاس کوئی

اور بھی نہیں ہے۔ اور وقت بھی ایسا نہیں ہے کہ تم یہاں اکیلی کھڑی رہو۔''

''میں تمہارے لئے کھڑی ہوں رام گلزاری! کیسے انسان ہو تم۔ انسان ہو بھی یا نہیں؟ انسان تو انسانوں کے جذبات کی پذیرائی کرتے ہیں۔ تم تو پتھر کے ایک بت لگتے ہو مجھے۔ میں تمہارے لئے یہاں کھڑی ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ آج تم سے بات کر کے ہی جاؤں گی۔ میں نے تمہیں باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ واپس تو تم آؤ گے ہی۔''

''کوشل! کیا مسئلہ ہے..... تم چاہتی کیا ہو؟''

''محبت کرتی ہوں میں تم سے..... دیوتا ہو تم میرے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو کوشل! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں شادی شدہ ہوں اور اپنی دھرم پتنی سے پیار بھی کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اگر میں چاہوں تب بھی تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔ کتنی بری بات ہے، رات کا ایک بج چکا ہے، تمہیں بدنامی سے ڈر نہیں لگتا؟ دیکھو میں تمہیں ایک اچھے انسان کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے برے خیالات اپنے دل سے نکال دو۔ میں تمہاری محبت کی پذیرائی نہیں کر سکتا۔''

''مگر میں تمہارے پریم میں پاگل ہو چکی ہوں۔ تم ایک چھوڑ دس شادیاں کر لو لیکن میرے من میں تمہاری محبت کم نہیں ہو گی۔ میں تم سے محبت کی بھیک مانگتی ہوں۔'' اس نے کہا اور دیوانوں کے سے انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

''دیکھو بہت بری بات ہے..... بہت ہی بری بات ہے..... تم نے میری نظروں میں اپنی عزت ختم کر دی۔ جاؤ واپس جاؤ۔ ورنہ میں لالہ جی کو آواز دیتا ہوں۔''

کوشل کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ نمودار ہو گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''انہیں آواز دے کر تم خود مصیبت میں پھنس جاؤ گے سمجھے میں اب بھی کہتی ہوں کہ میرا پریم سویکار کر لو۔ ورنہ پیار کرنے والی عورت سے زیادہ خطرناک ناگن اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ عورت کی نفرت جو تباہی پھیلاتی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

ابھی میں نے جواب دینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دفعتہً میں نے ایک اور سائے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اتنی تیزی سے اس طرف آ رہا تھا جیسے ہوا میں پرواز کر رہا ہو۔ ایک لمحے میں، میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جو ہر ایک کی مشکل کا حل بتے ہیں۔ یعنی بابا جلالی۔ وہ بہت تیزی سے ہم دونوں کے قریب پہنچے پھر انہوں

نے کوشل سے مخاطب ہو کر کہا جو انہیں دیکھ کر بری طرح سہم گئی تھی۔

"گھر جاؤ...... اور اگر میں نے تمہیں آئندہ اس طرح رات کے وقت گھر سے باہر قدم نکالتے ہوئے دیکھا تو ایسی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گی۔"

کوشل چپ چاپ کھلے دروازے سے اندر چلی گئی۔ تب بابا جلالی نے مجھے دیکھا اور بولے۔

"آؤ رام گلزاری...... میرے ساتھ آؤ۔"

میں بے قصور ہونے پر بھی چور بنا کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب تک یہاں قیام کے دوران میں نے جس طرح اپنا بھرم قائم کیا ہے وہ آج ایک پل میں ختم ہو گیا۔ معلوم نہیں بابا جلالی میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ اور اگر میں انہیں حقیقت بتاؤں تو میرا اعتبار بھی کریں گے یا نہیں۔

مکان میں قدم رکھنے کے بعد جب انہوں نے اپنے مصلّے کے قریب مجھے ایک چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ان کے لہجے کی شفقت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ میرے دل کو کچھ اطمینان سا ہوا اور میں بیٹھ گیا۔

"تمہیں یہاں لانے کا میرا مقصد سرزنش کرنا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ کوشل کی منہ زور جوانی اس کے قابو میں نہیں ہے اور بہکنے کے لئے راستے تلاش کر رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی میں اسے کئی مرتبہ روک چکا ہوں، اس کے باپ سے بھی میں نے کئی مرتبہ اس کی شادی کے لئے کہا ہے لیکن وہ کسی گھر داماد کی تلاش میں ہے۔ بہرحال میں تمہیں یہاں اس لئے لایا تھا کہ تمہارے چچا ٹنگو کے بارے میں تمہیں بتا سکوں۔"

"ٹنگو......؟" میرے منہ سے پھٹی پھٹی آواز نکلی۔ حیرت کی بات تھی کہ بابا جلالی کو اس کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا؟ جبکہ میں نے صرف پنڈت رام پرکاش کو رازدار بنایا تھا۔

"تم اس الجھن میں مت پڑو کہ کوئی بات مجھے کیسے معلوم ہوئی۔ تمہارے چچا کا انتقال ہو چکا ہے اور تمہیں فوراً اپنے گاؤں میں جا کر ان کا کریا کرم کرنا ہے۔"

میں سکتے میں رہ گیا...... چچا ٹنگو مر گئے، مجھے اس خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن میرے خیالات نے پلٹا کھایا کہ عین ممکن ہے کہ میرا ظالم چچا میری اور اپنی بیٹی کی تلاش میں وہاں پہنچا ہو اور ہم لوگوں کو وہاں نہ پا کر انتقام میں اس نے چاچا ٹنگو کو قتل

کر دیا ہو۔

"بھگوان کے لئے بابا جلالی! اتنا اور بتا دیجئے کہ وہ کیسے مرے؟" میں نے گڑگڑا کر کہا۔

"انہیں قتل کیا گیا ہے۔" بابا جلالی نے کہا۔

"یہ سنگدلانہ حرکت میرے ظالم چچا کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔" میں جوش میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اب تک اناميکا کے خیال سے چچا کو معاف کر رکھا تھا لیکن اس نے حد ہی کر دی تھی۔ میں نے قسم کھائی کہ اب وہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔

"نہیں...... جوش میں مت آؤ رام گلزاری...... ظالم کبھی اپنے گناہوں کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ تم اگر قانون کے دائرے میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنا اور اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔"

میں نے احتراماً بابا جلالی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا۔ بہرحال بابا جلالی بولے۔

"تم صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔"

"بابا صاحب! میرا گاؤں تو یہاں سے ایک رات اور دو دنوں کے فاصلے پر ہے...... میں وقت پر وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں؟"

"نہیں...... تم نے یہاں آتے ہوئے کافی چکر دار راستہ اختیار کیا تھا۔ ورنہ سیدھے راستے سے یہاں سے بارہ گھنٹے کی مسافت سے زیادہ نہیں ہے۔ تم صبح پانچ بجے یہاں سے روانہ ہو کر شام پانچ بجے وہاں پہنچ جاؤ گے۔ گاؤں سے باہر جا کر منڈی جانے والی سڑک پکڑ لینا وہی سیدھی تمہیں تمہارے گاؤں تک لے جائے گی۔"

بابا جلالی نے میری رہنمائی کی۔ بہرحال مجھے چچا ٹنگو کی موت کا بڑا رنج تھا۔ وہ میری وجہ سے مارے گئے تھے۔ مجھے شدت سے یہ احساس تھا کہ میں نے آج تک رتنا کماری کی وجہ سے چاچا جی کے خلاف کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا تھا۔ حالانکہ انہوں نے ہمارے اوپر زمین تنگ کر دی تھی اور ہم ان کے خوف سے نجانے کیسے کیسے حالات کا شکار تھے لیکن وہ اپنا کام کرتے چلے جا رہے تھے اور انہوں نے کہیں بھی کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ انہوں نے سب کچھ تو کر ڈالا تھا۔

بہرحال دوسرے دن صبح میں وہاں سے چل پڑا۔ جب میں تیاریاں کر رہا تھا تو

انامیکا نے کہا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑے جا رہے ہو۔ کیا میں ایک لمحہ بھی سکون سے گزار سکوں گی؟''

''نہیں رتنا! میرا جانا بہت ضروری ہے۔ لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلدی واپس آ جاؤں گا۔''

انامیکا کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کسی خاص کیفیت کا شکار ہے۔ وہ زار و قطار رونے لگی اور میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور اسے گلے لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

گاؤں سے باہر نکل کر میں نے اپنے گھوڑے کو منڈی والی سڑک پر چھوڑ دیا۔ بابا جلالی صاحب کا کہنا ٹھیک ہی تھا۔ میں گھوڑے کو تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔ بہر حال مقررہ وقت پر میں گاؤں پہنچ گیا اور یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت گاؤں سے باہر شمشان گھاٹ میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بڑے مناسب وقت پر میں وہاں پہنچا تھا۔

چاچا ننگو کی لاش کو چتا پر جلانے کے لئے لے آیا گیا تھا۔ لوگوں نے مجھے پہچان کر راستہ دے دیا۔ چتا تیار ہو چکی تھی۔ گھی بھی چھڑکا جا چکا تھا صرف آگ لگانے کی دیر تھی۔ میں چاچا ننگو کی ارتھی کے پاس پہنچ گیا۔ کپڑا اٹھا کر دیکھا تو ان کے سینے پر بائیں جانب ٹھیک دل کے مقام پر چھری کا زخم نظر آیا۔ میں نے کپڑا دوبارہ ڈھک دیا اور بمشکل تمام پنڈت کے ساتھ اشلوک پڑھنے لگا۔ پنڈت جی نے میرے ہاتھ میں دیا سلائی دے دی تاکہ میں چتا کو آگ لگا سکوں۔ بھگوان کا نام لے کر میں نے ماچس جلا کر گھی میں تر لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد میں پیچھے ہٹ گیا۔ ہم سب اس وقت تک خاموش کھڑے رہے جب تک راکھ جل کر خاک نہیں ہو گئی۔ پھر میں دوسرے لوگوں کے ساتھ واپس چل پڑا۔ راستے میں، میں نے پنڈت جی اور دوسرے لوگوں سے حالات معلوم کرنے چاہے مگر پتہ چلا کہ ان میں سے کسی کو بھی یہ نہیں معلوم کہ چاچا ننگو کا قاتل کون ہے۔ ان لوگوں کے بیان کے مطابق صبح کو جب چاچا ننگو حسب معمول بیدار نہیں ہوئے تو کچھ دیر کے بعد ایک پڑوسی نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا اور اس نے چاچا ننگو کو اس حالت میں پایا کہ وہ کمرے کے فرش پر پڑے ہوئے تھے اور ان کے اردگرد خون ہی خون بکھرا ہوا تھا..... گاؤں والوں کو اس بارے میں واقعی کچھ نہیں

معلوم تھا مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ قتل میرے چچا کے علاوہ اور کسی نے نہیں کیا۔

گاؤں میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو چچا ننگو کو موت کے گھاٹ اتار سکے اور پھر بابا جلالی نے بھی اشارہ کیا تھا۔ چچا ننگو کا کوئی رشتے دار، عزیز نہیں تھا۔ انہوں نے کوئی وصیت بھی نہیں چھوڑی تھی مگر گاؤں والوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ میں ہی ان کی چھوڑی ہوئی زمین اور مکان کا وارث ہوں۔ لیکن چونکہ میرا کوئی ارادہ گاؤں واپس آنے کا نہیں تھا اس لئے میں نے مکان اور زمین دونوں فروخت کر دیئے۔ اس کام کے لئے مجھے چند روز گاؤں میں رکنا پڑا مگر نجانے کیوں میرا دل انامیکا کے لئے بہت مضطرب تھا اور میں بار بار یہ کہہ کر خود کو تسلی دے رہا تھا کہ وہ پنڈت اوم پرکاش جیسے شفیق بزرگ کے گھر میں ہے۔ وہاں اسے کوئی خطرہ پیش نہیں آ سکتا۔

پانچویں دن میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے پاپا شیطان سے نمٹتا جاؤں لیکن میں نے اپنے انتقام کے منصوبے کو کچھ دن کے لئے ملتوی کر دیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے میں انامیکا کے پاس جاؤں اور پھر اس کے بعد اپنے چچا سے بھی نمٹ لوں گا۔ چچا ننگو کی موت کی رپورٹ باقاعدہ پولیس میں دی گئی تھی اور پولیس تحقیقات بھی کر رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ اصلی قاتل کو گرفتار نہیں کر سکے گی۔ میرے چچا نے اپنے پیچھے جرم کا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔

بہر حال تیسرے پہر میں واپس گاؤں پہنچا۔ لیکن گاؤں میں داخل ہوتے ہی مجھے غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ہمارے گھر کے سامنے کافی لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور لوگوں کے ہجوم کو پیچھے ہٹاتا ہوا مکان میں داخل ہو گیا۔ سامنے صحن میں چارپائی پر انامیکا کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر آگے بڑھا اور لاش پر ڈھکی ہوئی چادر الٹ دی۔ چادر الٹتے ہی میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ انامیکا خون میں نہائی پڑی تھی۔

اس کا سر دھڑ سے الگ تھا..... اسے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں اور میں لاش پر گر پڑا۔ میں نے اس کا سر دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور خون آلود چہرے کو بوسے دیتے ہوئے اپنے سینے سے لگا

لیا۔ اس وقت نجانے کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا قاتل بھی اس کا سنگدل باپ اور میرے چچا کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اسی وقت میری غرائی ہوئی آواز نکلی۔

''یہاں موجود لوگو! غور سے سنو اور گواہ رہو...... میں کالی ماتا کی سوگندھ کھاتا ہوں کہ میں اپنے چچا سے اپنے ماتا پتا، اپنے چاچا ننگو اور اپنی پیاری بیوی کے قتل کا ایسا خطرناک انتقام لوں گا کہ آج تک کسی نے نہیں لیا ہو گا۔ میں اس کے پورے خاندان کو تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ انہیں ذلیل اور بے عزت کروں گا۔ اور قسم ہے کالی ماتا کی کہ اگر میں اپنا انتقام پورا کرنے سے پہلے مر گیا تو میری روح اس انتقام کو پورا کرے گی۔ اے کالی ماتا! اپنے ایک ادنیٰ پجاری کی لاج رکھ لے...... مجھے اتنی شکتی دے کہ میں اپنی سوگندھ پوری کر سکوں اور اس کے بدلے تُو میرے جسم اور روح کا بلیدان قبول کر۔''

''یہ تُو نے کیا، کیا بے وقوف؟'' اچانک بابا جلالی کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا۔

''تُو نے ایک عذاب کو اپنے سر پر مسلط کر لیا۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ صبر کر اور خدا کے انصاف کا انتظار کر لیکن تُو نے انتقام کے جوش میں خود ہی اپنی تباہی کا سامان کر لیا۔ چل اب کیا ہو سکتا ہے...... اٹھ اور اس کی آخری رسوم ادا کر۔''

بابا جلالی کی آواز میں نجانے کیا تاثیر تھی کہ میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ میں نے خاموشی سے انامیکا کا سر اس کے دھڑ کے ساتھ ملا کر رکھ دیا اور اس پر چادر ڈال دی۔

مجھے بتایا گیا کہ گزشتہ رات کسی آدمی نے مکان کی دیوار پھلانگ کر گھر میں گھسنے کی کوشش کی اور اس نے پنڈت جی کو رسیوں سے باندھ کر ڈال دیا اور پھر انامیکا کو قتل کرنے کے بعد بڑے اطمینان سے چلا گیا۔ پنڈت اوم پرکاش خوف کے مارے بے ہوش ہو چکے تھے۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو مدد کے لئے پکارا لیکن اس وقت تک قاتل جو گھوڑوں پر سوار تھے، فرار ہو چکے تھے۔

پولیس کو اطلاع کی گئی اور جب میں واپس آیا تو پولیس اس سے کچھ پہلے ہی تحقیقات کر کے اور کچھ لوگوں کے بیانات لے کر واپس جا چکی تھی۔ رات ہونے سے پہلے انامیکا کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ اس کی چتا کو آگ لگا دی گئی۔

مجھے آج بھی حیرت ہے کہ چچا ننگو کی موت کے فوراً بعد میں نے اپنی محبوب بیوی کی موت کا صدمہ کیسے برداشت کر لیا۔ جس وقت چتا کو آگ لگائی جا رہی تھی،

میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں خود بھی اس آگ میں کود جاؤں۔ مگر میں نے زبردست قوتِ ارادی سے اپنے غم و غصے پر قابو پایا۔ میں نے یہ کہہ کر خود کو سمجھایا کہ اگر میں نے خود کو نہ سنبھالا اور انامیکا کی موت کے سوگ میں خود بھی پرلوک سدھار گیا تو میرا ظالم چچا زندہ رہے گا اور اس سے انتقام کون لے گا۔ مجھے تو بہت سے لوگوں کے انتقام اس سے لینے تھے اور اس کے لئے زندگی بڑی ضروری تھی۔

چنانچہ میں نے عارضی طور پر صبر کیا اور واپس آیا۔ پھر میں سیدھا بابا جلالی کے پاس پہنچ گیا اور میں نے ان سے کہا۔

''میرے چچا کو انامیکا کی اس گاؤں میں موجودگی کا علم کیسے ہوا؟''

انہوں نے اس لڑکی کا نام لیا جو اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لئے میری قربت چاہتی تھی۔ بابا جلالی نے بتایا کہ کسی طرح وہ انامیکا کے پاس پہنچی اور اس نے انامیکا کو شیشے میں اتار لیا اور پھر اسی نے گاؤں کے نائی کے ذریعے میرے چچا کو اطلاع کرائی۔

''اگر آپ کو یہ ساری باتیں معلوم تھیں بابا صاحب! تو آپ نے اس کی مدد کیوں نہیں کی؟''

''دیکھو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے ہم سب ذرّوں کی طرح حقیر ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔ چاہے کوئی کچھ کرے یا نہ کرے۔''

بہرحال وہ مجھے نصیحت کرتے رہے کہ میں صبر و ضبط سے کام لوں۔ مگر میں کالی ماتا کی قسم کھا کر اپنے چچا سے انتقام لینے کا عہد کر چکا تھا۔ اب میرا یہاں رکنا بالکل بے مقصد تھا۔ اوم پرکاش نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کا کوئی عزیز اس دنیا میں زندہ نہیں ہے اس لئے وہ اپنی تمام زمین اور جائیداد میرے نام چھوڑ جائیں گے۔ میں ان کی محبت کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل پڑا۔

بہرحال خاصی گڑبڑ رہی۔ مجھے پتہ چلا کہ چاچا نے اپنا علاقہ چھوڑ دیا ہے اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے کسی پوشیدہ جگہ رہ کر کر رہا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تقدیر میرے ساتھ نہیں تھی۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ چچا زندگی کا کامیاب ترین آدمی تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کہاں گیا؟ اس نے اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔

میں نے کالی ماتا کی قسم کھائی تھی اور پھر میں نے کالی ماتا ہی سے وردان مانگا۔ میں نے کہا دیکھ کالی ماتا! میں تو ایک کچا آدمی ہوں۔ سنسار میں اب تک ناکام زندگی

گزارتا رہا ہوں۔ اب تو اپنی سوگندھ کی لاج خود ہی رکھ۔ مجھے پتہ دے۔ نجانے کیا کیا جتن کرتا رہا میں۔ لیکن مجھے پتہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے جذبات میں آ کر کالی ماتا کی سوگندھ تو کھا لی لیکن کالی ماتا اپنی سوگندھ خود ہی کیوں پورا کراتی۔ نجانے میں کب تک بھٹکتا رہا۔ میری ذہنی حالت کافی خراب ہوگئی تھی۔ اور اس کے بعد میں آخر کار یہاں آ گیا۔ اس علاقے کا نام سہائے پور تھا۔ میں یہاں پہنچا اور بھٹکنے لگا۔ میری حالت پاگلوں جیسی تھی۔ ویرانوں میں بھٹکتا رہتا۔

ایک دن میں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ ویرانوں ہی میں ایک درخت کے نیچے میں نے ایک بزرگ کو نماز پڑھتے دیکھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سہائے پور میں ہندو مسلمان سب ہی رہا کرتے تھے۔ لیکن جب بزرگ نے نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرا تو میں ان کی صورت دیکھ کر ہی ششدر رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بابا جلالی تھے۔ میں دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا اور ان کے قدموں میں گر پڑا۔

''کہا تھا نا میں نے تجھ سے کہ اپنا مسئلہ اللہ کے دربار میں پیش کر دے۔ تجھے انصاف ملے گا..... رحم ہے گا..... پر نہیں مانا تو۔''

''میں مر جاؤں گا بابا صاحب..... مر جاؤں گا..... مجھے پتہ بتا دیجئے اس کا۔ وہ کہاں گیا؟''

''اللہ کے کام اللہ ہی جانتا ہے اور وہی بہتر کر سکتا ہے۔ سن یہیں اس علاقے میں اپنی کٹیا بنا لے۔ یہیں رہائش اختیار کر اور انتظار کر۔ تیرا چاچا یہاں آئے گا۔ ضرور آئے گا۔''

میں خوشی سے پاگل ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''بابا جلالی! میں اس کو پہچان لوں گا؟''

''ہاں..... تو اُسے پہچان لے گا۔''

میں نے یہ جگہ بنا لی۔ وہ سامنے درخت دیکھ رہے ہو نا، یہ وہی جگہ ہے جہاں بابا جلالی بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں اکثر ان کے چرنوں میں بیٹھ جاتا تھا۔ میں نے یہاں پوجا پاٹ بھی شروع کر دی تھی۔ یہ دیکھو اب بھی کالی ماتا کے بت یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ میں کالی ماتا کے چرن پکڑے ہوئے تھا۔

''ایک بار..... بس ایک بار میرے چاچا سے مجھے ملا دے.....''

پھر ایک رات میں نے دیکھا کہ ایک جٹا دھاری سادھو سامنے سے آتا نظر آ رہا

ہے۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ جٹا دھاری سادھو میرے پاس پہنچ گیا اور ادھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا۔

''جے کالی ماتا.....'' میں نے بھی خوش دلی سے اس کا جواب دیا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس ایک گنڈاسا ہے اور گنڈاسے سے خون ٹپک رہا ہے۔ میں نے کہا۔

''یہ خون کیسا ہے؟''

''بھینٹ دی ہے کالی ماتا کو..... بھینٹ دی ہے اس مسلمان کی جو اپنے آپ کو بڑا وروانی سمجھتا تھا۔ چھٹی کر دی سسرے کی میں نے، کالی ماتا کے نام پر۔''

''کون تھا وہ؟''

''ارے وہ سامنے درخت کے نیچے جو ایک بڈھا مسلمان دھونی جمائے بیٹھا رہتا ہے۔''

''بابا جلالی.....؟'' میں چیخ پڑا۔

''ہاں وہی..... تو جانتا ہے اسے۔''

''مار دیا تم نے اسے.....؟ مار دیا.....؟''

''ہاں، کیوں؟ بہت پرانی دشمنی چل رہی تھی میری اس سے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر میں نے اسے ختم نہ کیا تو وہ مجھے ختم کر دے گا۔ ٹنڈن گوپال ہے میرا نام..... سہائے پور کے جنوبی علاقے میں بستی کادوری ہے۔ اسی میں رہتا ہوں۔ بچپن ہی سے مجھے کالی ماتا سے پریم تھا اور کالی ماتا کے پجاریوں کی سیوا کرنا میرا دھرم۔ انہی سے مجھے امر شکتی کے بارے میں معلوم ہوا اور میرے من میں امر شکتی حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ میں اس سنسار میں ہمیشہ جینا چاہتا ہوں۔ میں نے بہت سے کالے علم سیکھے اور لوگوں کی مدد کرنے لگا۔ بڑے بڑے لوگ اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لئے میرے پاس آیا کرتے تھے۔ میں اپنے کالے علم کی مدد سے ان دشمنوں کو نقصان پہنچا دیا کرتا تھا اور یہی میری کمائی کا ذریعہ تھا۔

امر شکتی پانے کے لئے مجھے بہت محنت کرنا تھی۔ یہ ایک بڑا لمبا کھیل تھا اور اس لمبے کھیل کو جاری رکھنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے تھے۔ پھر ایک دیوالی کے موقع پر ہر طرف چراغ جل رہے تھے، سڑکوں پر چہل پہل تھی۔ عمارتیں سجی ہوئی تھیں۔ لیکن ٹھاکر بلونت رام کی حویلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بلونت رام کی حویلی کی روشنی

پوری بستی میں مشہور تھی اور لوگ دور دور سے ان روشنیوں کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ لیکن اس بار وہاں روشنی نہیں تھی۔ لوگ حیران تھے۔ حویلی کے پہرے داروں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی کو نہ آنے دیا جائے۔ لیکن صورت حال بہت کم لوگ جانتے تھے۔ بلونت رام کے ایک دشمن نے مجھے بہت بڑی رقم دی تھی اور کہا تھا کہ بلونت رام کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ میں نے اس سے دیوالی کی رات کا وعدہ کر لیا تھا اور اپنے کام میں مصروف تھا کہ کسی طرح بلونت رام نے اس مسلمان بابا سے رابطہ قائم کر لیا اور یہ وہاں میرے جادو کی کاٹ کرنے پہنچ گیا۔ اس وقت وہ حویلی ہی میں تھا اور حویلی کے گیٹ کے سامنے بنے ہوئے ایک ایسے درّے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں سے دور دور تک آسمان دیکھا جا سکتا تھا۔

حویلی کے مختلف گوشوں میں بلونت رام اور اس کے پریوار کے لوگ آنے والی قیامت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہندو دھرم میں جادو کی ان ہانڈیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے دیوالی کی رات کو پھینکی جاتی ہیں۔ ہزاروں داستانیں جنم لیتی ہیں۔ یہ گندی اور بڑی ہی خطرناک چیزیں ہوتی ہیں۔ بہر حال وہ مسلمان وہاں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ پھر رات کو بارہ بجے کے بعد آسمان پر ایک روشن شے اڑتی ہوئی دیکھی گئی جس کا رخ اس حویلی کی طرف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُڑتے اُڑتے حویلی پر آ رہی تھی۔

بلونت رام کی دھرم پتنی، ان کی بہوئیں، بچے سب بھگوان کو یاد کرنے لگے۔ دشمن آ گیا تھا۔ دشمن ہی سمجھتے تھے وہ مجھے۔ ادھر مُسلا بھی اس روشن نقطے پر نگاہیں جمائے ہوئے بیٹھا ہوا تھا جو حویلی کے لئے موت کا پیغام لے کر آ رہا تھا۔ وہ اس ہانڈی کی طرف نگاہیں جمائے کچھ پڑھ رہا تھا اور ہانڈی آہستہ آہستہ نیچے جھکی چلی آ رہی تھی۔ پھر جب وہ حویلی کے بڑے گیٹ کو عبور کر کے آگے بڑھی تو اچانک اس نے پھونک ماری اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ تین بار اس نے ایسا ہی کیا اور ہانڈی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ وہ جس طرف سے آئی تھی اسی طرف چل پڑی۔

بہر حال یہاں تو خوشیاں دوڑ گئیں۔ لیکن دوسری طرف...... دوسری طرف تباہی پھیل گئی تھی۔ میں اپنے چھوٹے سے پریوار کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنی کامیابی کا انتظار کر رہا تھا۔ آٹے کی شکل کا بنا ہوا ایک بھیانک پُتلا میرے سامنے رکھا ہوا تھا اور اس کے سامنے ماش کے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ برابر ہی خون کے دو دیے جل رہے تھے۔

یہ خون ایک ایسے دشمن کا تھا جو اپنے دشمن کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ کالے رنگ کا وہ پتلا مہا کالی کا پُتلا تھا اور میں اس کی آنکھوں میں مٹھ کو اُڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ میرے ایک منتر کی پیداوار تھی۔ مٹھ تیزی سے اُڑتا ہوا آگے جا رہا تھا اور پُتلے کی آنکھیں جو کسی خاص چیز سے بنائی گئی تھیں ان میں مٹھ کا روشن نقطہ نظر آ رہا تھا۔ پھر اچانک ہی میں نے اس نقطے کو پلٹتے ہوئے دیکھا اور میری ہنسی ایک دم ختم ہو گئی۔

یہ ایک بھیانک عمل تھا...... میرے ہاتھ پھیل گئے اور میں پریشانی سے بولا۔

''یہ کیسے ہو گیا کالی ماتا...... یہ کیسے ہو گیا؟''

اچانک ہی پُتلے کے ہونٹوں سے آواز نکلی۔

''تو اپنے دشمن کو بھول گیا نندن گوپال!''

''کون دشمن؟''

''بابا جلالی، سمجھا...... بابا جلالی۔''

''ہاں...... اوہو...... اوہو...... تو کیا اس نے......؟''

''ہاں...... اس نے تیرا مٹھ واپس کر دیا ہے۔ بچ، سنبھل، وہ آ گیا۔''

اور دوسرے ہی لمحے میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ نکلا۔ میں اپنی رہائش گاہ میں پہنچ گیا۔ اچانک ہی ایک دھماکہ ہوا۔ رہائش گاہ کی چھت میں سوراخ ہوا اور مٹی کی ہانڈی جس میں سندھور، چاول، دال، آٹا اور نجانے کیا کیا کچھ چیزیں بھری ہوئی تھیں چھت پھاڑتی ہوئی نیچے آ گری اور میرے پریوار کے لوگ آگ میں لپٹ گئے۔ وہ سب بہت ہی خوفناک آگ کا شکار ہو گئے تھے۔ پیلے پیلے ماحول میں میرے خاندان کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں...... میں...... اور میں...... تنہا رہ گیا تھا۔ اور اس کے بعد میں نے قسم کھائی تھی کہ اس آدمی کو جیتا نہیں چھوڑوں گا۔ اور آخر کار آج میں نے بدلہ لے لیا اس سے اپنا......''

میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ وہ بھی کالی ماتا کا پجاری تھا اور میں بھی کالی ماتا کا پجاری۔ وہ امر شکتی حاصل کرنا چاہتا تھا اور میں اپنے دشمن کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

بہر حال نندن گوپال کا میں کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ لیکن بابا جلالی میرے دل میں تھے۔ میرا تو ان سے گہرا رشتہ تھا۔ شکر تھا کہ نندن گوپال زیادہ نہیں رکا۔ میں نے اسے کھلایا پلایا اور وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوا، میں بابا جلالی کی کٹیا کی طرف دوڑا اور وہاں میں نے وہ بھیانک منظر دیکھا۔ بابا جلالی

کا سر ان کے باقی بدن سے کافی فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو پھوٹ بہے۔ میں زار و قطار رونے لگا۔ اور پھر اچانک میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ بابا جلالی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کا سر اتنے ہی فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا۔ بابا جلالی کے سر سے آواز آئی۔

''ہر انسان کو ایک دن اس دنیا سے جانا ہوتا ہے رام گلزاری۔ آج میں، کل تو، پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں۔ یہ کوئی غم کی بات نہیں ہے۔ کائنات کے خالق نے یہ کائنات تخلیق کی ہے۔ اب یہ وہ جانتا ہے کہ اسے اپنا کھیل کیسے چلانا ہے۔ خیر، میں تجھے ایک جگہ بتاتا ہوں۔ یہاں سے ان ڈھلانوں کو عبور کر، بلندی تک جا اور وہاں ایک جگہ جہاں پیپل کے دو چھوٹے چھوٹے درخت ہیں ان درختوں کے سائے میں میرے لئے قبر کھود اور وہاں مجھے دفن کر دے۔ بہت سی مٹی ڈال دینا میرے اوپر۔''

پھر بابا جلالی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور میرے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ میں ان کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ جو ڈھلان سامنے نظر آتے ہیں نا تمہیں ان سے اوپر جا کر ذرا تھوڑے سے فاصلے پر پیپل کے دو درخت ہیں۔ بس ان کے نیچے میں نے ایک قبر کھودی اور بابا جلالی خود اپنے سر کو ہاتھوں میں لئے اس قبر میں جا بیٹھے۔ انہوں نے اپنا سر اپنی گردن کے ساتھ لگا لیا تھا۔ میں نے ان پر منوں مٹی ڈال دی اور اس کے بعد روتا پیٹتا واپس آ گیا۔

''میرے خدا..... سر! پیپل کے وہ درخت.....'' کامران بولا۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' ہارون نے کمزور لہجے میں کہا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں سے وہ قبر نمودار ہوئی تھی۔ جس کے اوپر منوں مٹی آ گئی تھی۔ بابا جلالی کے بارے میں ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس قدر پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کے دل میں عقیدت کے جذبے گھر کر گئے۔ رام گلزاری تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''یہ سو سال پہلے کی بات ہے..... سو سال پہلے کی بات۔ اور اس کے بعد جو واقعات ہوئے وہ بڑے عجیب و غریب تھے۔

''وہ کیا واقعات تھے رام گلزاری؟''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ اتنی ساری باتیں بتا دیں ہم نے اور تم

ہمارے کان ہی کھائے جا رہے ہو۔ جاؤ بابا اپنا راستہ ناپو۔ جو ہوا بھگوان نے کیا اور جو آگے ہو گا وہ بھی بھگوان ہی کرے گا۔ بھگوان جانے اور اس کے کام۔ بس ہمیں انتظار کرنے دو۔ ہم انتظار کر رہے ہیں اس سمے کا جب ہمارا چاچا ادھر آئے گا اور ہم اس کی گردن اتار کر موت کا راستہ اپنا لیں گے سمجھے۔''

''مگر رام گلزاری.....''

''جاؤ بابا..... تم جاؤ..... یا پھر ہم جاتے ہیں۔'' اس نے کہا اور غصیلے انداز میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ ہارون اور کامران ششدر کھڑے دیکھتے رہ گئے تھے۔ انہوں نے کئی آوازیں بھی دی تھیں رام گلزاری کو لیکن وہ پلٹا نہیں تھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے معدوم ہو گیا۔ کامران نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''میرے خدا..... میرے خدا..... یہ کون سی دنیا ہے سر! ہمارا تعلق تو اس دنیا سے کبھی نہیں رہا۔''

''اب ہو گیا ہے۔'' ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''آؤ چلیں..... پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا ہے ہمیں۔ ذرا ادھر بھی تو چل کر دیکھیں۔''

دونوں واپس ان ڈھلانوں کی طرف چل پڑے۔ ان کا رخ اپنے کیمپ کی طرف تھا۔ کامران نے کہا۔

''بابا جلالی..... ویسے ایک بات کہوں سر! ہمارے لئے تو یہ مزار بڑی برکتوں کا حامل ہے اور اب ہمیں اس کے بارے میں خاصی تفصیلات معلوم ہو چکی ہیں۔''

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

نیرہ بیگم، صفورہ کو لے کر وطن واپس آ گئیں۔ ایک بہت ہی عالیشان کوٹھی کا فوری بندوبست ہو چکا تھا جسے ہر طرح کی ضرورتوں سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ صفورہ بہت زیادہ مطمئن نہیں تھی۔ حالانکہ پچھلے دور میں وہ ایک خوش مزاج اور انتہائی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ دوست بنانا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا لیکن تقدیر نے کچھ اس طرح پلٹا لیا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ پہلی ضرب تو اسے ہارون کی طرف سے لگی تھی جس نے اس سے شادی سے انکار کر کے اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو یہ سوچتی ہیں کہ دنیا ان کی مٹھی میں ہے۔ جدھر رخ کریں گی ان کے احکامات کی تعمیل کرنے والوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ ہوتا بھی یہی رہا تھا۔ زندگی کے بے شمار مسائل ہوتے ہیں لیکن باپ کی دولت، توجہ اور محبت نے مسائل کا لفظ ہی اس کی زندگی سے نکال دیا تھا۔ وہ صرف ایک ہی بات سوچتی تھی کہ وہ جو چاہے گی جو سوچے گی وہی ہو گا۔ اس میں کوئی تبدیلی کسی طور ممکن نہیں ہے اور ایسی کسی شخصیت کو جب اس طرح کا کوئی جھٹکا لگے تو جو کیفیت اس کی ہونی چاہئے وہی ہوئی تھی۔ باپ نے البتہ عقل کا ایک کام کیا کہ اسے لندن لے گیا۔

ماحول بدل گیا اور لندن کی فضاؤں نے آخر کار اس کے دل و دماغ پر دوسرا اثر ڈالا۔ ہارون کو وہ بھول تو نہیں سکی تھی۔ ویسے بھی اس کے دل میں ہارون کے لئے محبت وغیرہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ تو بس انا کی ٹھیس برداشت نہیں کر سکی تھی کہ بدنصیبی نے پھر گھیرا ڈالا اور ہری داس کی کمینگی نے ایک نئی کہانی کو جنم دے دیا۔

ٹنڈن گوپال جیسا بھیانک آدمی اسے ملا۔ یہ وہی ٹنڈن گوپال تھا جس نے سہائے پور میں بابا جلالی کو قتل کیا تھا لیکن اس کے بعد کی کہانی کیا تھی وہ ابھی تک صیغۂ راز میں تھی۔ البتہ صفورہ اس کی شیطانی خباثتوں کو لے کر وطن واپس پہنچ گئی۔ وہ یہاں ناخوش نہیں تھی۔ حاجی عطا کے اہل خاندان نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اسے ہر طرح کی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن بس اس کے اندر ایک بے چینی، ایک بے کلی

تڑپتی رہتی تھی۔ ماں نے اسے بہت ہی اچھا ماحول مہیا کیا تھا اور دنیا بھر کی تفریحات اس کے قدموں میں ڈال دی تھیں۔ لیکن وہ اپنی اس انوکھی بے کلی کو کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ عجیب و غریب احساسات تھے اس کے۔ ایسی انوکھی چیزوں کو دل چاہتا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہ سکے۔

ایک دن گھر کا بچا ہوا ایسا کھانا جو کسی قابل نہیں رہا تھا، اسے ڈسٹ بن میں ڈال کر بہت فاصلے پر رکھ دیا گیا تھا تاکہ صفائی کرنے والے اسے باہر پھینک دیں۔ اس سے سڑانڈ اٹھ رہی تھی۔ صفورہ ٹہلتی ہوئی اس طرف جا نکلی اور پھر اچانک ہی اس کے دل میں اشتہا بیدار ہو گئی۔ وہ ڈسٹ بن کے پاس پہنچی، اسے کھولا۔ سفید سفید چاولوں کے درمیان ننھے ننھے کیڑے بجبجا رہے تھے۔ منصورہ کا ذہن ایک عجیب سے سحر کا شکار ہو گیا۔ اس نے ڈسٹ بن میں ہاتھ ڈالا اور وہ چاول نکال کر کھانے لگی۔ ایسا عجیب و غریب منظر تھا کہ کوئی دیکھے تو دہشت سے بے ہوش ہو جائے۔ صفورہ کی آنکھوں میں نشیلا پن تھا اور وہ یہ چاول کھا رہی تھی کہ ایک ملازم نے دیکھ لیا۔ پہلے تو دیکھتا رہا پھر دھڑ سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

صفورہ خاصی دیر تک یہ چاول کھاتی رہی اور اس کے بعد وہاں سے اٹھ گئی۔ بے ہوش ملازم کو دوسرے ملازموں نے اٹھایا تھا۔

پھر جب ہوش میں آنے کے بعد اس سے صورتحال دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ بیگم صاحبہ کو بتائے گا۔ نیرہ بیگم نے جب ملازم کو دیکھا تو بولیں۔

''ہاں..... کیا بات ہے، سنا ہے تم بیمار ہو گئے تھے۔''

''بیگم صاحبہ! اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' بوڑھے ملازم نے کہا۔

''ہاں بولو..... کہو کیا بات ہے؟ چلو تم سب لوگ جاؤ۔'' نیرہ بیگم نے کہا۔

ملازم ادھر اُدھر دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''بیگم صاحبہ! صفورہ بی بی پر کوئی سایہ ہے۔''

''سایہ.....؟'' نیرہ بیگم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''کوئی برا سایہ جی..... کسی نے جادو کرا دیا ہے ان پر۔ میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ میرا تجربہ ہے جی۔ میری چھوٹی بہن پر بھی سایہ تھا۔ اس پر بھی جادو کرایا گیا تھا جی۔ بس نیم دیوانی ہو گئی۔ گندی سندی چیزیں کھاتی پھرتی تھی۔''

''بابا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا بکنا چاہتے ہو..... صاف صاف بکو۔''

نیرہ بیگم نے غصیلے لہجے میں کہا۔
''اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جی...... آپ کو پتہ چلا ہوگا کہ میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ جانتی ہیں کہاں بے ہوش ہوا تھا؟''
''کہاں......؟''
''کوڑے دان کے پاس۔''
''کیوں...... وہاں کیوں؟''
''وہاں میں نے جو کچھ دیکھا تھا ناں جی وہ بڑا عجیب تھا۔''
''بکو گے یا ایسے ہی بڑ بڑ کرتے رہو گے؟ کیا دیکھا تھا تم نے وہاں؟'' نیرہ بیگم نے ڈپٹ کر پوچھا۔
''صفورہ بی بی ڈسٹ بن کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس میں سڑے ہوئے چاول پڑے ہوئے تھے جی۔ بیگم جی کوڑے والا نہیں آیا تھا جو انہیں لے جاتا۔ صفورہ بیگم نے ڈسٹ بن کھولا اور اس میں سے گندے چاول نکال کر کھانے لگیں۔ ان چاولوں میں کیڑے بجبجا رہے تھے جی۔ آپ یقین کریں ہم نے جب یہ منظر دیکھا تو ہمارا دماغ خراب ہوگیا اور ہم حیرت سے وہیں گر کر بے ہوش ہو گئے۔''
''واہ...... بابا اگر پاگل ہو گئے ہو تو پاگل خانے جاؤ۔ تمہیں اب یہاں نہیں رکھا جائے گا۔ اس طرح کی فضول باتیں کرتے ہو۔''
''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ جی...... معافی چاہتے ہیں۔ ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔ وفاداری کا یہی صلہ ہونا چاہئے۔ ہم تو آپ کو اطلاع دینے آ گئے۔ آپ نے ہمیں نوکری سے نکال دیا...... نکال دیں جی، ملازم ہیں۔ بے عزت نہیں ہیں۔ ارے واہ...... چلیں ٹھیک ہے، وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کبھی مالکوں سے وفاداری نہیں کریں گے۔ جہاں بھی رہیں۔ یہاں یا کہیں بھی۔''
''پھر بک بک...... پھر بک بک...... میں کہہ رہی ہوں یہ بے تکی بکواس تم نے کیوں کی؟''
''ارے ہم نے بے تکی بکواس کیوں کی...... اور کیوں کرتے؟ دماغ تھوڑی خراب ہے ہمارا۔ جو دیکھا سو آپ کو بتا دیا۔ خود ذرا سی نگرانی کر کے دیکھ لیجئے پھر ہمیں بتایئے رہیں یا جائیں۔''
''تمہارا دماغ خراب ہے...... چلو جاؤ اپنا کام کرو۔ فضول باتیں مت کرو۔'' نیرہ

بیگم نے کہا۔
ملازم تو چلا گیا مگر نیرہ بیگم حیرت سے منہ پھاڑے یہ ساری باتیں دیکھتی اور سنتی رہیں۔ پھر خیال آیا کہ صفورہ کے چال چلن اور انداز بہت تبدیل ہو چکے ہیں۔ ایک ایسی انوکھی تبدیلی اس کے اندر رونما ہو چکی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ وہاں لندن میں بھی وہ نجانے کس طرح کی پراسرار راتیں گزارتی تھی۔
پھر انہیں ننڈن گوپال کا آشرم یاد آیا جس کے بارے میں طاہر علی صاحب نے انہیں مختصراً بتایا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ایک ناپاک ہندو ہے اور اپنے آشرم میں کالا جادو سکھاتا ہے۔ بڑے بڑے انگریز اور دوسرے ممالک کے لوگ اس کے آشرم میں اس کے چیلے بنے ہوئے ہیں۔ وہ سب کالا جادو سیکھتے ہیں اور کالا جادو گندگی چاہتا ہے۔
''ارے باپ رے...... کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ صفورہ کو بھی کالا جادو سیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہو اور بوڑھے ملازم کی یہ اطلاع اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔''
نیرہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسی رات شوہر کو ٹیلی فون کیا۔
''آپ وہاں بیٹھے ہوئے آرام کر رہے ہیں اور میں یہاں سولی پر لٹکی ہوئی ہوں۔ آپ نے بلا کی طرح ہم دونوں کو وہاں سے ٹال دیا۔ مجھے بتایئے میں کیا کروں؟''
''بھئی کون وقت ضائع کر رہا ہے؟ زبردست پھیلا ہوا کاروبار ہے۔ حالات کے تحت فیصلے کرنے پڑ رہے ہیں۔ ہر جگہ سے کاروبار کو سمیٹ رہا ہوں۔ سوچا ہے کہ ایک ہی بچی ہے، بے پناہ دولت ہے میرے پاس۔ مزید ہنگامہ آرائی کر کے کیا کروں گا؟ وہ کسی اچھے گھر میں چلی جائے گی تو رہ جائیں گے ہم دو افراد۔ اور ہم دو افراد کو زندگی گزارنے کے لئے اللہ نے بہت کچھ دیا ہوا ہے۔ وہیں اپنے وطن میں عزیزوں اور دوستوں کے درمیان رہیں گے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اپنے کاروبار کو سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔''
''اور یہاں جو زندگی گھٹی جا رہی ہے اس کا کیا ہوگا؟'' نیرہ بیگم نے کہا۔
''نیرہ! کوئی خاص بات ہے کیا؟''
''ٹیلی فون پر ہی سب کچھ بتا دوں آپ کو؟''
''بتاؤ...... کچھ تو بتاؤ۔''

''صفورہ کے چال چلن بہتر نہیں رہے۔''

''کک...... کک...... کیا مطلب...... کک...... کیا وہ......؟''

''میں ان چال چلن کی بات نہیں کر رہی۔ اس کے کردار میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ اس کی شخصیت میں کوئی خرابی پیدا ہو چکی ہے۔''

''آخر کیا؟''

''نہیں بتاؤں گی...... آپ بھی تو تڑپئے تھوڑا سا۔''

''نیرہ! مجھے بتا دو...... اسے کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟''

''خطرہ نہیں ہے...... اگر خطرہ نہیں تھا تو وہاں سے یہاں کیوں بھیجا تھا آپ نے اسے؟''

''وہ...... وہ میرا مطلب ہے کچھ تو بتاؤ۔''

''میں نے کہا ناں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ آپ یہاں آئیں گے تب میں سب بتاؤں گی۔''

''اچھا، اچھا...... ٹھیک ہے۔ دو تین دن کے اندر اندر آ رہا ہوں۔ حالانکہ مجھے کام ادھورا چھوڑ کر آنا پڑے گا۔ میں دوبارہ واپس چلا جاؤں گا۔ تم کہہ رہی ہو تو آ جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... آپ آیئے۔ میں تبھی آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔'' نیرہ بیگم نے کہا۔ جھلاہٹ ان کے اپنے ذہن میں بھی آ گئی تھی۔ ٹھیک ہے ملازم تھے، دوسرے لوگ، نوکر چاکر، حاجی عطا صاحب بھی تھے لیکن بیٹی کی بات باہر تو نہیں نکالی جا سکتی تھی۔ اس کا تو مستقبل ہی ختم ہو جاتا۔ پھر کون ہوتا جو اس سے شادی کرتا یہ جاننے کے بعد کہ وہ کالے جادو کے زیر اثر ہے۔

بہرحال طاہر علی بھی ادھر اتنے ہی پریشان ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوری طور پر واپسی کا فیصلہ کیا اور وطن واپس پہنچ گئے۔ گھر پہنچے تو بیٹی کو خوش و خرم پایا۔ غلاظت کھانے کے بعد صفورہ کو اپنے اندر ایک عظیم تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کا اضطراب ختم ہو گیا ہو۔ وہ بے چینی جو اس کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی ایک دم سے رفع ہو گئی تھی۔ کالے علم کو ہمیشہ غلاظتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

بہرحال نندن گوپال نے اس کے وجود میں کالا علم اتار دیا تھا اور ظاہر ہے یہ

سب کچھ اتنی آسانی سے زائل نہیں ہو سکتا تھا۔ طاہر علی نے حیرانی سے بیوی کو دیکھا۔ نیرہ بیگم کا چہرہ البتہ کچھ جھلسا جھلسا سا لگ رہا تھا۔ بہرحال بیٹی باپ کے آنے سے بہت خوش ہوئی تھی۔

''آپ نے خوب چال چلی پاپا...... میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کیا جانتے ہیں میں بے وقوف ہوں؟ مجھے وہاں سے یہاں لانے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا گیا۔'' صفورہ نے مسکراتی نگاہوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ طاہر علی کو صفورہ کے انداز سے خاصی ڈھارس ہوئی تھی۔

''بیٹا! لندن ہمارے لئے سازگار نہیں رہا تھا۔''

''کیوں...... آپ کو یہی شبہ تھا ناں کہ میں بدکار نہ ہو جاؤں؟'' صفورہ نے صاف گوئی سے کہا۔

''ارے نہیں بیٹا! کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''نہیں...... میں جانتی ہوں۔ خیر کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں اور میرا فرض ہے کہ آپ کی ہر خوشی پر گردن جھکا دوں۔''

رات کو بیڈ روم میں طاہر علی نے بیگم سے کہا۔

''نیرہ بیگم! اگر آپ نے میری محبت کو آزمایا ہے تو خدا کا شکر ہے کہ میں اس پر پورا اترا ہوں اور اگر خود آپ کے دل میں مجھ سے فاصلے رکھے ہیں تب بھی مجھے خوشی ہے کہ میری بیگم کے دل میں آج بھی میرے لئے اتنی ہی چاہت ہے۔''

''دیکھئے بلی کو دیکھ کر کبوتر نہ بنئے۔ دونوں باتیں سچ ہیں۔ آپ کی محبت بھی بے مثال ہے مجھ سے اور اپنی بیٹی کے لئے، میرے دل میں بھی آپ سے دوری کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور میں آپ سے دور نہیں رہنا چاہتی۔ لیکن اس وقت میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ایک ٹھوس سچائی ہے۔ صفورہ کسی مشکل کا شکار ہو چکی ہے اور ظاہر ہے وہ مشکل وہیں اسی آشرم سے پیدا ہوئی ہے جس کے بارے میں مختصراً آپ نے مجھے بتایا تھا۔''

''ہوا کیا ہے؟ کم از کم مجھے تفصیل تو بتاؤ۔'' طاہر علی نے بیوی سے سوال کیا۔

''ابھی کچھ دن پہلے وہ بہت ملول اور اداس رہتی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہیں آتا تھا۔ مجھ سے تو خیر کچھ نہیں کہتی تھی لیکن میں یہ دیکھتی تھی کہ وہ یہاں آ کر خوش نہیں ہے۔ اور پھر اس دن ملازم نے اسے کوڑے دان سے

سڑے ہوئے چاول نکال کر کھاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے ملازم کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش تو کر دیا ہے لیکن سنا یہی جاتا ہے کہ جب کالے جادو کے اثرات ہوتے ہیں تو انسان غلیظ چیزیں کھاتا پیتا ہے۔''

طاہر علی بھی سوچ میں ڈوب گئے۔ انہوں نے کہا۔

''کچھ عجیب صورتحال ہے۔ وہاں لندن میں ٹنڈن گوپال کے آشرم کے بارے میں بڑی نفرت پائی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس کے سخت مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہندو سادھو اس آشرم کے ذریعے برائیاں پھیلا رہا ہے۔ لیکن اس کے خلاف ابھی تک کسی نے باقاعدہ آواز نہیں اٹھائی کیونکہ وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ وہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کالا جادو سکھایا جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ صفورہ وہاں تک کیسے پہنچی لیکن میرے مخبروں نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ وہ باقاعدہ اس آشرم کی ممبر بن گئی تھی۔ اب ایسا کیسے ہوا یہ ہمیں نہیں معلوم۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا ہے وہ اب ہو چکا ہے۔ میں چونکہ اچانک ہی یہاں آیا ہوں اور وہاں میرے بہت سے کام رکے ہوئے ہیں چنانچہ مجھے واپس تو جانا پڑے گا۔ لیکن بہت جلد میں یہاں واپس آ جاؤں گا اور اس کے بعد دیکھوں گا کہ میں یہاں کیا کر سکتا ہوں۔''

''میں تو سخت پریشان ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے۔ یہاں آنے کے بعد ہم کچھ ایسا عمل کریں گے جس کے تحت وہ شادی پر آمادہ ہو جائے۔ یہ کام اگر ہو جائے تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' نیرہ بیگم نے فکرمندی سے کہا۔

ماں باپ اپنے طور پر پریشانی کا وقت گزار رہے تھے لیکن صفورہ اس کے بعد سے کافی حد تک خوشگوار کیفیتوں کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کرتی رہی ہے۔ لیکن تیسری رات وہ چوروں کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قدم اسی غلاظت گاہ کی طرف بڑھ گئے۔ نیرہ بیگم نے البتہ ایک کام کیا تھا۔ انہوں نے ملازموں کو ہدایت کر دی تھی کہ کوڑے دانوں میں ایک ذرہ نہیں رہنا چاہئے ورنہ وہ انہیں نکال دیں گی۔ ملازموں نے خود سارے ڈسٹ بن صاف کئے تھے۔ صفورہ وہاں تک پہنچی اور اس کے بعد افسوس بھرے انداز میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر وہ وہاں سے واپس پلٹی۔ ایک ملازم کے کوارٹر سے اسے بدبو سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تو اس کے قدم رک گئے۔ کوارٹر میں داخل ہونے کے لئے جو دروازہ تھا وہ بند تھا۔ صفورہ

بمشکل تمام دیوار پر چڑھی اور اندر کود گئی۔ وہ بدبو اسے اپنی جانب راغب کر رہی تھی۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ کوارٹر کے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔

باورچی خانے کے پچھلے حصے میں ایک ٹوکری رکھی نظر آئی جس میں سڑے ہوئے کیلے، خربوزے اور آموں کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ یہ کئی دن سے یہاں موجود تھے اس لئے بری طرح سڑ گئے تھے۔ خاص طور سے سڑے ہوئے ٹماٹروں نے فضا میں بڑی بدبو پھیلا رکھی تھی۔ لیکن یہ بدبو صفورہ کو دنیا کی سب سے بہترین خوشبو لگ رہی تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور اس کے بعد ٹوکری میں ہاتھ ڈال دیا۔ سڑے ہوئے کیلے، گلے ہوئے ٹماٹر، آموں کے چھلکے، پانی بن کر بہتے ہوئے خربوزے اسے بہترین خوراک محسوس ہو رہے تھے اور وہ بے صبری سے انہیں کھا رہی تھی۔ جب وہ دیوار سے کودی تھی تو ملازم کی بیوی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو جگایا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کوئی اندر کودا ہے غفور......''

''کیا مطلب......؟''

''ابھی دھم سے کودنے کی آواز سنائی دی ہے۔ کوئی چور نہ ہو۔''

''ایک بات کہوں تجھ سے؟'' ملازم غفور نے اپنی نوجوان بیوی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں بولو۔''

''تیری جوانی کہیں ضرورت سے زیادہ ہی بے قابو نہ ہو جائے۔ راتوں کو سونے نہیں دیتی تو مجھے۔ سوکھ کر ڈھانچہ بن جاؤں گا۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا...... پاگل ہو گئے ہو۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ تمہیں جگاؤں۔ تم اپنی غرض سے میری طرف متوجہ ہوتے ہو ورنہ میں تھوکتی بھی نہیں ہوں تمہارے منہ پر۔''

''ارے...... ارے...... برا مان گئی؟ چل جو تو کہے گی کر لیتا ہوں۔''

''میں کہتی ہوں بکواس مت کرو...... دیکھو...... دیکھو پھر آہٹ ہوئی۔'' اس کی بیوی بولی اور اس بار یہ آہٹ خود ملازم غفور نے بھی سنی تھی۔

''ارے باپ رے...... کوئی ہے تو سہی۔ کہیں کوئی بلی وغیرہ نہ ہو۔''

''بلی ہاتھی کے برابر نہیں ہوتی۔''

''مگر تعجب ہے اگر کوئی چور ہے تو کیا پاگل ہے وہ؟''

''چور پاگل ہوتے ہیں؟''

''تو اور کیا...... یہ پاگل پن ہی کی بات ہے۔ مالکوں کی حویلی چھوڑ کر نوکروں کے کوارٹر میں۔''

''ہوسکتا ہے وہ کوئی غریب چور ہی ہو۔'' بیوی نے کہا۔

''دیکھتا ہوں...... دیکھتا ہوں...... واقعی کوئی ہے۔ یہ کسی بلی وغیرہ کی آہٹ نہیں ہے۔'' ملازم نے کہا اور احتیاط کے ساتھ بستر سے نیچے اتر آیا۔ پاس رکھا ہوا ڈنڈا اٹھایا اور پھر آہستہ آہستہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ادھر ادھر دیکھا، چڑ چڑ کی آواز باورچی خانے کی پیچھے والی جگہ سے آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ مدھم مدھم روشنی میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے کسی انسانی وجود کو دیکھا جو گلے سڑے پھلوں والی ٹوکری کے قریب بیٹھا پھل کھا رہا تھا۔ ملازم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ گلے سڑے پھل کئی دن پرانے رکھے ہوئے تھے اور ان سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بیوی کو برا بھلا کہہ کر انہیں اٹھا کر باورچی خانے کی پیچھے والی گلی میں ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ مگر یہ کون بھوکا ہے؟ اس نے ایک دم باورچی خانے کی روشنی جلا دی اور اس کے بعد اس نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر خوف سے منہ کھول کر رہ گیا۔

مالکن کی بیٹی تھی۔ گھر کی مالکہ تھی۔ لیکن اس وقت کیا لگ رہی تھی۔ یہ دیکھنے کے قابل تھا۔ چاند کی طرح چمکتے ہوئے چہرے پر سڑے ہوئے ٹماٹروں کی غلاظت، منہ سے لٹکتا ہوا کیلے کا چھلکا۔ ٹھوڑی، ماتھے اور چہرے پر جگہ جگہ سڑی ہوئی چیزیں لپٹی نظر آ رہی تھیں۔ ملازم کو دیکھ کر اس نے ایک وحشت ناک چیخ ماری بالکل کسی خونخوار بلی جیسی آواز اس کے منہ سے نکلی تھی اور اس کے بعد اس نے غفور پر چھلانگ لگا دی۔ غفور کے حلق سے ایک دھاڑ نکلی تو اندر سے بیوی بھی چیخ پڑی۔ لڑکی نے اس کے چہرے پر ناخن مارے اور غفور کی کھال جگہ جگہ سے چھل گئی تھی اور خون چھلک آیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی دیوار کے پاس پہنچی اور اس کے بعد بلی کی طرح اچھل کر دیوار پر چڑھی اور دوسری طرف کود گئی۔

غفور کے حلق سے بدستور چیخیں نکل رہی تھیں۔ اندر اس کی بیوی چیخ رہی تھی۔ دونوں باہر نہیں نکلے تھے لیکن دوسرے ملازم جلدی جلدی اپنے کوارٹروں سے باہر نکل

آئے اور سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا...... کیا بات ہے...... پتہ یہ چلا کہ غفور چیخا تھا۔

غفور کا چہرہ دیکھا تو اس پر جگہ جگہ خون کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔

''ارے کیا ہوا...... کیا ہو گیا؟...... کیا بات ہے غفور...... کون تھا؟''

غفور سمجھدار ملازم تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر مالکن کی بیٹی کو بدنام کر سکتا تھا لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ ایک دم اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور بولا۔

''ارے بھئی کیا بتاؤں...... کتنی بڑی بلی تھی۔ اللہ رحم کرے...... یہی لگا تھا کہ جیسے کوئی نیچے کودا ہو۔ میں دیکھنے کے لئے وہاں گیا تو کالے رنگ کی ایک اتنی بڑی بلی کو وہاں پایا۔ کتے کے برابر تھی پوری کی پوری۔ پھلوں کی ٹوکری کے پاس بیٹھی ہوئی ٹوکری کرید رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مجھ پر چھلانگ لگائی اور دیکھو چہرے پر پنجے مارتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔''

''کتے کے برابر بلی؟''

''ہاں...... جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''یار یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کتا ہو؟'' ایک ملازم نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''کتے اور بلی میں فرق تو ہوتا ہے ناں۔''

''ہوتا تو ہے۔''

''اور تو بھی نرا پاگل ہے...... ابے کتا اس طرح چہرے پر پنجے نہیں مارتا۔ یہ کام بلی ہی کا معلوم ہوتا ہے۔''

''تو پھر غفور چاچا نے افیم کھا لی ہو گی جو انہیں بلی کتے کے برابر نظر آئی۔ ارے چلو چاچا، اس پر کچھ لگاؤ۔ بلی کے پنجے زہریلے بھی ہو سکتے ہیں۔ جاؤ آرام کرو۔''

غفور اندر آ گیا۔ ملازم بھی اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے تھے لیکن غفور کا دل بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے جاگتی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کیا ہے؟ صفورہ کو اس نے صاف پہچان لیا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ دوسرے کسی ملازم نے صفورہ کو بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بیوی صورتحال پوچھنے لگی۔ اس نے بیوی کو بھی وہی سب کچھ بتایا اور بولا۔

''تو نے ہی مجھے باہر دھکیلا تھا...... مروا دیا ناں......''

''ٹھہرو، میں چونا لگا دیتی ہوں۔''

"نمک لگا دے...... زخموں پر نمک لگانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"
"ارے تو پھر کیا لگاؤں؟"
"کتھا لگا...... کتھا......" ملازم نے کہا۔
"کتھا کہاں سے لاؤں؟"
"چونا کہاں سے لاتی؟"
"ہاں...... یوں تو چونا بھی گھر پر نہیں ہے۔"
"مٹی کا تیل ہے؟"
"ہاں وہ ہے......" بیوی جلدی سے بولی۔
"اسے منہ پر ڈال اور ماچس لگا دے۔" غفور نے کہا اور نلکے کی جانب بڑھ گیا تاکہ منہ دھو لے۔ زخموں پر تکلیف ہو رہی تھی اور اسے جھلاہٹ آ رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیرت نے بھی اس پر غلبہ طاری کیا ہوا تھا۔

❁

ادھر صفورہ کوارٹر سے چھلانگ لگا کر بھاگی اور اندرونی حصے میں داخل ہو گئی۔ اس کے بدن میں بے پناہ چستی اور پھرتی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب ہنسے...... بات بات پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔ واش روم میں داخل ہو گئی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر خوب قہقہے لگائے اور پھر منہ دھونے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے بدن میں توانائیاں ہی توانائیاں دوڑ گئی ہوں۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد واپس پلٹی۔ لباس بھی جگہ جگہ سے گندا ہو گیا تھا۔ اس نے لباس اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور بے لباس ہی مسہری پر آ کر لیٹ گئی۔ ریشمی چادر بدن پر ڈال لی۔ چادر بدن پر سرسرائی تو ایک گدگدی کا سا احساس ہونے لگا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار اپنے بدن پر چلنے لگے اور آہستہ آہستہ وہ بدن کو رگڑنے لگی۔ لیکن بہت دن کے بعد اسے ایک دم ان گزرے ہوئے واقعات کا خیال آیا۔ جب اس نے اپنے بدن کے کھلے ہوئے مسامات سے ننھے ننھے وجود برآمد ہوتے ہوئے دیکھے تھے۔ جہاں جہاں اس کے ہاتھ کی گردش ہوئی وہاں کے مسامات کھلنے لگے اور کوئی پانچ چھ ننھے ننھے چہرے ان مسامات سے نمودار ہونے لگے۔

وہ چھوٹی چیونٹیوں کے برابر تھے لیکن بدن سے برآمد ہونے کے بعد ان کی جسامت تھوڑی سی بڑھی اور پھر وہ اپنے پیروں پر چلتے ہوئے صفورہ کے سینے کی طرف

بڑھنے لگے۔ وہ صفورہ کے سینے کی بلندیاں طے کرتے ہوئے بار بار پھسل کر نیچے گر رہے تھے اور صفورہ انہیں حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ بہرحال سب کے سب صفورہ کے سینے پر آ کھڑے ہوئے۔ صفورہ نے انہیں دیکھ کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔
"تم میرے بیر ہو ناں؟"
"ہاں ہماری مالکہ...... ہاں دیوی...... بیر ہیں ہم تیرے۔"
"مگر تمہارے اندر ایک بہت بڑی خرابی ہے۔"
"وہ کیا دیوی؟" وہ بیک وقت بولے۔ ان کی باریک باریک آوازیں صفورہ کو بہت اچھی لگ رہی تھیں۔
"وہ یہ کہ ایک بار نمودار ہونے کے بعد تم دوبارہ واپس نہیں آتے۔ تم سے محبت کرنا تو بیکار ہے۔"
"ہم محبت کو جانتے بھی نہیں ہیں دیوی! ہم تو صرف تیری اطاعت کرتے ہیں۔"
"اچھا مجھے یہ بتاؤ تم میرے لئے کیا کیا کر سکتے ہو؟"
"دیوی! ہمارے ننھے ننھے وجود اس قابل تو نہیں ہیں کہ ہم تیرے لئے زمین آسمان ایک کر دیں لیکن چھوٹے چھوٹے کام جو تو ہمیں کہے گی وہ ہم ضرور کر سکتے ہیں۔"
"چھوٹے چھوٹے کیا کام ہوتے ہیں؟ ایک بات اور بتاؤ، تم لوگ زیادہ سے زیادہ کتنے بڑے ہو سکتے ہو؟"
"بس اتنے دیوی جتنے اس وقت تیرے سامنے ہیں۔"
"تب تو بے کار ہے...... کوئی بھی تمہیں کچل کر مار سکتا ہے۔"
"نہیں دیوی! ہم مرتے نہیں ہیں۔ بس آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔"
"مرتے نہیں ہو تم؟"
"نہیں دیوی! ہمارے لئے موت نہیں ہے۔ مگر ہم ایک سے گزارنے کے بعد پتھرا جاتے ہیں۔ اگر اسی کو تو موت کہتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم پتھرا کر دیکھتے ہیں، سنتے ہیں مگر حرکت نہیں کر سکتے۔ ہمارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔"
"میرے لئے کچھ معلومات تو فراہم کر سکتے ہو؟"

''ہاں دیوی کیوں نہیں؟''

''اچھا تو بتاؤ میں جس کوارٹر میں گئی تھی وہ کس کا ہے؟''

''نوکر کا ہے دیوی۔''

''نہیں ...... میرا مطلب ہے وہاں کون رہتا ہے؟''

''غفور۔''

''وہ اس وقت کیا کر رہا ہے؟''

''تم نے اس کے چہرے پر جو زخم لگائے تھے وہ ان پر مرہم لگا رہا ہے۔''

''اس نے مجھے دیکھا تھا؟''

''ہاں دیوی! دیکھا تھا۔''

''وہ مجھے کچھ نقصان تو نہیں پہنچائے گا؟''

''نہیں دیوی! کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہ تو نوکر ہے۔''

''اور کیا باتیں کروں تم سے...... اچھا یہ بتاؤ میرے ماں باپ کیا کر رہے ہیں؟''

''وہ سو رہے ہیں دیوی۔''

''اچھا یہ بتاؤ لندن کے آشرم میں گرو جی کیا کر رہے ہیں؟''

''جے کالی کلکتے والی۔'' ان پانچوں نے کہا اور گردنیں جھکا لیں۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ بالکل قریب سے ہی انہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دور سے اگر کوئی انہیں دیکھتا تو زیادہ سے زیادہ تیز نگاہ والا یہ دیکھ لیتا کہ زمین پر کچھ کیڑے رینگ رہے ہیں۔

''تم نے جواب نہیں دیا...... اس آشرم میں کیا ہو رہا ہے۔ گرو جی کیا کر رہے ہیں؟''

''دیوی! ننڈن گوپال کا آشرم ہمارے لئے عبادت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ عبادت گاہوں کے راز زبانوں سے کبھی باہر نہیں نکلتے۔ کون جانے مہاراج ننڈن گوپال کون سی بات باہر نکالنا چاہیں اور کون سی نہیں نکالنا چاہیں۔ اور پھر ہماری آنکھیں اتنی دور تک دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ چنانچہ آشرم کا حال ہم سے مت پوچھو۔'' باریک باریک آوازوں میں جواب ملا اور صفورہ ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ان آوازوں کو سننے لگی۔ ساری باتیں اپنی جگہ ننڈن گوپال نے اسے کالے جادو کے بارے میں جتنی بھی باتیں بتائی تھیں، جتنی بھی معلومات فراہم کیں وہ ایک الگ بات تھی۔ لیکن اتنی ریاضتوں کا صلہ ان بیروں کی شکل میں مل گیا تھا۔ ان ریاضتوں کو قائم رکھنا ایک الگ عمل تھا۔

بہر حال اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک تصور ابھرا۔ اس نے کہا۔

''میرے بیرو! مجھے ایک بات بتاؤ''

''جی دیوی ...... جی دیوی......'' آوازیں ابھریں۔

''ایک شخص ہارون ہوتا تھا ...... میں نے اس کے لئے بہت کچھ کیا۔ اس نے مجھے ٹھکرا دیا اور کسی اور سے شادی کر لی۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ''

کچھ لمحے خاموشی رہی، پھر بیروں نے کہا۔

''وہ ٹھیک ہے...... زندہ سلامت ہے۔ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ ایک بچے کا باپ ہے۔ اب تو بڑا سے بیت گیا۔ وہ اپنی بیوی افشاں کے ساتھ خوش ہے اور ایک دور دراز علاقے میں اپنا کام کر رہا ہے۔''

''آہ...... مجھے اس کے بارے میں کچھ اور تفصیل بتاؤ۔'' صفورہ نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ بیر پھر کچھ وقت خاموش رہے پھر انہوں نے کہا۔

''جس لڑکی سے اس نے شادی کی ہے اس کا نام افشاں ہے۔ اس کے باپ کا نام مرزا غیاث بیگ تھا۔ باپ مر چکا ہے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ ہم تمہیں اس گھر کا راستہ بتا سکتے ہیں۔ اس کا پتی ہارون سرکاری نوکر ہے اور ایک دور دراز علاقے میں نقشے بنا رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے بہت پریم کرتا ہے۔ اس کا بیٹا بھی اس کا چہیتا ہے۔ بس دیوی! اتنی معلومات ہم تمہیں دے سکتے ہیں۔''

''افشاں کے باپ کا کیا نام تھا......؟''

''مرزا غیاث بیگ۔''

''ہوں ...... ٹھیک ہے میرے بیرو! کیا تم ہر گھڑی، ہر وقت میرا ساتھ دے سکتے ہو؟''

''ہم تیرے خون کے قطروں سے پیدا ہوتے ہیں دیوی! جب بھی اپنے بدن کو ملے گی، تیرے ہر مسام میں سے ایک بیر پیدا ہو جائے گا اور تو جس طرح چاہے گی ہم تیرے حکم کی تعمیل کریں گے۔ پر ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا دیوی، ہم اپنے شریر کی طرح کمزور ہوتے ہیں۔ کوئی بڑی طاقت والا کام ہم سے نہ کرانا۔''

صفورہ، ہارون کے بارے میں تفصیلات سن کر ایک بار پھر انہی احساسات کا شکار ہو گئی تھی جو اسے آتش بنا دیتے تھے۔ دفعتہً ہی اس کے ذہن میں ایک تصور پیدا ہوا تھا۔ جب مجھے اتنی قوتیں حاصل ہو ہی گئی ہیں تو کیوں نہ ہارون سے اپنا انتقام

لینے کی کوشش کروں؟ اس احساس نے نجانے کیوں اسے ایک خوشی سی بخشی تھی۔

❀

ہارون اپنی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے گزر رہا تھا۔ بابا جلالی کے بارے میں معلومات حاصل ہونے کے بعد اس کے دل میں بابا جلالی کے لئے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی دن وہ بابا جلالی کے مزار پر پہنچ گیا اور بڑی عقیدت سے وہاں فاتحہ خوانی کی۔ کامران بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ واپسی پر کامران نے کہا۔

''حقیقت یہ ہے ہارون صاحب! کہ ویسے تو ہم نے بہت سی جگہوں پر سروے کا کام کیا ہے اور بڑے بڑے دلچسپ واقعات سے ہمارا واسطہ پڑا ہے۔ لیکن یہاں اس علاقے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ واقعی کمال کی بات ہے۔''

''یار! ساری باتیں اپنی جگہ، میری تو ڈبل ڈبل شادی ہوگئی۔'' ہارون نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ویسے ایک بات بتاؤں سر! چندر بدن ہے بہت خوبصورت۔''

''ہاں...... لیکن صرف ایک خواب...... ایک کہانی۔'' ہارون نے کہا۔

''پتہ نہیں اس کا ماضی کیا ہے۔ کوئی بات ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آئی۔ اچھا ایک بات بتائیں کیا آپ کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ چندر بدن کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں؟''

''ہاں...... کیوں نہیں...... تجسس تو انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ آخر وہ میری جانب کیوں متوجہ ہوئی؟ کیا میری زندگی کا کوئی راستہ اس کی سمت جاتا ہے؟''

''واقعی...... بالکل سنجیدگی سے سوچنے والی بات ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو آپ کا ماضی کیا ہے؟ خیر یہ بات تو ہمارا ایمان ہے کہ ہندو عقیدے کے مطابق آواگون کی جو کہانیاں ہوتی ہیں وہ صرف کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ بات تو تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی کہ ماضی میں کوئی آپ کا جنم ہو گا۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو بڑی احمقانہ سوچ ہے۔''

وہ دونوں اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ کامران خود حیرت کا شکار تھا۔ اس

نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سر! آپ تو ویسے بھی شادی شدہ ہیں۔ میں ایک غیر شادی شدہ شخص اگر ایسی کسی حسین روح کے جال میں پھنستا تو میرے لئے تو بہت بہتر تھا۔''

''اس وقت تو ہوا کھسک جاتی ہے تمہاری جب تم......''

''بس...... بس جناب...... ایسے خوفناک واقعات کا تذکرہ مت کریں۔ ویسے رام گلزاری کا کیس بھی بڑا عجیب ہے۔ ہر بات ہی عجیب ہے۔ جدھر دیکھو، جدھر غور کرو۔ ایک دم سے ذہن گھوم جاتا ہے۔ اور ایک بات بالکل سچ بتاؤں آپ کو؟'' کامران بے تکلفی سے بولا۔

''ہاں بتاؤ۔''

''خدا کی قسم، خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ان واقعات میں ایسی دلکشی ہے کہ ان سے دور جانے کو دل بھی نہیں چاہتا۔'' ہارون کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

بہرحال اسے افشاں سے محبت تھی۔ اپنے بیٹے اشعر کو بھی وہ زندگی کی طرح چاہتا تھا لیکن انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔ چندر بدن کا خیال اس کے ذہن پر اچھی خاصی گرفت قائم کر چکا تھا۔ چنانچہ اس رات بھی وہ بہت دیر تک اپنے خیمے میں بستر پر لیٹا چندر بدن کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا ہی بھیانک واقعات تھے۔ بازیبیں کیسا عجیب و غریب رخ اختیار کر گئی تھیں۔ وہ خوفناک شخص گجراج۔ ہارون کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان تمام واقعات کی تہہ میں اتر جائے۔ لیکن ظاہر ہے یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

رات کے غالباً دس بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ تب اچانک اس کے کانوں میں ''چھن'' کی ایک آواز ابھری۔ وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا لیکن ایک دم سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ کہیں یہ خیالات کا نتیجہ تو نہیں ہے؟ یہ کوئی وہم تو نہیں ہے؟ لیکن چھن، چھن، چھن کی آواز دو تین بار ابھری تو وہ پھرتی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ آواز باہر سے آ رہی تھی۔ ممکن ہے دوسرے لوگوں نے بھی اسے سنا ہو۔ وہ باہر نکل آیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر دور ڈھلوانوں کے پاس اسے چندر بدن کا سایہ نظر آ گیا اور وہ بے اختیار ہو گیا۔ اس کا ایک ہاتھ اٹھا۔ اس نے چیخ کر چندر بدن کو آواز دینے کی کوشش کی۔ لیکن آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔ البتہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے قدم خود بخود آگے بڑھ رہے ہیں۔ جیسے کوئی مشینی عمل انہیں متحرک کر رہا ہو۔ چندر بدن کا سایہ اس سے آگے

آگے چلتا ہوا ڈھلانوں میں اتر گیا اور خود ہارون بھی ان ڈھلانوں کی جانب چل پڑا۔
چندر بدن آگے آگے جا رہی تھی۔ پھر پہلی بار اس کے منہ سے نکلا۔
"رک جاؤ چندر بدن...... رک جاؤ۔"
چندر بدن نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ چاند سا چہرہ، ہونٹوں پر مسکراہٹ، آنکھوں کی گہرائیاں جھیل کی گہرائیوں کی طرح۔ کس قدر حسین وجود رکھتی تھی وہ۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کا انتہائی متناسب بدن شاخوں کی طرح ہچکولے لیتا ہوا تھا۔ اتنا خوبصورت بدن بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ سڈول پاؤں جو تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہارون ان قدموں پر نگاہیں جمائے آگے بڑھتا رہا اور نجانے کتنا فاصلہ طے ہو گیا۔ یہ سب کچھ بے خودی کے عالم میں ہوا تھا۔
اچانک ہی چھن چھن کی وہ آواز رکی اور اس کے بعد چندر بدن نگاہوں سے گم ہو گئی۔ ہارون کو ایک دم جیسے ہوش سا آ گیا تھا۔ وہ بھٹکی بھٹکی نگاہوں سے ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگا اور پھر کافی فاصلے پر اسے روشنی نظر آئی۔ اس وقت ہارون کے ذہن میں کوئی خاص تصور نمودار ہو گیا تھا۔ بس ایک ہوش اور بے ہوشی کا عالم تھا۔ چنانچہ اس کے قدم اس روشنی کی جانب بڑھ گئے۔ یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ کتنا فاصلہ طے کر کے وہاں تک پہنچا ہے۔ روشنی آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی سازوں کے بجنے کی آواز ابھرنے لگی تھی۔
جوں جوں اس کے قدم آگے بڑھ رہے تھے، سازوں کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ غالباً رقص و موسیقی کا کوئی منظر تھا۔ ہارون کو وہ لمحات یاد آ گئے جب اس نے بھری سبھا میں چندر بدن کو اپنی پتنی سوئیکار کیا تھا۔ دوبارہ ان لوگوں کا کوئی وجود نہیں ملا تھا۔ نہ ہی وہاں چتا وغیرہ کے کوئی نشانات ملے تھے۔ ویسے اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں وہ واقعہ پیش آیا تھا۔
ہارون آگے بڑھتا رہا اور پھر اس نے روشنیوں کے سائے میں انسانوں کے گروہ دیکھے۔ بہت سے لوگ تھے۔ قرب و جوار میں چھوٹے چھوٹے ڈیرے لگے ہوئے تھے۔ خاص قسم کے خیمے جو گھاس پھونس اور پھٹے پرانے کپڑوں سے بنائے گئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر انسانوں کا مجمع گھیرا بنائے ہوئے کھڑا تھا۔ موسیقی کی آواز وہیں سے ابھر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی گھنگھروؤں کی چھنا چھن۔ ہارون آگے بڑھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں پہنچ گیا۔ کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔

اس نے اپنے لئے جگہ بنائی اور درمیان میں دیکھنے لگا۔ وہ رقص کر رہی تھی۔ ہاں، وہ چندر بدن ہی تھی جس کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں جیسے چاند اتر آئے تھے۔ وہ اپنی چمکدار آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے ایک انتہائی ہیجان خیز رقص کر رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی چھنکار ایک سماں باندھے ہوئے تھی اور اس کی چھنا چھن جاری تھی۔ وہ لہریں لے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنا رقص دکھانے کے لئے ہارون کو اس کے خیمے سے یہاں تک لائی ہو۔
ہارون اسے دیکھنے لگا۔ اس وقت سب کچھ اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ چندر بدن اس کے ہوش و حواس پر چھائی جا رہی تھی۔ کس قدر حسین تھی وہ...... کتنی پیاری تھی۔ کیا زندگی میں کبھی اس کے حصول کی خواہش کی جا سکتی ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔
رقص جاری رہا۔ وہ ناچے جا رہی تھی۔ کتنی ہی بار اس کی آنکھیں ہارون کی جانب اٹھی تھیں اور یوں لگا تھا جیسے وہ بہت ہی پیار بھری نگاہوں سے ہارون کو دیکھ رہی ہو۔ پھر اچانک ہی کچھ ہلکی ہلکی آوازیں بلند ہوئیں اور بڑے بڑے دف بجنا بند ہو گئے۔ ایک دم سے گہرا سکوت چھا گیا تھا لیکن اس گہرے سکوت میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کوئی آ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں مڑ گئیں۔
رات کے تاریک اندھیروں میں چند گھوڑ سوار اس طرف آتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ قریب آ گئے۔ چندر بدن ناچتے ناچتے رک گئی اور دوسروں کی طرح ان گھوڑ سواروں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہارون خود بھی ان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ کوئی بارہ پندرہ افراد تھے جو گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ ان کے جسموں پر قیمتی لباس تھے۔ سب سے آگے والا آدمی جس کی وہ سب عزت و احترام کر رہے تھے کسی قدر بھاری بدن کا مالک، درمیانے قد و قامت رکھنے والا تھا۔ وہ لوگ آگے بڑھ آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص آگے آگے آ رہا تھا۔ وہ قریب پہنچے پھر اس شخص نے جو آگے آ رہا تھا کہا۔
"تمہارا سردار کون ہے؟"
"میں ہوں مہاراج...... گوگی ہے میرا نام۔ بنجاروں کا قبیلہ ہے یہ مائی باپ"
"ان زمینوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"
"خاقان مہاراج کی زمینیں ہیں یہ۔"
"ہمیں پتہ ہے۔"

''کیا تم نے اس زمین پر خیمے لگانے سے پہلے خاقان سے اجازت لی تھی؟''

''نہیں مہاراج...... ہم تو بس یہاں کچھ راتوں کے مہمان ہیں۔ کسی ایک جگہ کے کب ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ سب ہی اچھا سلوک کرتے ہیں کیونکہ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔''

''میں کہتا ہوں کہ خاقان کی زمینوں پر خیمے لگانے سے پہلے تم نے خاقان سے اجازت لی؟''

''نہیں مہاراج!''

''کیوں......؟''

''بتائیں نا مہاراج! آپ حکم دیں گے تو ہم صبح ہی یہ خیمے اٹھا دیں گے۔''

''یہ خاقان ہیں......'' آگے والے شخص نے بھاری بدن والے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جے ہو مہاراج کی...... مہاراج کے چرنوں کی دھول ہیں ہم۔ بس یہاں ڈیرا لگایا ہے۔ آپ جب حکم کریں گے چلے جائیں گے۔ اور اگر حکم دیں گے تو ابھی چلے جائیں گے یا پھر کچھ دن ٹھہر جائیں گے۔''

خاقان نے نگاہیں گھمائیں اور پھر اس کی نظریں چندر بدن پر جا کر رک گئیں۔

''یہ کون ہے......؟''

''چندر بدن ہے مہاراج...... قبیلے کی بیٹی۔''

''ناچ رہی تھی یہ......؟''

''ہاں......''

''بہت خوبصورت ہے۔''

''سندرتا تو بھگوان کی دین ہوتی ہے مہاراج۔''

''اس سے کہو کہ رقص کرے۔''

''مہاراج ہمارے مہمان ہیں۔'' بنجاروں نے کہا اور پھر اپنے حسب توفیق مختلف قسم کی چیزیں لے آئے۔ خاقان کو احترام سے ان پر بٹھایا گیا۔ ہارون ایک طرف کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ خاقان کا چہرہ اسے کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ نجانے کیوں بھولے بھٹکے ذہن میں اس چہرے کے نقوش جانی پہچانی شکل میں آ رہے تھے۔ نجانے یہ کس کا چہرہ تھا اور اس نے اسے کہاں دیکھا تھا...... اسے بالکل یاد نہیں آ

رہا تھا۔

مہمانوں کے لئے وہ لوگ کوئی مشروب بھی لے آئے جو انہوں نے گلاسوں میں ڈال کر پیش کیا۔ اور اس کے بعد چندر بدن نے دوبارہ رقص شروع کر دیا۔ خاقان چمک دار نگاہوں سے چندر بدن کو ناچتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے عضلات میں ایک عجیب سی ہوس ناک کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے چندر بدن اسے پسند آ رہی ہو۔

خاصا وقت گزر گیا اور اس کے بعد چندر بدن تھک گئی۔ بنجاروں نے کہا۔

''مہاراج! اب وہ تھک گئی ہے۔ دوسری لڑکیوں کو بلائیں؟''

''نہیں، بس ٹھیک ہے...... تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتے ہو۔ ہم دوبارہ تم سے ملاقات کریں گے۔'' خاقان نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''جے ہو مہاراج کی...... ہم جانتے تھے کہ مہاراج بہت رحم دل انسان ہیں اور وہ ہمارے اوپر احسان کریں گے۔''

''تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو سہائے پور کے مشرقی علاقے میں ہماری حویلی ہے، وہاں کسی کو بھیج دینا۔''

''جے ہو مہاراج کی...... ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔''

خاقان اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو باقی لوگ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور اس کے بعد وہ واپس پلٹ گئے۔ لیکن جیسے ہی واپس پلٹے گجراج جسے ہارون پہچانتا تھا کسی گوشے سے باہر نکل آیا۔ ہارون اسے دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ گجراج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے آ کر سردار گوگی کے سامنے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور بولا۔

''سردار! آپ نے اس شخص کو اتنی اہمیت کیوں دی؟''

''تو کہنا کیا چاہتا ہے گجراج؟''

''آپ تو تجربے کار ہیں سردار مہاراج! آپ نے دیکھا نہیں کہ اس آدمی کی آنکھوں میں کس قدر ہوس کی چمک تھی۔''

''تو کچھ زیادہ ہی نہیں بولنے لگا گجراج؟''

''مہاراج! پریم کرتا ہوں میں اس سے...... جان دیتا ہوں اس پر۔ اگر آپ کی بیٹی ہوتی تو دیکھتا کہ کس طرح آپ کسی کے کہنے پر اسے نچاتے ہیں۔''

''گجراج...... بدتمیزی کر رہا ہے تُو سردار سے۔'' ایک آدمی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''تو کاٹ دو میری گردن...... مار دو مجھے......ختم کر دو...... پر یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل نہیں ہو سکتا۔''

''نہیں، نہیں...... کچھ مت کہو اسے...... پاگل ہو گیا ہے یہ......اگر پاگل نہ ہوتا تو اس طرح میرے منہ کو تو نہ آتا۔ ارے پاگل! ہم لوگوں کو یہاں کچھ سے گزارنا ہے۔ اگر اس کے کہنے پر وہ ناچ لی تو کیا ہو گیا؟''

''اچھا نہیں ہوا ہے یہ مہاراج......اچھا نہیں ہوا ہے۔''

''چل دیکھیں گے......سوچیں گے......معلوم کریں گے کہ وہ کہتا کیا ہے۔''

''ایک بات ہم آپ سے کہے دیتے ہیں مہاراج! پران دے دیں گے، اپنا جیون وار دیں گے چندر بدن پر ہزار بار۔ پر کسی اور کے ہاتھوں میں نہیں جانے دیں گے اسے۔''

''خود چندر بدن کیا تجھ سے پریم کرتی ہے؟''

''ہم نہیں جانتے مہاراج! ہم اس پر قبضہ بھی نہیں جمانا چاہتے۔ وہ اگر اپنی پسند سے کسی کو سویکار کر لے گی تو ہم اس کا راستہ نہیں روکیں گے۔ پر ایسا بھی نہیں ہونے دیں گے اس کے ساتھ کہ جس کا من چاہے اسے اٹھا کر لے جائے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... پر اچھا خیر، دیکھیں گے کہ وہ کہتا کیا ہے۔ چلو رے...... چلو اٹھاؤ اپنا تام تبارہ۔ اٹھاؤ......''

اور پھر وہ لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے۔

ہارون پاگلوں کی طرح کھڑا ان لوگوں کو جاتے دیکھتا رہا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کے وجود سے واقف ہی نہ ہوں۔ یہاں تک کہ ایک ایک فرد اپنے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ صرف چندر بدن تھی جو ایک طرف سر جھکائے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

جب آخری آدمی بھی اس جگہ سے ہٹ کر اپنے خیمے میں داخل ہو گیا تو چندر بدن نے گردن اٹھائی۔ مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، ہنسی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ پازیب کی جھنکار آہستہ آہستہ ہارون کی جانب بڑھ رہی تھی۔ پھر وہ ہارون کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ہارون سحر زدہ نگاہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''آؤ چلتے ہیں یہاں سے......'' اس کی مترنم آواز ابھری اور وہ آگے بڑھ گئی۔

ہارون اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''یہاں سے کہانی کا آغاز ہوا تھا......'' چلتے چلتے اس نے کہا۔

ہارون چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ''کون سی کہانی کا؟''

چندر بدن کی ہنسی سنائی دی اور وہ آگے بڑھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

''جو ابھی آگے بڑھے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''کہانی کی بات کر رہی ہوں......تم نے آغاز تو دیکھ لیا ہے۔ بنجارے تھے ہم لوگ۔ سہائے پور تو ہماری آبادی بھی نہیں تھی۔ ہم نے تو یہاں عارضی طور پر ڈیرے لگائے تھے۔''

''تو پھر...... پھر کیا ہوا؟'' اس نے رک کر ہارون کی آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے کیا کیا کہانیاں اس کی آنکھوں میں تڑپ رہی تھیں۔ ہارون اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا لیکن وہ آگے بڑھ گئی اور اس کے بعد مسلسل خاموشی ہی طاری رہی۔ پھر وہ ایک جگہ رکی تو ہارون کو احساس ہوا کہ وہ اپنے خیموں کے پاس ہے۔ وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

''تم نے آگے بات نہیں بتائی؟''

چندر بدن پھر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی بے حد خوبصورت تھی۔ بس یوں لگتا تھا جیسے ستارے جھلملا اٹھے ہوں۔ ہارون کے قدم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک وہ رک گئی، پھر بولی۔

''تم جاؤ......''

''اور تم......؟''

''میں واپس جاتی ہوں۔''

''آؤ...... میرے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھو۔'' نجانے کس طرح یہ الفاظ ہارون کے منہ سے نکل گئے۔

''تو ادھر سے گھوم کر چلو۔'' چندر بدن بولی۔

''کیوں...... ادھر سے کیوں نہیں چل رہیں؟''

''ادھر پاک سرکار ہے۔''

''کون؟''

''پاک سرکار۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور ہارون کی نگاہیں جلالی بابا کے مزار کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے حیرت سے چندر بدن کو دیکھا تو چندر بدن بولی۔

''وہ پاک ہیں۔ ہم گندے...... ہم ادھر سے نہیں جا سکتے۔ چالیس چالیس گز میں ان کی پاک خوشبو تیرتی پھرتی ہے۔ ادھر سے گھوم کر چلو۔''

''تم انہیں جانتی ہو وہ کون ہیں؟''

''بابا جلالی'' وہ بولی۔ ''ہم انہیں پاک سرکار کہتے ہیں۔ آؤ، ادھر سے آ جاؤ۔'' چندر بدن نے کہا اور ہارون کچھ قدم آگے بڑھ گیا۔ لیکن پھر اچانک اس نے تھوڑے فاصلے پر کسی سائے کو دیکھا اور چونک پڑا۔ اسی وقت کامران کی آواز ابھری۔

''سر! یہ آپ ہیں؟''

ہارون نے گھبرا کر چندر بدن کی طرف دیکھا لیکن چندر بدن کا وہاں وجود نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اتنی دیر میں کامران اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

''خیریت سر! کیا نیند نہیں آ رہی؟ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

ہارون پاگلوں کی طرح گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جو واقعات اسے پیش آئے تھے وہ بڑے حیران کن تھے لیکن تعجب کی بات اس لئے نہیں تھی کہ چندر بدن کے بارے میں اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ جانے کیوں اس وقت اس کا دل نہیں چاہا کہ کامران کو ساری تفصیل بتائے۔ ایک تھکا تھکا سا احساس اس کے سارے وجود پر مسلط تھا۔ کامران کے سوال کے جواب پر اس نے کہا۔

''ہاں کامران...... آنکھ کھل گئی تھی۔ ایک عجیب سی وحشت نے گھیر لیا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے نکل آیا تھا۔''

''آیئے، بیٹھ کر باتیں کریں۔''

''نہیں...... بہت دیر سے باہر ہوں...... لیٹنا چاہتا ہوں۔ پلیز۔''

''جی سر...... جی سر......'' کامران نے جواب دیا۔ اور پھر ہارون کو اس کے خیمے تک چھوڑنے آیا۔ ہارون خیمے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا ذہن بری طرح چکرا رہا تھا۔

''میرے خدا...... میرے خدا...... یہ سب کچھ کیا ہے؟ وہ لوگ کون تھے؟...... اور

اس کے بعد کیا ہوا...... یہ کب کی کہانی ہے؟ حال کی یا ماضی کی...... اور اگر یہ کہانی ماضی سے کوئی تعلق رکھتی ہے تو پھر اس کہانی سے میرا کیا واسطہ......؟''

خیمے میں نجانے وہ کتنی دیر لیٹا یہی سوچتا رہا۔

''بات آگے بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں یہ کام چھوڑ دوں اور یہاں سے نکل جاؤں۔ پتہ نہیں آگے کون سی مصیبتیں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ افشاں، اشعر میری زندگی کا حصہ ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کسی الجھن میں پھنس جاؤں اور مجھے کوئی دقت ہو جائے۔''

ایک عجیب سا خوف ہارون کے دل پر طاری ہو گیا۔ پھر نیند نے ہی اس کی ان سوچوں کو ختم کیا تھا۔

صفورہ کے والدین نے ٹنڈن گوپال کے خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ ملازموں کے بیانات سے سخت پریشان تھے۔ خود صفورہ کی والدہ نے صفورہ کی نگرانی کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ صفورہ جو کچھ کہہ رہی ہے یا اس کے بارے میں جو کہا جا رہا ہے اس میں کچھ صداقت ہے یا نہیں۔ یہ بات تو خیر اس کے علم میں بھی آ چکی تھی کہ ٹنڈن گوپال نے وہاں کالے جادو کا مرکز کھولا ہوا تھا اور وہ لوگوں کو کالا جادو سکھا رہا تھا۔

صفورہ بھی کسی نہ کسی طرح ان کے جال میں پھنس گئی تھی لیکن اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اس کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ بہرحال طاہر علی صاحب ابھی اپنے معاملات سلجھانے میں مصروف تھے۔ بہت بڑا کاروبار پھیلا ہوا تھا یورپ بھر میں۔ اسے سمیٹنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ابھی یہاں نہیں پہنچے تھے اور ساری ذمے داری نیرہ بیگم ہی کے سر تھی۔ صفورہ نے ماں سے کہا۔

''ماما...... آپ کہتی ہیں یہ ہمارا وطن ہے، میں بھی مانتی ہوں۔ پر آپ نے ابھی تک مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی۔''

''بیٹا! میں نے یورپ میں آپ کو پابند نہیں کیا تھا تو یہاں کیا کروں گی۔ بس اتنی سی بات ہے کہ ابھی آپ یہاں سے اجنبی ہیں۔''

''اجنبیت تو دور کرنا ہی ہوگی ماما۔''

''ہاں، ہاں...... نکل جایا کرو۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ میری رائے ہے ڈرائیور کو ساتھ لے لیا کرو۔''

''ماما...... آپ جانتی ہیں کہ میں نے ڈرائیور کا جھگڑا کبھی نہیں پالا۔ اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ جہاں بھی جاؤں گی آرام سے گھر واپس آ جاؤں گی۔''

ماں کی اجازت سے صفورہ کار لے کر نکل گئی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ کہاں جائے۔ وہ سارے شہر میں بھٹکتی رہی۔ اور پھر اسی رات واپسی کے بعد اس نے اپنے کمرے میں بیروں کو بلایا۔

''میں تم سے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ کیا یہاں کوئی کالے جادو کا مرکز ہے؟''

''جے مہا شری، یہاں مرکز تو کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اسلامی ملک ہے۔ مگر برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ ایک دو نام ہیں ایسے جہاں کالے جادو کا زور ہوتا ہے۔ خاص طور سے ایک ہے جو یہاں مہاشے داور کہلاتا ہے۔ اس کا کوئی دین دھرم نہیں ہے۔ وہ لوگوں سے پیسے لے کر کالا جادو کرتا ہے۔ تھوڑا بہت علم جانتا ہے وہ۔ اگر تم چاہو تو وہاں جا سکتی ہو۔''

''مجھے پتہ بتاؤ اس کا۔''

''آگے چلی جاؤ دیوی جہاں ایک شمشان گھاٹ ہے۔ جہاں ہندو اپنے مُردے جلایا کرتے ہیں۔ شمشان گھاٹ کے دوسرے سرے پر ٹوٹے مندر کے نام سے ایک جگہ موجود ہے۔ بس اسی ٹوٹے مندر میں مہاشے داور رہتا ہے۔''

صفورہ نے اس کا پورا پتہ معلوم کر لیا۔ بہرحال اس کے اندر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ مذہب تو دل سے نکل ہی گیا تھا۔ کالے جادو کے اثرات نے یا پھر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ٹنڈن گوپال نے جو غلاظتیں اس کے وجود میں اتار دی تھیں انہوں نے اس کے سارے خون کو گندا کر دیا تھا اور اب اس خون میں غلاظت کے کیڑے کلبلاتے رہتے تھے۔ برائی ہمیشہ حسین ہوتی ہے۔ صفورہ کے نقوش بھی نکھر گئے تھے اور وہ بہت جاذب نگاہ نظر آنے لگی تھی۔ بیروں سے پتہ معلوم کر کے وہ دوسرے ہی دن مہاشے داور کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔

بڑی بھیانک جگہ تھی۔ سرِ شام وہاں پہنچی تھی۔ شمشان گھاٹ میں دو مُردے جل رہے تھے۔ لوگ کھڑے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ گوشت کی چراند فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ اسے یہ چراند بہت اچھی لگی۔ وہ آگے بڑھی اور فاصلے طے کرتی ہوئی ٹوٹے مندر کے پاس پہنچ گئی۔ ٹوٹا مندر واقعی ٹوٹا مندر تھا۔ باہر کی دو دیواریں گری ہوئی تھیں لیکن جب وہ اندر داخل ہوئی تو مندر کافی صاف شفاف نظر آیا۔ ایک بڑا سا چبوترہ تھا جس پر کنواں بنا ہوا تھا۔ کنوئیں پر ڈول اور رسی پڑی ہوئی تھی۔ سامنے ہی دالان جیسی جگہ تھی۔ اس کے عین سامنے کالی دیوی کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ کسی انسان کا وہاں کوئی پتہ نہیں تھا۔

وہ اندر داخل ہوگئی اور اس مجسمے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے دیکھتی رہی۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ مجسمہ ہنس پڑا ہو۔ ہنسی کی آواز بھی اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

تب ہی اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس نے ایک لمبے تڑنگے آدمی کو دیکھا جس کے بال بہت بڑے بڑے تھے۔ اوپری جسم ننگا تھا، نچلے جسم پر دھوتی بندھی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

''جے مہا شری!'' صفورہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ بولا۔

''دیوی! پہلے تو میں یہ سمجھا تھا کہ کوئی بھولی بھٹکی مسافر ادھر آ گئی ہے۔ مگر جب کالی دیوی نے مجھے وردان دیا اور کہا کہ اپنوں ہی میں سے ایک آیا ہے تو میں تیرے سواگت کے لئے یہاں آ گیا۔''

''کیا نام ہے تیرا؟'' صفورہ نے بڑی تمکنت سے پوچھا۔

''یہاں کے لوگ مجھے مہاشے داور کہتے ہیں۔ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوا تھا لیکن اس کے بعد کالی کا داس بن گیا۔ ناموں سے کیا ہوتا ہے دیوی! میں نے یہ نام صرف اس لئے رکھا ہوا ہے کہ میں ان لوگوں کے درمیان رہتا ہوں۔ پر انکو تو سے میرا کوئی دھرم نہیں ہے۔ میرا دھرم صرف کالا علم ہے۔''

''میں ٹنڈن گوپال کی شاگرد ہوں۔''

''کون ٹنڈن گوپال؟''

''وہ بھی کالا جادو جانتا ہے۔''

''اچھا...... اچھا...... دیوی! جب تم اس کی شاگرد ہو تو پھر ہماری بھی مہمان ہو۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ تم کالی دیوی کی مہمان ہو۔''

''ہاں...... میں کالی دیوی کی مہمان ہوں۔''

''تو پھر آؤ دیوی...... آؤ ہم تمہاری خاطر مدارت کریں۔'' اس نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مندر کے ایک گوشے میں ایک دروازے کے پاس پہنچا اور وہاں سے وہ سیڑھیاں نیچے اترنے لگا۔ صفورہ کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھی اور تہہ خانے میں پہنچ گئی۔ تہہ خانے میں بڑا اچھا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ مہاشے داور نے اسے پیشکش کی اور صفورہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہاں سے مہاشے داور ایک گوشے میں پہنچا اور پھر اس کے بعد کچھ پلیٹیں لئے ہوئے آ گیا۔ ان پلیٹوں میں

سڑا ہوا گوشت رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی برتنوں میں ایک عجیب قسم کا سیال تھا جو میلا اور بدنما تھا۔ اس نے کہا۔

''جے مہا شری! یہ کالی کا کرنت حاضر ہے۔''

صفورہ کے ہاتھ سڑے ہوئے گوشت کی پلیٹ کی جانب بڑھ گئے اور پھر ایک نہایت ہی گھناؤنا منظر وہاں سامنے نظر آنے لگا۔ سڑا ہوا گوشت اور سڑا ہوا خون جس کی بدبو پورے تہہ خانے میں پھیل رہی تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے یہ ان کی مرغوب غذا ہے۔ صفورہ نے کافی کچھ کھایا اور اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ اس نے مہاشے داور سے کہا۔

''یہ میری آنکھوں میں نشہ سا کیسا اتر رہا ہے؟''

''یہ جیون کا وردان ہے دیوی! اس کے بعد ہم سنسار کی ان ساری خوشیوں کو سمیٹیں گے جو منش کے لئے بڑی حیثیت رکھتی ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے......؟''

''ہاں دیوی۔''

''نہیں مہاشے داور! ساری باتیں اپنی جگہ...... میں اپنی آبرو کسی طور نہیں گنوانا چاہتی۔ ٹنڈن گوپال مہاراج......''

''چھوڑیں دیوی! نہ میں ٹنڈن گوپال کو جانتا ہوں نہ عزت آبرو نام کی کسی چیز کو۔ تم میری مہمان ہو۔ ہم دونوں جیون کے سارے عیش......''

''ہرگز نہیں...... تم فضول باتوں سے پرہیز کرو۔''

''دیوی یہ تو ہر مرد کا حق ہے ہر عورت پر۔''

''میں نے کہا ناں...... بکواس مت کرو۔ میرے بیرو! میری سہائتا کرنا، سمجھے۔ اگر میں سو بھی جاؤں تو میرا حکم ہے تمہارے لئے کہ میری مدد کرنا۔ یہ شیطان میرے جسم کو ہاتھ نہ لگانے پائے۔''

مہاشے داور قہقہے لگانے لگا، پھر بولا۔

''کہاں ہیں تمہارے بیر دیوی! ہمیں تو نظر نہیں آ رہے۔''

''آ جائیں گے...... نظر آ جائیں گے۔'' صفورہ نے نیم غنودہ لہجے میں کہا۔

مہاشے داور نے اسے کوئی نشہ آور چیز پلا دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کے بعد وہ وہیں زمین پر لیٹ گئی۔ اس نے لیٹتے ہوئے اپنے

دونوں ہاتھ اپنے جسم پر ملے تھے۔ مہاشے داور مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صفورہ کے دلکش وجود کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آئے جا رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جے دیوی تیرے کرم اپرم پار ہیں۔ تُو اپنے داسوں کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اتنی خوبصورت لڑکی بھیج دی میرے لئے۔ میرے تو وارے نیارے ہو گئے۔''

وہ واپس پلٹا، پھر ایک الماری سے اس نے شراب کی بوتل نکالی۔ گلاس میں ڈال کر اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے صفورہ کو دیکھتا رہا جو اب گہری بے ہوشی کا شکار تھی۔

چند لمحوں کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور صفورہ کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ لیکن دفعتہً اس کی نگاہ زمین پر گئی۔ بہت سی چیونٹیاں صفورہ کے جسم سے نکل نکل کر باہر آ رہی تھیں۔ اس نے حیرانی سے یہ منظر دیکھا اور جلدی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اچانک ہی اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ چیونٹیاں نہیں تھیں، بلکہ ننھے ننھے بدشکل انسان نما چیونٹے تھے جو دَل کے دَل کی شکل میں نکلتے چلے آ رہے تھے۔ مہاشے داور دو قدم پیچھے ہٹا اور چیونٹے اس کی جانب دوڑنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مہاشے داور کے جسم پر چڑھ گئے اور اس کے بعد مہاشے داور کو اپنی زندگی کے سب سے اذیت ناک دور سے گزرنا پڑا۔

چیونٹے اس کے بدن کو کاٹ رہے تھے اور اس طرح کاٹ رہے تھے کہ مہاشے داور کی چیخیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ دھاڑتا ہوا وہاں سے باہر بھاگا اور چیونٹے اسے مسلسل کاٹتے رہے۔ وہ باہر زمین پر گرا اور بری طرح لوٹنے لگا لیکن ان خوفناک چیونٹوں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ بہت سے چیونٹے اس کی کھال سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مہاشے داور بری طرح تڑپتا رہا۔ ایسی شدید اذیت، ایسی شدید جلن ہو رہی تھی اسے کہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

اور پھر اس کے بعد وہ وہاں سے بھاگ کر کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گیا اور وحشت کے عالم میں کنوئیں ہی میں کود گیا۔ پانی میں کودنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ چیونٹوں کی یا اس خوفناک مخلوق کی اذیت یا تکلیف کم ہو گئی ہے۔ وہ پانی میں تیرنے لگا۔ کنواں بہت زیادہ گہرا نہیں تھا۔ وہ اوپر چڑھ سکتا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک وہ کنوئیں میں تیرتا رہا اور چیونٹے پانی کی سطح پر آنے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے انہیں

دیواروں پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ دَل کے دَل...... دیواریں کالی ہو گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اوپر پہنچ گئے۔

اب ایک بھی چیونٹا مہاشے داور کے جسم میں نہیں تھا لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں آگ لگی ہوئی ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا، اس کے بعد ڈرتے ڈرتے اس نے ان طاقوں میں پیر جما کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا جن کی مدد سے وہ اوپر پہنچ سکتا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے اسے سخت اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن کنوئیں میں بھی تو نہیں رہ سکتا تھا۔ کنوئیں میں پانی بھی اچھا خاصا تھا، اس کی گہرائی بہت زیادہ نہیں تھی جس کی وجہ سے اس کی زندگی بچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اوپر پہنچ گیا اور کنوئیں کی منڈیر کے پاس بیٹھ کر کتے کی طرح ہانپنے لگا۔ پھر اس کے منہ سے آہستہ سے آواز نکلی۔

''جے کالی دیوی...... اگر اسے تیرا وردان حاصل تھا تو مجھے بتا دیتی۔ تیرے حکم سے گردن تو نہ اٹھاتا میں۔ ہے دیوی! کیا کروں میں...... میرے شریر کو سکون دے دے...... میں مرا جا رہا ہوں۔''

وہ اپنے بدن کو بری طرح کھجا رہا تھا۔ آج جیسی اذیت اسے زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔

ادھر صفورہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ آدھی رات تک وہاں پڑی رہی۔ آدھی رات کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹوٹے مندر کے ماحول کو دیکھا اور ایک دم اس کو خوف سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنی کیفیت پر غور کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ بالکل نارمل ہے۔ اس نے سکون کی سانس لی اور اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اس تہہ خانے سے باہر نکل آئی۔ وہاں اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ کہیں دور سے مہاشے داور نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن پھر وہ چھپ گیا تھا۔ جو تجربہ اسے حاصل ہوا تھا اس کی زندگی کا سب سے بھیانک تجربہ تھا۔ صفورہ باہر آئی اور تھکے تھکے قدموں سے اپنی کار کی جانب بڑھ گئی۔ پھر وہ کار اسٹارٹ کر کے واپس چل پڑی تھی۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اپنے گھر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مہاشے داور کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کا کیا ہوا؟ ویسے اسے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پیروں نے اس کی مدد ضرور کی ہے۔

گھر پہنچی تو نیرہ بیگم اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''یہاں بھی تم نے وہی کام شروع کر دیا صفورہ؟''

''کیا ماما......؟'' صفورہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

''کہاں سے آ رہی ہو؟ اور یہ حلیہ کیا ہو رہا ہے تمہارا؟''

''ڈسکو میں گئی تھی۔ ڈانس کر رہی تھی۔''

''بیٹا! میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ یہ جگہ بری ہے مگر ذرا احتیاط کرو۔ تمہارے پاپا آ جائیں تو تم جس طرح چاہو یہاں وقت گزارنا۔ لیکن بیٹا! اس طرح مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''خیال رکھوں گی ماما!'' صفورہ نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے غسل کیا اور اس کے بعد بستر پر جا لیٹی۔ بدن پر اب بھی ایک عجیب سی کھولت سوار تھی۔ پھر اس نے اپنے بازو کو رگڑا اور چند ہی لمحوں میں بہت سے کیڑے اس کے وجود کے مسامات سے نمودار ہو گئے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے سینے پر پہنچے۔ اس کے چہرے کے قریب۔ اور پھر ان کی آواز آئی۔

''جے مہا شری۔''

''کیا وہاں ٹوٹے مندر میں میرے ساتھ مہاشے داور نے بدسلوکی کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''ہاں دیوی...... وہ پوری طرح شیطانی روپ میں تمہارے پاس آیا تھا۔ پر آپ نے ہم سے کہا تھا کہ ہم آپ کی سہائتا کریں۔ ہم نے ایسا سبق سکھایا اسے کہ اب جیون بھر کبھی کسی کے ساتھ ایسی کوئی بدسلوکی کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

دفعتہً ہی صفورہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا واقعی......؟''

''ہاں دیوی۔''

''کیا، کیا...... ذرا مجھے بتاؤ۔''

اور پھر بیر اپنی مہین مہین آوازوں میں اسے صورتحال بتانے لگے۔ صفورہ خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

''اس کا مطلب ہے تم ہر جگہ میری مدد کر سکتے ہو۔''

''دیوی! تم ہماری مالک ہو...... جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم تمہارے

تمام دشمنوں کو نیچا دکھائیں گے۔ تم یہ مت سوچنا کہ ہم بہت چھوٹے ہیں۔ ہم وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو تمہارے لئے اچھا ہو۔''

صفورہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''واقعی ٹنڈن گوپال مہاراج نے میرے لئے بڑا کام کیا ہے۔ یہ تو لوگوں نے مجھے نجانے کیا سے کیا سمجھ لیا تھا...... خاص طور سے ہارون نے۔ اس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی لیکن میرے پندارِ حُسن کی توہین کی تھی اس نے۔ میرے بیرو! میں اس سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''یہ تو تیری مرضی ہے مالک! تیرا جو دل چاہے کر۔ ہم تو صرف تیرے حکم کی غلامی کریں گے۔''

''اچھا یہ بتاؤ اب اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''دیوی! وہ اپنے بیوی بچوں سے دور اپنے کام میں مصروف ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹا الگ گھر میں رہ رہے ہیں۔''

''مجھے اس گھر کا پتہ بتاؤ؟'' صفورہ نے خونخوار لہجے میں کہا اور بیر اسے ایک پتہ بتانے لگے۔

''میرے لئے ایک ایسی جگہ کا بندوبست کرو جہاں میں کسی کو قید رکھ سکوں۔ وہاں مجھے اپنے قیدی کی نگرانی کرنے والوں کی بھی ضرورت ہو گی۔''

''یہ انتظام جب تُو ہمیں حکم دے گی، ہو جائے گا دیوی۔''

''جب یہ انتظام ہو جائے تو تم مجھے اطلاع دو۔'' صفورہ نے کہا۔

''جے مہا شری۔'' بیروں کی ننھی ننھی آوازیں ابھریں اور صفورہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''بس اب تم جاؤ......'' اور بیر چند ہی لمحوں میں غائب ہو گئے۔

❁

عجیب سی بے کلی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ دوسرے دن اس نے کامران سے کہا۔

''کامران! میں شدید الجھن محسوس کر رہا ہوں۔''

''اس کا اندازہ تو مجھے رات کو ہی ہو گیا تھا سر! مجھے بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

’’یہاں کا کام سنبھالے رکھو۔ بلکہ اگر ہو سکے تو کام میں تھوڑی سی تیزی کرا دو۔ کام تو بہت زیادہ ہے۔ میں جانتا ہوں مجھے طویل عرصے تک یہاں رہنا پڑے گا لیکن پھر بھی میں جلدی کوئی رپورٹ دے دینا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور کو یہاں میری جگہ تعینات کر دیا جائے۔ میں اس جگہ سے بڑی الجھن محسوس کر رہا ہوں۔‘‘

’’اگر کوئی اور خاص بات ہوئی ہو تو مجھے ضرور بتائیے چیف! میں خود بھی ان معاملات میں خاصی دلچسپی لے رہا ہوں۔‘‘

’’نہیں...... کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس اپنی الجھنیں ہیں۔‘‘ نجانے کیوں ہارون نے کامران کو ساری تفصیل بتانا پسند نہیں کی تھی جو اس پر بیتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ بہت سے راز، راز میں رکھے جائیں۔ بہرحال اس نے کامران کو کاموں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد جیپ لے کر چل پڑا۔ افشاں کو اس نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اچانک ہی پہنچ کر اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

راستے طے ہوتے رہے۔ پھر وہ جگہ نظر آئی جہاں ایک بار اسے چندر بدن ملی تھی۔ غیر اختیاری طور پر اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ جیپ کی رفتار سست ہو گئی تھی۔

اچانک ہی اس کا دل زور سے دھڑکا۔ سڑک سے کافی فاصلے پر جہاں کھیت لہلہا رہے تھے اور بہت سے درخت کھڑے ہوئے تھے، اسے چندر بدن نظر آئی۔ نگاہوں کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ تصور نے واہمہ کو مجسم نہیں کیا تھا۔ وہ چندر بدن ہی تھی۔ درخت کے ایک تنے کے پاس پاؤں پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ پاؤں کے انگوٹھے ہل رہے تھے اور پازیب کی چھن چھن گونج رہی تھی۔ جیپ خود بخود رک گئی۔ وہ اسے دیکھتا رہا اور پھر جیپ سے نیچے اتر آیا۔

اس وہم کو رفع کرنا چاہتا تھا...... دیکھوں تو سہی وہ ہے کیا؟ اس نے سوچا اور آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ چندر بدن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دونوں پاؤں سمیٹ لئے۔ ہارون نے سب سے پہلے اس کے پیروں کا ہی جائزہ لیا تھا۔ الٹے پیروں والیاں بھتنیاں، چڑیلیں جنگلوں میں پائی جاتی ہیں...... کیا وہ بھی کوئی پچھل پیری ہے؟ اس نے اس کے پیروں کو دیکھا، کومل اور حسین پاؤں بالکل سیدھے تھے۔ وہ کوئی روح نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی گندی روح، گندی آتما۔ اسے دیکھ کر اس نے پاؤں سمیٹے اور پھر آہستہ آہستہ

اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز میں ایک الھڑ پن اور شوخی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی اسی انداز کی تھی۔ ہارون آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

’’چندر بدن......‘‘

’’ہائے میں مر جاؤں...... جب تم اپنے ہونٹوں سے میرا نام لیتے ہو تو بھگوان جانتا ہے کہ سارے بدن میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔‘‘

’’چندر بدن! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟‘‘

’’انتظار کر رہی تھی تمہارا...... اس سے بھی جب تم پہلی بار نظر آئے تھے۔ اس سے بھی جب تم میرے پیچھے دوڑے تھے اور میری پازیب سڑک پر رہ گئی تھی۔‘‘

’’چندر بدن! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’آؤ...... بیٹھو...... بیٹھ جاؤ...... یہ تو میرے من کی آواز ہے۔ کیا تمہارے من میں بھی کوئی ایسی آواز ابھرتی ہے؟‘‘

’’کیسی آواز؟‘‘

’’یہی کہ تم مجھ سے باتیں کرو۔‘‘

’’ہاں چندر بدن! آج میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تو کرو نا...... ایسے کیوں اینٹھے ہوئے ہو؟‘‘ وہ ناز بھرے انداز میں بولی۔

’’چندر بدن! مجھے بتاؤ گی تم کون ہو؟‘‘

’’داسی ہوں تمہاری...... پتنی سویکار کیا ہے مجھے تم نے۔‘‘

’’چندر بدن! تم جانتی ہو کہ تم میری بیوی نہیں ہو۔‘‘

’’ہاں...... جانتی ہوں۔‘‘ اس کے لہجے میں ہلکی سی اُداسی پھیل گئی۔

’’چندر بدن! ایک بات بتاؤ، کیا میں تمہارے پچھلے جنم کا کوئی ساتھی ہوں؟‘‘

’’ہم کیا جانیں...... پر تم نے ہمیں پتنی سویکار کیا ہے۔‘‘

’’دیکھو چندر بدن! تم اس سے پہلے بھی مجھے نظر آئی تھیں۔ وہیں جہاں میں رہتا ہوں...... یعنی میرا مطلب ہے جہاں میں نے خیمے لگا رکھے ہیں۔‘‘

’’ہاں نظر آئے تھے...... پھر......؟‘‘

’’چندر بدن! میں...... میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا...... کیا تم سہانے پور ہی میں رہتی ہو؟‘‘

’’ہاں...... وہاں بھی ہے ہمارا گھر۔‘‘

''اور کہاں ہے؟''
''بہت سی جگہوں پر۔''
''تمہیں وہ لوگ چتا میں جلا رہے تھے۔''
''ہاں ...... پاپی وہ جو گجراج ہے ناں ...... وہ سب سے یہی کہتا پھرتا تھا کہ ہم اس کی پتنی ہیں۔''
''کیا ایسی بات ہے؟''
''بالکل نہیں۔ ہم نے کوئی پھیرے نہیں کئے اس کے ساتھ۔''
''پھیرے تو تم نے میرے ساتھ بھی نہیں کئے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے پر ...... پر ہمارا من تو تمہارے گرد بہت سے پھیرے لگا چکا ہے۔''
''مطلب......؟''
''بس ہم نے تمہیں جب دیکھا تو نجانے کیوں ہمارے من نے کہا کہ تم ہی ہمارے من کے میت ہو۔''
''چندر بدن! میں شادی شدہ ہوں۔''
''ہمیں معلوم ہے۔''
''ایک بیٹا بھی ہے میرا۔''
''یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔''
''تو پھر میں ...... میں تمہاری طرف کیسے راغب ہو سکتا ہوں؟''
''یہ بھی تو ہم نہیں جانتے پر ہمارا من اسی دن سے ڈول گیا جب ہم نے تمہیں دیکھا تھا۔''
''اس دن تو میں اتفاقاً تمہارے پاس پہنچ گیا تھا۔ میرا مطلب ہے جب وہ لوگ تمہیں چتا میں جلا رہے تھے۔''
''اتفاقاً نہیں پہنچے تھے تم۔''
''تو پھر......؟''
''ہم نے تمہیں پکار کر بلایا تھا۔ ہم تو تمہیں نجانے کب سے پکار رہے تھے۔''
''مگر میں نے تو کبھی تمہاری آواز نہیں سنی۔''
''من سے من نہیں ملا نا ابھی تک۔ پر ہم مایوس نہیں ہیں۔ مل جائے گا تمہارا

من ہم سے۔''
''دیکھو چندر بدن! میں اپنی بیوی اور اپنے بیٹے سے محبت کرتا ہوں۔ افشاں سے میں نے شادی کر رکھی ہے۔ وہ ایک مکمل بیوی ہے۔ میرے دل میں کسی اور کے لئے جگہ نہیں ہو سکتی۔ اور پھر تم سے شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے اور تمہارے دھرم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''
''نہ ...... سوامی نہ ...... زمین آسمان تو ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہیں۔ میں تو تمہارے پاس ہوں۔''
''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' ہارون نے سوال کیا۔
''گونا کرا لو ہمارا ...... داسی سویکار کیا ہے تم نے ہمیں۔ ہمیں پھولوں کی سیج دے دو۔ ہماری پیاسی آتما کو شیش مکھ دے دو۔ ہم شانت ہو جائیں گے۔ پریمی ...... پریمی ان ساری باتوں کو نہیں دیکھتا۔''
''ایک بات بتاؤ گی چندر بدن؟''
''ہاں بولو......''
''کیا میرا تمہارا کوئی پچھلے جنم کا رشتہ ہے؟'' ہارون نے احمقانہ انداز میں پوچھا اور وہ ہنس پڑی۔
''تمہارے پچھلے جنم کے بارے میں تو ہمیں کچھ نہیں معلوم۔''
''اور اپنے پچھلے جنم کے بارے میں؟''
''وہ بھی نہیں معلوم۔ بھگوان جانے ہمارا پچھلا جنم کیا تھا؟''
ہارون نے ایک گہری سانس لی۔ بس یہ احمقانہ سوال اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔
''نجانے کیوں مجھے امید تھی کہ تم مجھے یہاں ملو گی۔''
''ارے ناں ...... ہم تو تمہیں قدم قدم پر ملیں گے جب تک کہ تم ہمیں سویکار نہ کرا لو۔''
''مجھے کیا کرنا ہو گا؟ یہ بتاؤ'' ہارون نے سوال کیا۔
''ہمارے ساتھ مگن منڈل چلنا ہو گا۔''
''یہ مگن منڈل کیا ہے؟''
''چلو گے تو پتہ چلے گا۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ...... کیا تم ایک باقاعدہ انسانی وجود ہو؟''

ہارون کے اس سوال پر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی پھیل گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہم نہیں جانتے۔''

''مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ ہم کیا ہیں یہ ہمیں نہیں معلوم۔ پر یہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا من تمہارے لئے تڑپتا ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ تم ہمارا ہاتھ پکڑو اور مگن منڈل لے چلو۔ وہاں ہم اپنی آتما کو شانت کریں اور امر ہو جائیں۔''

''اور میری بیوی اور بچے کا کیا ہوگا؟''

''یہ بھی ہم نہیں جانتے۔''

''مگر میں جانتا ہوں...... چلتا ہوں۔''

''سنو...... سنو تو سہی۔''

''نہیں بھئی، میں کسی روح کے جال میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ تم بہت اچھی ہو چندر بدن! پر......''

''سنو تو سہی...... پتنی ہیں ہم تمہاری ناتھ۔ پنچائیت کے سامنے تم نے ہم سے کہا تھا کہ ہم تمہاری پتنی ہیں۔ اگر تمہیں ہمارے ساتھ یہی سلوک کرنا تھا تو بھسم ہو جانے دیتے وہیں ہمیں اس چتا میں۔ سنو تو سہی ناتھ...... سنو تو سہی...... سنو تو سہی۔''

لیکن ہارون نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ ان تمام سوالات نے چندر بدن کے تھوڑے سے ہیولے کو واضح تو ضرور کر دیا تھا لیکن یہ مگن منڈل کیا ہے، وہ اس کے ساتھ کون سے پھیرے پورے کرنا چاہتی ہے یہ سب کچھ اسے نہیں پتہ تھا اور نہ ہی وہ اسے مانتا تھا۔ جیپ میں بیٹھ کر اس نے جیپ اسٹارٹ کی۔ کافی دیر تک وہ اپنے پیچھے پازیب کی چھن چھن سنتا رہا تھا۔ اس نے عقب نما آئینے میں چندر بدن کو بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس پر نگاہ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد چھن چھن کی آواز رک گئی۔

تب اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی سڑک خالی پڑی ہوئی تھی اور اب وہاں چندر بدن کا وجود نہیں تھا۔

''میرے خدا! یہ مصیبت کیسے میرے گلے پڑ گئی؟ اور اب اس سے چھٹکارہ کیسے

حاصل ہوگا؟''

اس نے سوچا کہ کچھ کرنا چاہئے۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔ اس طرح تو دماغی توازن ہی خراب ہو جائے گا۔ راستے بھر وہ انہی سوچوں میں گم رہا تھا۔ چندر بدن نے کم از کم یہ الفاظ تو اپنے منہ سے کہہ دیئے تھے کہ اس کا اس سے پچھلے جنم کا کوئی ساتھ نہیں ہے۔ کبھی بھی تو یہ بھلا کوئی ماننے والی بات تھی؟ سارا کھیل ہی بالکل الگ تھا۔

سفر جاری رہا اور اس نے بہت سے فیصلے کئے۔ لیکن اس میں یہ آخری فیصلہ بھی تھا کہ افشاں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ عورت ذات ہے، نجانے اس کی سوچیں اسے کہاں سے کہاں تک لے جائیں۔ پریشان بھی ہوگی اور بھٹک بھی جائے گی۔''

گھر اچانک پہنچا تو سب خوشی سے کھل اٹھے۔ اشعر سکول سے واپس آ چکا تھا۔ دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا۔

''کتنے عرصے کا کام رہ گیا ہے آپ کا ڈیڈی؟''

''کام تو ابھی کافی ہے بیٹے! بہت دن لگ جائیں گے۔''

''ڈیڈی! آپ کے بغیر دل نہیں لگتا۔''

''میں جانتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے میرا دل لگ رہا ہوگا وہاں؟''

''بہرحال آپ جلدی کام ختم کر لیجئے...... میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ وہاں کا کام ادھورا چھوڑ دیجئے۔''

''ہاں بیٹے...... ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن ہم آپ کی خواہش پر غور کریں گے۔'' ہارون نے کہا۔ افشاں بھی خوشی سے مسکرا رہی تھی۔

''واقعی بڑا سونا سونا لگ رہا ہے۔''

''گھر......؟''

''نہیں، دل۔'' وہ بولی۔

بہرحال یہاں آ کر وہ خوش ہو گیا تھا۔ پھر اس نے دل میں سوچا کہ اپنے افسر اعلیٰ سے ملاقات کرے اور ان سے کہے کہ اسے اس جگہ سے ہٹا لیا جائے۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا کام تھا۔ اس سے پہلے اس نے ہر طرح کے چیلنج قبول کئے تھے۔ جہاں بھی اسے بھیج دیا جاتا وہ خوشی سے چلا جاتا۔ بلکہ وہ اس طرح کے انجینئروں میں شمار ہوتا تھا جن کے بارے میں بڑی اچھی اچھی رپورٹیں ملتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ جو ذمہ

داری انہیں سونپی جائے اس کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خوش اسلوبی سے پوری ہوگی۔

افشاں سے اس نے البتہ اس مسئلے میں مشورہ بھی نہیں کیا تھا۔ بس اپنے طور پر ہی سوچ رہا تھا۔ دو دن وہ اپنے گھر میں رکا اور پھر تیسرے دن یہ سوچ کر وہاں سے چل پڑا کہ اس بارے میں ابھی کامران سے بھی مشورہ کرے گا۔

راستے میں جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں اسے دو بار چندر بدن ملی تھی تو جیپ کی رفتار خود بخود ہلکی ہو گئی۔ مگر آج چندر بدن وہاں موجود نہیں تھی۔

❁

''تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔'' صفورہ نے ننھی ننھی چیونٹیوں جیسے بیروں سے کہا۔

''دیوی! ہم حاضر ہیں۔''

''مجھے ایسے جنتر منتر بتاؤ جو مجھے کامیابی کا راستہ دکھائیں۔''

''ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

جب وہ گھر سے باہر نکلی تو نیرہ بیگم نے بالکل اتفاقیہ طور پر پوچھ لیا۔

''کہاں جا رہی ہو صفورہ؟''

''بری بات ہے ماما...... آپ بزرگ لوگ ہی کہا کرتے ہیں کہ جب کوئی گھر سے باہر نکلے تو اسے ٹوکنا نہیں چاہئے۔''

''یورپ میں رہنے کے باوجود تم اس طرح کے توہمات کا شکار ہو۔ بھلا یہ پوچھ لینے سے کیا ہوتا ہے؟''

''ماما...... بس ایک کام سے جا رہی ہوں۔''

نیرہ بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔ جب صفورہ باہر نکل گئی تو وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''یہ طاہر علی اس وقت واپس آئیں گے جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا۔ اس لڑکی کے لچھن مجھے اچھے نظر نہیں آتے۔ کہیں کوئی بڑا المیہ نہ ہو جائے۔'' وہ فکر مندی سے بیٹھی سوچتی رہیں۔

صفورہ کار دوڑا رہی تھی۔ بیروں نے اسے جو راستہ بتایا تھا اس کے مطابق اس نے نقشے تیار کر لئے تھے اور پھر خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے کے سامنے پہنچ گئی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہاں ہارون کی

بیوی افشاں رہتی ہے۔

ڈور بیل بجائی۔ ایک خوبصورت سے بچے نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھنے لگا۔ صفورہ کو اس کے چہرے میں ہارون کے نقوش نظر آئے تھے۔

''ہیلو آنٹی! کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''جنابِ عالی! سب سے پہلے تو آپ ہمیں اپنا نام بتائیے۔'' صفورہ نے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''خادم کو اشعر کہتے ہیں۔''

''واہ...... بڑا خوبصورت نام ہے آپ کا۔ آپ کے ڈیڈی کا نام یقینی طور پر ہارون ہے۔''

''اتنے یقین سے کہہ رہی ہیں آپ تو ظاہر ہے میں اس کی تردید نہیں کر سکتا۔'' بچے نے غیر معمولی الفاظ میں کہا اور صفورہ نے آنکھیں گھمائیں۔

''آپ تو خاصے تیز طرار معلوم ہوتے ہیں۔''

''جو لوگ زندگی میں بہت پیچھے نظر آتے ہیں وہ کامیاب زندگی کبھی نہیں گزار سکتے۔ آئیے۔''

''ڈیڈی ہیں گھر پر؟''

''نہیں...... وہ تو نہیں ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ میرے ڈیڈی کو کیسے جانتی ہیں؟'' بچے نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ اسی وقت اندر سے آواز آئی۔

''اشعر! کون ہے بیٹا؟''

''ماما! ایک مہمان آئی ہیں۔ بہت سویٹ آنٹی ہیں اندر لا رہا ہوں۔ آپ کو پتہ ہے کہ مجھے خوبصورت چہرے پسند ہیں۔''

''ارے...... ارے تم تو بھئی بڑی آگے کی چیز معلوم ہوتے ہو۔'' صفورہ نے کہا اور اسی وقت افشاں باہر نکل آئی۔ صفورہ نے گہری نگاہوں سے افشاں کا جائزہ لیا تھا۔ متناسب جسم اور حسین نقوش والی افشاں بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔

''ہیلو......'' صفورہ بولی۔

''ہیلو...... آئیے، آئیے......'' افشاں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں...... آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''ہمیں بھولی ہوئی داستان کہتے ہیں۔''

''بڑا طویل نام ہے۔'' اشعر نے بیچ میں لقمہ دیا اور صفورہ ہنس پڑی پھر بولی۔

''ہاں...... نام کی حد تک طویل ہیں ہم۔ ورنہ دل بہت مختصر ہے۔''

''یہ الفاظ آپ نے صرف کہنے کے لئے کہے ہیں یا ان کا تعلق کسی تاریخی واقعہ سے ہے؟'' اشعر نے کہا۔

افشاں نے اسے گھورا۔ ''اشعر! زیادہ نہیں بولتے۔''

''ٹھیک ہے...... اگر کم بولنے کی پابندی ہے تو ہم چلتے ہیں یہاں سے۔ اچھا تو یہ بتا دیجئے آنٹی کہ آپ کے لئے کیا بھجوائیں؟''

''کوئی بھی مشروب۔'' صفورہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جاتے ہیں...... جی تو چاہتا تھا کہ باتیں کریں آپ سے۔''

''ضرور باتیں کریں گے۔ اب نہیں، تھوڑی دیر کے بعد۔''

''ٹھیک ہے......'' اشعر نے کہا اور باہر نکل گیا۔ افشاں مسکرا کر بولی۔

''ضرورت سے زیادہ بولتا ہے۔''

''ہارون کا بیٹا ہے ناں...... بچپن میں ہارون بھی اتنا ہی بولتے تھے۔''

افشاں نے چونک کر صفورہ کو دیکھا اور بولی۔ ''آپ ہارون کو بچپن سے جانتی ہیں؟''

''کہا تھا ناں میں نے آپ سے کہ بھولی ہوئی داستان ہیں ہم۔''

''پلیز اپنا تعارف کرائیے۔''

''صفورہ ہے ہمارا نام۔''

''صفورہ......؟''

''جی...... مرزا غیاث بیگ میرے ماموں تھے۔''

''جی......؟''

''ہاں......''

''مم...... مگر وہ تو میرے والد تھے۔''

''تو پھر...... اس میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں آپ؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے آپ نے کہا تھا کہ آپ ہارون کو بچپن سے جانتی ہیں۔''

صفورہ ایک دم سنبھل گئی پھر بولی۔ ''کہنے میں کیا حرج ہے...... بچوں سے باتیں اسی طرح کی جاتی ہیں۔''

''مگر ابو کو آپ کیسے جانتی ہیں؟''

''بھئی بتایا میں نے، ماموں تھے میرے۔ بس بعض اوقات رشتے ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ تھوڑا سا فاصلہ تھا ہمارے اور ان کے رشتے میں۔ کسی اور رشتے سے ماموں لگتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری امی انہیں بہت چاہتی تھیں۔''

''آپ کی امی......؟''

''ہاں...... انتقال ہو گیا ان کا۔''

''اوہ......''

''میں یورپ میں تھی۔''

''اچھا...... اچھا...... تعجب کی بات ہے۔ بڑا انوکھا انکشاف ہے۔ مجھے کبھی آپ کے بارے میں بتایا ہی نہیں گیا۔''

''میں نے کہا ناں بھولی ہوئی داستانیں کم ہی دہرائی جاتی ہیں۔ کوئی تھا ہی نہیں آپ کو میرے بارے میں بتانے والا۔''

اتنی دیر میں رشیدہ شربت لئے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''پلیز لیجئے...... ہارون آپ کے بارے میں سنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔ مگر میں اب الجھن کا شکار ہوں۔''

''آپ کی ساری الجھنیں میں دور کر دوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔'' صفورہ نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور شربت کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس مسکراہٹ کو وہ شربت کے گلاس کی آڑ میں چھپا گئی تھی۔ اس نے کہا۔

''آپ کا بیٹا بہت پیارا ہے۔''

''ہاں...... بہت ہی پیارا ہے وہ۔''

''بھئی اب میں یہاں آئی ہوں تو میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں سے ملاقات رہنی چاہئے۔''

''کیوں نہیں...... ہارون ابھی ایک دن پہلے آئے تھے اور واپس چلے گئے ہیں۔ جیسے ہی وہ دوبارہ آئیں گے آپ کے بارے میں انہیں بتاؤں گی۔ ویسے بھی ہم لوگ

بڑے محروم ہیں۔ ہمارے ملنے جلنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہے ہی نہیں۔''

''چلئے، اب تو میں آ گئی ہوں۔ ہماری اور آپ کی ملاقاتیں رہیں گی۔''

''آپ کا مستقل قیام یہاں رہے گا اب؟''

''ہاں..... بس یوں سمجھ لیجئے کہ آپ لوگوں کے لئے ہی آئی ہوں۔''

''میں سمجھی نہیں؟''

''میرا مطلب ہے اپنے تو اپنے ہی ہوتے ہیں۔'' صفورہ نے کہا اور پھر وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدانے لگی۔

ٹنڈن گوپال نے اسے جو کچھ بتایا تھا اب وہ اسے آہستہ آہستہ استعمال کر رہی تھی۔ جو منتر وہ اپنے ہونٹوں میں پڑھ رہی تھی اسے پڑھنے کے بعد اس نے افشاں کی طرف دیکھا اور افشاں کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کوئی غیر مرئی شے اس کے دماغ میں داخل ہو رہی ہو اور رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کے دائرے پھیلتے چلے گئے۔ اب وہاں صرف سفیدی ہی سفیدی تھی..... اس کا ذہن طلسم میں سوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بظاہر نارمل نظر آنے لگی۔

اسی وقت اشعر بھی کمرے میں داخل ہوا اور صفورہ نے فوراً ہی اس کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اشعر کے منہ سے نکلا۔

''ہم تو انتظار کر رہے تھے کہ شاید حسینوں کی اس محفل میں ہمارے لئے بھی کوئی جگہ بن جائے لیکن.....'' اس لیکن سے آگے اس کے الفاظ ادھورے رہ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صفورہ کو دیکھنے لگا۔ افشاں تو پہلے ہی پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ بھی ذہنی بے خیالی کا شکار ہو گیا۔ تب صفورہ نے کہا۔

''کیا خیال ہے..... چلا جائے..... اٹھو۔''

اور وہ دونوں مشینی انداز میں اٹھ گئے۔ صفورہ آگے آگے باہر نکلی۔ برآمدے میں رشیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ صفورہ کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ پیچھے پیچھے اس نے افشاں اور اشعر کو دیکھا۔ دونوں صفورہ کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ جب وہ برآمدے سے نیچے اترے تو رشیدہ نے پوچھ ہی لیا۔

''کہیں جا رہی ہیں بی بی؟''

''ہاں..... میرے ساتھ جا رہی ہیں..... تھوڑی دیر کے بعد واپس آ جائیں گی۔''

افشاں کی بجائے صفورہ نے جواب دیا۔ دونوں صفورہ کی کار کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے اور صفورہ نے کار سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ رشیدہ کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

''ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔''

❁

کامران عجیب سی نگاہوں سے ہارون کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''مگر مجھے ایک بات بتائیں کہ اس میں ہمت ہارنے کی کیا بات ہے؟ آپ نے تو کبھی کسی جگہ ہار نہیں مانی میرے دوست! یہ بات آپ کے کیریئر پر دھبہ بن جائے گی اور تو کچھ نہیں جو لوگ آپ کے مخالف ہیں وہ آپ سے کہیں گے کہ آپ نے ایک پروجیکٹ کو کرنے سے انکار کر دیا۔''

''اصل میں مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے نا کامران میں اسے صرف جذباتی انداز میں نہیں لے سکتا۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے چندر بدن میرے لئے مصیبت بن جائے گی۔''

''افسوس تو یہ ہے کہ آپ کچھ بتاتے بھی نہیں ہو۔''

''میں کیا بتاؤں..... جس دن سے اسے دیکھا ہے عجیب و غریب الجھنوں کا شکار رہا ہوں۔''

''ہے تو وہ بہت خوبصورت۔'' کامران نے مسکرا کر کہا۔

''خدا کی قسم کامران! یقین کرو میں اس کے حُسن وغیرہ سے متاثر نہیں ہوں۔ بس ایک طلسمی سی کیفیت مجھ پر طاری ہے۔ میں کسی طلسمی جال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔''

''اگر آپ اپنی قوتِ ارادی سے کام لیں گے تو کوئی بھی طلسمی جال، جال نہیں ہو سکتا۔'' کامران نے ایک دوست کی حیثیت سے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... لیکن میں بتاؤں اس رات جب تم مجھے باہر ملے تھے اور تم نے پوچھا تھا کہ کیا کر رہے ہو تو میں نے یونہی تم سے کہہ دیا تھا کہ میں چہل قدمی کر رہا ہوں، نیند نہیں آئی۔ میں کافی دور نکل گیا تھا۔''

''کہاں.....؟'' کامران نے چونک کر پوچھا اور ہارون اسے اس رات کی داستان سنانے لگا کہ کس طرح چندر بدن کی پازیب کی جھنکار اسے اپنے پیچھے لگا کر بہت دور لے گئی۔ پھر بہت سے انسانوں کے مجمع میں وہ رقص کرتی نظر آئی۔ اس کے

بعد گھوڑے سوار زمینوں کا مالک خاقان اور نجانے کیا کیا...... اس نے اپنی واپسی تک کی پوری داستان سنائی اور کامران حیرت سے دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گیا، پھر بولا۔

''اور جناب ہارون صاحب! آپ نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔''

''یار! کہاں تک بتاؤں اور کیا کیا بتاؤں۔ اس کے بعد بھی جب میں گھر جا رہا تھا تو وہ مجھے راستے میں ملی۔''

''چندر بدن......؟'' کامران بولا۔

''ہاں...... اسی جگہ جہاں کے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ مجھے ملی تھی اور سڑک پر اس کی پازیب پڑی ہوئی تھی۔ بعد میں وہ پازیب میرے گھر سے حاصل کر لی گئی تھی۔ اصل میں کامران! یہ ایک بڑی حیرت ناک بات ہے جو میں خاص طور پر محسوس کر رہا ہوں۔''

''کیا...... پلیز مجھے بتائیں؟''

''وہ یہ کہ یہاں ایک عجیب سا امتزاج چل رہا ہے۔''

''امتزاج......؟''

''ہاں......''

''وہ کیسے؟ اور کیا؟''

''ایک روح صرف روح ہوتی ہے۔ اس سے متعلق ہر شے غیر مرئی۔ لیکن وہ پازیب، بار بار اس کے لئے ہنگامہ آرائی اور اس کا اس طرح ملنا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس کے بدن کو چھونے کی کوشش کروں تو اس میں بھی مجھے کامیابی حاصل ہو جائے۔ میں نے اس کے پیروں کو بھی غور سے دیکھا ہے۔ وہ الٹے پیروں والی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی بدروح بھی نہیں ہے۔ میں نے اس سے اس کے پچھلے جنم کے بارے میں بھی پوچھا ہے تو وہ ہنس کر کہنے لگی کہ نہیں، نہ میں اس کے پچھلے جنم کا ساتھی ہوں اور نہ ہی اور کوئی ایسی بات ہوئی ہے۔ میں اس سے پوچھنے لگا کہ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے تو اس نے کہا کہ میں نے اسے پتنی سویکار کیا ہے یعنی بیوی کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ میں اسے اپنی بیوی بنا لوں۔''

''یعنی...... یعنی......'' کامران نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا۔

''سنجیدگی سے سنو...... مذاق مت اُڑاؤ میرا۔''

''نہیں...... سچ...... سچ...... خدا کی قسم مذاق نہیں اُڑا رہا۔ اتنی خوبصورت عورت آپ کو اپنی زندگی کا مالک بنانے کی دعوت دے رہی ہے۔''

''مگر جناب! میں افشاں سے محبت کرتا ہوں۔ ہر قیمت پر میں اسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''خیر...... خیر وہ تو ظاہر ہے۔''

''کہنے لگی گونا کر لو۔''

''یہ گونا کیا ہوتا ہے؟''

''رخصتی ہوتی ہے یار! ان کے ہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا ہمارے ہاں پہلے نکاح ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رخصتی کر لی جاتی ہے۔ بعض حالات میں وہ بھی گونا اسی کو کہتے ہیں۔''

''آپ نے کیا جواب دیا؟''

''بڑی احمقانہ باتیں ہیں جس پر مجھے خود ہنسی آتی ہے۔'' ہارون نے جھینپے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر مختصراً اسے بتانے لگا۔ کامران پوری سنجیدگی سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''نہیں...... ہنسنے والی بات نہیں ہے...... وہ آپ کو مانگ رہی ہے یعنی آپ کو ہماری بھابھی سے چھینا چاہتی ہے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''خیر، بھابھی کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہے...... میں نے اسے ہوا بھی نہیں لگنے دی ہے ان حالات کی۔ لیکن کامران میں اب سوچ رہا ہوں کہ اپنے اعلیٰ افسر سے بات کروں اس بارے میں۔ یہاں آنا ضروری تھا ورنہ میں بات کر کے ہی آتا۔''

''گویا اس علاقے کو چھوڑ دیں گے؟''

''کامران! اگر تم چاہو تو یہاں......''

''نہیں خیر اب میرا تو کوئی چکر بھی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔'' کامران نے کہا۔

''میں بات کروں گا۔ اعلیٰ افسران سے بات کروں گا۔''

اور پھر ہارون کو کچھ ایسی سنک سوار ہوئی کہ دوسرے ہی دن کامران کو صورتحال

سمجھا کر اور ضروری کاموں سے آگاہ کر کے واپس چل پڑا۔

جب وہ اس علاقے میں پہنچا جہاں اسے چندر بدن نظر آتی تھی تو وہاں اسے وہ نظر نہیں آئی۔ نجانے کیوں ہارون کے دل کو ایک کسک کا سا احساس ہوا۔ بہرحال وہ جیپ سست رفتاری سے آگے بڑھاتا ہوا لے گیا۔ راستے بھر اسے یہ خیال آتا رہا کہ پتہ نہیں آج وہ وہاں کیوں نہیں ہے۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ آخر یہ مخصوص علاقہ ہی کیوں؟ وہ تو ایک آوارہ روح ہے۔ کہیں اور کسی بھی جگہ نظر آ سکتی ہے۔

لیکن بہرحال یہ باتیں سمجھ میں نہ آنے والی تھیں۔ چنانچہ وہ خاموش ہی رہا اور آخر کار گھر پہنچ گیا۔ اچانک ہی اسے دوبارہ دیکھ کر افشاں ضرور حیران ہو جائے گی۔ وہ اس سے اس کی آمد کی وجہ پوچھے گی۔ وہ اسے حقیقت نہیں بتائے گا اور یہی کہے گا کہ کوئی سرکاری کام ہے۔ اسے اپنے آفس جانا ہے اس لئے واپس آ گیا۔ یہ تمام باتیں سوچتے ہوئے اس نے گاڑی پارک کی اور نیچے اترا۔ اشعر یا افشاں کو اس کے آنے کی توقع نہیں تھی اس لئے وہ گاڑی کی آواز سن کر نہیں آئے تھے۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد رشیدہ ضرور آ گئی۔ رشیدہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''آپ کو کس نے بتایا صاحب جی.....؟'' وہ بولی اور نجانے کیوں کامران کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔

''کیا رشیدہ؟''

''یہی کہ بیگم صاحب جی.....''

''کیا ہوا..... کیا ہوا بیگم کو؟..... اشعر کہاں ہے.....؟''

''جی وہ دونوں چلے گئے۔''

''چلے گئے.....؟''

''ہاں.....''

''کہاں.....؟''

''یہ تو ہمیں بالکل نہیں معلوم صاحب جی! نیلے رنگ کی ایک کار تھی اور وہ بی بی جی آئی تھیں یہاں۔ بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ شربت پیا۔ پھر اشعر میاں اور بیگم صاحب ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئیں۔''

''افشاں.....؟''

''ہاں جی..... انہی کی بات کر رہی ہوں۔''

''تم سے کچھ کہہ کر نہیں گئی؟''

''یہی تو حیرت کی بات ہے صاحب جی! ایک لفظ بھی تو نہیں بولا انہوں نے مجھ سے۔ اور نہ ہی پہلے مجھے اپنے جانے کے متعلق کچھ بتایا۔''

''سنو..... سنو..... کب کی بات ہے یہ؟''

''کل کی صاحب جی! اگر کچھ ہی دیر کی بات ہوتی تو ہم یہ سوچتے کہ وہ آ جائیں گی۔ لیکن وہ تو رات کو اسی طرح غائب رہیں۔ نہ کوئی کپڑے لے کر گئیں۔''

''کیا کہہ رہی ہے..... کیا کہہ رہی ہے تُو؟'' ہارون نے شدید پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''ہاں صاحب جی! وہ..... آپ یقین مانو..... ہم تو خود بھی بڑے پریشان تھے۔ پر صاحب جی! ہمیں فون کرنا نہیں آتا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم آپ سے کیسے بات کرتے۔ ہم تو رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ہماری آنکھیں دیکھیے جی!''

ہارون دوڑتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور پھر پورے گھر کی تلاشی لینے لگا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر ایسی کون سی بات تھی جو افشاں اسے بتائے بغیر کسی کے ساتھ چلی گئی۔

جب وہاں کچھ بھی ایسی چیز نہ ملی تو اس نے رشیدہ سے اس عورت کے بارے میں پوچھا۔ رشیدہ اس کا الٹا سیدھا حلیہ بتانے لگی۔ لیکن ہارون کو اس حلیے سے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ افشاں کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ کس طرح کی عورت ہے۔ ہارون اس کی زندگی کا سب کچھ تھا۔ ہارون سے پوچھے بغیر تو وہ ایک قدم گھر سے باہر نہیں نکال سکتی تھی نہ صرف وہ بلکہ اشعر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اور وہ آخر کون عورت تھی؟ رشیدہ جاہل سی عورت تھی۔ وہ تو یہ بھی نہ بتا سکی کہ اس گاڑی کا نمبر کیا تھا۔ ہارون کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔

صفورہ نے خاصا وقت یورپ میں گزارا تھا۔ اچھا خاصا حلقۂ احباب تھا اُس کا۔ اس حلقے میں ایک سے ایک چالاک آدمی موجود تھا۔ صفورہ خود بھی کوئی احمق لڑکی نہیں تھی۔ اپنے بیروں سے اس نے سوال کیا تھا۔

''مجھے تو اپنے اندر موجود شکتی کا خود بھی احساس نہیں ہے۔ کیا کیا کر سکتی ہوں میں؟''

''ٹنڈن گوپال مہاراج کے پاس جو ایک دن بھی رہ لیا وہ سنسار میں بسنے والے بہت سے انسانوں سے کہیں زیادہ سمجھدار اور چالاک ہو جاتا ہے۔ تم نے تو ان کے ساتھ بڑا سمے گزارا ہے دیوی! بھلا تم سے زیادہ عقلمند کون ہو سکتا ہے؟''

''میں تو اپنے آپ کو بے وقوف سمجھ رہی ہوں۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ اگر میں کسی کو اپنے قبضے میں کرنا چاہوں تو کیسے کر سکتی ہوں؟''

''جیسے تمہارا من چاہے دیوی! تم صرف اس کی آنکھوں میں دیکھ لو۔ تم اس سے اپنی بات منوا سکتی ہو۔ یہ بھی ایک ٹنڈن گوپال مہاراج کا وردان ہے۔''

''اگر یہ بات ہے تب تو واقعی کام کی بات بتائی ہے تم نے۔''

''جے دیوی!''

اور پھر تجربہ کر لیا گیا۔ صفورہ نے یہ بھی کہا تھا کہ کون سے ایسے کام ہوں گے جن میں اسے کامیابی اور کون سے ایسے ہوں گے جن میں ناکامی حاصل ہو گی۔

''کالے جادو کا مقصد یہی ہے دیوی کہ سنسار میں بسنے والوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ کالے جادو کے ذریعے کوئی نیک کام تو کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر تم کسی کے لئے کوئی برا کام شروع کرو گی، اس میں کالا جادو تمہاری سب سے اچھی سہائتا کرے گا اور کہیں اگر تمہارے من میں دیا آ گئی۔ تم نے انسانوں کی بھلائی کے لئے کام کرنا شروع کیا تو تم سے کالے جادو کی ساری شکتی چھین لی جائے گی۔''

''اور اگر کوئی میرا دشمن ہو اور میں اسے کوئی نقصان پہنچانا چاہوں تو......؟''

''نقصان پہنچانے کے لئے کسی دوست یا دشمن کی تمیز بھی نہیں کرنی چاہئے۔ کوئی بھی غلط کام کرنا ہو، تم کالے جادو کا سہارا لے سکتی ہو۔''

اور انہی باتوں کی روشنی میں صفورہ نے آخر کار افشاں کی جانب قدم بڑھایا تھا۔ وہ انتقام کی پیاسی تھی اور اس کے دل میں صرف انتقامی جذبے پروان چڑھ رہے تھے۔ ورنہ پہلے بھی اسے اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ ہارون کی ذات سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن اس نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اسے اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور کرنا چاہتی تھی اور اسی جذبے نے اسے یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

افشاں اور اشعر کو لے کر وہ ایک کچی آبادی میں پہنچی جہاں اس نے بابو خاں نامی ایک آدمی سے رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ یہ بابو خاں ایک ہٹا کٹا آدمی تھا جو کچھ کرتا ورتا نہیں تھا۔ صفورہ نے اسے بہت سے پیسے دے کر کہا۔

''بابو خاں! میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔''

''حکم کریں بیگم صاحب! بابو خاں تو حکم کا بندہ ہے۔ بس مجھے نوٹ دکھاتی رہو اور ریل کی پٹری پر لٹا دو۔ اپنی جیب میں نوٹ بھر کر میں خوشی سے ریل کی پٹری پر لیٹ جاؤں گا۔''

''لیکن تمہاری تو گردن کٹ جائے گی۔ پھر ان نوٹوں کا کیا کرو گے؟''

''نوٹوں کے ساتھ تو مرنا بھی بڑی بات ہے بیگم صاحب!''

''اچھا خیر چھوڑو، میں کسی کو یہاں لانا چاہتی ہوں۔ تمہیں اس کی خدمت کرنا ہو گی۔''

''آپ تو فکر ہی نہ کرو بیگم صاحب جی! اس کام کے لئے تو تمہیں بابو خان سے اچھا کوئی آدمی ملے گا بھی نہیں۔''

اور صفورہ، افشاں اور اشعر کو لے کر وہیں بابو خان کے گھر پہنچ گئی تھی۔ بابو خان نے سر جھکا دیا کیونکہ صفورہ نے اسے اچھے خاصے پیسے دیئے ہوئے تھے۔

''دیکھو یہ میرے معزز مہمان ہیں۔ تمہیں کچھ باتوں کا خاص خیال رکھنا ہے بابو خان! پہلی بات تو یہ کہ انہیں یہاں ذرا بھی تکلیف نہ ہو۔ ان کے کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام تمہیں خود کرنا ہو گا۔ یہ جو میری مہمان ہیں وہ خود کھائیں گی، پکائیں گی۔ ان کا بیٹا بھی یہیں ان کے ساتھ رہے گا۔ دوسرا کام یہ بابو خان کہ انہیں گھر کے دروازے سے باہر مت نکلنے دینا۔ چاہے اس کے لئے تمہیں ان کی ٹانگیں ہی کیوں نہ

توڑنی پڑیں۔"

"ہیں....." بابو خان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں..... ہیں کیا؟" صفورہ نے کہا۔

"نہیں جی..... میرا مطلب ہے مہمانوں کی ٹانگیں..... آپ مذاق کر رہی ہیں بیگم صاحب!"

"میرا تیرا مذاق کا رشتہ نہیں ہے بابو خان! جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہی ہونا چاہئے سمجھے۔"

"بالکل وہی ہوگا بیگم صاحب جی!"

"اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچی تو میں تجھے بند کرا دوں گی۔"

"نہیں جی..... اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی آپ کو۔"

"کوئی اگر تجھ سے ان کے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا تیرے دور کے رشتے دار ہیں، باہر سے آئے ہیں۔ یہ عورت تجھ سے زیادہ باتیں نہیں کرے گی۔ اور نہ ہی لڑکا۔ لیکن اگر یہ ضرورت کی کوئی چیز تجھ سے مانگیں تو تم انہیں دینا۔"

"جی بیگم صاحب!"

پھر صفورہ نے افشاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اور تم سنو۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں اٹھانی ہوگی۔ جتنا وقت ضروری ہے وہ وقت یہاں گزارنا ہوگا۔ کھانے پینے اور ضرورت کی کوئی چیز تم اس سے مانگ سکتی ہو۔ یہ تمہیں فراہم کرے گا۔ گھر سے باہر قدم مت نکالنا ورنہ تمہارے لئے نقصان دہ ہوگا۔"

افشاں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے صفورہ کو دیکھتی رہی تھی۔

صفورہ یہ تمام ہدایات دینے کے بعد باہر نکل آئی اور پھر اس نے شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"نندن گوپال مہاراج! آپ کے دیئے ہوئے عطیات کا شکریہ۔ اور ہارون! رفتہ رفتہ ہی میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم نے اپنے آپ کو کتنے بڑے نقصان سے دوچار کر لیا ہے۔ وہ تو تقدیر نے مجھے یہ طاقت بھی بخش دی ورنہ میں کسی اور طریقے سے تم سے انتقام لیتی۔ کیونکہ انتقام میری زندگی ہے۔"

ہارون دنگ رہ گیا تھا۔ یہ کیا ہوا..... یہ کیسے ہوا..... کوئی عورت کار میں آئی تھی۔ مگر ہارون کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کون تھی وہ عورت؟ کیا کروں..... کیا خاموش بیٹھ کر افشاں کی واپسی کا انتظار کروں؟ میرا بیٹا اشعر کہاں گیا؟ کہاں گیا وہ.....؟ یہ کوئی اتفاقی بات ہے یا پھر کوئی سازش..... اتفاقی بات ہو نہیں سکتی۔ افشاں اس طرح کی ہے ہی نہیں۔ میری اجازت کے بغیر تو وہ ایک قدم باہر نہیں نکال سکتی۔ پھر اس طرح کیسے جا سکتی ہے وہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے..... ضرور کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔

وہ پریشانی سے سوچتا رہا۔ گھر سے باہر قدم نکالنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں باہر جاؤں اور افشاں کا فون آ جائے۔ وہ بتائے کہ میں یہاں ہوں۔ بہرحال بہت ہی بری بیت رہی تھی اس پر اور وہ شدید پریشانی کے عالم میں گرفتار تھا۔ رشیدہ کو ایک بار پھر بلایا اور کہا۔

"رشیدہ! کم از کم مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ صحیح طور پر۔"

"سرکار جی! خوبصورت سی تھی۔ جوان بھی تھی۔ بڑی پرکٹی لگتی تھی۔ مطلب یہ چٹک مٹک، چٹک مٹک۔ بیگم صاحب نے اس کے لئے شربت منگوایا تھا۔"

"پھر..... پھر کیا ہوا؟"

"بس جی کچھ نہیں۔ بیگم صاحب اور چھوٹے بابو اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑے۔ بیگم صاحب پر کوئی زبردستی نہیں کی جا رہی تھی۔ اپنی مرضی سے وہ کار میں بیٹھی تھیں اور اس نے کار چلا دی تھی۔"

"اپنی مرضی سے..... یہ نہیں ہو سکتا۔"

وہ رات ہارون نے کانٹوں کے بستر پر گزاری۔ بڑی پریشان کن کیفیت تھی۔ صبح ہو گئی، دوپہر ہو گئی، شام ہو گئی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ ضرور کوئی بہت بڑا چکر چلا ہے۔ کیا کروں..... پولیس کو اپنے بیٹے اور بیوی کی گمشدگی کے بارے میں اطلاع دوں؟

رات کو وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اب انتظار کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس نے دل میں سوچا اور پھر اس نے اچانک ہی چونک کر ٹیلی فون کو دیکھا۔ جلدی سے ٹیلی فون کی طرف جھپٹا اور کامران کو کال کیا۔ کامران سے کچھ ہی لمحوں کے بعد رابطہ

قائم ہو گیا تھا۔
"کامران! غضب ہو گیا ہے......"
"خیریت سر! کیا بات ہے؟"
"کامران! افشاں اور اشعر غائب ہیں۔"
"غائب ہیں......؟"
"ہاں کامران! کل میں جس وقت گھر پہنچا تو وہ دونوں موجود نہیں تھے۔ کامران! اس وقت سے میں کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہا ہوں۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے اس بات کا کہ افشاں اپنی مرضی سے نہیں گئی ہے۔"
"تو پھر......؟"
"ضرور اسے کسی چکر میں یا دھوکے سے کہیں لے جایا گیا ہے۔ لے جانے والی ایک عورت تھی۔"
"عورت......؟"
"ہاں...... کار میں آئی تھی اور کار میں اسے لے گئی تھی۔"
"سر! عجیب بات بتا رہے ہیں آپ...... کیا آپ نے ایسی جگہوں پر افشاں بھابھی کو تلاش کیا جہاں وہ جا سکتی تھیں؟"
"کوئی ایسی جگہ نہیں ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ افشاں مجھ سے پوچھے بغیر کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی۔"
"سر! بڑی عجیب بات ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"
"بس میں نہیں جانتا کہ ایسا کیسے ہو گیا۔ میں سخت پریشان ہوں۔ تم یوں کرو کامران کہ جس حد تک وہاں کے معاملات کو سنبھال سکتے ہو سنبھالو۔ میرے بارے میں خود تم میرے آفس کو اطلاع دے سکتے ہو۔ میری تو دنیا ہی لٹ گئی ہے۔ بیٹا اور بیوی دونوں ہی غائب ہیں۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں نوکری کے چکر میں انہیں نظر انداز کر دوں۔ نوکری رہے یا نہ رہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں انہیں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"
"میرا خیال ہے ہارون صاحب! پولیس سے مدد لے لیجئے۔"
"پولیس کو اگر اس مسئلے میں ڈال دیا تو......"
"نہیں، ڈالنا ضروری ہے۔ بعد میں کہیں پچھتاوا نہ ہو آپ کو۔"

"اچھا...... دیکھتا ہوں۔"
"یہاں کے معاملات میں سنبھالے ہوئے ہوں۔ آپ سے فون پر رابطہ رکھوں گا۔"
کامران کے مشورے پر ہارون پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ انسپکٹر کوئی سلجھا ہوا آدمی تھا۔ اس نے کہا۔
"جی فرمائیے......؟"
"انسپکٹر صاحب! میری بیوی اور ایک سات سالہ بیٹا غائب ہو گیا ہے...... میری ملازمہ کا کہنا ہے کہ ایک عورت آئی تھی نیلے رنگ کی ایک کار میں۔ وہ ان دونوں کو بہلا پھسلا کر کہیں لے گئی۔ کل سے غائب ہیں وہ۔"
"اوہو...... کچھ ایسے معاملات جن کا خود آپ کو شبہ ہو؟"
"افسوس تو یہی ہے انسپکٹر صاحب!"
"بیوی اور بچے کی کوئی تصویر؟"
"ہاں...... وہ میں لایا ہوں۔" ہارون نے کہا۔ احتیاطاً وہ فریم سے افشاں اور اشعر کی تصویریں نکال لایا تھا۔ اس نے وہ تصویریں انسپکٹر صاحب کے سامنے رکھ دیں۔
"آپ ذرا اپنے بارے میں مکمل تفصیلات بتا دیجئے۔" انسپکٹر نے ڈائری میں خود ساری تفصیلات درج کیں پھر بولا۔
"اب جس طرح آپ کی مسز اور آپ کا بیٹا گھر سے غائب ہیں یہ بالکل ایک الگ چیز ہے لیکن پھر بھی ہم احتیاطاً ہسپتالوں اور تھانوں میں تلاش کئے لیتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارا ساتھ دیں۔"
ہارون نے انسپکٹر کا شکریہ ادا کیا اور پھر وہ ساری رات انہوں نے ایسی جگہوں کی تلاش میں گزار دی جہاں کوئی زخمی یا کوئی اس قسم کا شخص مل سکتا تھا جس کی ذہنی حالت خراب ہو گئی ہو۔ لیکن ایسا کوئی شخص نہیں ملا تھا۔ پھر انسپکٹر نے کہا۔
"دیکھئے میں آپ سے پوری پوری ہمدردی رکھتا ہوں ہارون صاحب! ہم جتنا کچھ کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں گے۔ آپ سے رابطہ بھی رکھیں گے۔ کسی کو ٹیلی فون پر ضرور تعینات کر دیجئے گا اور آپ اپنے طور پر بھی کام کرتے رہیں۔"
صبح کا وقت تھا۔ ہارون پریشان حالت میں گھر کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ

دفعتہ ہی کوئی چیز اوپر سے گری اور چھن کی ایک آواز ابھری۔ ہارون اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا اور پھر اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''چندر بدن......''

دوسرے ہی لمحے اس کے دماغ کی چرخی برق رفتاری سے گھومنے لگی۔

''گون کر لو ہمارا...... سوئیکار کیا ہے تم نے ہمیں۔ پھولوں کی سیج دے دو...... ہماری پیاسی آتما کو شیش کھ دے دو۔''

''چندر بدن! کیا یہ تُو ہے جس نے میری بیوی اور میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کر دیا ہے اپنی آگ، اپنی خوشی پوری کرنے کے لئے؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے آخر؟'' وہ بڑے عجیب و غریب انداز میں سوچنے لگا اور پھر اس نے فوراً ہی موبائل فون پر کامران سے رابطہ قائم کیا۔

کامران تین بار اس سے اس دوران افشاں کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔

''جی ہارون صاحب...... کچھ پتہ چلا؟''

''ایک بات بتاؤ کامران! میرے خیمے کے آس پاس، اندر باہر یا وہاں سہائے پور کی گہرائیوں میں تم نے چندر بدن کو تو نہیں دیکھا؟''

''نام و نشان نہیں ملا اس کا۔ کیوں؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کامران کہ وہ اس دن مجھے راستے میں ملی تھی جس دن میں پہلی بار...... میرا مطلب ہے اب سے پہلے گھر واپس آیا تھا۔''

''جی...... آپ نے بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ...... کہ......'' اچانک کامران بھی بولتے بولتے چونک پڑا۔ پھر اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''سر! آپ چندر بدن کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے؟''

''ہاں...... اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''حالانکہ جس روپ میں وہ افشاں اور اشعر کو لے گئی ہے وہ تو بالکل کسی جدید عورت کا روپ ہے۔ چندر بدن کیا ایسا کر سکتی ہے؟''

''میں نہیں جانتا...... لیکن میں اس سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے کامران!''

''سر! آپ کیا کرنے والے ہیں...... مجھے بتائیے تو سہی۔''

''بعد میں بتاؤں گا۔'' ہارون نے کہا اور موبائل فون بند کر کے جلدی جلدی

تیاریاں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جیپ لے کر واپس سہائے پور کی جانب چل پڑا تھا۔ جس جگہ دو بار اسے چندر بدن ملی تھی وہاں اس نے جیپ روکی اور نیچے اتر آیا۔ دن کا وقت تھا لیکن پھر بھی سڑک پر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس علاقے میں ذرا کم ہی گاڑیاں وغیرہ چلتی تھیں۔ اس جگہ کھڑے ہو کر وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر اور بھونپو سا بنا کر چیخا۔

''چندر بدن...... چندر بدن...... چندر بدن...... چندر بدن...... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ چندر بدن! میرے پاس آؤ۔ اگر تم یہاں موجود ہو تو میرے پاس آؤ۔ چندر بدن! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں...... میرے پاس آؤ چندر بدن! آج میں تمہیں یاد کر رہا ہوں، پہلے تم مجھے یاد کرتی رہی ہو۔ چندر بدن! آؤ مجھے آج تمہاری ضرورت ہے...... چندر بدن! پلیز آؤ۔'' اس کی آواز کی بازگشت سناٹے میں دور تک گونج رہی تھی مگر کوئی تحریک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی آواز رندھ سی گئی۔

''آؤ چندر بدن، آؤ...... مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔ چندر بدن! آج مجھے تم سے کام آ پڑا ہے...... آؤ...... پلیز آؤ......'' مگر کوئی آواز نہیں ابھری تھی۔

بہت دیر تک وہ کھڑا ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا رہا اور پھر مایوس ہو کر وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ جیپ تیز رفتاری سے اب اپنے کیمپ کی جانب جا رہی تھی۔ کامران چونکہ صورتحال سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے دور ہی سے جیپ کو دیکھ لیا۔

کام بدستور ہو رہا تھا اور کامران نے اس کی رفتار بڑھوا دی تھی۔ جو صورتحال سامنے آئی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہارون اب بہت عرصے تک یہ کام جاری نہیں رکھ سکے گا۔ وہ عجیب سی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ کامران نے کیمپ سے کچھ فاصلے پر ہارون کا استقبال کیا اور ہارون اسے دیکھ کر نیچے اتر آیا۔ ہارون کے چہرے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس مختصر سے وقت نے اس سے اس کی ساری شگفتگی چھین لی ہے۔ کامران نے آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''بدقسمتی سے میں صرف تمہارا ماتحت ہی نہیں تمہارا دوست بھی ہوں۔ اور جب تم مجھے اس دوست کے روپ میں نظر آتے ہو تو میں تم سے بہت زیادہ بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ ہارون! یہ سب کیا ہو گیا؟''

ہارون نے ایک اداس نگاہ اٹھا کر کامران کی طرف دیکھا۔

''کاش میں بتا سکتا کہ یہ کیا ہو گیا۔''

''میرا تو ایک ہی اندازہ ہے ہارون۔''

''کیا؟''

''ہم جس جال کو ایک تفریحی جال سمجھ رہے تھے اور یہ سوچتے تھے کہ ہمارا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا وہ ہمارے لئے بہت بڑی مصیبت بن گیا۔''

ہارون نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

''سب کچھ تو کر چکا ہوں میں۔ چندر بدن سے میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا میرا اور اس کا جنم جنم کا کوئی تعلق ہے؟ اس نے انکار کر دیا۔ بس کھیل ہی کھیل میں یہ مصیبت بن گئی۔ یقین کرو کامران میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ بے شک وقت نے مجھے جس قسم کے معاملات سے دوچار کیا ہے وہی میرے لئے کٹھن تھا ساری باتیں اپنی جگہ، میں افشاں اور اشعر کو اپنی زندگی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اس دنیا میں سب سے زیادہ چاہنے والا انسان ہوں لیکن میرا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرا اور کوئی ہے بھی نہیں اس دنیا میں۔ میں ان کے علاوہ کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ہم تینوں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ پہلے میں اور افشاں اکیلے تھے۔ پھر قدرت نے ہمیں اشعر سے نوازا اور اشعر ہماری زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ لیکن اب تم دیکھو! میں اکیلا ہوں، کامران! میں بالکل اکیلا ہو گیا ہوں۔''

ہارون کی آواز بھرا گئی اور کامران نے آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہارون! زندگی کے یہ الٹ پھیر زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہمیں ہر طرح کے حالات سے دوچار رہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہیں دلاسہ دینا خود اپنے الفاظ کا مذاق اڑانا ہے۔ کیونکہ جو کچھ تمہارے دل پر بیت رہی ہوگی وہ تم ہی جانتے ہو۔ لیکن میرے دوست! سب سے بڑی چیز ہمت ہے۔ اگر ہم نے ہمت ہار دی تو پھر کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔''

''کامران! تم بہت اچھے دوست ہو...... اس دوران تم نے ہم کا لفظ استعمال کیا ہے اور مسلسل کیا ہے۔ یہ چیز بہت بڑی ہے۔ تم مجھے ڈھارس دے رہے ہو...... تم تم کامران! میں تمہیں تمہاری اس محبت کا کیا صلہ دے سکوں گا؟''

''یار... یاری ہی تو دنیا میں سب کچھ ہے۔ تم اپنی بیوی اور بچے سے محبت کرتے ہو، میں تم سے محبت کرتا ہوں ہارون! دیکھو نوکری، کام دھندے تو چلتے ہی

رہتے ہیں۔ یہ بے شک زندگی کی ضرورت ہوتے ہیں میرے بھائی! اس سے بھی بڑی ایک ضرورت ہے اور وہ ہے محبت۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر اور ایک بات ذہن میں رکھو لو، ہم بھابھی کو تلاش کریں گے۔ میں ایک لمحے کے لئے تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ فوری طور پر یہ بندوبست کرتے ہیں کہ یہاں کا کام کسی اور کو دے دیا جائے۔''

''کامران اب یہ بتاؤ کریں کیا؟''

''دیکھو میرا ذہن تو بار بار ایک ہی سمت جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہارے ماضی کی داستان سننا چاہتا ہوں...... اگر فوری طور پر ذہن میں کسی عمل کا منصوبہ نہ ہو تو ایک بار پھر مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ حالانکہ میں جانتا ہوں لیکن دوبارہ یہ داستان دہرا کر ہم ان کونوں کھدروں کو تلاش کریں گے جہاں ہو سکتا ہے بھابھی کی گمشدگی چھپی ہو۔''

''حمایت علی نے میری پرورش کی تھی۔ میں انہی کے گھر پلا بڑھا۔ رقیہ خالہ میری پرورش کنندہ تھیں۔ یقین کرو جب تک ہوش نہیں تھا یا یہ کہا جائے کہ جب تک مجھے یہ بات بتائی نہیں گئی تھی کہ میں حمایت علی کا بیٹا نہیں ہوں، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کوئی اجنبی حیثیت رکھتا ہوں۔ حمایت علی کے دو بچے تھے شمسہ اور عنایت۔ مجھے وہاں اس گھر میں سب پر فوقیت دی جاتی تھی۔ ایک ایسا بچہ سمجھا جاتا تھا جو گھر کے تمام لوگوں سے زیادہ معزز ہو اور بڑی حیثیت رکھتا ہو۔ میں نہیں جانتا ایسا کیوں کیا جاتا تھا؟ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی۔ کامران! اس کے بعد حالات رخ بدلتے رہے اور میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ حمایت علی چچا کا انتقال ہو گیا۔ رقیہ خالہ بھی مر گئیں۔ شمسہ کی شادی ہو گئی۔ عنایت گھر سے کچھ لے کر فرار ہو گیا۔ اس میں ایک صندوقچی بھی تھی جسے میری ملکیت بتایا جاتا تھا اور جو بڑی پراسرار اہمیت کی حامل تھی۔

عنایت وہ صندوقچی لے کر فرار ہو گیا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس میں میرے لئے جمع کی ہوئی دولت بھری ہوئی ہے جبکہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات کبھی بھی نہیں تھی۔ پھر حاجی عطا نے میری شادی کرانا چاہی لیکن میں مرزا غیاث بیگ کی بیٹی افشاں سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نے صفورہ سے شادی نہیں کی اور اس شادی سے انکار کر دیا اور اس کے بعد حاجی عطا صاحب بھی مجھ سے ناراض ہو گئے اور ان

سے تعلقات بالکل ختم ہو گئے۔ بس پھر افشاں کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزر رہی تھی کہ تقدیر نے یہ تماشہ دکھا دیا۔ چندر بدن...... چندر بدن......"

"صرف چندر بدن......؟" کامران نے کہا اور ہارون چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟"

"ماضی کی کہانی میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے بارے میں یہ سوچا جائے کہ بھابھی کی گمشدگی اس بات کا شاخسانہ ہے؟"

"ضرور چندر بدن نے کوئی عمل کیا ہے۔ ابھی راستے میں آتے ہوئے اس جگہ جہاں مجھے وہ دو تین بار مل چکی ہے میں نے اسے پکارا تھا مگر وہ وہاں بھی مجھے نظر نہیں آئی۔"

"تو پھر آؤ...... اسے سہائے پور کے کھنڈرات میں تلاش کریں۔ یہ ساری کہانی سہائے پور کے کھنڈرات میں ہی بکھری ہوئی ہے۔" کامران نے کہا اور ہارون خیال بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"کامران! بے شک تم ہر لمحے میرا ساتھ دو لیکن میرے دوست......"

"کیا لیکن ویکن...... میں آپ سے الگ ہوں ہارون؟"

"نہیں الگ تو نہیں ہو۔ پر یہاں سے معاملات......"

"اوور سیر دیکھے گا...... میں اسے سمجھائے دیتا ہوں۔" کامران نے ایسے لہجے میں کہا کہ ہارون انکار نہیں کر سکا۔ بہرحال وہ کیمپ تک پہنچے۔ کامران نے زبردستی ہارون کو کھلایا پلایا اور بولا۔

"ہمیں وہاں چلنا تو ہے ہی۔ میں جانتا ہوں سر! کہ اس دوران آپ نہ تو سوئے ہوں گے نہ آپ نے کھایا پیا ہوگا۔ سر پلیز! اتنی عزت مجھے دیں کہ جو کچھ میرا دل آپ کے لئے کرنا چاہتا ہے اسے کرنے دیں۔"

ہارون ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔ خیمے میں پہنچ کر اس نے کہا۔

"میرا دل تو بالکل بھی نہیں چاہتا کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی ٹک کر کہیں آرام کروں...... تم یقین کرو میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔ پتہ نہیں میری افشاں اور میرا بچہ کس حال میں ہو گا۔ یار! بڑی محبت اور بڑے پیار سے پالا تھا انہیں۔"

"میں جانتا ہوں...... اچھی طرح جانتا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں پلیز۔ اس کے بعد ہم سہائے پور کے کھنڈرات کی جانب نکلیں گے۔ نجانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ وہاں مجھے افشاں بھابھی کا کچھ نہ کچھ پتہ ضرور چل جائے گا۔"

ہارون نے کامران کے اصرار پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

❁

دونوں میاں بیوی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ طاہر علی نے کہا۔

"بس کیا بتاؤں...... جتنا زبردست کاروبار پھیلا ہوا تھا میرا اور جس انداز میں چل رہا تھا اسے ختم کرتے ہوئے لوگوں نے اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھا تھا جیسے سمجھ رہے ہوں کہ میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے نیرہ بیگم کہ ایسے اعلیٰ کاروبار کو ختم کر دینا دماغ کی خرابی ہی تصور کی جا سکتی ہے۔ کون ایسا کرتا ہے۔"

"آپ کو اپنے کاروبار کا افسوس ہو رہا ہے۔ یہ بتائیے کہ بیٹی کے علاوہ آپ کی زندگی میں کچھ اور ہے؟ سب کچھ اسی کے لئے کر رہے تھے نا آپ...... اگر وہی ہمارے ہاتھوں میں نہ رہی تو پھر اس کاروبار کا کیا کریں گے آپ...... مجھے جواب دیجئے۔"

"ہاں...... یہی سوچ کر تو سب کچھ ختم کر بیٹھا ہوں۔"

"آپ تصور نہیں کر سکتے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے طاہر! جس بیٹی کے لئے ہم نے کاروبار ختم کر دیا اور سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ گئے وہ اب بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بہت زیادہ پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن اب جب تم آ گئے ہو اور تسلی سے بیٹھ گئے ہو تو گزرے ہوئے دنوں کی باتیں میں تمہیں سنانا چاہتی ہوں۔ وہاں لندن میں تو ہم بالکل ہی بے یار و مددگار تھے۔ ہماری بات کو سمجھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ کسی کو سمجھاتے تو صرف مذاق اڑانے کے علاوہ کچھ نہ ملتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا اس نندن گوپال کو اس کائنات سے نیست و نابود کر دے جس نے ہم سے ہمارا اکلوتا ہیرا چھین لیا۔ یہ کیسے ہوا، کچھ نہیں معلوم۔"

"ہماری غلطیوں سے نیرہ بیگم...... ہماری غلطیوں سے۔ بیٹا ہو یا بیٹی، والدین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس وقت تک جب تک کہ وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ بچے کا ذہن پختہ ہو گیا ہے اور وہ کسی غلط جال میں نہیں پھنسے گا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ لمحہ لمحہ اس

کی نگرانی کریں اور یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ کس راستے پر جا رہا ہے۔''

''مشکل ہوتا ہے طاہر! مشکل ہوتا ہے۔ بچے ایک عمر تک پہنچنے کے بعد سرکش بھی تو ہو جاتے ہیں۔ ہماری بیٹی بھی انہی بچیوں میں سے تھی جو سرکش ہو جاتی ہیں۔''

''تم مجھے اور زیادہ دہشت زدہ نہ کرو...... مجھے وہ عوامل بتاؤ جس کی بناء پر تم ان حالات کا شکار ہوئی ہو۔ میرا مطلب ہے اس سوچ کا۔ وہ گئی کہاں ہے؟''

''یہ پوچھ رہے ہو مجھ سے۔ یہ پوچھو کہ وہ آتی کب ہے؟''

''نیرہ بیگم! تم نے مجھے یہ سب تو نہیں بتایا۔''

''انتظار کر رہی تھی کہ تم وہاں کے معاملات سے نمٹ کر یہاں آ جاؤ تو تمہیں پوری تفصیل بتاؤں۔ دوہری مشکلات کا شکار ہو جاتے۔ کاروباری امور کو سمیٹنا آسان کام تو نہیں ہوتا۔''

''اب تم مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے؟''

''کالے جادو کے بارے میں تم نے یہ بات تو سن رکھی ہے طاہر علی کہ وہ دین دنیا سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ مذہب تو خیر چھن ہی جاتا ہے، دنیا داری بھی چھن جاتی ہے۔ پتہ نہیں یہ بدبخت کیوں اس طرف راغب ہوتے ہیں۔''

''ایک ہی بات ہے...... صرف ایک ہی بات ہے۔ ہر چیز کالا جادو ہے نیرہ بیگم! انسان کی فطرت میں اقتدار پسندی ہے۔ وہ اپنی ذات کی برتری کا بھوکا ہے۔ اس کے حصول کے لئے کبھی وہ ہٹلر بن جاتا ہے کبھی چنگیز خاں کبھی اسٹالن کبھی آئزن ہاور، کبھی کچھ بن جاتا ہے، کبھی کچھ۔ ہر قسم کی طاقت وہ اقتدار کے لئے ہی حاصل کرنا چاہتا ہے نیرہ بیگم! کالے جادو کے ماہر بھی اسی قسم کی کیفیتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ طریقہ کار ہے اپنا اپنا۔ وہ اپنا ایمان کھو کر طاقت حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور صحیح معنوں میں شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ تو ازل سے جاری ہے، مختلف شکلوں میں، بادشاہوں کی شکل میں، جنگجو سرداروں کی شکل میں۔ یہ لوگ اقتدار کے لئے سب کچھ کر دیتے ہیں۔ کھوپڑیوں کے مینار بناتے ہیں، انسانی جسموں کو بھٹی میں جلا دیتے ہیں۔''

''مگر یہ سودا صفورہ کے دل میں کیسے سمایا؟''

''مجھے معاف کرنا نیرہ بیگم! وہاں یورپ میں بھی میرا ایک پاؤں کسی ملک میں ہوتا تھا اور دوسرا کسی ملک میں۔ ماں کی حیثیت سے یا عورت کی حیثیت سے صفورہ کو

سنبھالنے کی ذمہ داری تو تم پر عائد ہوتی تھی۔ یہ سوال تمہیں مجھ سے نہیں کرنا چاہئے۔''

نیرہ بیگم کی گردن جھک گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہیں، پھر ان کی شرمندہ شرمندہ آواز ابھری۔

''مجھ سے سوال کرو گے؟ میں تو غلطی بھی کرتی ہوں تو تمہارے بل پر۔ خود میں کیا کر سکتی ہوں، مجھے بتاؤ؟''

''تم یہ تو بتاؤ کہ سلسلہ کیا ہے؟ کیسے چل رہا ہے؟''

''میرا تو یہی خیال ہے کہ صفورہ یقینی طور پر اپنے راستوں پر چل رہی ہے۔ نندن گوپال بے شک یہاں نہیں ہے مگر صفورہ کے طور طریق بالکل مختلف ہو گئے ہیں ہم سے۔ مجھے معاف کرنا مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہماری بیٹی اپنا ایمان بھی کھو بیٹھی ہے۔ وہ اب ہمارے مذہب میں نہیں رہی ہے۔ کالے جادو کے بارے میں تمہیں بھی علم ہے کہ مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کو ماننے والا سب سے پہلے مذہب ہی کی نفی کرتا ہے۔''

''خدا کے واسطے اتنی بھیانک باتیں نہ کرو نیرہ بیگم!''

''وہ غلاظتیں کھاتی ہے۔ ملازم زبان بند رکھتے ہیں لیکن جو کچھ اس کی فطرت میں پیدا ہو چکا ہے......''

''ہاں غلاظتیں کھانے کا کیا سلسلہ ہے...... بتاؤ۔'' اور جواب میں نیرہ بیگم، طاہر علی کو وہ واقعات سنانے لگیں جو ان کے کانوں تک پہنچے تھے۔ طاہر علی کا چہرہ غم و اندوہ میں ڈوب گیا تھا۔ سوچتے رہے پھر دفعتاً ہی انہوں نے گردن اٹھا کر کہا۔

''نہیں...... ہمیں اس قدر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ یہ ہمارا اپنا وطن ہے...... یہاں ہمارے ہم مذہب اور ہمارے خیال کے لوگ رہتے ہیں۔ کالا جادو یورپ میں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں تو اس کی شدید ممانعت ہے۔ اس کا توڑ کرنے والے بھی بہت موجود ہیں۔ میں خفیہ طور پر معلومات حاصل کروں گا اور اس کے علاوہ اب میں خود دیکھوں گا بلکہ ایسا کروں گا کہ میں خفیہ طور پر صفورہ کا تعاقب کروں گا اور یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ وہ کہاں جاتی ہے؟''

''ہاں ایسا ہی کرو......''

صفورہ ماں باپ کی ان باتوں سے بے خبر اپنے معمولات میں مصروف تھی۔ وہ

کالے جادو کی قوتوں کا بھرپور تجربہ کر رہی تھی اور دل ہی دل میں بے پناہ خوش تھی کہ اسے بہت سی قوتیں حاصل ہوتی جا رہی ہیں۔ رات کو اس کا بہترین مشغلہ یہ ہوتا کہ اپنے کچھ بیروں کو بلا لیتی اور ان سے باتیں کرتی رہتی۔ اس رات بھی وہ یہی کھیل کھیل رہی تھی۔

''بیرو...... پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ٹنڈن گوپال مہاراج کے پاس میں نے جتنا وقت گزارا اس سے مجھے کیا حاصل ہوا؟''

''جے مہاشری...... یہ تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ تو آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ تم خود اپنا جائزہ لے لو۔ تمہاری شکتی بڑھتی جا رہی ہے۔ ٹنڈن گوپال مہاراج کے چرنوں میں جو بھی تھوڑا سا سمے بتا لے سمجھ لو وہ اپرم پار ہو گیا۔ عام انسان سے اس کا کیا واسطہ۔ تمہاری آنکھوں میں اتنی شکتی آ گئی ہے کہ جسے دیکھو اس سے اپنی بات منوا لو پاگل کا بچہ بن کر رہ جائے وہ۔ جب چاہو اپنے اس فن کو آزما لینا اور ہم تو خیر ہیں ہی تمارے داس۔ ہمیں جو حکم دیتی ہو ہم وہ کر ڈالتے ہیں۔'' صفورہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

طاہر علی یورپ سے اپنا کاروبار ختم کر کے واپس آ گئے تھے۔ صفورہ کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ طاہر علی نے یورپ کیوں چھوڑا ہے۔ دل ہی دل میں اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''ڈیڈی صاحب! آپ مجھے یورپ سے یہاں لے آئے ہیں تاکہ ٹنڈن گوپال سے بچا سکیں۔ آپ سمجھتے ہی مجھے یہ بات معلوم نہیں ہے لیکن ڈیڈی صاحب! میں جانتی ہوں یہ بات۔ بے شک گرو جی مہاراج میرے پاس نہیں ہیں لیکن ان کا سکھایا ہوا علم میرے پاس فروغ پا رہا ہے اور یہ ہی نہیں گرو مہاراج کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے میں یہاں اپنے شاگرد بنانے کا آغاز کروں گی۔ میں خود ایک ایسا آشرم کھولوں گی جو خفیہ طور پر چلایا جائے گا اور اس میں گرو مہاراج کے نام پر کالے جادو کی شکشا دی جائے گی۔'' بری قوتیں صفورہ کے اندر نجانے کیا کیا طاقتیں پیدا کر رہی تھیں۔ ہارون کے بارے میں وہ جب بھی سوچتی یہ خیال اس کے دل میں آتا رہتا تھا کہ ہارون سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ہے لیکن کئی بار اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر ہارون سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ہے تو پھر وہ ہارون کے خلاف یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہے۔

دنیا میں تو لاکھوں کروڑوں افراد موجود ہیں۔ خود یہاں بھی اس کے اپنے وطن

ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے دل میں ہارون کے لئے کوئی لگاؤ ضرور موجود ہے یا پھر یہ صرف پندارِ حسن کی توہین کا انتقام ہے۔ وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی ابھی۔ ہارون کے مسئلہ کو اس نے آہستہ آہستہ نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہاں کم از کم ہارون کو ایک اذیت کا شکار کر کے اسے دلی مسرت ہو رہی تھی۔

افشاں اور اشعر بدستور بابو خاں کے قبضے میں تھے اور بابو خان ایک قابل اعتماد آدمی تھا۔ ایسے لوگ دولت کے غلام ہوتے ہیں۔ بابو خان کو اپنی نگاہوں کا نشانہ بنانے کے بجائے اسے اپنی دولت کا نشانہ بنایا تھا اور یہ وار بھی سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ بابو خان بڑی سعادت مندی کے ساتھ ان دونوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ صفورہ کو خوشی ہوتی تھی۔ اس نے ان دونوں کے دماغ پلٹ ڈالے تھے اور اب وہ یہی جانتے تھے کہ وہ کون ہیں، کہاں رہ رہے ہیں۔ بابو خان کی رپورٹ اسے ملتی رہتی تھی۔ بابو خان صحیح معنوں میں اس سے وفاداری نبھا رہا تھا۔ چنانچہ اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس دن بھی اپنے معمولات سے فارغ ہوئی۔ ناشتہ باپ کے ساتھ ہی کیا تھا۔ طاہر علی اس سے بہت سی باتیں کرتے رہے تھے۔

''ہاں بھئی صفورہ! میں اور تمہاری ماں اب مل کر یہ سوچ رہے ہیں کہ تمہاری شادی کر ڈالی جائے۔'' جواب میں صفورہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی تھی پھر اس نے کہا۔

''ضرور کر دیں ڈیڈی! مگر ایک مشورہ میں آپ کو دینا چاہتی ہوں۔''

''ہاں ہاں، بولو...... شوق سے بولو۔''

''میری شادی کسی ایسے شخص سے کریں جس سے آپ کی بہت ہی پرانی دشمنی چل رہی ہو۔''

''کیا......؟'' طاہر علی حیران رہ گئے۔

''ہاں ڈیڈی...... تاکہ آپ اس سے بھرپور انتقام لے سکیں۔ جو شخص مجھ سے شادی کرے گا آپ سمجھ لیجئے کہ زندگی کی سب سے بڑی اذیت میں گرفتار ہو جائے گا۔ اسے آپ کوڑھی کہہ سکتے ہیں۔ کینسر یا ٹی بی کا مریض بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔''

اس گفتگو کی طاہر علی صاحب کو بالکل بھی امید نہیں تھی۔ انہوں نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''صفورہ! مجھ سے بات کر رہی ہو تم؟''

''ہاں ڈیڈی..... وقت بہت بدل گیا ہے۔ وہ تو شکر کیجئے کہ آپ اپنے وطن میں ہیں، یورپ میں نہیں ہیں۔ یہاں آپ اپنا لہجہ ناخوشگوار بنا سکتے ہیں۔ یورپ میں اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ ڈیڈی دیکھیں میں بہت اچھی بیٹی ہوں آپ کی۔ میں آپ سے برملا کہہ رہی ہوں۔''

''صفورہ! میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیجئے..... آپ کو اس کا حق ہے ڈیڈی!''

''صفورہ! تم اس قدر بگڑ کیسے گئیں؟''

''اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے ڈیڈی! ہوسکتا ہے جس عمل کو آپ بگڑنا کہتے ہیں میرے نزدیک زندگی کا وہی صحیح راستہ ہو۔ اور پھر ڈیڈی یورپ کی سوچ اس سلسلے میں بہت مناسب ہے۔ دیکھیں، برا مت مانئے میری بات کا۔ ہم لوگ اس دنیا میں آتے ہیں۔ دنیا میں آنے سے پہلے ہمیں نہیں پتہ ہوتا کہ ہم کون سے گھر میں پیدا ہوں گے، ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔ ڈیڈی معاف کیجئے گا آپ لوگ بھی یہ نہیں سوچتے کہ آنے والا کیا ہوگا اور اس کی پرورش آپ کو کس طرح کرنا ہوگی۔ جب ہم اس دنیا میں آجاتے ہیں نا ڈیڈی! یہاں آنے کے بعد ہماری تقدیروں کا تعین ہوتا ہے۔ آپ لوگ ہمیں پیدا کرنے سے پہلے یہ نہیں سوچتے کہ کس طرح ہم سے محبت کریں گے، ہمیں چاہیں گے۔ وہ تو سب بعد کے عوامل ہیں ڈیڈی! بس اتنا خیال ہمارے جتنا دوسرا برداشت کر سکے۔ تو مطلب یہ ہے کہنے کا کہ میں نے بھی جب اپنے آپ کو دیکھا، پرکھا، محسوس کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں ایک آزاد شخصیت رکھتی ہوں۔ ایک اچھے اور بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ میں نے اپنے ذہن کی ترتیب اسی انداز میں کی۔ اور ڈیڈی یہی ترتیب مجھے مناسب لگی۔ اب آپ مجھے بتائیے میں کیا غلط کر رہی ہوں ڈیڈی؟ بالکل غلط نہیں کر رہی میں۔''

''بیٹا! وہاں لندن میں تم نے ٹنڈن گوپال نامی بدنام شخص سے رابطے قائم کئے اور گندے علوم سیکھنے کی کوشش کی۔ وجہ بتا سکتی ہو اس کی؟''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں ڈیڈی کہ سڑکوں پر نشے میں ڈوبے ہوئے لوگ پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گندی نالیوں میں مر جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ڈاکے ڈالتے ہیں، مختلف قسم کے جرائم کرتے ہیں۔ آپ بتا سکتے ہیں اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟''

''ہوتی ہے اس کی وجہ بیٹا! ہوتی ہے۔''

''ہوتی ہے نا.....؟''

''ہاں..... بالکل وجہ ہوتی ہے۔ حالات کی رفتار اسی کو تو کہتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے ڈیڈی! ٹنڈن گوپال کی طرف متوجہ ہونے کی بھی ایک وجہ تھی۔''

''کیا وجہ تھی.....؟''

''وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔''

طاہر علی صاحب کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ صفورہ حد سے زیادہ بے باک ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا۔

''ہم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''آپ رشتے میں میرے ماں باپ لگتے ہیں۔''

''رشتے میں.....؟''

''رشتے ہی کی تو بات ہے ڈیڈی! بتائیے، نہیں؟''

''ہمارے کچھ حقوق ہیں تم پر۔''

''نہیں۔'' صفورہ نے جواب دیا۔

''کیا.....؟'' طاہر علی اچھل پڑے۔

''ہاں ڈیڈی! حقوق کیا چیز ہوتے ہیں۔ دیکھئے میں بڑی ہوگئی۔ آپ جب چاہیں معذرت کر سکتے ہیں کہ بی بی! جاؤ اپنی زندگی خود تلاش کرو۔ اپنے راستے خود متعین کرو۔ ڈیڈی یہ آپ کا حق ہے۔ آپ چاہیں تو ابھی کھڑے کھڑے مجھے گھر سے نکال دیں اور پھر میرا فرض ہے کہ میں اپنے لئے اپنی پسند کا مستقبل تلاش کروں۔ ایک اچھا گھر۔ سڑکیں یا گندی نالیاں۔ سمجھ رہے ہیں ناں ڈیڈی؟''

''ٹھیک..... گویا تم ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہو۔''

''ہاں ڈیڈی..... بالکل نکل چکی ہوں۔''

''ہوتا نہیں ہے ایسا صفورہ!''

''جہاں نہیں ہوتا ہوگا نہیں ہوتا ہوگا۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم پر سختی کی جائے۔''

''نہیں ڈیڈی! اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے۔ اگر آپ مجھ پر سختی کریں گے تو ڈیڈی! میں اپنا بچاؤ کروں گی۔''

طاہر علی گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے تھے۔ پھر وہ اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ صفورہ مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تیار ہونے لگی۔ پھر وہ کار لے کر باہر نکل گئی۔ لیکن طاہر علی نے کچھ اور ہی فیصلے کر لئے تھے۔ صفورہ کی یہاں مصروفیات کے بارے میں جاننا چاہتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ صفورہ کا تعاقب کریں گے۔

انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں صفورہ کے ملنے جلنے والے کون کون سے ہیں...... وہ کہاں کہاں جاتی ہے، کیا کرتی ہے۔ بٹی کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ صفورہ کی باتیں بتا چکی تھیں کہ وہ بالکل ہی آؤٹ ہو چکی ہے لیکن ایسے تو نہیں چھوڑا جا سکتا اسے۔ طاہر علی ابھی تک کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ بہر حال جیسے ہی صفورہ کی کار باہر نکلی وہ خود بھی کار اسٹارٹ کر کے اس کے پیچھے چل پڑے۔ ڈرائیور کو انہوں نے پیچھے بٹھا لیا تھا اور خود کار ڈرائیو کر رہے تھے تاکہ صورتحال سے آگاہ رہیں۔

یہ کار بھی انہوں نے ڈرائیور کو رینٹ اے کار بھیج کر منگوائی تھی تاکہ صفورہ اس کی شناخت نہ کر سکے۔ بہر حال وہ بڑی ہوشیاری سے اس کا تعاقب کرنے لگے۔

صفورہ بڑے خوشگوار انداز میں کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ طاہر علی اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ لیکن وہ بے حد چالاک تھی یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیطانی قوتوں نے اس کی حسیات میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ ایک کار اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اس نے اپنے بازو پر ہاتھ پھیرا، چند لمحات کے بعد دو ننھی ننھی چیونٹیاں اس کے بازو پر نمودار ہو گئیں۔

''جے مہاشری!'' ان میں سے ایک کی آواز ابھری۔

''کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے؟'' صفورہ نے کہا اور تھوڑی دیر تک بیروں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر ان کی آواز ابھری۔

''ہاں جے شری! پیچھا کر رہا ہے تمہارا۔''

''کون ہے؟''

''تمہارا باپ۔''

''کیا......؟''

''ہاں...... یہ وہی آدمی ہے جسے تم ڈیڈی کہتی ہو۔ کار وہی چلا رہا ہے۔''

''یہ کہاں سے میرے پیچھے لگے ہیں؟''

''تمہارے گھر سے باہر نکلتے ہی مہاشری۔''

''ہوں، ٹھیک ہے...... جاؤ آرام کرو۔''

''آرام......؟'' ایک بیر کی باریک سی آواز ابھری۔

''کیوں...... کیا بات ہے؟''

''مہاشری کچھ لمحے تو ہمیں اپنے ساتھ رہنے دو۔ ہم بھی تمہارے چاہنے والوں میں سے ہیں۔''

''کیا...... ؟'' صفورہ اچھل پڑی۔

''ہاں...... تم جانتی ہو ہم میں سے جو تمہارے شریر سے باہر نکل آتے ہیں وہ پھر واپس شریر میں نہیں جا سکتے۔ انہیں سنسار کی ہواؤں کے ساتھ ختم ہو جانا ہوتا ہے۔ ہم سب تمہارے خون کے قطرے ہیں مہاشری۔ تمہیں چاہتے ہیں۔ تم سے پیار کرتے ہیں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ کچھ دیر کے بعد ہماری فنا یقینی ہے۔ پر تھوڑی دیر تو ہمیں اپنے بدن کا لمس لینے دو۔''

''ٹھیک ہے...... بیٹھے رہو میرے بازو پر۔'' صفورہ نے مسکرا کر کہا۔ نجانے کیوں اسے خوشی کا سا احساس ہوا تھا۔ یہ اس کے اندر کا عورت پن تھا۔ اور پھر اپنے اس عورت پن کو یاد کر کے اسے ہارون کا خیال آیا جس نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اگر ہارون اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا تو آج یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ وہ ایک عام سی گھریلو لڑکی بن جاتی۔ لیکن ہارون نے اسے ٹھکرا کر ایک عفریت کو جنم دیا تھا۔

ایک دم سے صفورہ کے دل میں افشاں اور اشعر کا خیال آیا۔ اس نے عقب نما آئینے کو سیٹ کیا اور پیچھے آنے والی کار کا جائزہ لینے لگی۔ بے چارے طاہر علی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ صفورہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور پھر اس نے ایک خاص سڑک پر کار موڑ دی۔

یہ سڑک شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف جاتی تھی۔ اس میں بہت سے موڑ آتے تھے۔ صفورہ نے اچانک ہی آگے بڑھ کر کار کی رفتار طوفانی کر دی۔ رفتار بتانے والی سوئی تیزی سے آگے بڑھنے لگی اور کار کا انجن پوری طاقت کے ساتھ کار کو آگے دوڑانے لگا۔ آن کی آن میں طاہر علی کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ صفورہ ایک موڑ مڑی اور اس نے کار کو ایک سائیڈ پر اتار کر اس کا انجن بند کر دیا۔

طاہر علی نے بھی رفتار تیز کر دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد انہوں نے بھی وہ موڑ

کانٹا اور آگے بڑھے۔ لیکن انہوں نے صفورہ کی کار دیکھ لی تھی جو سائیڈ میں کھڑی ہوئی تھی۔ طاہر علی کچھ لمحے کے لئے بوکھلا سے گئے۔ اب کیا کرنا چاہئے؟ یا تو سیدھے چلے جائیں یا پھر کار روکیں۔ اور انہوں نے ابھی کوئی فیصلہ بھی نہیں کیا تھا کہ صفورہ کی کار پھر سڑک پر آ گئی اور اب وہ تیزی سے طاہر علی کی کار کے پیچھے جا رہی تھی۔

طاہر علی کو یہ اندازہ تو ہو ہی چکا تھا کہ صفورہ کو اس تعاقب کا علم ہو گیا ہے۔ اب فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کار آگے لے جا کر سائیڈ سے لگا دی۔ صفورہ نے بازو پر بیٹھے ہوئے بیروں سے کہا۔

''تم نے میرے وجود کے لمس سے فراغت حاصل کر لی؟''

''حکم ہے شری..... آپ ہمیں حکم دیں۔''

''چپ چاپ نیچے اترو اور جس طرح بھی بن پڑے اس رکی ہوئی کار کے چاروں ٹائروں کی ہوا نکال دو۔ کر سکو گے یہ کام؟''

''ہم کون سا کام نہیں کر سکتے؟ تم ہمارے ننھے سے وجود پر نہ جاؤ۔ ہمیں حکم دیا کرو ہم کیا کریں۔''

''ٹھیک ہے..... میں کار اس کار کے آگے لے جا کر روکوں گی۔ دروازہ کھول کر نیچے اتروں گی۔ وہیں سے نیچے اتر کر اپنا کام شروع کر دینا۔''

''جو حکم مہا شری۔'' بیروں نے کہا۔

صفورہ نے تھوڑے فاصلے پر کار روک دی اور پھر دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ طاہر علی اپنی کار کے اسٹیئرنگ پر سیدھے سیدھے بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہیلو ڈیڈی! کیا بات ہے..... جیمس بانڈ بنے ہوئے ہیں۔ میرا پیچھا کر رہے تھے؟''

''ہاں..... دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کار کتنی رفتار سے چلاتی ہو۔''

''دیکھا؟''

''صفورہ بیٹا! دیکھو ابھی سمجھا رہا ہوں۔ باپ ہوں اور محبت سے سوچ رہا ہوں تمہارے بارے میں۔ تمہارے راستے غلط ہیں بیٹا! واپس آ جاؤ۔ دوسری صورت میں مجھے سختی کرنا پڑے گی۔''

''مزہ آئے گا ڈیڈی..... مزہ آئے گا۔ آپ کو خوشی ہو گی کہ آپ کی بیٹی کس قدر

طاقتور ہے اور کیا کیا کچھ کر سکتی ہے۔ ڈیڈی! آپ کی بیٹی کے سامنے آپ کی ایک نہیں چلے گی۔ آپ ہر مرحلے پر شکست کھائیں گے۔ ظاہر ہے نہ آپ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ میں آپ کو کوئی نقصان پہنچا سکتی ہوں۔ ہمارے درمیان تو صرف کھیل ہو گا۔ کیا سمجھے؟''

''غلط فہمی کا شکار ہو صفورہ! بہرحال ٹھیک ہے۔ کہاں جا رہی ہو؟''

''پتہ لگا لیجئے ڈیڈی! پیچھا تو کر رہے ہیں نا آپ میرا۔ آپ ہی تو رکے تھے۔ میں تو نہیں رکی۔''

''ٹھیک ہے، جاؤ۔ دیکھنا پڑے گا تمہیں۔'' طاہر علی نے کہا اور صفورہ نے ہنس کر کار آگے بڑھا دی۔ طاہر علی غصے سے پیچ و تاب کھاتے رہے تھے۔ پھر انہوں نے بھی اپنی کار آگے بڑھائی۔ لیکن کار اپنی جگہ سے آگے نہیں کھسکی تھی۔ اور جب کھسکی بھی تو بری طرح اچھل اچھل کر۔ طاہر علی کے منہ سے آواز نکل گئی تھی۔

گاڑی سے نیچے اترے اور پھر انہوں نے اپنی کار کے ٹائر دیکھے اور ان کی کھوپڑی ناچ کر رہ گئی۔ ڈرائیور بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا تھا۔ اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

''صاحب جی! چاروں ٹائر..... یہ چاروں ٹائر کیسے پنکچر ہو گئے؟''

طاہر علی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ہارون کے سارے وجود میں دکھن تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے بلندیوں میں پرواز کرتے ہوئے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا ہو۔ ماضی کی کہانیاں کچھ بھی ہوں، بچپن بھی برا نہیں گزرا تھا۔ ایک عجیب سی برتری اسے حاصل تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس گھر کا کوئی فرد نہ ہو جس گھر میں وہ پرورش پا رہا ہے۔ بلکہ کوئی بلند ہستی ہو۔ حالانکہ بسا اوقات اسے اپنی یہ برتری بری لگنے لگتی تھی۔ ایک بچے کی حیثیت سے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی گلی محلے میں کھیلے کودے، شمسہ اور عنایت کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرے، مار پیٹ کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کبھی عنایت اس کی برابری کرنے کی کوشش کرتا تو حمایت علی چچا اسے بری طرح پیٹ کر رکھ دیتے تھے۔ ایک دو بار تو ان کے منہ سے کچھ اس طرح کے الفاظ بھی نکل گئے تھے کہ تو اپنی اوقات پہچان۔ کس کی برابری کر رہا ہے؟

اس وقت تو یہ الفاظ ہارون کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ یہ سوچنے لگتا تھا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا تھا۔ اس کا اندازہ تو اسے آہستہ آہستہ ہو گیا تھا۔ اس وقت جب اس نے ہوش سنبھال لیا تھا کہ وہ حمایت علی کا بیٹا نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ انہیں چچا کہتا تھا۔ اگر وہ حمایت علی کا بھتیجا بھی ہے تو بھی اس پر تری کی کیا نوعیت تھی۔ بہر حال یہ سب ماضی کی باتیں تھیں۔ پتہ نہیں اس صندوقچی میں کیا تھا جسے عنایت لے کر بھاگ گیا تھا۔ یہ ساری باتیں جب بھی اس کے دل میں آتی تھیں وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور ان تمام باتوں کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ افشاں اتنی ہی اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی اس کے لئے کہ افشاں نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ پھر اشعر کی آمد ہوئی تھی اور دونوں میاں بیوی نے اشعر کو ایک بہترین کردار کا مالک بنا دیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کا تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

بہر حال وہ بہت دیر تک سوچوں میں ڈوبا رہا اور پھر اس کے بعد نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا جو ماں کی طرح ہوتی ہے سکون بخش اور دنیا کے جھگڑوں سے نکال دینے والی۔

لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ انہی [illegible] خیالات کا شکار ہو گیا جو اس کی زندگی میں داخل ہوئے تھے تو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ [illegible] سے پروجیکٹس پر کام کیا تھا، بہت سے ویرانوں میں بھی تعمیرات کی تھیں۔ لیکن یہاں آنے کے بعد جو واقعات پیش آئے تھے وہ ابھی تک ناقابل فہم تھے۔ چندر بدن کہاں گئی؟ اندازہ یہی ہوتا تھا کہ چندر بدن نے اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اپنے راستے صاف کرنے کے لئے افشاں اور اشعر کو غائب کر دیا۔

"نہیں چندر بدن ..... بالکل نہیں ..... تُو ہزار بار بھی حُسن مجسم ہو کر میرے سامنے آ جائے تو میرے لئے افشاں نہیں بن سکتی۔ اور پھر اشعر ..... میری زندگی، میرے وجود کا ایک ٹکڑا ..... میرا دل، میری جان، میری روح، میری آنکھوں کی روشنی سب کچھ ہے وہ میرا۔ اور اس کے بعد مجھے کسی اور رشتے کی حاجت نہیں ہے۔ چندر بدن ..... اگر تیرے ہاتھوں افشاں کو کوئی نقصان پہنچا تو تُو تصور نہیں کر سکتی کہ میں کیا کروں گا۔ میں زمین آسمان ایک کر دوں گا۔"

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل پر سخت وحشت سوار تھی۔ یہ وحشت اسے خیمے سے

باہر لے آئی۔

کائنات اسے ایک بھیانک خلاء لگ رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا اور اس کے حلق سے آواز نکلی۔

"میں تجھے تلاش کر کے چھوڑوں گا ..... میں تجھے تلاش کر کے چھوڑوں گا۔"

وجود میں لاوا سا بھر گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم ان ڈھلانوں کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ وہ بالکل دیوانگی کے سے عالم میں آگے بڑھ رہا تھا اور اسے احساس نہیں تھا کہ رات کی ان تاریکیوں میں اس نے کتنا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ پھر بہت دور اسے روشنیاں نظر آئیں۔ مدھم مدھم روشنیاں۔ اور اسے یاد آ گیا کہ اس دن جب وہ اپنے خیمے سے نکل کر باہر آیا تھا اور ایسی روشنیوں کو دیکھتا ہوا سہائے پور کے جنوبی علاقے میں نکل آیا تھا جہاں کھنڈرات نہیں تھے بلکہ خانہ بدوشوں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔

یہ وہی سمت تھی۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن اس بار ذرا روشنیاں مختلف سی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جگہ جگہ آگ سلگائی گئی ہو۔ پھر اچانک ہی اسے فضا میں گوشت جلنے کی چراند بھی اُڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس کی متجسس نگاہیں ان روشنیوں کا جائزہ لے رہی تھیں اور رفتہ رفتہ اسے احساس ہوتا جا رہا تھا کہ یہ جلتے ہوئے خیمے تھے۔ خانہ بدوشوں کے وہ خیمے جنہیں وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بے شمار خیمے جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ بہت سے آگ میں لپٹے ہوئے تھے اور بہت سوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ غالباً ان خیموں میں انسان بھی جلے تھے۔ کیونکہ اب اٹھنے والے دھوئیں سے گوشت جلنے کی بدبو شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

ہارون کے قدم برق رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ یہ کیا قصہ ہے..... اور پھر وہ ان جلتے ہوئے خیموں کے پاس پہنچ گیا۔ اندازہ بالکل صحیح تھا۔ یہی وہ خیمے تھے جہاں اس نے چندر بدن کو رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہی میں خانہ بدوش رہتے تھے۔ مگر یہ سب کیا ہے ..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اس نے کئی جلے ہوئے انسان دیکھے جن میں سے کچھ کے بدن خیمے سے باہر آ گئے تھے لیکن اب وہ مر چکے تھے۔ وہ خیموں کے درمیان چکراتا ہوا پھر رہا تھا۔ پھر اس کے حلق سے ایک تیز آواز نکلی۔

"چندر بدن ..... چندر بدن ..... میرے سامنے آ ..... میرے سامنے آ چندر بدن

...... کہاں ہے تُو ...... میری افشاں کہاں ہے...... میرا اشعر کہاں ہے......؟ بدبخت عورت! کہیں تُو انہیں یہاں تو نہیں لے آئی تھی؟ چندر بدن! اگر تُو یہاں ہے تو میرے سامنے آ۔''

ہارون رندھی ہوئی آواز میں چیختا ہوا خیموں کے درمیان چکراتا پھر رہا تھا۔
پھر اچانک ہی اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ چونک کر پلٹا۔ لیکن اس کا یہ پلٹنا اس کے لئے زندگی بن گیا۔ چوڑے چمک دار پھل والے کلہاڑے کی ضرب اس کے شانے پر پڑتے پڑتے بچی تھی۔ شائیں کی آواز کے ساتھ کلہاڑا اس کے پاس سے گزر گیا۔

ہارون گھبرا کر پیچھے ہٹا تو اس پر کلہاڑے کا دوسرا وار ہوا اور پھر کلہاڑا بردار پے در پے وار اس پر کرنے لگا۔ وہ کلہاڑا گھما رہا تھا اور ہارون اچھل اچھل کر اس سے بچ رہا تھا۔ ابھی تک وہ صحیح طرح سے اس شخص کی صورت بھی نہیں دیکھ پایا تھا جس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلہاڑا بردار انتہائی برق رفتاری سے حملے کرتا رہا۔ نجانے کہاں سے ہارون کے اندر یہ پھرتی پیدا ہوئی تھی کہ وہ اس کے مسلسل حملوں سے بچ رہا تھا۔ پھر ایک پتھر پیچھے آیا اور وہ اچھل کر اس پر چڑھ گیا۔ کلہاڑا بردار سانس لینے کے لئے رکا تھا۔ تب ہی ہارون نے اس کی صورت دیکھی۔ اور اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔
''گجراج......''

''نہیں چھوڑوں گا...... بھگوان کی سوگندھ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ سب کچھ تباہ و برباد کر دیا تو نے ہمارا...... جیتے جاگتے انسان زندہ جلا دیئے ...... ہمارا قبیلہ ختم کر دیا تُو نے ہمارا۔''

''گجراج! کیا بکواس کر رہا ہے؟ میں نے کیا، کیا؟ میں تو ابھی یہاں آیا ہوں ...... یہ سب کیا ہوا ہے مجھے نہیں معلوم۔''
''دے دے ...... ہماری چندر بدن ہمیں دے دے...... دیکھ ہماری چندر بدن ہمیں دے دے۔ وہ تیری کوئی نہیں ہے۔ جھوٹا ہے تُو ......سدا کا جھوٹا ہے۔ کتنا ظلم کیا ہے تُو نے ہم پر۔''
''تیرا دماغ گھوم گیا ہے گجراج! میں تو ابھی ابھی یہاں آیا ہوں ...... یہ سب کیا ہے ...... میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔''
''پریوار ہے یہ ہمارا ...... سب ہمارے اپنے تھے۔ اتنے سارے مارے گئے،

باقی جان بچا کر بھاگ گئے۔''
''مگر یہ کس نے کیا؟''
''تُو نے ...... تُو نے...... تُو نے......''
''آہ...... لگتا ہے تُو پاگل ہو چکا ہے ...... اس صدمے نے تجھ سے تیرا دماغی توازن چھین لیا ہے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے ...... کچھ بھی نہیں۔ میں تو بس ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں آیا ہوں۔''
''تیرے بدن میں اسی کی خوشبو آتی ہے ...... تیری رگوں میں اسی کا خون دوڑ رہا ہے ...... ہماری اس بستی کو اجاڑنے والا خاقان ہے...... خاقان ...... اس دن چندر بدن ناچ رہی تھی۔ وہ آ گیا تھا تباہی و بربادی پھیلانے۔ اور پھر اس نے چندر بدن کو دیکھا ...... ہم تو اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ اس کی آنکھوں میں کھوٹ آ گئی ہے۔ جن آنکھوں سے اس نے ہماری چندر بدن کو دیکھا تھا ہمیں پتہ چل گیا تھا۔ ہائے وہ ہماری چندر بدن...... چندر بدن کو لے گیا ...... اسی کے لئے آیا تھا وہ...... اسی کے لئے آیا تھا۔ کہنے لگا چندر بدن دے دو۔ وہ میری عیش گاہ میں رہے گی۔ میرے لئے ناچے گی۔ سردار نے کہا کہ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہم اس طرح اپنی بیٹیاں دوسروں کے حوالے نہیں کر دیتے۔ تو وہ غصے میں آ گیا اور اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ سارے قبیلوں کو زندہ جلا دو۔ اور وہ پاپی مشعلیں لے کر دوڑ پڑے۔ آگ لگا دی انہوں نے ہمارے خیموں میں۔ اور خاقان چندر بدن کو اٹھا کر لے گیا ...... لے گیا وہ۔''
گجراج دھاڑیں مارنے لگا۔ اس نے کلہاڑا پھینک دیا تھا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو رہا تھا۔
یہاں تو کہانی ہی بدل گئی۔ ہارون نے سوچا۔ اس کا تو خیال تھا کہ چندر بدن نے افشاں کو غائب کیا ہے پر یہاں تو چندر بدن خود غائب ہو گئی تھی۔ اور وہ خاقان ...... ہارون نے اس رات کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خاقان ایک خطرناک آدمی ہے اور چندر بدن اس کی نگاہوں میں آ گئی ہے۔ لیکن ایسا بھی ہو جائے گا اس نے یہ نہیں سوچا تھا۔ جو کچھ تھا اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ کہیں سے کوئی جھوٹ یا وہم تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔
ہارون نے گجراج کو دیکھا جو اب سسک سسک کر رو رہا تھا۔ کلہاڑا اس نے پھینک دیا تھا۔ ہارون اپنی جگہ سے ہٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا گجراج کے پاس پہنچ

گیا۔

''گجراج! جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے یا جو کچھ تمہارے قبیلے کے ساتھ ہوا ہے وہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے۔ میں تمہارے دکھ پر دکھی ہوں۔ لیکن تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے مجھ پر حملہ کیوں کیا؟ یہ بات بھی میری عقل سے باہر ہے۔ تم نے ایک عجیب بات کہی کہ میرے بدن سے خاقان کے خون کی بو آتی ہے...... میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ خاقان سے میرا کوئی تعلق ہو گا۔ میں نے تو اس رات پہلی بار ان گھڑ سواروں کو دیکھا جب چاند کی روشنی میں چندر بدن یہاں ان خیموں کے سامنے والے میدان میں رقص کر رہی تھی۔ میں نے پہلی بار خاقان کو دیکھا تھا۔ اس کی باتیں سنی تھیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے گجراج! جو تم نے کہی۔ لیکن بہر حال بہت سی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں میرے دوست! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ مجھے بتا تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ یہ سب کیا ہے! میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا ہے۔ میں تو اس رات بھی حیران تھا جب چندر بدن کو چتا میں جلایا جا رہا تھا۔ بڑی عجیب عجیب کہانیاں ہو رہی تھیں۔ گجراج! میں بالکل بے قصور ہوں۔ کچھ بھی نہیں جانتا ہوں۔ میں تو بیوی بچے والا ہوں۔ میری بیوی اور بچہ غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کہیں چندر بدن نے تو ایسا نہیں کیا؟ میں تو انہی کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ چندر بدن تو خود بھی غائب ہو گئی ہے۔ گجراج! کیا تم میری بیوی اور بچے کی تلاش میں میری مدد کر سکتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں کر سکتا میں...... آہ...... کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے میری چندر بدن واپس دے دو...... مجھے میری چندر بدن واپس دے دو۔''

''گجراج! وہ تمہاری ہے۔ میں نے تو اس رات اس کی زندگی بچانے کے لئے اس کے کہنے کے مطابق اسے اپنی پتنی سویکار کر لیا تھا۔ میری بیوی تو افشاں ہے۔ میں تو صرف اسی کے لئے سرگرداں ہوں۔''

''میری مدد کرو...... آہ میری مدد کرو...... اگر تم میری مدد کرو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا...... میری چندر بدن اس سے لے کر مجھے دے دو۔''

ہارون نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر بولا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ خاقان چندر بدن کو کہاں لے گیا ہے؟''

''اپنی حویلی لے گیا ہے وہ...... سیدھا اپنی حویلی لے گیا ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے وہ۔''

''کیا تم اس کی حویلی کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''لو...... کون نہیں جانتا اس کی حویلی کے بارے میں۔''

''مجھے بتا سکتے ہو اس کی حویلی کہاں ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں...... سہائے پور کے آخری گوشے میں رہتا ہے وہ۔''

''مجھے وہاں تک لے جا سکتے ہو؟''

''ہاں لے جا سکتا ہوں۔''

''چلو پھر مجھے دکھاؤ وہ جگہ۔ ہو سکتا ہے چندر بدن کے حصول میں، میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

''آؤ میرے ساتھ......'' گجراج نے کہا۔

ایک لمحے تک ہارون سوچتا رہا۔ بے شک بات بالکل مختلف ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے گجراج کی مدد سے کسی طرح افشاں کا بھی پتہ چل سکے۔ یہ پراسرار کردار تھے جو اچانک ہی ہارون کے اردگرد پھیل گئے تھے۔ وہ خود بھی توجیہہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب کون ہیں اور ان کا اس کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ لیکن بہر حال اب جس جال میں پھنسا تھا اس میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ چنانچہ وہ گجراج کے ساتھ چل پڑا۔ جلتے ہوئے خیموں میں انسانی لاشیں سلگ رہی تھیں اور گوشت جلنے کی بدبو فضا میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

خاقان بہت ظالم آدمی تھا جس نے ان بے چارے خانہ بدوشوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ گجراج آنسو پونچھتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔ بڑا وحشی سا انسان معلوم ہوتا تھا۔ بالوں سے اس کا پورا بدن بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ چہرے پر بھی بال اُگے ہوئے تھے جس سے وہ تھوڑی سی غیر انسانی شخصیت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔

اس کے بعد خاصا لمبا سفر طے کیا گیا۔ پھر ہارون نے ایک دریا دیکھا...... دریا کیا ندی تھی جو اس کے بائیں سمت سبک روی سے بہہ رہی تھی اور آگے جا کر ایک دائرے کی شکل میں مڑ جاتی تھی۔ سامنے ہی خوبصورت باغات نظر آ رہے تھے جن سے اٹھنے والی پھلوں کی بھینی بھینی خوشبو ماحول کو انتہائی خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ یہ جگہ بڑی آئیڈیل تھی۔ ہارون کو حیرت ہونے لگی کہ سہائے پور کے اطراف کے اتنے

سارے چکر لگانے کے باوجود وہ اس علاقے تک کیوں نہیں آیا۔

باغوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ندی بھی ان کے درمیان بل کھاتی ہوئی ایک طرف مڑ گئی تھی۔ پھر وہ لوگ باغات کے آخری سرے تک پہنچے اور اس کے بعد انہیں وہ چہار دیواری نظر آنے لگی جو ایک انتہائی عظیم الشان عمارت کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ یہ لوگ چونکہ کسی قدر بلندی پر تھے اس لئے یہاں سے اس احاطے کے اندر کا جائزہ لے سکتے تھے۔ مخمل جیسی گھاس کا عظیم الشان فرش پھیلا ہوا تھا اور اس کے بعد وہ خوبصورت حویلی نظر آ رہی تھی جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ہی مسلح پہرے دار گشت کر رہے تھے۔ بہت سے پہرے داروں کا غول حویلی کے دروازے کے پاس بھی موجود تھا۔ ہارون حیرت اور دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ ایسے مناظر فلموں میں تو نظر آ سکتے ہیں عام انسانی زندگی میں ایسی کوئی جگہ اب بھی موجود ہو گی یہ بات باعث حیرت تھی۔

بہرحال دولت نے سارے کام کر ڈالے تھے۔ یہ لوگ تہذیب کی اس دنیا سے دور اپنی دنیا الگ بسائے ہوئے ہیں۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں بھی نہیں ہو گی۔ گجراج ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر بولا۔

''یہ ہے خاقان کی حویلی۔''

''بڑی خوبصورت جگہ ہے۔''

''ہم بنجارے تو ایسی جگہ خواب میں ہی دیکھ سکتے ہیں۔''

''مگر ایک بات بتاؤ گجراج...... کیا تمہیں یقین ہے کہ خاقان ہی چندر بدن کو یہاں لایا ہے؟''

''تم یقین کی بات کرتے ہو۔ بہت سے لوگ خیموں سے نکل کر بھاگ گئے۔ ان میں، میں بھی تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''ہوں...... جگہ خاصی مشکل ہے۔ سوچنا پڑے گا کہ اندر کیسے داخل ہوا جائے۔''

''میری مدد کرو مہاراج...... میری مدد کرو...... میری چندر بدن مجھے واپس دلوا دو۔ کتنے کٹھن راستے طے کروں میں...... کیسے کیسے کٹھن راستے طے کروں؟''

''گجراج! مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گا۔ اس وقت میں خود بھی بہت پریشان ہوں۔''

''میں کیا کروں...... ہے بھگوان میں کیا کروں؟''

''اٹھیں گے نہیں...... سورج چڑھ آیا ہے۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔'' اچانک ہی ہارون کے کانوں میں کامران کی آواز ابھری اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کامران کو دیکھ رہا تھا۔ کامران نے کہا۔

''اٹھیں...... نہالیں۔ طبیعت بہتر ہو جائے گی۔''

''کک...... کک...... کامران! میں...... میں...... وہ حویلی...... وہ...... وہ......''

''خواب دیکھ رہے تھے نا...... زور زور سے کہہ رہے تھے کہ میں پریشان ہوں، میری افشاں گم ہو گئی ہے۔''

''تو یہ سب خواب تھا......؟''

''اٹھیں...... بھوکے بھی ہوں گے۔ پلیز! میری بے تکلفی کو معاف کر دینا۔ میں اس وقت عجیب سے جذبوں کا شکار ہوں۔''

ہارون ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ گیا تھا۔ وہ خواب زندگی کا سب سے انوکھا خواب تھا جسے وہ خواب میں بھی خواب تصور نہیں کر سکتا تھا۔

طاہر علی کو وہیں چھوڑ کر وہ کافی دیر تک سڑکوں پر چکراتی رہی۔ بظاہر تو اس بات کے امکانات بالکل نہیں تھے کہ طاہر علی دوبارہ اس کے تعاقب میں آ سکیں۔ ان کی گاڑی کا خانہ خراب کر آئی تھی وہ۔ لیکن پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ کافی دیر تک سڑکوں پر چکراتی رہی اور آخر کار اس نے اس کچی آبادی کا رخ کیا۔ وہ براہِ راست وہاں نہیں جاتی تھی تاکہ بابو خاں کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بابو خاں نے خود ہی اس سے درخواست کی تھی اور کہا تھا۔

''بی بی صاحب! یہ جو چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں رہنے والے لوگ ہوتے ہیں ناں ان کے دل میں تجسس حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ہر چیز کے بارے میں جان لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ آپ اگر میرے پاس میرے گھر آؤ گے تو یہ لوگ آپ کو دیکھ کر سوچیں گے کہ آپ یہاں کیوں آتے ہو اور ہو سکتا ہے کوئی تجسس کا مارا میرے گھر تک پہنچ جائے۔ یہ اچھا نہیں ہوگا۔ آپ ایک کام کیا کرو، میں ایک جگہ بتائے دیتا ہوں آپ کو۔ وہاں گاڑی روک کر مجھے بلا لیا کرو۔ میرے پاس موبائل ہے۔ آپ مجھے نمبر مار دیا کرو۔''

''ٹھیک ہے.....''

وہ جگہ اس کچی آبادی سے کچھ فاصلے پر ایک نالے کے پُل کے پاس سے گزرتی تھی۔ یہیں پر رک کر صفورہ انتظار کر لیا کرتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد اس نے بابو خاں کو موبائل پر کال کیا۔

''جی بیگم صاب؟''

''میں تمہارا یہاں انتظار کر رہی ہوں۔''

''ابھی پہنچا جی.....'' بابو خاں نے جواب دیا اور صفورہ نے موبائل بند کر دیا۔ پھر وہ کار کے اگلے حصے سے ٹک کر بابو خاں کا انتظار کرنے لگی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بابو خاں اسے ایک سائیکل پر آتا ہوا نظر آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ صفورہ کے پاس

پہنچ گیا۔

''سلام بی بی صاب!''

''کیا حال ہے تمہارا بابو خاں؟''

''بی بی صاب! سب ٹھیک ہے۔''

''مہمان کیسے ہیں؟''

''آرام سے ہیں جی..... کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''کچھ بات کرتے ہیں؟''

''بالکل نہیں..... خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی صورت تکتے رہتے ہیں۔''

''اس دوران کوئی تمہاری طرف متوجہ تو نہیں ہوا؟''

''کون.....؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے تمہارے ملنے جلنے والے بھی تو آتے ہوں گے تمہارے پاس۔''

''بیگم صاب! ہم برے لوگوں کے کچھ اصول بہت اچھے ہوتے ہیں۔ رشتے، ناتے، دوستیاں، گپ شپ کرنے کے لئے ہمارے پاس بہت سے ٹھکانے ہوتے ہیں۔ اڈے بنے ہوتے ہیں ہمارے جی۔ وہیں ہم سب ایک دوسرے سے ملتے ہیں، بیٹھتے ہیں، بات کرتے ہیں۔ پھر ان دنوں تو میری ڈیوٹی ہی الگ ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں عام طور سے گھر پر ہی رہتا ہوں۔''

''میرا مطلب ہے کہ کسی کو ان کے بارے میں کچھ علم تو نہیں ہوا؟''

''کیسے معلوم ہوتا جی..... ہم پیسے کس بات کے لیتے ہیں۔ پر ایک سوال ہم آپ سے ضرور کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں..... بولو۔''

''کتنے عرصے تک یہ لوگ ہمارے مہمان رہیں گے؟''

''کیوں، گھبرا رہے ہو..... اُکتا رہے ہو؟''

''نہیں..... بالکل نہیں۔ جب تک آپ ہمیں پیسے دیتی رہیں گی نہ ہم اکتائیں گے نہ گھبرائیں گے۔ لیکن ایک منصوبہ ضرور ہونا چاہئے۔ پتہ چلنا چاہئے ہمیں کہ کتنے عرصے تک یہ ہمارے پاس رہیں گے۔''

''بہت زیادہ نہیں، مہینہ، دو مہینہ بس۔ اس سے کم بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا

ہے کہ ایک ہفتے سے زیادہ نہ رہیں۔''
''ہوں...... ٹھیک ہے...... بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا جی! بات یہ ہے کہ اپنی ذمہ داری بھی تو پوری کرنی ہے نا...... ہوسکتا ہے کبھی کوئی آ ہی جائے۔ کچھ بتانا تو پڑتا ہی ہے۔''
''ہاں...... سمجھ رہی ہوں میں تمہاری بات۔ بہرحال احتیاط سے رہنا۔ کام جاری رکھو۔ میں بہت جلد کچھ نہ کچھ کروں گی۔''
''آپ اس کی فکر مت کرو جی۔ ہم آرام سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔''
''ان سے بات کرنے کی بھی کوشش کرو۔ تاکہ مجھے ان کے اندر کا حال معلوم ہو۔ میں دیکھوں کہ اب وہ کس انداز میں سوچ رہے ہیں۔''
''ٹھیک ہے جی...... ایسا بھی کرلیں گے۔'' بابو خان نے جواب دیا۔
صفورہ نے کچھ پیسے نکال کر بابو خان کو دیئے تو بابو خان نے انہیں جلدی سے اچک کر اپنے لباس میں رکھ لیا۔
''شکریہ جی...... بڑا شکریہ۔''
''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' صفورہ نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ لیکن کافی لمبا سیلف لگانے کے باوجود گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ صفورہ بہت دیر تک کوشش کرتی رہی، پھر بابو خان سے بولی۔
''گاڑی کے بارے میں کچھ جانتے ہو تم؟''
''بس اتنا جی کہ گاڑی گاڑی ہوتی ہے۔ چلتی ہے...... اور چلتی کا نام گاڑی ہوتا ہے۔''
''مذاق کر رہے ہو مجھ سے؟''
''نہیں جی، توبہ توبہ۔''
''گاڑی کے بارے میں کچھ جانتے ہوتے بیگم صاب جی تو آپ کو کچھ بتاتے۔''
''کوئی مکینک ہے آس پاس؟''
''یہاں کوئی مکینک اپنی تقدیر کیوں پھوڑے گا جی۔ ان کچی بستیوں میں گاڑی نہیں ہوتی ہیں۔ اور جب گاڑیاں نہیں ہوتیں تو مکینک بھی نہیں ہوتے۔''
''زیادہ چرب زبانی سے کام مت لو۔ کہیں سے جا کر ایک مکینک لے کر آؤ۔

بلکہ یوں کرو مجھے ایک ٹیکسی لادو۔ میں کسی مکینک کو لے آؤں گی۔ گاڑی یہیں بند کئے دیتی ہوں۔''
''ٹیکسی مل جائے گی جی...... ابھی لاتے ہیں۔'' بابو خان نے کہا اور سائیکل پر سوار ہو کر گنگناتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ جیب میں رقم آ جائے تو ہونٹوں پر گنگناہٹیں آ ہی جاتی ہیں۔
مین سڑک سے وہ ایک ٹیکسی لے آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک جوان اور اوباش سی شکل کا آدمی تھا۔ کالے رنگ کے ہونٹ بتاتے تھے کہ چرسی ہے۔ صفورہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ دروازے وغیرہ اس نے لاک کر دیئے تھے اور بابو خان سے اس نے کہا تھا کہ خیال رکھے۔ مکینک کو یہاں کا پتہ بتا کر یہاں بھیج دے گی۔ وہ گاڑی ٹھیک کر کے اس کے گھر پہنچا دے گا۔
ٹیکسی ڈرائیور صفورہ کو لے کر چل پڑا تھا۔ صفورہ نے اسے پتہ بتایا اور بولی۔
''تمہیں یہ پتہ معلوم ہے نا؟''
''جی......''
''چلو......'' صفورہ بے شک خود گاڑی لئے دوڑتی پھرتی تھی لیکن پورے شہر سے اس کی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ بس جن جگہوں کے بارے میں معلومات تھیں انہی کے بارے میں جانتی تھی۔ ٹیکسی سڑک پر پہنچی اور ایک سمت دوڑنے لگی۔
کدھر سے چل رہے ہو ڈرائیور؟''
''بیگم صاحب جی! آپ نے جو پتہ بتایا ہے اسی پر جا رہا ہوں۔''
''مگر یہ راستہ تو کسی اور طرف جاتا ہے۔''
''نہیں جی...... آگے جا کر گھوم جاتا ہے۔ یہ نمک منڈی والا راستہ ہے۔''
صفورہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگئی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب اچانک ہی ڈرائیور نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر اتار دی تو صفورہ نے چونک کر سامنے دیکھا۔ خیالات میں ڈوبا ہونے کی وجہ سے وہ اب تک راستے پر توجہ نہیں دے سکی تھی۔ اب جو اس نے سامنے دیکھا تو اسے عجیب و غریب منظر نظر آیا۔ دور دور تک نمک کے گودام پھیلے ہوئے تھے۔ سمندر کا علاقہ تھا اور یہاں آمد و رفت بالکل نہیں تھی۔ گوداموں کے علاقے بھی سنسان پڑے ہوئے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر پہاڑی چٹانیں تھیں۔ ذیلی سڑک نمک کے گوداموں کی وجہ سے ایک مخصوص حصے تک گئی تھی اور اس

کے بعد ختم ہوگئی تھی۔

''یہ...... یہ...... یہ کہاں جارہے ہو تم؟''

''وہ بیگم صاب جی! ادھر ہمارا گھر ہے...... کچھ سامان لینا تھا۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا...... یہاں تو کوئی گھر نہیں ہے۔''

''آپ دیکھو جی ہمارا گھر...... طبیعت خوش ہو جائے گی آپ کی۔'' ڈرائیور نے شیطانی لہجے میں کہا اور صفورہ ایک لمحے کے لئے ڈر سی گئی۔ کچھ دیر کے لئے وہ بھول گئی تھی کہ وہ پراسرار قوتوں کی مالک ہے۔ اس دوران ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار کافی تیز کر دی تھی۔ اور پھر وہ اسے ان چٹانوں کی طرف لیتا چلا گیا۔ صفورہ نے ایک لمحے کے اندر اندر اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ دل ہی دل میں اس نے کہا۔

''بیٹے! اچھا ہے، تمہیں سبق دینے کے لئے اس وقت میں یہاں موجود ہوں۔ اگر کوئی بیچاری اور ہوتی تو شاید اپنی عزت آبرو گنوا بیٹھتی۔ لیکن اب میں تمہیں ایسا سبق دوں گی کہ تم بھی زندگی بھر یاد رکھو گے۔''

ٹیکسی ڈرائیور شیطانی انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ ایک پہاڑی چٹان کی آڑ میں رک گیا اور ہنس کر بولا۔

''بی بی صاحب! کیسا جگہ ہے؟''

''جگہ تو بہت اچھی ہے۔''

''ابی میرے کو معاف کرنا...... بس آپ پسند آ گئے مجھے۔ جہاں حکم کرو گے پہنچا دوں گا۔ ایک پیسہ کرائے کا نہیں لوں گا۔''

''واقعی......؟''

''ہاں...... اور جب بھی تم مجھے آواز دو گے میں تمہارے پاس آ جاؤں گا بی بی صاحب! آ جاؤ، نیچے اتر آؤ۔''

''ہوں......'' صفورہ نے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کے تعاون سے بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔

''ابی میں آپ کے لئے کوئی بہت اچھی چیز تو نہیں دے سکتا پر کھانا میری طرف سے ہو گا۔''

''اچھا...... کھانا بھی کھلاؤ گے مجھے؟''

''آپ جو کہو گے وہ کروں گا۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

''ایک چیز دکھاتی ہوں تمہیں۔'' صفورہ بولی۔

''آپ تو سر سے پاؤں تک چیز ہی چیز ہو شیزادی صاب۔ دکھاؤ۔'' اس نے کہا اور صفورہ نے اپنے بازو کھول لئے۔ پھر وہ اپنے بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگی تو ڈرائیور بولا۔

''یہ کام میرے کو کرنے دو۔''

''کر لینا...... کر لینا...... ایک منٹ تو رکو۔'' صفورہ نے کہا اور ٹیکسی ڈرائیور اس کے بازوؤں کو دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ہی اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے لڑکی کے بازوؤں سے کوئی چیز ٹپک رہی ہو۔ لیکن یہ ٹپک تو نہیں رہی تھی۔ یہ تو چیونٹی جیسی چیزیں تھیں اور سینکڑوں کی تعداد میں اس کے بازوؤں پر دوڑ رہی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے حیرت سے ان چیونٹیوں کو دیکھا اور بولا۔

''شہزادی صاب! یہ چیونٹیں آپ کے ہاتھ پر کاٹے گا۔''

''یہ چیونٹی تو نہیں ہے۔ ذرا دیکھو۔''

صفورہ نے بازو آگے کئے تو ٹیکسی ڈرائیور آگے بڑھ آیا اور پھر اسے وہ انسانی شکلوں والی چیونٹیاں نظر آ گئیں۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''یہ...... یہ...... یہ کیا ہے؟''

''یہ میرے بچے ہیں...... میرے ننھے ننھے بچے...... میرے پیارے بچو! ذرا اس آدمی کو دیکھو جو دھوکے سے مجھے یہاں لے آیا ہے۔''

اور چیونٹے پھرا مار کر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دوڑ پڑے۔ ٹیکسی ڈرائیور کسی قدر نروس ہو گیا تھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ چیونٹے اتنے پھرتیلے تھے اور دو پیروں سے انسانوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔ یہی بات اس کے لئے ناقابل یقین تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے بدن پر چڑھ گئے اور اب کے بعد انہوں نے اسے نوچنا شروع کر دیا۔ ان کے دانت ٹیکسی ڈرائیور کے بدن میں پیوست ہو رہے تھے اور وہ گوشت کی ننھی ننھی بوٹیاں نوچ کر واپس آ رہے تھے۔ ان کی بے شمار تعداد صفورہ کے بازوؤں سے نمودار ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ پھرتی سے دوڑتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کے جسم کے ہر کھلے ہوئے حصے پر پہنچ گئے تھے۔

''ارے باپ رے باپ...... بب...... بچاؤ...... مر جاؤں گا......'' ٹیکسی ڈرائیور

نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے پاؤں اس کا ساتھ نہیں دے سکے۔ چیونٹے اب اس کے پورے بدن میں چمٹتے جا رہے تھے۔ پورا بدن خون میں ڈوب چکا تھا۔
صفورہ نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا اور بولی۔

''جتنا تمہاری قسمت میں ہوگا تمہارا گوشت بچ جائے گا۔ ورنہ چھٹی تو ہو ہی گئی تمہاری۔'' یہ کہہ کر وہ ٹیکسی میں جا بیٹھی۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور پھر اسے واپس موڑ کر چل پڑی۔

ٹیکسی ڈرائیور حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا لیکن وہ چیونٹے اس کے بدن کے بہت سے حصوں کو کھا چکے تھے اس کا بدن کھوکھلا ہوا جا رہا تھا۔

ٹیکسی دور نکل آئی۔ کافی فاصلے پر پہنچنے کے بعد صفورہ نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ وہ جگہ اب بہت پیچھے رہ گئی تھی اور اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد صفورہ سڑک پر پہنچ گئی۔ اس نے ٹیکسی سڑک سے نیچے ہی کھڑی کر دی تھی اور اتر کر پیدل ہی چل پڑی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اسے ایک اور ٹیکسی نظر آئی۔ اس نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی پھر اس نے کہا۔

''چلو.....''

''جی میم صاحب.....'' ٹیکسی کے ڈرائیور نے ادب سے گردن خم کر کے کہا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

❁

اس خواب نے بھی ہارون کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ وحشتیں آسمان تک پہنچتی جا رہی تھیں۔ کامران اس کی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک اچھا دوست تھا وہ اور ہر طرح اپنے دوست کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اب فیصلے ہارون سے نہیں کرانے تھے بلکہ خود اپنے طور پر یہ فیصلے کرنے تھے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ ہارون کے مسئلوں کو پہلے حل کر لے۔

ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''ہمیں چلنا ہے.....''

ہارون نے بھاری آنکھوں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''کہاں.....؟''

''واپس..... میں اوور سیئر کو سارے معاملات سمجھائے دیتا ہوں۔ ظاہر ہے ہم

اپنی مشکل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

''مگر کامران تم.....''

''نہیں ہارون صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آپ کو اپنا باس سمجھتا ہوں لیکن آپ نے خود غلطی کی ہے مجھے اپنا دوست کہہ کر۔ دوستی تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے میرے دوست! بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اتنی بڑی مشکل کا شکار ہو جائیں اور میں یہاں اپنے فرائض پورے کرتا رہوں۔ اور پھر ویسے بھی کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم آفس چلتے ہیں۔''

کامران نے ہارون کی ایک نہ سنی اور جیپ میں اسے لے کر چل پڑا۔ اوور سیئر کو اس نے باقی کام سمجھا دیئے تھے۔ ہارون اب کچھ نڈھال نڈھال سا نظر آنے لگا تھا۔ کامران نے کہا۔

''رات کو بہت دیر تک سوتے رہے ہو گے۔''

''پتہ نہیں کامران! ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں یار۔ تقدیر کا ستارہ گردش میں آ گیا ہے۔ میں تمہارے خلوص کو کسی بھی طور نہیں جھٹلا سکتا۔ لیکن یہ بہت بڑی سچائی ہے کہ اب میں زیر حساب ہوں۔ تقدیر کے زیر عتاب۔ میرے بھائی! ایسا کرو مجھے اپنی آگ میں جلنے دو۔ کبھی نہ کبھی تو یہ آگ بجھے گی۔ میں تمہارے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔''

''اگر ڈائیلاگ ہی بولنا ہے تو چلو۔ تم اپنے ڈائیلاگ بول چکے۔ اب میرے بھی سن لو۔ بات یہ ہے کہ میں روایتی قسم کا بے وقوف ہوں۔ پتہ نہیں یہ بات کسی نے مجھے بتائی تھی یا نہیں، مجھے یاد نہیں۔ لیکن یہ ہے کہ دوستی کی آگ میں جل کر انسان امر ہو جاتا ہے۔ خوشگوار ماحول اور خوبصورت حالات میں تو ہر شخص ہی دوستی نبھا لیتا ہے لیکن سنا یہ گیا ہے کہ اگر حالات خراب ہوں تو دوست کا ساتھ چھوڑ دینا دنیا کی سب سے بری بات ہے۔ کیا سمجھے۔ میں تمہارے ساتھ اس آگ میں جلنا چاہتا ہوں۔ نتیجہ کچھ بھی ہو اور یہ بھی سن لو کہ اگر مجھے تمہاری مشکلات میں ساتھ دیتے ہوئے زندگی بھی کھونا پڑے تو شوق سے کھو دوں گا۔ وعدہ ہے۔''

کامران نے مردانہ وار کہا اور ہارون اسے دیکھنے لگا۔ کامران ہنس پڑا تھا۔

''کیسا ڈائیلاگ تھا؟''

''نہیں..... یہ ڈائیلاگ نہیں، زندگی تھی۔''

"تھی ناں...... تو پھر میرے بھائی مجھے موت کی جانب کیوں دھکیل رہے ہو؟ میں تمہاری مشکل میں تمہارا ساتھ دے کر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے۔"

"اب یہ جذباتی باتیں مت کریں۔ جو ہوا ہے وہ تو ہوا ہی ہے۔ ہم اس سے شکست مان کر نہیں بلکہ مردانہ وار ان حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ ایسی تیسی ان بری روحوں کی۔"

"رات کو میں نے خواب دیکھا تھا۔"

"سنائیں...... سنائیں......"

"کامران وہی میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں۔ میں اسے خواب اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ صبح کو تم نے مجھے جگایا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم نے مجھے رات کو دیکھا تھا؟"

کامران جو جیپ ڈرائیو کر رہا تھا ایک دم سے اس کا ہاتھ اسٹیرنگ پر لہرا گیا۔ اس نے چونک کر ہارون کو دیکھا اور بولا۔

"مطلب......؟"

"رات کو تو تمہاری آنکھ نہیں کھلی تھی؟"

"دو بار......" کامران نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں...... حیران کیوں ہو؟"

"آپ کے سوال پر۔"

"کون سے سوال پر۔"

"یہی کہ کیا میں نے رات کو آپ کو دیکھا تھا۔"

"تو پھر......؟"

"ہارون صاحب دو دفعہ میں رات کو اٹھا اور بس اس لئے کہ کہیں آپ بے چین نہ ہوں، پریشان نہ ہوں۔ میں نے آپ کے خیمے میں جھانکا۔

"پھر......؟" ہارون نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

"دونوں بار آپ اپنے خیمے میں موجود نہیں تھے۔"

"نہیں تھا؟"

"ہاں...... خدا کی قسم نہیں تھے۔ میں نے یہ سوچا کہ شاید باہر کسی ضرورت سے نکلے ہوں گے۔ خود بھی کہولت میں گرفتار تھا۔ چنانچہ جا کر سو گیا۔"

"کامران!" ہارون نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

"اس سوال میں کوئی بات تھی ہارون!"

"کیا بات تھی؟"

"میرا خواب۔"

"پلیز مجھے بتاؤ۔"

"کامران! میں نے بالکل خواب اور بے خوابی کے عالم میں خیمے سے باہر نکل کر باہر کے ماحول کو دیکھا۔ اب یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ خواب نہیں سچائی تھی۔ میں ڈھلانوں کی جانب بڑھ گیا۔ اور پھر میں نے سہائے پور کی جانب نگاہ دوڑائی۔ میں اس طرف چل پڑا۔ چلتا رہا۔ مجھے چندر بدن کی تلاش تھی۔ اور پھر بہت دور سے مجھے روشنیاں نظر آئیں۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں نے خانہ بدوشوں کی ایک بستی دیکھی تھی جہاں چندر بدن رقص کر رہی تھی۔ وہاں اس بستی میں، میں بھی پہنچ گیا تھا اور چندر بدن کے رقص میں گم ہو گیا تھا۔ پھر کسی طرف سے کچھ گھوڑے سوار آئے۔ ان میں ایک شخص نمایاں تھا۔ اسے خاقان کے نام سے یاد کیا جا رہا تھا۔ اور پھر اس شخص نے خانہ بدوشوں کے سردار سے بات کی اور چندر بدن کی جانب متوجہ نظر آیا۔ اب میں دوبارہ وہاں پہنچا تو وہ خیمے میرا مطلب ہے وہ جو روشنی نظر آ رہی تھی وہ ان جلتے ہوئے خیموں کی تھی۔ خانہ بدوشوں کے خیموں میں آگ لگا دی گئی تھی اور وہاں سے گوشت کی بدبو اٹھ رہی تھی۔ جلتے ہوئے گوشت کی بدبو۔ میں نے ان خیموں کے درمیان بہت سے جلتے ہوئے خانہ بدوش دیکھے اور انہی کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ اچانک ہی کسی نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل والا کلہاڑا تھا۔ میں نہیں کہتا کہ یہ میری پھرتی تھی یا کوئی پراسرار غیر مرئی قوت جو میرے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ میں اس خوفناک حملہ آور سے بچتا رہا۔ وہ گجراج تھا۔"

"گجراج......؟"

"ہاں...... میں گجراج کے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"ہاں...... ہاں...... میں سمجھ گیا۔" کامران نے کہا۔

"گجراج نے مجھ پر بہت سے حملے کئے اور آخر کار تھک گیا۔ تب میں نے اس سے پوچھا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس نے کہا کہ میرے بدن سے خاقان کی بو آتی ہے۔ میرے خون میں اس کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ اسی کی وجہ سے حملے

کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ خاقان نے چندر بدن کو مانگا تھا۔ سردار نے انکار کیا تو خاقان نے خیموں میں آگ لگا دی اور چندر بدن کو لے کر چلا گیا۔ گجراج اپنی محبت کی داستان سناتا رہا اور پھر وہ وقت آ گیا جب تم نے مجھے جگایا۔ کامران! یقین کرو یہ کہانی مجھے خواب کی کہانی نہیں معلوم ہوتی۔ مجھے اپنی جسمانی کیفیت کا احساس ہے۔ میرے بدن کی تھکن مجھے بتا رہی ہے کہ میں یہاں نہیں تھا، کہیں اور تھا۔''

کامران نے جیپ کو بریک لگا دیئے اور ہارون چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیوں خیریت..... کیا بات ہے؟''

''سر! تھوڑا سا وقت نکال لیں گے؟''

''کامران میرے دوست! پہلے تو میں تمہیں یہ کہوں گا کہ تم مجھے سر اور جناب وغیرہ نہ کہا کرو۔ جب دوست کہا ہے تو ان تکلفات میں نہ پڑو۔ تم میرا نام لے سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے دوست! اب مجھے بتاؤ کہ تم تھوڑی تاخیر برداشت کر لو گے؟'' کامران نے کہا۔

''کیا مطلب.....؟''

''ہم ادھر ہی چلتے ہیں جہاں تم نے یہ منظر دیکھا تھا۔''

''تو پھر.....؟''

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔ صورتحال کا ذرا جائزہ لیتے ہیں۔ پلیز میری یہ بات مان لو۔ نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں وہاں جا کر حالات کا جائزہ لوں۔''

''چلو.....'' ہارون نے پھیکے سے لہجے میں کہا اور کامران نے جیپ واپس موڑ دی۔ البتہ کیمپ کی طرف جانے کی بجائے اس نے ایک لمبا راستہ اختیار کیا اور انہی ڈھلانوں میں پہنچ گیا۔ سہائے پور کے کھنڈرات تمام ہیبت ناکی کے ساتھ خاموش کھڑے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ کامران انکے درمیان میں سے جیپ گزارنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''ہمیں اس راستے پر چلنا ہے جو تمہارے بتائے ہوئے خیموں کے شہر کی سمت جاتا ہے۔''

''ہاں..... بائیں سمت جنوبی سہائے پور کا علاقہ تھا وہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔''

ہارون نے کہا اور کامران اس طرف جیپ دوڑانے لگا۔ خاصی دیر کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے۔ کامران نے آہستہ سے کہا۔

''کس طرف؟''

''ادھر..... ادھر آ جاؤ۔'' ہارون نے کامران کی رہنمائی کی اور پھر وہ اس جگہ پہنچ گئے۔ قرب و جوار کا ماحول وہی تھا لیکن نہ وہاں خیمے تھے نہ خیموں کی راکھ۔ ہارون کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہی جگہ ہے کامران..... یہی جگہ ہے۔''

''مگر یہاں.....''

''ہاں..... کچھ نہیں ہے۔''

''آؤ..... ذرا دیکھیں۔'' کامران جیپ کا انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور اس کے بعد وہ اس پورے علاقے کے ایک ایک حصے کا جائزہ لینے لگے۔ مگر کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی نشان نہیں تھا۔ بالکل سادہ سا ماحول تھا۔ وہ ایک ایک چپے کا جائزہ لیتے رہے۔ ہارون نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

''یہی جگہ ہے..... مجھے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ مگر یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ آہ..... پتہ نہیں کیا ہے یہ سب کچھ یار! میں نہیں جانتا۔''

کامران نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دور دور تک نگاہیں دوڑانے کے بعد کامران نے کہا۔

''آؤ، چلتے ہیں۔''

ہارون خاموشی سے اس کے ساتھ مڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی جیپ واپسی کا سفر طے کر رہی تھی۔ راستے بھر خاموشی رہی۔ ہارون تو خیر الجھا ہوا تھا ہی لیکن کامران کا ذہن بھی صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ کیسا خواب تھا جو حقیقت سے قریب تھا۔ ہو سکتا ہے وہ صرف خواب ہی ہو۔

بہرحال فاصلے طے ہوتے رہے۔ آخر کار وہ شہری آبادی میں داخل ہو گئے۔ کامران دفتر پہنچ گیا تھا۔ ہارون بھی ساتھ تھا۔ افسر اعلیٰ کے سامنے کامران نے کہا۔

''جناب عالی! صورتحال شاید آپ کے علم میں آ گئی ہو۔ ہارون صاحب کے ساتھ بڑے عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں۔''

''بھئی اوورسیئر نے مجھے ٹیلی فون کر کے بتایا تھا کہ جس جگہ یہ کام ہو رہا ہے

وہاں کے واقعات کچھ پراسرار ہیں۔ خاص طور سے ہارون کی پریشانی کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل معلوم ہوئی تھی لیکن زیادہ نہیں۔''

''جی سر! پہلی بات تو یہ کہ وہاں ایک مزار دریافت ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سہائے پور میں بہت ہی پراسرار قسم کے واقعات پیش آئے ہیں۔''

اچانک ہی ہارون کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس وقت اس کے دماغ سے اس حویلی کا خیال بالکل نکل گیا تھا جہاں گجران اسے لے گیا تھا۔ سہائے پور کے اس علاقے میں وہ حویلی ہارون نے بڑی تفصیل کے ساتھ دیکھی تھی لیکن اس وقت جب وہ خانہ بدوشوں کے خیموں کا جائزہ لے رہے تھے حویلی کا تصور ہی ہارون کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ بہت بڑی بات تھی۔ لیکن کیا کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی کوئی طلسمی عمل ہی ہو۔ افسر اعلیٰ نے ساری تفصیل سننے کے بعد افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر ہارون! ہم ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ جس طرح چاہیں اپنا کام کریں۔ وہاں دوسرے لوگوں کا بھی بندوبست کیا جا سکتا ہے اور اگر فوری طور پر ہمیں آپ کا نعم البدل مل بھی جائے تو وہاں کام بند کر دیں گے۔ جب آپ کے مسائل حل ہو جائیں تو آپ دیکھ لیجئے گا۔''

''سر! آپ کے اس تعاون کا میں انتہائی شکر گزار ہوں۔ میں تو آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میں اب یہ نوکری نہیں کر سکوں گا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا وقت اس میں لگ جائے۔''

''آپ فکر کیوں کرتے ہیں...... ہمیں ہماری ذمہ داریاں بتایئے ہارون صاحب! آپ کیوں نوکری چھوڑیں گے؟ کیوں استعفیٰ دیں گے؟ ہم آپ کی لمبی چھٹی منظور کئے لیتے ہیں۔ ہمارا بھی تو کوئی فرض ہوتا ہے۔''

''شکریہ کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں میں۔''

''بالکل نہیں...... آپ یقین کیجئے بڑی عزت کرتے ہیں ہم آپ کی۔''

کامران نے کہا۔ ''سر! میں بھی ہارون صاحب کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں...... ہاں...... میں سمجھ رہا ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بس ذرا سی تکلیف کرنا پڑے گی آپ کو۔ دو درخواستیں ٹائپ کروا دیں اور ان پر دستخط کر دیں۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' افسر اعلیٰ نے کہا۔ ہارون واقعی تہہ دل سے افسر

اعلیٰ کے اس تعاون کا شکر گزار ہو گیا تھا۔

❁

صفورہ گھر میں داخل ہوئی۔ طاہر علی صاحب کسی نہ کسی طرح واپس آ گئے تھے۔ نیرہ بیگم سے انہوں نے ساری تفصیل کہی تھی اور کافی دیر تک دونوں میاں بیوی آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ انتہائی پریشان کن اور قابل افسوس ہے۔ نہ پتہ نہیں ہم نے حالات کو اس طرح نظر انداز کیوں کر دیا۔ ہمیں اسے اتنی آزادی نہیں دینی چاہئے تھی۔ اپنی غلطی اور حماقت کا اعتراف ہر حالت میں کرنا ہو گا۔ دیکھو تو سہی کس قدر بے باک ہو گئی ہے۔ میں تو بہت دکھی ہوں اور نہ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنی بیٹی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ اس سے زیادہ دکھ کی بات اور کوئی نہیں ہو گی نیرہ بیگم کہ ہماری اکلوتی بیٹی ہماری اپنی نہیں رہی۔ والدین کے سامنے بہت سی اولادیں ہوتی ہیں، ان کی ذمہ داریاں بھی بٹ جاتی ہیں اور محبتیں بھی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ایک سے یکساں محبت صرف ایک روایتی بات ہے۔ ہوتا تو یہ ہے کہ جو اپنا دلدار ہو وہی قابل محبت ہوتا ہے۔ ہماری بدقسمتی تو یہ ہے کہ وہ ہماری اکیلی بیٹی ہے۔ بتاؤ کیا کریں؟''

''آنے دیجئے اسے...... آج اس سے دو ٹوک بات ہو جائے گی۔''

''نیرہ! جو لڑکی اپنے باپ کے ساتھ اس قدر بدتمیزی کر سکے تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ تمہارے ساتھ تعاون کرے گی؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا نیرہ بیگم...... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ تمہیں بھی چٹکیوں میں اڑا دے گی۔''

پھر انہوں نے صفورہ کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب وہ ڈرائنگ روم سے گزری تو نیرہ بیگم نے اسے کرخت لہجے میں آواز دی۔

''صفورہ! ادھر آؤ۔''

''ارے باپ رے...... اتنا خوف ناک لہجہ...... لگ رہا ہے میری شامت آ رہی ہے۔'' صفورہ نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور ماں کے قریب پہنچ گئی۔

''ہیلو ڈیڈی...... کیسے ہیں آپ؟''

طاہر علی نے سرد نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا اور بولے۔

''ٹھیک ہوں بیٹا...... بالکل ٹھیک ہوں...... آپ جو تکلیف مجھے دے آئی تھیں

بہر حال اس سے پریشان تو ہوا لیکن پریشانیاں بھگتنا ہی پڑتی ہیں۔"

صفورہ ہنس پڑی پھر بولی۔ "خوش ہونا چاہئے ڈیڈی انسان کو اولاد کی قوتوں پر۔ اور آپ دیکھئے ماں باپ بیٹیوں کے لئے کتنے پریشان رہتے ہیں۔ کہیں وہ ان کے رشتے تلاش کرتے ہیں کہیں وہ اس خوف کا شکار رہتے ہیں کہ کہیں ان کی بیٹی کو کوئی جسمانی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ڈیڈی! بیٹی ہونے کے باوجود میں نے آپ کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ مجھے بتائیے آپ کو کیا درکار ہے؟ دولت، شہرت، دشمنوں پر غلبہ؟ بتائیے آپ کو کیا چاہئے؟ اپنے دشمنوں کا نام لیجئے میرے سامنے۔ کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے آپ کے پاس نہ پہنچ جائیں تو میرے پر تھوک دیجئے گا ڈیڈی! ایک بیٹی ہوکر میں نے وہ قوت حاصل کر لی ہے جو ناقابل زوال ہے۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی صفورہ! کالے جادو کو سیکھ کر تم اپنے آپ کو طاقتور کہتی ہو۔"

"دیکھئے ڈیڈی! کوئی تلوار چلانا جانتا ہے، کوئی ریسلر، کوئی ایک ماہر نشانہ باز ہے۔ اب آپ یہ کہیں کہ اس کی قوت آپ کے لئے ناپسندیدہ ہے تو ڈیڈی! اس نے تو محنت کی ہے نا اس قوت کو حاصل کرنے میں۔ کالا جادو ہو یا پیلا جادو۔ بات وہی ہو جاتی ہے نا کہ طاقت کس طرح حاصل کی۔"

"یہ بے غیرت بھی ہو چکی ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ مذہب تو چھن چکا ہے اس سے۔"

"نہیں ڈیڈی! میرا مذہب ہے۔ میں کالی ماتا کی پجاری ہوں۔"

"خدا کی لعنت ہو تجھ پر..... بے شک ہم یورپ میں رہے لیکن اپنے دین، اپنے مذہب کو ہمیشہ ہم نے اپنی ذات میں سموئے رکھا۔ اور آج بھی ہم اپنے مذہب کے پیروکار ہیں۔ تُو اپنے آپ کو کالی ماتا کی پجاری کہتی ہے۔ یہ تو ہندو بھی نہیں ہوتے۔ یہ صرف کالے جادوگر ہوتے ہیں۔"

"ہائے کتنا اچھا لگتا ہے جب آپ مجھے کالے جادو کی ماہر کہتے ہیں۔ آسان بات نہیں ہے ڈیڈی! کون سی قوت کس طرح حاصل کی جاتی ہے اب کسی کو کیا پتہ اور کیا بتایا جائے؟"

طاہر علی صاحب کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ کہنے لگے۔

"دیکھو صفورہ! میرا خیال ہے بات اب میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ تم کالے جادو کی ماہر ہو نا؟"

"ماہر نہ کہیں ڈیڈی! بس یوں سمجھیں کہ جدوجہد کر رہی ہوں کالی قوتیں حاصل کرنے کی۔"

"مذہب تو تم کھو ہی چکی ہو۔ نیرہ نے مجھے بتایا ہے کہ تم غلاظتوں کو اپنی غذا بناتی ہو۔"

"جسے آپ غلاظت کہتے ہیں نا ڈیڈی وہ امرت ہے میرے لئے۔ آپ لوگ کیا جانیں کہ وہ سب کیا ہے۔ غلاظت تو اسے آپ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی نگاہوں کی پہنچ بہت محدود ہے۔"

"بگڑ چکی ہے یہ نیرہ! بالکل ختم ہو چکی ہے۔"

نیرہ بیگم کا دل اب ہولتا جا رہا تھا۔ صفورہ کی سرکشی اس حد تک آگے بڑھ جائے گی اس کا انہیں خواب میں بھی گمان نہیں تھا۔ یہ تو سب کچھ ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

طاہر علی نے کہا۔

"ٹھیک ہے..... اب مجبوری ہے صفورہ! میں تمہیں راہ راست پر لانے کے لئے جو بھی قدم اٹھاؤں گا وہ میری مجبوری ہوگی۔ اس میں تمہیں کوئی بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"ارے واہ ڈیڈی..... آپ نے تو ایک دلکش باب کھول دیا۔ یہ واقعی ایک خوبصورت تجربہ ہوگا میرے لئے۔ آپ پلیز کچھ کریں۔ کچھ کریں آپ۔ ایک مقابلہ رہے گا۔ اور اس مقابلے میں لطف آئے گا۔"

طاہر علی نے گردن ہلائی اور بولے۔

"ٹھیک ہے..... قدرت اگر مجھے ایک انوکھے امتحان میں ڈالنا چاہتی ہے تو میں حاضر ہوں۔ میرے مالک! بیٹی کو زندگی کی طرح چاہتا ہوں۔ لیکن اگر زندگی ہی دشمن بن جائے، آنا تو تیرے ہی حضور ہے۔ اپنی محبتوں میں لپٹ کر اگر تیرے راستے سے بھٹک جاؤں تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تُو مجھ سے امتحان چاہتا ہے۔ بہت بڑا کرم ہے تیرا..... بہت بڑا کرم ہے۔ اگر یہ امتحان میری تقدیر میں لکھا ہے تو ٹھیک ہے صفورہ! تم سے جو کیا جا سکتا ہے کرو۔"

"بات سنیں..... بات سنیں ڈیڈی! میں کہتی ہوں کہ آخر آپ کو مجھ سے اختلاف کیا ہے؟"

''میں تجھ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں بیٹا! کیا چاہئے تجھے؟ دولت کے انبار ہیں تیرے پاس اور اس دنیا کی دولت کی طاقت سب سے بڑی طاقت مانی جاتی ہے۔ کالا جادو حاصل کر کے تُو اور کون سی قوت چاہتی ہے؟''

''انسانوں کی تسخیر ڈیڈی! انسانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑنا چاہتی ہوں۔''

''کون ہے وہ انسان......؟''

''نہیں ڈیڈی! یہ کوئی سوال نہیں ہے۔ اس دنیا میں بکھرے ہوئے لاتعداد لوگ۔ آپ پلیز ایسا کیجئے کہ میرے خلاف محاذ بنایئے۔ میں اپنے آپ کو آزمانا چاہتی ہوں۔ جاؤں؟''

طاہر علی صاحب نے رخ بدل لیا تھا۔ صفورہ مسکراتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی جانب چل پڑی۔

بیڈ روم میں پہنچنے کے بعد اس نے لباس وغیرہ تبدیل کیا۔ آج کا دن بڑا دلچسپ گزرا تھا۔ اس کی فطرت بھی بدل چکی تھی۔ ماں باپ کے لئے اب اس کے دل میں کوئی احترام نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تو معمولات زندگی میں سے ہے۔ آج یہ لوگ ہیں، کل نہیں ہوں گے۔ لیکن یہ مہان شکتی اسے مل جائے گی۔ اس سے وہ اپنے ہر دشمن کو شکست دے سکتی ہے۔ اور اسے اپنے بدترین دشمن کا خیال آیا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے اپنے بدن کو ملا تو اس کے وجود سے ناپاک کیڑے نمودار ہو گئے اور ان کی ننھی ننھی آوازیں ابھریں۔

''جے مہا شری...... کیا حکم ہے ہمارے لئے؟''

''میرے بیرو! ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ میرا وہ دشمن جس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا کہاں ہے وہ...... کہاں مل سکتا ہے وہ مجھے؟''

''دیوی! بہت آسان ہے اس کا پتہ۔ تم اس سے فون پر بات کر سکتی ہو۔''

''مجھے اس کا فون نمبر چاہئے۔''

''یاد کر لو دیوی!''

پھر ہارون کا موبائل نمبر صفورہ تک پہنچ گیا اور صفورہ مسکرانے لگی۔ پھر اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کچھ لمحوں کے بعد اسے دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

''ہاں......کون......؟''

''تمہاری ایک دیرینہ دوست مائی ڈیئر مسٹر ہارون!''

''میری دوست؟''

''ہاں......تمہاری دوست۔''

''پلیز مجھے بتاؤ......کون ہو تم؟...... چندر بدن؟''

''واہ...... یہ تو ہندی نام ہے۔ تم ہارون ہی بول رہے ہو نا؟''

''ہاں...... میں تو ہارون ہی بول رہا ہوں۔ مگر تم کون ہو؟''

''کہا ناں تمہاری دیرینہ دوست...... مگر چندر بدن نہیں۔ ویسے بتاؤ گے مجھے یہ چندر بدن کون ہے؟''

''تم کون ہو...... یہ بتاؤ......؟''

''ہارون! ایک کام کرو...... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں......؟''

''تمہیں افشاں اور اشعر کے بارے میں بتاؤں گی۔''

''کیا......؟'' دوسری طرف سے ہارون کی آواز سنائی دی۔ صفورہ ہنسی اور بولی۔

''اگر میں تم سے کہوں کہ تمہاری بیوی اور بیٹا میرے پاس ہیں تو تم پر کیا ردِعمل ہو گا؟''

''دیکھو! میں واقعی تمہیں نہیں پہچان سکا۔ اگر تم کوئی ایسی شخصیت ہو جسے میرے ہاتھوں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو جس طرح سے کہو میں تم سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر تم ان کے بدلے مجھ سے کوئی رقم چاہتی ہو تو پلیز مجھے بتاؤ کہ میں تمہیں کیا پیش کروں؟ خدا کے لئے مجھے یہ بتا دو کہ وہ لوگ خیریت سے تو ہیں ناں؟''

''ہاں...... ابھی تک تو خیریت سے ہیں۔ ویسے بھی میں انسانوں کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ لیکن تم سے میرا ایک پرانا جھگڑا ہے۔ بہرحال یہ تو جائز بات ہے کہ جھگڑوں کے جواب میں جھگڑے ہی ہوتے ہیں۔''

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

''ابھی نہیں...... ابھی نہیں۔ کل تم میرے فون کا انتظار کرو۔ میں کسی ہوٹل میں تم سے ملاقات کا بندوبست کرتی ہوں۔ تمہیں فون کر کے کمرہ نمبر بتاؤں گی۔ تم وہاں مجھ سے ملنے آ جانا۔ اور ایک بات اور بتا دوں تمہیں...... کسی بھی قسم کی کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ کیونکہ اس کے بعد تم قابل معافی نہیں رہو گے۔ پہلے مجھ سے باتیں کرو۔ بیٹھو

میرے ساتھ۔ سمجھ رہے ہو نا تم؟''

''ٹھیک ہے...... تم مجھے ہوٹل کے بارے میں کس وقت بتاؤ گی؟''

''یہی کوئی بارہ ایک بجے۔''

''پلیز کچھ جلدی نہیں ہو سکتا؟''

''نہیں...... صبح اٹھنے کے بعد میں ہوٹل کا انتظام کروں گی۔ پھر تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گی۔''

''آہ...... اگر تم یہ کام میرے سپرد کر دو تو میں ہوٹل کا بندوبست کر لوں۔''

''نہیں......'' صفورہ آہستہ سے ہنسی۔ اور پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے دل میں ٹھنڈک اتر رہی تھی۔ بہت عرصے کے بعد ہارون کی آواز سنی تھی اس کے لہجے اور بے تابی پر دلی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ بارہا اس نے ہارون کے بارے میں سوچا تھا۔ اس کے دل میں ہارون کے لئے کوئی خاص جذبہ نہیں تھا لیکن فطرتاً شاید وہ انتقامی مزاج رکھتی تھی اور یہی انتقامی مزاج اسے ہارون کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ بدنصیب کو کالے جادو کی قوتیں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ اور ظاہر ہے کالا جادو گناہ کا دوسرا نشان ہوتا ہے۔ گناہ کے نشان، گناہ پر ہی آمادہ کرتے ہیں۔ ان سے بہتری کا بھلا کیا تصور؟ بہرحال وہ خوش تھی اور آئندہ کے لئے بہت سے منصوبے بنا رہی تھی۔ ہارون ملے گا۔ اسے اپنے جوتے چاٹنے پر مجبور کر دے گی۔

ٹھکرا دیا تھا اس نے مجھے...... بہت برا سمجھا تھا اسے آپ کو...... اور اب کتنا پریشان ہو رہا ہے۔ پہلے تو دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا ہارون کے لئے لیکن اب جب برائیاں اس کے رگ و پے میں اتر چکی تھیں تو وہ اس سے بھرپور انتقام لینا چاہتی تھی۔

دوسرے دن صبح ناشتے پر ماں باپ کے پاس آ بیٹھی۔ دونوں سے بچے روٹھے روٹھے لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔ ماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ہوتا ہے...... ایسا بھی ہوتا ہے صفورہ! کاش ماؤں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ اولاد کی شکل میں سنپولئے کو جنم دے رہی ہیں۔ صفورہ! ہماری کسی غلطی سے تو گناہوں کی اس دلدل میں جا کر نہیں پھنسی۔ جو کچھ کیا تو نے خود ہی کیا۔ اس لئے ہم شرمندہ نہیں ہے۔ ہاں ہماری بدنصیبی صرف یہ ہے کہ تو ہماری اکلوتی اولاد ہے بیٹا! واپسی کا کوئی ذریعہ ہے؟''

''ماما...... پاپا...... لوگ تو اپنی اولادوں کی ہونہاری پر فخر کرتے ہیں۔ دیکھو، تھوڑا

سا وقت دو مجھے۔ میں تمہیں قائل کر لوں گی کہ میں نے جو کچھ کیا ہے غلط نہیں کیا ہے۔ پاپا! میں آپ کو ایک چھوٹی سی بات بتاؤں۔ میری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی کی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑی۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے سوچا کہ ایک نوجوان لڑکی ہتھے چڑھ گئی ہے۔ پاپا! وہ مجھے ایک ویرانے میں لے گیا اور پھر اس نے اپنی ناپاک خواہشوں کی تکمیل کرنا چاہی۔ لیکن پاپا! میرا خیال ہے اس کی ہڈیوں کا پنجر اسی ویرانے میں پڑا ہوگا۔ پتہ میں بتائے دیتی ہوں، جا کر معلومات حاصل کر لیں۔ دیکھ لیں۔''

دونوں میاں بیوی اچھل پڑے۔ طاہر علی کے منہ سے نکلا۔

''ہڈیوں کا پنجر؟''

''ہاں پاپا...... میں نے اپنے ایک خاص عمل سے، اس سے اپنی آبرو بچائی مگر اس کے نتیجے میں اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔''

''تت...... تت...... تُو نے...... تت...... تُو نے...... تُو نے قتل بھی کر دیا؟''

صفورہ نے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ میز پر دے ماری اور پلیٹ کے ٹکڑے اچھل اچھل کر دور جا گرے۔ صفورہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

''کیسے ہیں آپ لوگ...... مخالفت برائے مخالفت ہی کرنا جانتے ہیں یا بات کی گہرائیوں پر بھی سوچتے ہیں۔ آپ کو اپنی بیٹی کی عزت آبرو کا خیال نہیں ہے۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں ڈیڈی، ممی! پکنک پر گئی تھی وہاں لندن میں۔ ایک کتے نے دھوکے سے مجھے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانا چاہا۔ پہلا قتل میں نے اسی کا کیا تھا۔ جان سے مار دیا تھا میں نے اسے ماما...... وہیں مجھے ٹنڈن گوپال ملے اور انہوں نے میری زندگی بچائی۔ ورنہ میں ہری داس کے قتل کی مجرم قرار پاتی۔ ماما! ٹنڈن گوپال مہاراج نے مجھے بتایا کہ اگر انسان کے پاس طاقت نہ ہو تو جینا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ ماما! بات میری سمجھ میں آئی۔ آپ کا کیا خیال ہے...... میں جوڈو کراٹے ماسٹر بن جاتی، ٹارزن بن جاتی، پہلوان بن جاتی اور دنیا کا مقابلہ کرتی پھرتی۔ کوئی ایسی ہی طاقت درکار تھی مجھے جس سے میں ہوس کے ماروں سے اپنے آپ کو بچا سکوں۔ کمال کرتے ہیں آپ لوگ۔ آپ اس ٹیکسی ڈرائیور کی موت کا افسوس کر رہے ہیں۔ آپ مجھے قاتل کہہ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا، کیا میں اپنے آپ کو اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیتی؟ جواب دیجئے مجھے ڈیڈی! آپ جواب دیجئے۔''

طاہر علی عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''لیکن تُو نے...... تُو نے...... تُو نے اپنا ایمان گنوا دیا۔''

''ہاں ڈیڈی...... آپ کے خیال سے میرا ایمان چلا گیا لیکن میری آبرو بچ گئی۔ کمال کرتے ہیں آپ لوگ۔ بڑے عجیب ہیں آپ سب۔'' صفورہ نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''ناشتہ تو کر لو صفورہ!''

''میرا ناشتہ آپ جانتی ہیں...... غلاظت، کیڑے پڑی ہوئی خوراک، وہ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے ماما...... ہاں ایک بات آپ سے کہوں، جب آپ کو کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے، کسی مصیبت میں گرفتار ہوں آپ، تب میرا نام لے دیجئے گا۔ آپ کی مشکل دور ہو جائے گی۔''

''لعنت ہے تجھ پر۔ تیرے بجائے شیطان کا نام لینا زیادہ بہتر ہو گا۔''

صفورہ ہنستی ہوئی وہاں سے باہر نکل آئی۔ پھر اس نے تیاریاں کیں اور اپنی کار لے کر چل پڑی۔ اسے ہوٹل کا بندوبست کرنا تھا۔

⁂

نیرہ بیگم اور طاہر علی، صفورہ کے جانے کے بعد گردن جھکا کر بیٹھ گئے۔ ناشتہ وغیرہ سب بیکار ہو گیا تھا۔ بیٹی نے دل پر ایسا گھاؤ لگایا تھا کہ شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ یہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ نیرہ بیگم نے طاہر علی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو تڑپ گئیں۔

''طاہر علی!'' انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا اور طاہر علی نے گردن اٹھائی۔

''کیا بات ہے نیرہ بیگم؟''

''آپ رو رہے ہیں؟''

''ہاں...... قدرت کی ستم ظریفی پر آنسو نکل آئے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں اولاد کی محبت اس قدر دل میں ڈال دی ہے کہ انسان اولاد کے ہاتھوں بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔''

''یہ تو صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ ہم کون سے نئے ماں باپ ہیں۔'' نیرہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔''

''وہ پاگل ہو چکی ہے۔''

''پاگل نہیں ہو چکی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ آسیب زدہ ہو چکی ہے۔''

''نہیں...... وہ آسیب زدہ نہیں ہے۔ جان بوجھ کر اس نے یہ سب کچھ اپنایا ہے۔''

''پھر بھی ہے تو چھوٹی عمر کی۔ حالات اس طرح اس کے سامنے آئے ہیں کہ وہ ان کے جال میں مکمل طور پر پھنس چکی ہے۔ اور پھر نٹذن گوپال تو بڑا مشہور آدمی ہے۔''

''ہاں...... گھوم پھر کر بات وہیں آ جاتی ہے کہ غلطی ہماری ہے۔ ہمیں بیٹی کی طرف سے اس قدر لاپرواہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔''

''کیا کرتے...... جس ماحول میں رہ رہے تھے اس ماحول میں شخصی آزادی کے نام پر رشتے کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو...... وہ ان کا اپنا معاشرہ ہے، ان کا اپنا کھیل ہے۔ ہمارے اقدار تو بالکل مختلف ہیں۔''

''میرا ذہن چھوٹا سا ہے...... بہت بڑی بڑی باتیں نہیں سوچ سکتی۔ یہ درست ہے کہ انسان روٹی کے حصول کے لئے دنیا بھر میں گردش کرتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہم لوگ جس طرح اپنے معاشرے کو پسماندہ سمجھ کر دوسروں کی گود میں جا بیٹھتے ہیں وہ چیز کبھی نہ کبھی نقصان دیتی ہی ہے۔ آپ دیکھو لاتعداد گھرانے دنیا کے مختلف ملکوں میں منتقل ہو چکے ہیں اور وہاں منتقل ہو کر رزق کمانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ہمارا اپنا وطن ہے۔ وہ لوگ بھی اپنے وسائل سے کام لے کر آخر اس منزل تک پہنچے ہیں جہاں وہ دنیا کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ خدا نے ہمیں اپنے ملک میں بہت کچھ دیا ہے مگر ہم اپنے وطن میں کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری آرزو یہ ہوتی ہے کہ ہمارے پاس بھی اونچے محل اور مخمل کے بستر ہوں۔ اپنے وطن کو اس منزل تک لے جانے کے لئے جب ہم اونچے محلوں اور مخمل کے بستروں کے قابل بن سکیں، ہم محنت نہیں کرتے بلکہ ملک چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی مٹی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ مٹی جو ہمیں ہر وقت سونا دینے کے لئے تیار رہتی ہے۔ مگر ہم باہر کے لئے کام کرنا پسند کرتے ہیں اور

اس کے بعد نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہم ان ممالک میں تیسرے درجے کے بلکہ چوتھے درجے کے شہری گردانے جاتے ہیں مگر ہم خوشی سے وہاں وہ سارے کام کر لیا کرتے ہیں جو ہمارے شایانِ شان نہیں ہوتے۔ افسوس ہے...... افسوس ہے ہم اس وقت جاگتے ہیں جب گردن گردن تک دلدل میں غرق ہو چکے ہوتے ہیں۔''

طاہر علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے بیٹھے بیوی کی صورت دیکھتے رہے پھر بولے۔

''کوئی حل ہے نیرہ بیگم...... کوئی حل ہے کہ ہم اپنی بچی کو بچا سکیں؟''

نیرہ بیگم دیر تک سوچتی رہیں پھر بولیں۔

''یہاں کے ماحول میں بڑی تبدیلی ہے طاہر علی! یہاں کہیں ایسے پہنچے ہوئے بزرگ بھی مل جاتے ہیں جو اس کالے جادو کی قوتوں کو ختم کر دیتے ہیں بلکہ انہیں فنا کر دیتے ہیں۔ کیوں نہ کسی ایسے بزرگ کی تلاش کی جائے جو ہماری اس مشکل میں ہماری مدد کرے۔''

''افسوس مجھے تو اب یہاں کے ماحول سے مکمل واقفیت بھی نہیں رہی۔'' طاہر علی نے کہا۔

''طاہر علی! بہت سے شناسا، بہت سے ہمدرد مل جائیں گے جن سے مدد لے سکتے ہو۔''

''نہیں نیرہ بیگم...... شناساؤں اور ہمدردوں کے مسئلوں کو جانے دو۔ میں اپنے اندر یہ ہمت نہیں پاتا کہ لوگوں سے یہ کہتا پھروں کہ لوگو دیکھو! میری بچی کالے جادو کے جال میں پھنس گئی ہے۔ وہ خود کالے جادو کی ماہر ہے۔ اس کے لئے میری مدد کرو۔''

''تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔''

''ایک کام کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا؟''

''تمام کام چھوڑ کر خود کسی ایسے عامل کی تلاش میں نکلوں جو میری مدد کر سکے۔''

''کریں...... کچھ کریں...... اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔''

''میں کوششیں کرتا ہوں۔'' طاہر علی نے کہا اور اس کے بعد وہ اپنی ان کاوشوں

میں مصروف ہو گئے۔ سارا دن سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ پھر شہر کے مضافات میں ایک کچی آبادی کے کنارے پر انہیں ایک مزار نما جگہ نظر آئی جہاں سبز رنگ کے جھنڈے لگے ہوئے تھے اور ایک بینر بھی جس پر لکھا تھا ''بابا البیلے دولہا۔ مشکلوں کا حل دریافت کرنے والے، کالے جادو کے توڑ کے ماہر۔ ایک بار آزمائیے، کام نہ ہونے پر جو جرمانہ چاہیں طلب کریں۔''

طاہر علی خوش ہو گئے اور پھر ان کی کار اس آستانے کے پاس جا رکی۔ بڑا اہتمام تھا۔ چھدرے چھدرے درخت چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ درختوں کے نیچے خیمے لگے ہوئے تھے۔ یہ حاجت مندوں کی ٹولیاں تھیں جنہیں بابا صاحب نے یہاں روکا ہوا تھا۔ ایک کچا راستہ اس آستانے تک گیا تھا۔ بڑا سا صحن تھا جس میں کوئی چار چار فٹ کی دیواریں بنائی گئی تھیں جو چونے سے رنگی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی ایک دالان نما جگہ نظر آ رہی تھی جس کے کنارے پر پانی کے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ اسی دالان میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ دالان کے عقب میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ بائیں طرف ایک اصطبل نما جگہ تھی جس میں چھوٹے چھوٹے خانے بنائے گئے تھے۔ ان خانوں میں بھی کچھ لوگ رہائش پذیر تھے۔

بہرحال بڑی عجیب سی جگہ تھی۔ سیاہ رنگ کے لباس میں ملبوس ایک شخص نے ان کے قریب آ کر کہا۔

''حاجت مند ہے بچہ...... تیری حاجت روا ہو گی۔ البیلے دولہا نے تجھے تیری مشکلوں سے متاثر ہو کر طلب کیا ہے۔''

''مجھے......؟'' طاہر علی نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں...... تجھے...... تُو کیا سمجھتا ہے یہاں تُو خود آیا ہے؟ آیا نہیں بے وقوف، لایا گیا ہے۔''

''مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

''البیلے دولہا کی روحانی قوتیں۔ تُو جس مشکل کا شکار ہے اس مشکل کے لئے تجھے البیلے دولہا نے طلب کیا ہے۔ کیا سمجھا؟''

''عجیب بات ہے یہ تو...... میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

''ایسے نہیں...... ایسے نہیں...... وہاں بیٹھ جا، ہم تیری درخواست وہاں پہنچا دیں گے۔''

"ٹھیک ہے...... جیسا آپ کہیں۔" طاہر علی نے کہا اور اس گوشے میں جا بیٹھے جہاں ایک چھوٹا سا درخت تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار تھے۔ اس سے پہلے کبھی ایسی مشکل کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ بہرحال دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

بہت دیر تک وہ بیٹھے رہے اور اس کے بعد ایک اور شخص ان کے پاس آیا اور کہا۔ "آ...... تجھے طلب کیا گیا ہے۔"

کچھ لمحوں کے بعد طاہر علی اس دالان سے گزر کر ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گئے جہاں زمین پر ہرن کی کھال بچھی ہوئی تھی اور اس پر البیلے بابا جو ایک دراز قامت اور بھیانک سی شکل کے آدمی تھے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر پر گیندے کے پھولوں کا سہرا باندھا ہوا تھا۔ سہرے کی لڑیاں ان کے چہرے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"آوے ای آوے...... آوے ای آوے...... حق اللہ...... حق اللہ......"

طاہر علی اس عجیب الخلقت چیز کو دیکھتے ہوئے اس کے سامنے پہنچ گئے اور بولے۔ "میرا نام طاہر علی ہے۔"

"ہمیں نام بتاتا ہے بے وقوف...... ہم تو تیرا پورا شجرۂ نسب بتا سکتے ہیں۔ کیا سمجھا؟"

"بابا صاحب! میں یورپ سے آیا ہوں۔ کچھ نہیں جانتا یہاں کے حالات کے بارے میں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے...... میں ایک بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔"

"ننگے...... بیوقوف...... احمق...... گدھے...... ہمیں بتا رہا ہے اپنی مشکل کے بارے میں؟ ارے کیا نہیں جانتے ہم۔ اپنے منہ سے کہنا چاہتا ہے تو اپنے منہ سے بتا کیا مشکل ہے تیری؟"

"آپ کا نام البیلے دولہا ہے؟"

"یہ سہرا نہیں دیکھ رہا ہمارے سر پر؟ ارے...... یہ سہرا باندھا گیا ہے۔ بزرگوں نے، ولیوں نے، درویشوں نے بہت کچھ دیا ہے ہمیں۔"

"بابا صاحب! میری ایک بیٹی ہے۔"

"اے بیوقوف شخص! ہمیں بتا رہا ہے؟ یہ بات ہم جانتے ہی کہ تیری اکلوتی بیٹی ہے وہ۔"

"جی بابا......"

"آگے بول...... آگے بول...... اپنا شوق پورا کر۔"

"بابا صاحب! ہم لوگ لندن میں رہتے تھے۔ وہاں ایک ہندو جو گندے علوم کا ماہر تھا اس نے اپنا ایک آشرم کھول رکھا ہے۔ اس آشرم میں وہ بھولے بھالے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو بھٹکا کر لے جاتا ہے۔ انہیں کالا جادو سکھاتا ہے۔ چھوٹے موٹے جنتر منتر پڑھ کر انہیں تھوڑی بہت کالے جادو کی قوتیں دے دیتا ہے اور اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ میری بیٹی بھی نجانے کس طرح اس شخص کے جال میں جا پھنسی۔"

"حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ...... نجانے کس طرح کی بات کرتا ہے تُو...... تم لوگ باہر کے ماحول میں جا کر وہاں کے دباؤ میں آ کر اپنے بچوں کو آزادی دے دیتے ہو اور پھر وہ لوگ بے لگام ہو جاتے ہیں۔ خیر...... خیر...... میں نصیحت کرنے والا کون...... تُو بیٹی کا باپ ہے۔ تُو جانے تیرا کام جانے...... پھر کیا ہوا؟"

"وہاں اس نے کالا جادو سیکھا۔"

"سیکھا؟"

"ہاں سیکھا۔"

"کتنا سیکھا؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔"

"اچھا پھر...... آگے بول...... آگے بول!"

"ہمیں جب اس بات کا علم ہوا تو ہم اسے وہاں سے یہاں لے آئے۔ اور وہ اب مکمل طور پر کالے جادو کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ سرکش ہو چکی ہے۔ کسی کی بات نہیں مانتی۔"

"گندا علم جاننے والے بھلا سرکش نہ ہوں گے تو کیا ہوں گے۔ اس نے تو اپنا ایمان ہی کھو دیا۔"

"ہاں...... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔"

"خیر...... خیر...... پھر...... پھر......؟"

"بابا صاحب! آپ کی مدد چاہئے مجھے۔"

"ہم نے تجھے خود بلایا ہے۔ تُو آیا تو نہیں ہے ہمارے پاس۔ اپنی مشکل کے لئے بھٹک رہا تھا کہ تُو نے ادھر کا رخ کیا۔ کیا سمجھا؟ مدد کریں گے ہم تیری۔ مدد کریں

گے۔ پتہ بتا اپنا۔ ہم آئیں گے تیرے پاس۔ مگر دیکھ جب انسان اپنے کئے کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر اسے بہت سی مشکلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ تُو نہیں جانتا ہمارے شانوں پر کتنی ذمہ داریاں لاد دی گئی ہیں۔ بہتوں کے کام آتے ہیں۔ اور حکم یہ ہے ہمیں کہ کسی کے ساتھ اگر کچھ کریں تو دائیں ہاتھ سے دینے والے کو بائیں ہاتھ کی خبر نہ ہو۔ سمجھ رہا ہے یہ سب کچھ۔ ہم تجھ جیسے لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ کیا لایا ہے ہماری مشکل کے حل کے لئے؟ دنیا بہت بری جگہ ہے...... دولت نے انسان پر قبضہ جما رکھا ہے۔ لوگ دین ایمان بھول چکے ہیں۔ دولت کے پجاری بن کر رہ گئے ہیں۔ اب دولت کے ذریعے حاجت مندوں کی مشکل حل کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں ہم۔ تُو ہی بتا، کیا مدد کر رہا ہے تُو ہماری؟''

''بابا صاحب! میری بچی ٹھیک ہو جائے، میں لاکھوں خرچ کرنے کو تیار ہوں۔''

''کون سا احسان کرے گا دنیا پر...... مشکل میں پڑنے سے پہلے کیا تُو نے ادھر کا رخ کیا تھا؟ جب ادھر کا رخ کیا ہے تو اپنی مشکل کا حل پانے کے لئے۔ مشکلوں میں ڈوبے ہوئے ان ہزاروں انسانوں کی مدد تجھے کرنا ہوگی۔ کیا لایا ہے اس وقت؟''

''اس وقت میں نقد رقم نہیں لئے پھر رہا۔ البتہ میری گاڑی میں چیک بک پڑی ہوئی ہے۔''

''دو لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر دے جا۔ آدمی کر دیتا ہوں تیرے ساتھ۔ پتہ لکھوا دے، پہنچیں گے ہم۔ ہمارا موبائل نمبر لے لے۔ ہمیں بتانا کہ لڑکی کس وقت گھر میں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ بس ہم پہنچ جائیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اور ہاں، صحیح چیک دینا۔ واپس نہ ہو جائے۔ تُو جانتا ہے کہ آج کل چیک واپس ہونے پر مقدمہ قائم ہو جاتا ہے۔''

''جی بابا صاحب! آپ میری مشکل حل کر رہے ہیں۔ میں بھلا آپ کو دھوکا کیسے دوں گا؟'' طاہر علی نے کہا۔

''جا...... جا...... جا......'' بابا صاحب جلالی لہجے میں بولے اور اپنے سہرے کی لڑیاں نوچنے لگے۔

طاہر علی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور باہر نکل آئے۔ ایک آدمی فوراً ان کے ساتھ چل پڑا۔

''چیک مجھے دیجئے گا......'' اس نے کہا اور طاہر علی آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے

اپنی گاڑی تک آ گئے۔ گاڑی کی ڈگی سے انہوں نے چیک بک نکالی۔ دو لاکھ روپے کا چیک لکھا اور دستخط کر کے انہوں نے اس شخص کے حوالے کر دیا۔ پھر انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے واپس موڑ دیا۔ نجانے کیسے کیسے احساس ان کے دل میں پل رہے تھے۔

ایک خوبصورت سے ہوٹل کے سامنے صفورہ نے کار روک دی۔ اس کے اندر بہت زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ ویسے بھی لندن کی فضاؤں میں پرورش پانے والے بہت سے عام مرحلوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ صفورہ نے بھی آزادی کے ساتھ لندن میں وقت گزارا تھا۔ کسی طرح کی جھجک اس کے دل میں نہیں تھی۔ گاڑی ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں پارک کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہو گئی۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے کمرے کے بارے میں بات کی۔

''جی میڈم! کمرہ حاضر ہے...... آپ یہاں براہ کرم دستخط کر دیجئے۔''

کاؤنٹر منیجر نے ضروری کارروائیاں کیں اور اس کے بعد ایک پورٹر کو آواز دی۔

''میڈم کا سامان گاڑی سے نکال لاؤ۔''

''میرے ساتھ کوئی سامان نہیں ہے۔ میری ضرورت کی چیزیں بعد میں آ جائیں گی۔''

''او کے...... او کے......''

پورٹر صفورہ کو لے کر چوتھی منزل پر پہنچا۔ لفٹ سے اترنے کے بعد ایک خوبصورت روشن راہداری عبور کی اور اس کے بعد وہ کمرہ نمبر 403 کے سامنے رک گیا۔ دروازہ کھولا اور صفورہ کو ساتھ لے کر اندر پہنچ گیا۔

''میڈم! یہ آپ کا کمرہ ہے اور میں آپ کا خادم۔ جیسے ہی آپ کا سامان پہنچے آپ یہ بٹن دبا دیجئے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو فرما دیجئے گا۔''

''نہیں شکریہ، جاؤ۔ اور ہاں یہ رکھو۔'' صفورہ نے اپنے پرس سے ایک نوٹ نکال کر پورٹر کو دیا اور پورٹر سلام کر کے چلا گیا۔ صفورہ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اسے یہ کمرہ کافی پسند آیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے خود کلامی کی۔

''اس کمرے کو تو مستقل طور پر اپنے پاس رکھنا چاہئے۔ جب بھی گھر سے

آزادی کی ضرورت ہو یہاں آ کر قیام کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات نجانے پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ ویسے بھی گھر کے لوگ انتہائی بور ہو چکے ہیں۔ میرا تو ان سے دل لگتا ہی نہیں ہے۔ یہاں میں اپنی من مانی کرسکوں گی۔ واہ...... ایک نیا آئیڈیا ذہن میں آیا ہے۔ اوکے...... اوکے......''

اس نے پلٹ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور مسہری کی طرف بڑھ گئی۔ مسہری پر بیٹھ کر اس نے اپنے دونوں جوتے فضا میں اچھالے لیکن اسی وقت وہ بری طرح اچھل پڑی۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی اور ہو گا۔ واش روم کا دروازہ کھلا تھا اور کوئی واش روم کے دروازے سے باہر نکلا تھا۔ صفورہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

لیکن آنے والے کی شکل دیکھی تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شوق کی پرچھائیاں نظر آئیں اور اس کے بعد اس کے اندر وارفتگی پیدا ہو گئی۔ وہ ننگے پاؤں ہی اس طرف بھاگی اور قریب پہنچ کر اس نے کہا۔

''گرو جی مہاراج...... مہاراج ٹنڈن گوپال......''

''پاؤں چھوتے ہیں پگلی۔ گرو کے پاؤں چھوتے ہیں ہمیشہ۔ ہم تجھے گلے نہیں لگائیں گے۔ کیونکہ اگر ہم نے تجھے گلے لگا لیا تو بہت کچھ کرنا پڑے گا...... بہت کچھ......''

ایک دم سے صفورہ کو ایک عجیب سا احساس ہوا لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ ایک لہر سی آ کر گزر گئی۔ یہ سب کچھ تو سو فیصدی ہندو رسم و رواج کے مطابق ہو سکتا تھا۔ لیکن اب اس کا کون سا دین دھرم تھا جو وہ اس بات کی پرواہ کرتی۔ وہ جھکی اور اس نے ٹنڈن گوپال کے پیر پکڑ لئے۔

''جے ہو...... جے ہو...... جے ہو...... کھڑی ہو جا۔''

وہ کھڑی ہو گئی۔ ٹنڈن گوپال آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''ایک کام آ پڑا تھا تجھ سے تو ہمیں یہاں تک آنا پڑا۔''

''مجھ سے گرو جی......؟''

''ہاں تجھ سے۔''

''یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔''

''جو کچھ بھی سمجھ لے...... اگر خوش نصیبی کسی کے بھاگ میں لکھی ہوتی ہے تو

اسے ضرور مل جاتی ہے۔'' ٹنڈن گوپال نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور صفورہ بڑے اطمینان سے اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔

ٹنڈن گوپال نے ایک ہاتھ اٹھایا، اس کے سر پر سایہ کیا اور بولا۔

''ہاں صفورہ...... تیرے بھاگ میں یہ خوش نصیبی بھی لکھی ہوئی تھی۔ ورنہ ٹنڈن گوپال کا کام کرنے کے لئے تو اتنے لوگ تیار ہو جاتے ہیں کہ ان کی گنتی مشکل ہو جائے۔ کیا سمجھی؟''

''جی گرو جی مہاراج...... میں واقعی اس بات پر خوش ہوں۔''

''ہم زیادہ وقت برباد نہیں کریں گے۔ ہاں تجھے ایک بات ضرور بتائیں گے۔ یہ جس آدمی سے تیری دشمنی چل رہی ہے وہی ہمارا بھی دشمن ہے۔ میرا اور اس کا صدیوں کا جھگڑا ہے، صدیوں کا۔ بات بہت پرانی ہے صفورہ! میں تجھے بتاؤں، اس کی اور میری جنم جنم کی دشمنی ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کا عکس ہے جس نے قسم کھائی تھی کہ وہ مجھے قتل کر دے گا۔ بس یوں سمجھ لے کہ میرے من میں کالا جادو سیکھنے کی بھاونا اسی سمے سے آئی تھی اور اس کے بعد میں نجانے کیا کیا اُپائے کرتا رہا ہوں۔ سب کچھ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں معلوم کر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہی آدمی جو تیرا دشمن ہے، میرا بھی دشمن ہے۔ صفورہ! بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کو سمجھنے کے لئے صدیوں کا گیان چاہئے۔ پیش گوئی کر دی گئی تھی کہ میرے دشمن کا پوتا میری جان لینے کی کوشش کرے گا۔ پر میں نے بھی بہت بچاؤ کر لیا ہے اپنا۔ اب تو سن، کیا نام ہے اس کا جسے تُو نقصان پہنچانا چاہتی ہے؟''

''ہارون...... ہارون......''

ٹنڈن گوپال نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''ہاں ٹھیک...... اب تجھے میرا جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے اس کا دھرم چھین لے۔''

''دھرم چھین لوں؟''

''ہاں......''

''ترکیب بتائیں گے مہاراج؟''

''بھرشٹ کر دے اس کا دھرم بھی۔ پر اس کے لئے تجھے شریر دان دینا پڑے گا۔''

"شریر دان؟"

"ہاں....."

"مم..... میں سمجھی نہیں مہاراج۔"

"اپنا بدن اسے دے دے..... اسے اپنا مرد بنا لے۔ تُو کنواری کنیا ہے۔ اپنا کنوار پن اسے دے دے۔ وہ تیرا دیوانہ ہو جائے گا۔"

صفورہ کے پورے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی تھی۔ اس نے کہا۔

"مم.....مم..... مہاراج..... مم..... مہاراج....."

"منع کر دے گی ہمیں..... ہیں..... تیرا شریر ہم سے زیادہ ہے صفورہ..... تُو یہ بات سمجھ لے کہ ہم جب چاہیں تُو اپنی خوشی سے اپنا شریر ہمیں پیش کر دے۔ پر ہم بڑے کاموں کے لئے چھوٹے کام نہیں کرتے۔ جس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیں اس کی پہلی آرزو بن جائیں۔ ہم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ تو پھر کیا تُو ہمیں اس کام کے لئے منع کر دے گی؟"

"اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی مہاراج.....؟"

"ہوں..... اس کا مطلب ہے کہ تُو....."

"مہاراج میرا تعلق....."

"مذہب سے ہے۔ کون سے مذہب کی بات کر رہی ہے صفورہ؟ تیرے شریر میں ہمارے بیر پل رہے ہیں۔ اور تیرے من میں کوئی دین دھرم نہیں ہے۔ ایسی بات مت کر۔ کوئی تہذیب، کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا دھرم شکتی ہے سمجھی..... سب سے بڑا دھرم شکتی ہے..... شکتی سے بڑا دھرم اور کوئی نہیں ہے۔ اور تجھے ہمارے پاس سے شکتی مل رہی ہے۔ بول کیا کہتی ہے؟"

"مہاراج! میں آپ سے انکار نہیں کر سکتی۔ میں آپ کو بتاؤں کہ میری اور اس کی دشمنی کی وجہ یہی ہے کہ میری شادی اس سے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔"

ٹنڈن گوپال ہنسنے لگا، پھر بولا۔

"اور تُو اُس کی دشمن بن گئی؟"

"یہ ٹھکرانا مجھے اپنی نسوانیت کی توہین محسوس ہوا مہاراج!"

"پاگل ہے..... پاگل ہے..... پاگل ہے۔ میں بتاؤں تجھے، تیرے من میں اس

کی چاہت ابھر آئی۔ تُو اسے چاہنے لگی۔ پاگل ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ تُو صرف اس سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ تُو اس سے اس بات پر ناراض ہے کہ اس پر تیرا قبضہ کیوں نہیں ہو سکا۔ دیکھ، انسان چاہے کتنا ہی بلوان ہو جائے، منش کو چاہے کتنی ہی شکتی کیوں نہ مل جائے۔ ایک کمزوری اس کے اندر رہتی ہے۔ پریم بھاونا..... اپنی توہین کا بدلہ لینے کی بھاونا۔ یہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ خیر چھوڑ اس لمبی چوڑی بحث کو۔ اب یہ تجھ پر منحصر ہے کہ تُو کس طرح اسے اپنی مٹھی میں جکڑتی ہے۔

دیکھ میں اتنا لمبا فاصلہ طے کر کے تیرے پاس آیا ہوں۔ ایسی ہی ضرورت تھی۔ کچھ عرصے کے لئے میں نے اپنا آشرم بند کر دیا ہے۔ وہاں اپنے شاگردوں کو چھوڑ دیا ہے میں نے۔ میرے چیلے بس اس آشرم کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ اور جب میرا دشمن میرے ہاتھوں ختم ہو جائے گا تو میں اپنے آشرم واپس چلا جاؤں گا۔ اور سن، اس کے بدلے میں، میں تجھے ایک ایسی شکتی دے جاؤں گا کہ جیون بھر مجھے دعائیں دیتی رہے گی۔ وہ بن جائے گی جو تُو نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ میں تجھے ایک مندر میں دیوی بنا کر چھوڑ دوں گا اور تُو وہاں انسانوں کی آرزوئیں اور خواہشیں پوری کرتی رہے گی۔ تجھے ایک مہان دیوی تسلیم کر لیا جائے گا۔ وہ مہان شکتی میں تجھے دوں گا۔ بس تجھے وہ کرنا ہے جو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ اسے اپنے شکنجے میں جکڑ اور اپنا شریر اسے دے دے۔

جب تم دونوں کے جسموں کا ملاپ ہو جائے گا تو تیرے بدن کی ساری غلاظتیں اسے اپنی لپیٹ میں لے لیں گی اور اس کی ساری ایمانی قوتیں ختم ہو جائیں گی۔ بس پھر میں دیکھوں گا کہ وہ کس طرح میرا مقابلہ کرتا ہے۔ تڑپا تڑپا کر ماروں گا اسے۔ جنگلوں میں، پہاڑوں میں، گرم ریگستانوں میں۔ کیا یاد کرے گا وہ بھی کہ کس سے پالا پڑا تھا۔ ٹنڈن گوپال ہے میرا نام..... سمجھ رہی ہے ناں.....؟"

"جی مہاراج!"

"بس اب میں چلتا ہوں۔ تجھے باقی کام خوش اسلوبی سے کرنا ہے۔"

ٹنڈن گوپال کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چرن چھو میرے....." وہ بولا اور صفورہ نے جلدی سے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ ٹنڈن گوپال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ آہستہ سے مڑا اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچا اور پھر دروازے سے باہر

نکل گیا۔

صفورہ ایک لمحے تک سوچتی رہی پھر وہ دوڑ کر دروازے پر پہنچی۔ اس نے دروازے کے باہر جھانکا۔ دونوں طرف کی راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کا کمرہ درمیان میں تھا۔ لفٹ تک پہنچنے کے لئے بھی وقت درکار ہوتا تھا۔ مگر ٹنڈن گوپال کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور دروازہ بند کر کے واپس مڑ گئی۔ اس کے سارے وجود پر ایک عجیب سے احساس کا حملہ ہوا تھا۔ ہارون اس کی محبت نہیں تھا، اس کی چاہت نہیں تھا۔ ٹنڈن گوپال کو یہاں غلط فہمی ہوئی ہے۔

مگر گرو مہاراج تھے اس کے...... کیا کہتی ان سے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی سچائی تھی کہ آج تک کوئی اس کے دل کے دروازے سے اندر داخل نہیں ہو سکا تھا۔ جبکہ ٹنڈن گوپال کہہ رہے تھے کہ وہ ہارون کو چاہتی ہے۔ نہیں گرو مہاراج! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہے آپ کی گرو مہاراج! یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں...... میں ایسا کیسے کرلوں؟ ایک کنوار پن ہی تو میری جاگیر ہے، میری میراث ہے۔ اسے بھی آپ کی نظر کر دوں؟''

وہ بہت دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی...... آہ کرنا پڑے گا...... ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ واقعی یہ بہت بڑی بات ہے کہ گرو مہاراج نے مجھے اپنے کسی کام کے لئے منتخب کیا ہے۔ مگر وہ کہانی بھی عجیب وغریب ہے جو انہوں نے مجھے سنائی ہے کہ ان کی موت...... یہ سارے الجھاوے میرے بس سے باہر ہیں۔ ٹھیک ہے...... اگر ایسا ہے تو ایسا ہی کرنا ہوگا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ہارون سے رابطہ کرنے کے لئے تیار ہوگئی کیونکہ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا۔

افشاں اور اشعر اس تکلیف دہ جگہ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ دونوں ماں بیٹا حواس کھوئے ہوئے تھے۔ وہ نہ کبھی اپنے بارے میں سوچتے تھے نہ انہیں کسی چیز سے کوئی احساس ہوتا تھا۔ ماں بیٹا آپس میں باتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ اس وقت اشعر ماں سے کہہ رہا تھا۔

''ماما...... تم میری ماما ہو ناں؟''

''ہاں بیٹا...... کیا بات ہے؟''

''ماما زمین پر سوتے ہوئے میری پیٹھ میں درد ہو جاتا ہے ماما...... ایسا کیوں ہونے لگا ہے؟''

''بیٹے! بدن تو میرا بھی دکھ جاتا ہے۔''

''ماما...... مجھے ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں پوچھو......''

''ماما...... کیا ہم کبھی اچھے گھر میں رہتے تھے؟''

''اچھا گھر......؟''

''ہاں ماما...... ایسا جہاں سونے کے لئے زمین نہیں ہوتی، کچھ اور ہوتا ہے۔''

''پتہ نہیں بیٹا...... سمجھ میں نہیں آتا۔''

''ماما! یہ آدمی کون ہے جو ہمیں کھانے پینے کی چیزیں لا کر دیتا ہے؟''

''بیٹا! یہ ماما ہے تمہارا۔''

''ماما......؟''

''ہاں...... ماما۔''

''ماما...... ماما تو تم ہو۔ پھر یہ ماما کہاں سے آ گیا؟''

''مجھے بھی نہیں پتہ بیٹے۔''

''ماما! ہم کون ہیں؟''

''بیٹا! تم میرے بیٹے ہو، میں تمہاری ماں ہوں۔''

''بس......؟''

''اور ...... وہ تمہارا ماما ہے۔''

''ماما کون ہوتا ہے آخر؟''

''بیٹا ماما کا بھائی۔''

''اوہو...... تو وہ تمہارا بھائی ہے؟''

''ہاں بیٹا! بھائی ہی ہے۔''

''ماما! تمہیں کیسے معلوم ...... جبکہ مجھے تو یہ بات نہیں معلوم تھی۔''

''مجھے بھی نہیں معلوم تھی بیٹا! مگر وہ یہی کہتا ہے کہ وہ میرا بھائی ہے۔''

''ماما! اب ہم کیا کریں گے؟''

''کچھ نہیں بیٹا۔''

''یہیں رہیں گے؟''

''ہاں۔''

''زندگی بھر......؟''

''تو اور کیا بیٹا۔''

''پتہ نہیں کیوں ماما! مجھے یوں لگتا ہے کہ زندگی [illegible] دکھی ہوتی ہے۔''

''ہوتی ہوگی بیٹا! مجھے نہیں معلوم۔''

یہ ساری باتیں بابو خان سن رہا تھا اور نجانے کیوں اس کے دل میں ایک بھونچال سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم خوفزدہ سا ہو گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے اور آسمانی بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے اوپر دیکھا ایک زور دار تڑاخہ ہوا۔ بجلی چمکی اور اسے یوں لگا جیسے اس پر بجلی گری ہو۔ اس کا سارا وجود ایک لمحے کے لئے خوف و دہشت میں نہا گیا تھا۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اور پھر اس کے اندر ایک خوف پیدا ہو گیا......

یہ کیا ہے ...... یہ کیا ہے ...... کیا ہوا ہے یہ ...... یہ کیسے ہو گیا ...... میں ...... میں ...... میں اتنا بڑا درندہ کیسے بن گیا؟ دو معصوم انسان زندگی سے محروم ہیں اور صرف چند پیسوں کے لئے میں نے انہیں قید کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں؟ کون ہیں؟ کیسے ہیں؟

آہ، یہ تو مناسب نہیں ہے۔ کیا کرنا چاہئے؟ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ آخر خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ بے شک جرم کرنا پڑتا ہے زندہ رہنے کے لئے، اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لئے۔ لیکن یہ جرم...... کیا یہ جرم قابل معافی ہو گا؟ خدا مجھے معاف کر دے گا؟

جب انسانوں کے لئے بہتری کا تصور بیدار ہوتا ہے تو قدرت کی طرف سے وہ اسباب پیدا کئے جاتے ہیں جو اس کے حق میں ہوں۔ اور یہی ہو رہا تھا۔ بابو خان کے دل میں جو احساس جاگا تھا وہ قدرت کی طرف سے تھا۔ ایک دم سے اس کے اندر ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ سوچتا رہا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ نہیں، ان ماں بیٹے کو صرف چند روٹی کے ٹکڑوں کے لئے قید نہیں رکھا جا سکتا۔ غلط...... غلط ہے یہ سب کچھ۔''

اور اس کے بعد وہ فیصلہ کرنے لگا۔ اس کی ایک دور کی رشتے کی بہن جو بیوہ تھی ایک دور دراز علاقے میں رہتی تھی۔ اس بیوہ بہن کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بابو خان ان کی کفالت کرتا تھا۔ جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ انہیں پہنچا دیا کرتا تھا اور وہ بابو خان کے سہارے ہی زندگی گزار رہے تھے۔ اس وقت جب اسے یہ خیال آیا تو اسے اپنی بیوہ بہن یاد آئی۔ فی الحال تو یوں کرنا چاہئے کہ ان ماں بیٹوں کو اپنی بہن کے پاس منتقل کر دینا چاہئے اور اس کے بعد یہ کوشش کرنا ہو گی کہ انہیں ان کا ماضی واپس مل جائے۔ کوئی حادثہ ہوا ہے بے چاروں کے ساتھ جو وہ اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہیں۔ شکل و صورت سے بھی، ہاتھ پاؤں سے بھی وہ اچھے گھرانے کے فرد معلوم ہوتے ہیں۔ نجانے ان ماں بیٹے کے ساتھ کیا افتاد بیتی ہے۔ نجانے یہ صفورہ کون ہے؟

صفورہ نے اس سے رابطہ قائم کیا تھا اور بابو خان نے مناسب معاوضہ لے کر ان دونوں کو اپنا قیدی بنا رکھا تھا۔ بہرحال وہ سوچتا رہا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ گھر سے باہر نکل کر وہ ایک تانگہ لے آیا۔ تانگے والے کو دروازے پر کھڑا کیا۔ اب اس کے دل میں نیکیاں جاگ اٹھی تھیں۔ اندر پہنچنے کے بعد اس نے افشاں سے کہا۔

''آؤ بہن! چلنا ہے تمہیں۔''

''کہاں......؟'' افشاں نے سوال کیا۔

''دوسرے گھر میں۔''

اشعر خوش ہو گیا تھا۔ ''ماما! ہم دوسرے گھر میں جائیں گے۔ یہاں میرا بالکل دل نہیں لگتا۔''

اور دونوں ماں بیٹا معصوم بھیڑوں کی طرح نکل آئے۔ بابو خان نے انہیں تانگے میں بٹھایا اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تانگہ چل پڑا۔ بابو خان نے دل میں سوچا تھا کہ وہ خوبصورت عورت جو عورت بھی نہیں بلکہ لڑکی ہے بہت بڑی چڑیل معلوم ہوتی ہے۔ اس کی خوبصورتی کے پیچھے ضرور کوئی پراسرار راز چھپا ہوا ہے۔ کہیں وہ نظر نہ آ جائے۔ اسے بابو خان پر مکمل اعتماد ہو چکا تھا۔ بابو خان نے اسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ یہ دونوں ماں بیٹا کبھی اس کی قید سے نہیں نکل سکیں گے۔ ویسے بھی ان کے ذہن کھو چکے تھے۔

بہر حال راستہ طے ہوتا رہا۔ راستہ کافی تھا۔ لیکن آخر کار وہ بہن کے پاس پہنچ ہی گیا۔ چھوٹا سا کٹیا نما گھر تھا جس میں بابو خان کی بہن رشیدہ اپنی زندگی گزارتی تھی۔ بھائی ان کی کفالت کرتا تھا لیکن وہ خود بھی کچھ سینا پرونا کر لیا کرتی تھی اور محلے کے لوگ بھی اس کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کرتے تھے۔ دونوں بچے بڑے پیارے تھے جنہیں اس نے سکول میں داخل کرا رکھا تھا۔ بابو خان کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔

''کیا...... تم جلدی کیسے آ گئے ...... ارے یہ کون ہیں؟ کیسا پیارا بچہ ہے۔ آؤ بہن آؤ۔'' رشیدہ نے افشاں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا۔ بابو خان بھی اندر داخل ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''رشیدہ! اسے بھی تُو میری بہن ہی سمجھ لے۔''

''ٹھیک ہے بھیا! منہ بولی بہن ہے تمہاری؟''

''ہاں ...... منہ سے جو کچھ بول دیا جائے وہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔ لوگ منہ کی کہی بھول جاتے ہیں۔ پر رشیدہ، یہ بھولنے والی چیز نہیں ہے۔ میں اسے تیرے پاس لایا ہوں۔ یہ پیسے رکھ۔ کھانے پینے کا انتظام کر لینا جیسے کرتی ہے۔ تھوڑے دن یہ تیرے پاس رہے گی اس کے بعد اللہ مالک ہے، اس کا کوئی سہارا مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے......''

''ایک اور بات کہوں رشیدہ! یہ بیچاری اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔ اس سے اس کے ماضی کے بارے میں مت پوچھنا۔''

''اس کا بیٹا بھی؟''

''ہاں دونوں بیچارے کسی حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ تم ان سے ان کے ماضی کے بارے میں مت پوچھنا۔ البتہ دعا کرنا ان کے لئے کہ انہیں ان کا ماضی یاد آ جائے اور یہ بہتر حالت میں زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔''

''ٹھیک ہے ...... تم پرواہ مت کرو بھیا!'' رشیدہ نے پُر محبت لہجے میں کہا۔ بابو خان نے ایک نگاہ افشاں کو دیکھا اور کہا۔

''یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی بہن! رشیدہ، ان لوگوں کو بہت اچھے بستر دے دینا۔ بستر تو ہیں ناں تمہارے پاس۔''

''کئی گدے، چادریں، تکیے پڑے ہیں بھیا! تم فکر مت کرو۔ اب تمہارے مہمان میرے مہمان ہیں۔ تم ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔'' رشیدہ نے جواب دیا اور بابو خان نے گردن جھکا لی۔ اور پھر ایک نگاہ اس نے ان دونوں کو دیکھا اور افشاں سے بولا۔

''بہن ...... میں چاہتا ہوں تم اطمینان سے یہاں رہو۔ تمہیں اب یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔''

افشاں نے معصومیت سے گردن ہلا دی تھی۔

بابو خان نے ایک بار پھر رشیدہ کو ہدایات دیں اور اس کے بعد وہاں سے آ گیا۔ یہ کام اس نے نیک جذبوں کے ساتھ کیا تھا۔ برا آدمی تھا اور ہر برے آدمی کے عقب میں ایک داستان ہوتی ہے۔ انسان فطری طور پر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس حالات اس کے راستوں کا تعین کرتے ہیں۔ کچھ لوگ برے راستوں پر جانے سے اپنے آپ کو روک لیتے ہیں۔ بعض لوگ بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں اور پھر ان کے لئے اور کوئی جگہ نہیں رہتی۔ بابو خان کوئی بہت بڑا مجرم نہیں تھا۔ بس چھوٹے موٹے کام کر لیا کرتا تھا۔ چوریاں بھی کی تھیں اس نے۔ نقب زن بھی تھا۔ جیب تراشی البتہ نہیں آتی تھی کیونکہ اس میں باقاعدہ کسی استاد کی شاگردی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن ہیرا پھیری کے اور بھی بہت سے کام کر لیا کرتا تھا۔ لڑائی جھگڑوں میں بھی ملوث ہو جایا کرتا تھا۔ بس زندگی اپنے طور پر گزار رہا تھا۔ ایک کوٹھے والی سے دوستی تھی۔ جب بھی دل گھبراتا تو اس کے پاس چلا جاتا۔ وہاں تو پیسے کا خرچ ہوتا ہے۔ بہر حال اس طرح کے معاملات تھے۔ وہ رشیدہ کے پاس سے نکل کر باہر آ گیا۔ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ خیال دامن گیر تھا۔ البتہ ایک بات اس کے

دماغ میں ضرور تھی۔ وہ لڑکی جس نے اسے اس کام پر آمادہ کیا تھا اسے کافی خطرناک اور پُراسرار لگتی تھی۔ بابو خان، صفورہ سے کیا ڈرتا لیکن ایک عجیب سا احساس ایک عجیب سا خوف اس کے دل پر تھا۔

بہتر تو یہ ہوگا کہ صفورہ سے دور ہی رہا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنے ایک دوست کے پاس پہنچ گیا۔ اس دوست کا نام سعید تھا۔ سعید بھی اسی کی لائن کا آدمی تھا اور اکثر دونوں نے مل کر بھی کام کیا تھا۔ سعید نے ان دنوں ایک بنگالی لڑکی کو رکھا ہوا تھا جس کے بارے میں اسے بتایا تھا کہ اسے خرید کر لایا تھا۔ بڑی سیدھی سادھی اور معصوم سی لڑکی تھی۔ سعید کے گھر کو اس نے اس طرح سنبھال لیا تھا جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو اور وہ سعید کی بیوی ہو۔

بابو خان نے دروازہ بجایا۔ روبینہ ہی نے دروازہ کھولا تھا اور پھر بنگالی لہجے میں اس نے اُردو بولتے ہوئے بتایا کہ سعید گھر پر موجود ہے۔ اندر سے سعید کی آواز آئی۔

''کون ہے......؟''

''بابو خان ہوں یار! اجازت ہو تو اندر آجاؤں؟''

''اچھا اب اجازت لے کر اندر آئے گا تو'' سعید نے کہا اور بابو خان مسکراتا ہوا اندر پہنچ گیا۔

''کیا ہوا بھئی؟''

''بس یار پچھلے دنوں کچھ طبیعت خراب رہی تھی۔ ہلکی بخار ہو گیا تھا۔ آرام کر رہا ہوں گھر پر۔''

''بھابی تو کافی نکھر گئی ہے۔ نکاح کیا تو نے اس سے یا ابھی تک نہیں؟''

سعید جیسے تڑپ سا گیا۔ ایک لمحے تک خاموش رہا پھر بولا۔

''بیٹھ...... بیٹھ تو سہی۔''

بابو خان ہنستا ہوا بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''سب سے پہلے بھابی سے چائے کے لئے کہہ دے۔''

''روبینہ چائے بنا لو۔''

''جی بابو صاب۔'' روبینہ نے کہا۔

''بابو صاحب کہتی ہے اب بھی تجھے؟''

''بابو! ایک بات کہوں تجھ سے؟''

''ہاں...... ہاں بول۔''

''یار ہم بہت برے لوگ ہیں۔ معاشرے کا گند۔ دنیا بھر کی نفرتوں کا شکار۔ ٹھیک ہے وقت نے ہمیں یہ راستے دکھا دیئے لیکن ایک بات بتا، کیا ہمیں خود بھی اپنے آپ سے نفرت کرنی چاہئے؟''

''یار سعید! تُو ٹھہرا پڑھا لکھا آدمی۔ اپن تو جاہل ہیں۔ ہم سے ایسے گاڑھے سوال مت کیا کر۔''

''نہیں، سوال گاڑھا نہیں ہے۔ تُو مجھے پڑھا لکھا آدمی کہتا ہے ناں...... علم کی ہر کتاب انسان کو سیدھے اور سچے راستے دکھاتی ہے۔ ہر کتاب ایک ہی بات کہتی ہے، جہاں علم سیکھنا ہو وہاں علم سیکھو۔ اور علم یہ بھی ہے کہ دنیا کے اچھائی کے راستے اپناؤ۔ یار میں نے پڑھ لکھ کر اپنے لئے ایک اچھی زندگی تلاش کی تھی مگر نہیں ملی۔ برے لوگ مل گئے جنہوں نے روٹی کا آسرا دیا اور مجبوراً مجھے ان کی برائیوں میں شریک ہونا پڑا۔ لیکن میں نے اپنے آپ سے نفرت کبھی نہیں کی۔ میں جانتا ہوں کہ دنیا ہم سے نفرت کرتی ہے اور کرنی بھی چاہئے۔ جسے ہمارے ہاتھوں سے کوئی تکلیف پہنچے گی، جس کا ایک روپیہ بھی ہم ناجائز طریقے سے اپنے قبضے میں لے آئیں گے وہ ہم سے محبت تو نہیں کرے گا۔ ہم نے دنیا کی نفرت قبول کر لی۔ اس لئے کہ دنیا نے ہمیں یہی سب کچھ دیا۔ لیکن میرے پیارے بھائی! مجھے یہ بتاؤ کہ ہم اپنے آپ سے نفرت کیوں کریں؟''

''ابے یار! چائے آنے سے پہلے تو میری کھوپڑی بالکل خالی کر دے گا۔''

''نہیں...... تُو نے ایک بے وقوفی کی بات کی ہے۔ مجھے دکھ ہوا ہے تیری بات پر۔''

''ارے...... ارے...... کون سی ایسی بات کہہ دی میں نے؟''

''روبینہ کو تُو نے بھابی کہا۔ مجھے مشورہ دے رہا ہے کہ میں اس سے نکاح کر لوں۔ کیوں؟ کیا سمجھ رہا ہے تُو؟ ...... روبینہ کے بارے میں بتاؤں، ہماری لائن کے ہی ایک آدمی نے جو اس طرح کی خرید و فروخت کا دھندا بھی کرتا ہے روبینہ کو پتہ نہیں کہاں سے اغواء کیا۔ اس کا کوئی نہیں ہے اب اس پوری دنیا میں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اسے برے لوگوں میں بھیج دے گا۔ ہو سکتا ہے اسے کوٹھے پر بھی پہنچا دیا جائے۔ یار برائیاں تو میں نے بہت ساری کی ہیں۔ میں نے اس سے اس کی قیمت پوچھی۔ اتفاق

سے اتنے پیسے میرے پاس تھے۔ میں اسے یہاں لے آیا۔ میرا تو اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ یہاں لانے کے بعد میں نے اسے رکھا۔ یہ بیچاری یہی سمجھتی تھی کہ میں اس کا مرد بنوں گا۔ مگر میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی بہن بنا لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ روبینہ، سعید تیرا بھائی ہے۔ بہن کی طرح اس گھر کو سنبھال۔ میں برا آدمی ہوں لیکن کوشش کروں گا کہ تیری زندگی کے لئے سہارا بن جاؤں۔ دیکھیں آگے قدرت کیا کہتی ہے۔ بابو خان! میری بہن ہے یہ۔ بہنوں سے نکاح نہیں کئے جاتے اور کسی کو بغیر سوچے سمجھے بھائی نہیں کہا جاتا۔''

بابو خان کا دل دہشت سے سکڑ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سعید کو دیکھتا رہا۔ اس پر بھی نیکی کے احساس کا حملہ ہوا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور سعید کے پاؤں پکڑ لئے۔

''ارے...... ارے...... ارے او بے وقوف آدمی! کیا کر رہا ہے؟''

''غلطی ہو گئی...... بہت بڑی غلطی ہو گئی سعید! معافی مانگتا ہوں۔ ہم برے لوگ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم برے لوگ ہیں؟ کم از کم تو برا آدمی نہیں ہے سعید۔ اور میرا ایمان ہے کہ خدا تجھے تیری اس نیکی کا ضرور صلہ دے گا۔''

''آمین......'' سعید نے کہا۔

بابو خان تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''میرا بھی ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیا......؟'' سعید نے سوال کیا اور بابو خان اسے تفصیل بتانے لگا۔ پھر بولا۔

''وہ لڑکی مجھے کافی پراسرار لگتی ہے۔ رابطہ کئے ہوئے ہے مجھ سے۔ پولیس ان دونوں کی تلاش میں میرے گھر پہنچے گی۔ میں کچھ دن کے لئے روپوش ہونا چاہتا ہوں۔''

''تو آرام سے یہاں رہ سکتا ہے۔ بلکہ اگر ضرورت سمجھے تو ان ماں بیٹے کو بھی یہاں لے آ۔ آگے بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔''

''ہاں...... ہاں...... ذرا اس لڑکی سے چھٹکارہ مل جائے۔ اس کے بعد دیکھوں گا اور سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔''

''تو آرام سے یہاں رہ...... ساری باتیں میں تجھے بتا چکا ہوں۔'' سعید نے کہا اور بابو خان نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

ہارون شدید بے چینی کا شکار تھا۔ نجانے وہ کون لڑکی ہے؟ اس کا ذہن بری طرح بھٹکا ہوا تھا۔ بے حد پریشان تھا وہ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے رہتے تھے۔ ماضی کا ایک ایک نقش ذہن پر اُجاگر ہوتا رہتا تھا۔ بہت ہی پیارا تھا اس کا بیٹا اور بہت ہی اچھی تھی افشاں۔ نجانے کیا افتاد پڑی بے چاری پر۔ لیکن ایسی لڑکی کون ہو سکتی ہے جس نے افشاں کو اغوا کیا اور وجہ کیا تھی؟ مقصد کیا تھا؟ کامران اس کے لئے سب کچھ چھوڑ چکا تھا اور خود اس کے ساتھ رہتا تھا۔ دلاسے بھی دیتا تھا اور اپنے طور پر اس کا دل بھی بہلائے رکھتا تھا۔ افشاں کی تلاش کے سلسلے میں ہر کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ہارون پولیس سے بچنا چاہتا تھا۔ اس نے کامران کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

''یار! میں وہ روایتی جملے نہیں دہرانا چاہتا۔ مگر تم بھی جانتے ہو کہ ہم ایک نئے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ میں اپنے طور پر ہی کوششیں کرنا چاہتا ہوں۔''

پھر ہارون کو وہ فون موصول ہوا اور وہ کامران کی طرف دوڑ گیا تھا۔

''کامران! ایک عجیب بات ہوئی ہے۔'' اس نے کامران کو ساری تفصیل بتائی اور کامران بھی سنسنی کا شکار ہو گیا۔

''ایسی کوئی لڑکی تمہارے ذہن میں آتی ہے جو اس طرح کی کوئی حرکت کر سکے؟''

''بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔''

''اور وہ تم سے کیا چاہتی ہے؟''

''یہ تو اس سے ملاقات پر ہی پتہ چلے گا۔''

''کیا کریں کیا نہ کریں۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

''انتظام کر لو...... ویسے میں نے اغواء برائے تاوان کے بارے میں بھی سوچا ہے۔ ایسے کام تحقیقات کے بغیر نہیں کئے جاتے۔ ہم سے کوئی مانگے گا تو کیا مانگے گا۔ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔''

بہر حال دونوں دوست باتیں کرتے رہے۔ وقت کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہے تھے۔ پھر خدا خدا کر کے رات گزری۔ دوسرے دن کافی وقت کے بعد ہارون کو ٹیلی فون موصول ہوا۔

''ہیلو......'' ہارون نے بے تابی سے کہا۔

''کیسے ہیں مسٹر ہارون؟''

''آپ......آپ......''

''ہاں...... میں وہی ہوں جو کل تم سے گفتگو کر رہی تھی۔''

''ہاں...... میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ دیکھو ایک بات سنو۔ کیا واقعی تم میری بیوی اور بچے کے بارے میں جانتی ہو؟''

''نہ صرف جانتی ہوں بلکہ اب تمہیں یہ بتا رہی ہوں کہ دونوں میرے پاس ہیں۔''

''آہ...... کون ہو تم؟ اور وہ تمہارے پاس کیوں ہیں؟''

''جواب چاہتے ہو؟''

''ہاں......''

''تو پھر پتہ بتائے دیتی ہوں۔ آؤ، مجھ سے ملو۔ لیکن کسی فریب کے بغیر۔ جہاں میں تم سے ملاقات کروں گی وہاں تمہاری بیوی اور تمہارا بچہ نہیں ہوگا۔ وہ کہیں اور ہوں گے اور ایسے لوگوں کے پاس ہوں گے جن سے اگر میرا رابطہ نہ ہوا تو وہ صرف ایک کام کریں گے، دونوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں کسی ویرانے میں پھینک دیں گے۔''

''نہیں ...... تم بے فکر رہو۔ میں ہر قیمت پر اپنی بیوی اور بچے کی بازیابی چاہتا ہوں۔ ایک بات اور بتا دو مجھے۔ کیا تم ان کے بدلے مجھ سے کوئی رقم طلب کرو گی؟ دیکھو میں......''

''نہیں، بالکل نہیں ...... بھول جاؤ اس بات کو۔ کوئی رقم وغیرہ مجھے درکار نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے ...... مجھے بتاؤ کہ میں کہاں آؤں تمہارے پاس؟''

''میرے ہوٹل کا پتہ نوٹ کر لو اور سیدھے چلے آؤ۔ اور تنہا آؤ گے۔ کوئی ساتھ نہیں ہوگا۔ میری شرائط کو مذاق مت سمجھنا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو۔''

''میں تنہا ہی آؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔'' ہارون نے کہا۔ اسے پتہ بتا دیا گیا اور وہ کامران کو دیکھنے لگا۔

''کامران! اس نے مجھے تنہا بلایا ہے۔''

''باتوں سے سمجھ رہا تھا میں۔ پھر؟''

''تنہا ہی جاؤں گا۔''

''سوچ لو، کوئی نقصان نہ پہنچ جائے تمہیں۔''

''نہیں میرے دوست! افشاں کے بغیر ویسے بھی زندگی ادھوری ہے۔ زیادہ سے زیادہ کیا نقصان پہنچ سکتا ہے مجھے۔ میں تو خود اپنی زندگی ختم کرنے پر آمادہ ہوں۔''

''نہیں، حوصلہ نہ ہارو۔ میں تمہارا تعاقب نہیں کروں گا۔ لیکن بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گا۔''

''مجھے اجازت دو میرے دوست!'' ہارون نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور پھر ایک لٹے پٹے انسان کی حیثیت سے باہر نکل آیا۔ وہ اسی ہوٹل کی جانب جا رہا تھا جس کا اسے پتہ بتایا گیا تھا۔

❁

صفورہ شدید کشمکش میں گرفتار تھی۔ سب کچھ کھو چکی تھی۔ اپنا دین، ایمان، ماں باپ کی محبت، کچھ بھی نہیں رہا تھا اس کے پاس۔ نجانے دل کے کون سے گوشے میں عزت و عصمت کا احساس رہ گیا تھا۔ لیکن ٹنڈن گوپال نے اب اس کی قربانی بھی مانگ لی تھی۔ صفورہ کبھی کبھی اپنی سوچوں کے دائرے میں ہوتی تھی۔ ایک شوق، ایک وارفتگی تو بے شک دل میں تھی۔ اپنے آپ کو وہ عام انسانوں سے بلند پاتی تھی۔ کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا تھا۔ اس کے بدن میں خون کے ذرات کی طرح پیدا ہونے والے بیر اس کی ہر طرح سے حفاظت کرتے تھے، اس کی ہر خواہش کی تکمیل کرتے تھے۔ اور وہ درحقیقت اپنے آپ کو بہت سوں سے بلند سمجھنے لگی تھی۔ اب تک کے پیش آنے والے واقعات یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ جب اور جسے چاہتی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اپنے قدموں تلے لا سکتی تھی۔ اس چیز نے اس کے اندر بڑی سرکشی پیدا کر دی تھی۔

اچھے اچھے طاقت کے زعم میں برے احساسات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ خود بھی ایسی ہی ہو گئی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اس کے اندر بس یہ احساس باقی تھا کہ وہ اس طرح پامال ہونے کے لئے نہیں ہے اور اس احساس کو قتل کرتے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن بہرحال ٹنڈن گوپال کی خواہش تو پوری کرنی ہی تھی۔ ٹنڈن

گوپال نے اسے حکم دیا تھا کہ ہارون کو اپنے بدن کی پیشکش کر دے۔

بہر حال مجبوری۔ وہ ہارون کو فون کرنے کے بعد اس کا انتظار کرنے لگی۔ پھر جب ہوٹل کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بہت نڈر ہو چکی تھی وہ اس دوران۔ لیکن ماضی کے احساسات ہر احساس پر حاوی ہوتے ہیں۔ بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھال کر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''کون ہے...... آ جاؤ۔''

اور دروازہ کھول کر ہارون اندر داخل ہو گیا۔ سرخ و سفید رنگت، گھنے گہرے سیاہ بال، انتہائی دلکش نقوش، بھرا بھرا بدن۔ آج بھی اس کی شخصیت اتنی ہی شاندار تھی۔ لیکن صفورہ پہلے بھی اس شخصیت سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو بس اس لئے برگشتہ ہو گئی تھی کہ ہارون نے اسے ٹھکرا کر افشاں کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیا تھا۔ اس وقت بھی اس کے دل پر کسی کا نقش نہیں تھا لیکن اس وقت اس نے ہارون کو دیکھا تو ایک دم اسے ٹنڈن گوپال کے الفاظ یاد آ گئے۔ ٹنڈن گوپال نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ ہارون کو پہلے اپنا مرد بنا لے۔ اپنا جسم اسے سونپ دے۔

بہر حال اس نے تعریفی نگاہوں سے ہارون کو دیکھا جبکہ ہارون کے چہرے پر حیرت کے نقوش تھے۔ وہ کچھ قدم اور آگے بڑھا اور اس نے آہستہ سے کہا۔

''صفورہ!''

''تھینکس گاڈ...... پہچان لیا تم نے مجھے۔ میرا تو خیال تھا کہ میں تمہارے ذہن سے نکل چکی ہوں گی۔''

''صفورہ! میں تم سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟''

''ہاں...... ہاں بولو۔''

''کیا تم وہی لڑکی ہو جس نے مجھے ٹیلی فون پر یہاں آنے کی دعوت دی تھی؟''

''حیران ہو......؟''

''تم وہی لڑکی ہو صفورہ؟''

''ہاں...... ہوں۔''

''صفورہ! افشاں کہاں ہے؟ تم نے کہا تھا کہ وہ......''

''اتنی جلد بازی ہارون! اتنے عرصے کے بعد ملے ہو اور ملتے ہی اپنی پسند کا سوال۔''

''صفورہ! افشاں کو تم نے اغواء کیا ہے؟''

''بہت برا لفظ ہے...... بہت برا لفظ استعمال کیا ہے تم نے۔ تمہارے خیال میں، میں خواتین کو اغوا کرنے والی لگتی ہوں؟ اور کوئی الزام دو گے ہارون! بیٹھو تو سہی۔''

''صفورہ! میں بہت پریشان ہوں۔ میرا بیٹا اور افشاں خیریت سے تو ہیں ناں؟''

''بالکل ٹھیک ہیں...... تم یہ سمجھ لو کہ میں نے انہیں......''

''کہاں ہیں وہ......؟'' ہارون نے بے قراری سے سوال کیا۔

''ہارون! سنجیدگی اختیار کرو۔ بہت بھولے ہو تم...... بہت سیدھے ہو۔ مجھ سے بات کرو۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا صفورہ! تمہیں افشاں سے یا مجھ سے کیا شکایت ہو گئی کہ تم نے یہ قدم اٹھایا۔''

''ٹھیک ہے...... تم مجھے نگیٹو ہی سمجھ لو ہارون! تم میرے دل میں تھے۔ میں تمہیں اس وقت نہیں جانتی تھی جب تمہارے نام کے ساتھ میرا نام جوڑا گیا۔ حاجی عطا صاحب نے تمہاری بڑی تعریفیں کیں۔ تمہارے بارے میں ایک عجیب و غریب انداز اختیار کیا انہوں نے اور پھر میرے ذہن میں یہ نقش لایا گیا کہ مجھے تمہاری زندگی میں لایا جا رہا ہے۔ اصل میں ہارون! تم میرے مزاج سے واقف نہیں تھے۔ کوئی نہیں تھا میرے دل میں اور کوئی نہیں ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے تو ہارون! میں خاکستر ہو گئی۔ میرا رواں رواں غم میں ڈوب گیا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے تم سے عشق تھا بلکہ اس لئے کہ کیا میں ٹھکرائے جانے کے قابل ہوں؟ اس قدر دل برداشتہ ہوئی میں کہ میرے والدین مجھے ملک سے باہر لے گئے۔ نجانے کتنا عرصہ میں شدید کرب و اذیت کا شکار رہی اور آخر کار میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ لندن کی فضاؤں میں، میں نے خود کو گم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب کبھی میرا پندارِ نسوانیت جاگتا، مجھے یہی احساس ہوتا کہ میں ایک ٹھکرائی ہوئی شے ہوں۔ ہارون! جب میں کسی بھی طور اپنے آپ کو اس اذیت سے دور نہ کر پائی تو میں نے اپنے والدین سے کہہ دیا کہ وطن واپس چلیں۔ ہم لوگ یہاں آ گئے۔ میں نے تمہارا پتہ لگایا۔ افشاں اور اشعر کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تو میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مجھے تم سے انتقام لینا چاہئے۔ اور اس کے بعد میں نے ان دونوں کو اغواء کر لیا۔ اب وہ میرے پاس ہیں۔''

ہارون سکتے کے عالم میں یہ داستان سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''صفورہ! یقین کرو میں تمہیں ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو بس یوں سمجھ لو کہ افشاں میرے دل کو بھا گئی تھی۔ اور چونکہ مجھے تمہاری کیفیت کا کوئی علم نہیں تھا اس لئے......''

''ہوتا ہے...... کہانیاں ایسے ہی بنتی ہیں۔''

''افشاں خیریت سے تو ہے نا...... وہ تو بہت پریشان ہوگی۔''

''خوش ہے...... کوئی پریشانی نہیں ہے اسے۔''

''صفورہ! یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہے...... میں تمہیں دکھاؤں گی، ثابت کر دوں گی۔ وہ کتنی مطمئن ہے اور اشعر بھی۔''

''تو پھر مجھے بتاؤ میں اپنے اس جرم کی تلافی کیسے کروں؟''

''وقت بہت بدل چکا ہے ہارون! میں بھی بہت بدل چکی ہوں۔ لندن میں، میں نے کسی بھی کردار کو نہیں اپنایا۔ لیکن انسان تو ہوں نا۔ ہارون! تم افشاں سے ملنا چاہتے ہو؟''

''ہاں صفورہ...... فوراً...... ابھی...... اسی وقت۔''

''احمقانہ خیال ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''ہارون! مجھے معاف کرنا۔ یورپ میں زندگی گزاری ہے میں نے اور وہاں کے بہت سے اصول اپنا لئے ہیں۔ سمجھ رہے ہو...... زندگی میں جو کچھ خواہش دل میں پیدا ہو اس کی تکمیل کر ڈالنی چاہئے۔ ہارون! میں اپنی شکست کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔''

''کیسے......؟''

''تمہیں مجھے قبول کرنا ہوگا۔''

''م...... مطلب......؟'' ہارون نے پریشانی سے کہا۔

''مطلب میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' صفورہ پر ایک دم عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے لباس کے بٹن کھولنا شروع کر دیئے۔ ہارون بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ صفورہ نے اپنا اوپری بدن برہنہ کر دیا۔ ہارون کی آنکھیں جھک گئیں۔ اچھے کردار کا انسان تھا۔ بہت ہی سادہ لوح اور نیک فطرت۔ صفورہ کا یہ انداز اسے پانی پانی کر گیا۔ صفورہ کا ہاتھ زیریں لباس کی طرف گیا تو اس نے کہا۔

''خدا کے لئے صفورہ...... خدا کے لئے...... تم جذبات میں اتنی اندھی ہو گئی ہو

کہ اپنا مقام بھی بھول گئیں۔''

''تقریریں مت کرو...... نصیحتیں مت کرو۔ میں نے تم سے کہا نا میرا اندازِ فکر بدل چکا ہے۔ افشاں سے ملنا چاہتے ہو نا؟ میرے بدن کی مانگ پوری کر دو۔ میرے انتقام کی پیاس بجھا دو۔ مجھے......''

''صفورہ...... صفورہ پلیز! لباس پہن لو۔''

''نہیں...... افشاں سے ملنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔''

''میری بات تو سن لو...... اتنی جلد بازی کیوں کر رہی ہو؟ میں تم سے بات کروں گا۔ پلیز، مجھے اپنے آپ سے نگاہ ملانے کا موقع تو دو۔''

''جاہل...... دیسی...... گنوار......'' صفورہ نے کہا اور اپنا لباس دوبارہ پہن کر اس کے بٹن درست کر لئے۔

''صفورہ! کیا انتقام لینے کا یہی ایک طریقہ ہے؟''

''تو پھر دوسرا طریقہ میں تمہیں بتاؤں؟''

''ہاں......''

''افشاں کو طلاق دو...... مجھ سے شادی کر لو۔''

''کیا......؟'' ہارون کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''نہیں کر سکو گے نا ایسا...... تم تو افشاں کے لئے پاگل ہو رہے ہو۔ سنو، جو کچھ میں نے کہا ہے وہی تمہیں افشاں تک پہنچا سکتا ہے۔''

''نہیں صفورہ! چلو تمہاری بات مان بھی لیتا ہوں تو اس بات کی تصدیق کون کرے گا کہ افشاں تمہارے قبضے میں ہے اور خیریت سے ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''افشاں سے ملاؤ گی مجھے؟''

''اس کے بعد میری بات مان لو گے؟''

ہارون نے گردن جھکا لی۔

''بولو...... اس کے بعد میری بات مان لو گے؟''

''ہاں...... مان لوں گا۔'' ہارون نے بحالت مجبوری جواب دیا اور صفورہ مسکرانے لگی۔

''ٹھیک ہے...... میں تمہیں افشاں کے پاس لئے چلتی ہوں۔''

پھر صفورہ نے اپنے لئے ایک لباس نکالا اور اسے لے کر واش روم میں چلی گئی۔

ہارون عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ کامران کو وہ ساتھ نہیں لایا تھا کہ کہیں خلاف ورزی پر افشاں اور اشعر کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ سخت بے تاب تھا وہ۔ ماضی کی بہت سی باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ یہ کردار اس قدر گھناؤنا نکلے گا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ صفورہ ایک اچھے خاندان کی لڑکی تھی اور واقعی ہارون کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ اس رشتے سے انکار پر کوئی ری ایکشن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ صفورہ سے اس کی زیادہ ملاقاتیں نہیں تھیں۔ بس ایک دو بار ہی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

صفورہ تیار ہو کر باہر آ گئی۔ اب اس کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا۔ وہ سرد لہجے میں بولی۔

''آؤ......''

ہارون اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد افشاں نظر آنے والی تھی۔ کیا کروں گا میں...... کیا کروں گا...... صفورہ سے بات کرنا ہو گی۔ یہ شیطان عورت شیطانیت پر آمادہ ہے۔ اپنی دیوانگی کا شکار ہے یہ۔ حالانکہ ایک اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔ لیکن جب انسان بگڑتا ہے تو بہت کچھ بگڑ جاتا ہے اس کا۔ راستے میں اس نے کہا۔

''صفورہ! آپ کی شادی نہیں ہوئی؟''

''نہیں ہوئی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''نہیں...... میرا مطلب ہے کہ آپ نے شادی نہیں کی؟''

''نہیں۔''

''کیوں......؟''

''اس لئے کہ میں اپنی آگ میں جل رہی تھی۔''

''صفورہ! آپ نے کبھی پہلے مجھے اس بات سے آگاہ نہیں کیا۔''

''تمہارا کیا خیال تھا، پاگل ہو رہی تھی میں تمہارے لئے؟ دیوانی ہو گئی تھی کیا؟ یہی سمجھتے ہو نا تم؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''اب بھی تم سے یہی کہہ رہی ہوں کہ ایسی بات نہیں ہے۔''

''تو صفورہ! جو کچھ تم مجھ سے چاہ رہی ہو نقصان تو اس سے تمہارا ہی ہو گا۔ کیا

تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے؟''

''نقصان، فائدہ...... یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں اپنے انتقام کی آگ سرد کروں گی سمجھے؟'' صفورہ نے بد دلی سے کہا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہے اور ہارون کو بتا دے کہ وہ ہارون جیسے جوانوں پر تھوکتی بھی نہیں ہے۔ یہ تو ٹنڈن گوپال کی خواہش ہے۔ گرو جی مہاراج کی خواہش پوری کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ انہوں نے مجھے مہان شکتی دی ہے۔

راستے طے ہوتے رہے۔ ہارون نے کہا۔

''صفورہ! ایک درخواست کر سکتا ہوں تم سے؟''

''بولو......''

''کیا تم افشاں کو میرے حوالے کر دو گی؟''

''ہاں...... کر دوں گی۔''

''میرا مطلب ہے ابھی۔''

''پاگل سمجھا ہوا ہے تم نے مجھے؟''

''تو پھر ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''افشاں سے ملو گے تم۔ کوئی بات نہیں کرو گے اس سے۔ اس کے سامنے جاؤ گے۔ اپنے بیٹے کو گلے لگاؤ گے۔ وہ اگر تم سے کچھ پوچھے گی بھی تو تم جواب نہیں دو گے۔ پھر میرے ساتھ واپس چلے آؤ گے۔ رات ہم اپنے ہوٹل میں گزاریں گے پھر کل صبح میں افشاں کو تمہارے حوالے کر دوں گی۔''

''افشاں سے یہ مت کہنا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

جواب میں صفورہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ''ڈرتے ہو اپنی بیوی سے؟''

''ہاں...... وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔''

''اور اگر وہ تم سے شناسائی کا اظہار بھی نہ کرے تو؟''

''کیا مطلب؟'' ہارون نے کہا۔

''کچھ نہیں...... خاموش بیٹھو۔'' صفورہ بولی اور اس کے بعد اس نے کچی آبادی سے تھوڑے فاصلے پر کار روک دی۔

''اترو......''

''ہاں...... مگر یہ......''

''خاموش...... خاموش۔ چلئے آؤ میرے ساتھ۔'' صفورہ بولی اور تھوڑی دیر کے بعد بابو خاں کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دی۔ ایک بار، دو بار، چار بار اور پھر وہ اندر داخل ہوگئی۔ ہارون بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ چھوٹا سا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہاں کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ وہ غصے سے غرائی۔

''بابو خان!'' مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ افشاں یا اشعر بھی یہاں نہیں تھے۔ ہارون پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''آؤ میرے ساتھ۔''

پھر وہ باہر نکل آئی اور اس کے بعد پڑوس کے دروازے کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر بابو خان کے بارے میں پوچھنے لگی۔ پڑوسیوں نے نفرت اور حیرت کا اظہار ساتھ ساتھ کیا۔

''اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہوتا بی بی! لچا، لفنگا آدمی ہے۔ کب آتا ہے، کب جاتا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم۔ کہیں سے بھی بابو خاں کے بارے میں معلوم نہیں ہوا تھا۔ ہارون نے پریشان لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا صفورہ...... مجھے بتاؤ گی نہیں؟''

''کچھ گڑ بڑ ہوگئی ہے۔ گڑ بڑ ہوگئی ہے۔ آؤ چلیں''

''صص...... صفورہ! کیا تم نے انہیں یہاں رکھا تھا؟''

''میں نے کہا نا فضول باتیں مت کرو۔ آؤ چلو یہاں سے۔'' صفورہ نے کہا۔ وہ شدید غصے کے عالم میں تھی۔ باہر آ کر وہ پھر کار میں بیٹھ گئی۔

''اب کیا کرو گی؟''

''تم جہاں کہو گے میں تمہیں اتار دوں گی۔''

''اور افشاں؟''

''بھاڑ میں گئی وہ۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم...... دیکھو......''

''ہارون پلیز! میرا دماغ مت خراب کرو۔ وہ غیر متوقع طور پر غائب ہوئے ہیں۔ لیکن بے فکر رہو۔ میں انہیں تلاش کر لوں گی۔ ایک بار اگر تم کر سکتے ہو تو میری بات مان لو۔''

''کیا......؟''

''جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تکمیل کر دو۔ یقین کرو، افشاں تمہیں مل جائے گی۔''

ہارون کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''دیکھو! میں تمہارے بارے میں کوئی برا لفظ نہیں کہنا چاہتا لیکن اتنا میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ تمہاری اس فرمائش پر تمہاری حیثیت ایک دو کوڑی کی عورت سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے میری نگاہوں میں۔ صفورہ! انسان کی شخصیت ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔ میں نے اگر تمہاری بات مان لی تو تم یقین کرو کہ عزت تو بہت بڑی چیز ہے میں تم سے نفرت بھی نہیں کر سکوں گا۔''

صفورہ پیچ و تاب کھانے لگی۔ پھر اس نے کہا۔

''تمہاری فطرت میں ہی یہ سب کچھ ہے کہ تم میری توہین پر توہین کیے جاؤ۔ قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے تم سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن جو فرمائش میں نے تم سے کی ہے، جو کچھ میں نے تم سے چاہا ہے بس...... بس...... اترو......'' اس نے اچانک کار کو بریک لگا دیئے اور ہارون حیران رہ گیا۔

''مم...... مم...... مجھے......''

''میں کہتی ہوں اتر جاؤ ورنہ میں تمہیں ہلاک نہ کر دوں۔''

''مگر افشاں......''

''بھاڑ میں گئی افشاں...... میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے خود تم سے رابطہ قائم کروں گی۔''

''پر کب...... کہاں...... کیسے......؟'' ہارون نے نیچے اتر کر کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر کہا لیکن اچانک اسے اچھل کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ صفورہ نے پوری قوت سے کار آگے بڑھا دی تھی۔

ہارون حیران نگاہوں سے اپنی جگہ پر کھڑا صفورہ کی کار کو آگے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر دل غم و اندوہ میں ڈوب گیا تھا۔ ایک آس بندھ گئی تھی۔ حالانکہ جو کچھ اس وقت اس کے ساتھ ہوا تھا اور جو بھی اس پر بیتی تھی وہ سب ناقابل فہم تھا۔ خواب اور افسانہ محسوس ہو رہا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ انوکھا تصور تھا یہ۔ ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ صفورہ تو ایک اچھے ماں باپ کی بیٹی تھی۔ پھر یہ سب کچھ......؟

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک جیپ اس کے برابر آ کر رک گئی۔ کچھ ایسا انداز تھا کہ اسے تھوڑا سا چونکنا پڑا۔ لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر کامران کو دیکھ کر وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''آیئے مسٹر ہارون!'' کامران نے کہا اور ہارون تھکے تھکے سے انداز میں آگے بڑھ کر جیپ میں جا بیٹھا۔

''کیا ہوا...... کیا رہا......؟''

''کامران! ایک بار پھر میں انہی اندھیروں میں ڈوب گیا ہوں۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''کیا بتاؤں یار...... چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' ہارون نے کہا اور کامران نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ہارون نے کہا۔

''تم یہاں کہاں؟''

''جہاں مسٹر ہارون...... وہاں ہم۔''

''کک...... کیا مطلب...... ساتھ تھے تم میرے؟''

''ہاں...... میں نے تمہیں تنہا چھوڑنے کے لئے اپنی نوکری نہیں چھوڑی ہے۔''

''کہاں...... کہاں تم میرے ساتھ تھے؟''

''کہا نا اس ہوٹل میں بھی جہاں تم گئے تھے۔ اور اس کمرے سے بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا میں جس میں تم داخل ہوئے تھے اور پھر اس لڑکی کے سامنے میں نہیں

آیا لیکن میں نے تمہارا پیچھا کیا اور اس کچی آبادی تک پہنچا ہر جگہ میں تمہارے ساتھ تھا۔ پھر جس طرح وہ اپنی کار لے کر بھاگی ہے وہ بھی میں نے دیکھا۔ لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔''

''گڑبڑ...... ہاں بتاتا ہوں یار! کہیں چل کر بیٹھو۔''

ایک چھوٹے سے خوبصورت ریسٹورنٹ کی دو کرسیوں پر بیٹھ کر ہارون نے چائے وغیرہ طلب کی اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کامران! برا وقت ہے اور برے وقت میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔''

''صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں ہارون! آخر کار ہر طرح کا وقت ٹل جاتا ہے اور پریشانی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو کچھ ہو رہا ہے آخر کار اس کا اختتام بھی ہو جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ہارون نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور شیشوں کے اس پار دیکھنے لگا۔ جس جگہ وہ بیٹھے ہوئے تھے وہاں سے سڑک کا دیو دور دور تک نظر آتا تھا۔ سڑک کے اس پار بہت ہی اعلیٰ درجے کے ڈیپارٹمنٹل سٹور پھیلے ہوئے تھے۔ خوش پوش لوگ ہر طرح کے جھگڑوں سے آزاد زندگی کی مصروفیات میں مگن تھے۔

ہارون نے حسرت بھری نگاہوں سے ادھر دیکھا اور بولا۔

''جب انسان ہر مشکل سے آزاد ہوتا ہے تو یقین کرو اسے آزادی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ یہ تک نہیں سوچتا کہ کس قدر پرسکون زندگی گزار رہا ہے وہ۔ کوئی فکر ہی نہیں ہوتی اسے۔ بس اپنے آپ میں مگن زندگی سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ اور جب کسی دکھ کا شکار ہو جاتا ہے تو حسرتیں ہی حسرتیں دل میں پروان چڑھنے لگتی ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ کتنے پرسکون ہوتے ہیں وہ لوگ جو کسی مشکل کا شکار نہیں ہوتے۔ زندگی ان پر کتنی آسان ہوتی ہے۔ میں تھوڑے دن پہلے کے واقعات کو یاد کرتا ہوں تو اپنی ذات میں مگن تھا میں اور کوئی فکر ہی نہیں تھی۔''

''مجھے تم نے اس لڑکی کے بارے میں تفصیل نہیں بتائی۔''

''ہاں کامران...... بہت پرانی بات ہے۔ جب افشاں میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ شاید میں نے تم سے صفورہ نامی لڑکی کا ذکر کیا تھا۔''

''صفورہ......؟''

''ہاں......''

''نہیں...... میرے لئے یہ نام اجنبی ہے۔''

''شاید اس لئے کہ اس کا میری زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ میرے ایک مربی حاجی عطا صاحب تھے۔ انہوں نے میرے لئے ایک رشتے کا انتخاب کیا لیکن میرے ذہن میں افشاں تھی۔ میں نے وہ رشتہ قبول نہیں کیا اور افشاں سے شادی کرنے کا عندیہ ظاہر کر دیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ صفورہ نامی وہ لڑکی جس کا رشتہ میں نے ٹھکرایا تھا کسی طور اس طرح کے احساس کا شکار ہو جائے گی کہ مجھ سے دشمنی پر آمادہ ہو جائے گی۔ یہ وہی لڑکی صفورہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے اسے ٹھکرا دیا تو اس کے پندارِ حسن کو ٹھیس پہنچی اور وہ مجھ سے انتقام پر آمادہ ہو گئی۔''

''مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے۔''

''ہاں...... اس نے اس احساس کو دل میں رکھا اور افشاں کو اسی نے اغواء کیا ہے۔''

''مائی گاڈ...... مائی گاڈ...... اس نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے؟''

''ہاں...... اور وہ مجھے افشاں کے پاس لے گئی تھی۔''

''پھر......؟'' کامران نے بے تابی سے سوال کیا۔

''جہاں اس نے افشاں کو رکھا تھا، میرا مطلب ہے اس کچی آبادی میں تم نے تو ہمارا تعاقب کیا ہی ہوگا۔''

''ہاں، لیکن......''

''افشاں وہاں موجود نہیں تھی جس پر وہ خود بھی حیران اور پریشان ہو گئی۔''

''اوہ میرے خدا...... یہ تو خاصا سنگین معاملہ ہے۔ گویا یہ انتقام کا معاملہ ہے۔''

''ہاں...... صفورہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا میں۔''

''مگر اب کیا کرو گے؟''

''صفورہ، افشاں کو تلاش کرے گی اور پھر مجھ سے رابطہ کرے گی۔'' ہارون نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟''

''بتاؤ یار! میرا دماغ تو ماؤف ہو چکا ہے۔''

''تم حاجی عطا سے ملو۔ جانتے ہو نا ان کے بارے میں؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔''

''ہو سکتا ہے وہ تمہاری مدد پر آمادہ ہو جائیں۔ اس دوران کبھی ان سے ملاقات ہوئی؟''

''نہیں...... بالکل نہیں۔ ملا ہی نہیں میں کسی سے افشاں کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بعد۔''

''حاجی عطا سے ملو...... میرا خیال ہے تمہیں کوئی نہ کوئی مدد ملے گی وہاں سے۔''

ابھی کامران نے یہی جملے ادا کئے تھے کہ اچانک ہی اچھل پڑا۔ سامنے والے سٹور سے ایک لڑکی باہر نکلی تھی لیکن اس کا چہرہ...... ہارون سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کامران نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہارون...... ہارون...... ہارون......''

ہارون اس کے لہجے پر چونک پڑا۔ اس نے کامران کی صورت دیکھی تو کامران نے کہا۔

''وہ اس طرف...... وہ ادھر دیکھو...... ادھر پلیز...... وہ اسٹور کی سیڑھیوں پر۔''

اور کامران سڑک کے پار دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے اس کے سارے وجود میں بھی ایک چھناکا سا ہوا۔ اسٹور سے جو لڑکی باہر نکل رہی تھی وہ سو فیصدی چندر بدن تھی۔ چندر بدن کا چاند سا چہرہ، اس کے حسین نقوش نظر انداز نہیں کئے جا سکتے تھے۔ ایک بار اسے دیکھنے کے بعد شاید ہی کوئی ایسا بد ذوق ہو جو اس چہرے کو بھول سکے۔ لیکن اس وقت اس کے جسم پر سیاہ رنگ کی ایک چست پتلون تھی اور اوپری بدن پر گلابی رنگ کا اپر پہنا ہوا تھا۔ انتہائی خوبصورت اور دلکش بدن کی مالک تھی وہ۔ اور پھر سب سے بڑی بات وہ چہرہ...... ہزار بار اس چہرے کو چھپا لیا جاتا لیکن وہ چہرہ کبھی نگاہوں سے محو نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت ہی خوبصورت بال جو اس نے ایک خاص اسٹائل سے بنائے ہوئے تھے۔ کامران اور ہارون شدت حیرت سے گنگ ہو گئے۔ بمشکل تمام کامران کے منہ سے نکلا۔

''میرا اندازہ درست ہے نا؟''

''ہاں......''

''مگر یہ کیسے ہوا؟''

''پتہ نہیں۔''

''اس کا پیچھا نہیں کرو گے؟''

''ہاں اٹھو......'' ہارون نے بے اختیار کہا اور وہ اپنی ٹیبل سے اٹھ گئے۔ پھر اس کے بعد وہ پھرتی سے باہر نکل آئے تھے۔ کامران جیپ کی جانب دوڑا۔ لڑکی ایک چھوٹی سی خوبصورت کار میں بیٹھ رہی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ خود کھولا تھا اور اسٹیئرنگ کے پیچھے جا بیٹھی تھی۔ کامران نے فوراً جیپ اسٹارٹ کر دی اور ہارون دوڑ کر اس میں سوار ہو گیا۔

''یار کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔'' ہارون نے کہا۔

''مگر ہارون! اس کا چہرہ لاکھوں میں ایک ہوتا ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''اندازہ تو میرا بھی یہی ہے مگر اس کا حلیہ...... زمانہ قدیم کی کوئی آوارہ روح یہ شکل کیسے اختیار کر سکتی ہے؟''

''خیر یہ نہ کہو...... آوارہ روحیں تو ہر طرح کی شکلیں اختیار کر سکتی ہیں۔ دیکھو، وہ گاڑی موڑ رہی ہے۔'' کامران نے کہا۔

''گاڑی موڑ کر وہ اسی ٹریک پر آ جائے گی۔''

''مگر ہمیں گاڑی موڑنے میں دقت ہو گی۔''

''ہمیں کیوں گاڑی موڑنی پڑے گی۔ وہ سامنے ہی آ جائے گی۔''

وہ خاموشی سے چھوٹی سفید کار کو مڑتا دیکھتے رہے اور پھر وہ ان کے سامنے سے گزری۔ چندر بدن نے باقاعدہ چہرہ نکال کر انہیں دیکھا اور دھیرے سے مسکرائی۔ پھر اس کی کار ایک زناٹے سے آگے بڑھ گئی۔ کامران جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس نے اسے گیئر میں ڈالا اور جیپ کار کا تعاقب کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہارون گزرے ہوئے واقعات بھول گیا تھا۔ چندر بدن کی تلاش میں اس نے کافی وقت گزارا تھا لیکن اب چندر بدن پر وہ شبہ نہیں رہا تھا کہ اس نے افشاں کو کوئی نقصان پہنچایا ہو گا۔ لیکن الجھاوے ہزاروں تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی عمل ہو سکتا ہے۔

کامران بڑی مہارت کے ساتھ آگے جانے والی سفید کار کا تعاقب کر رہا تھا۔

''یار! پہلی بار یہ انکشاف ہوا ہے کہ روحیں ڈرائیونگ بھی کر سکتی ہیں اور وہ بھی اتنی عمدہ ڈرائیونگ۔ کتنی تیز رفتار سے وہ کار دوڑا رہی ہے۔''

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ذہن مختلف خیالات میں الجھ گیا تھا۔ یہ کیا قصہ ہے؟ چندر بدن اچانک ہی ماڈرن روپ میں۔ جبکہ گجراج نے حملے کرتے ہوئے کہا تھا کہ خاقان چندر بدن کو لے گیا ہے۔ پھر یہ کیا قصہ ہے؟ وہ خاقان پر غور کرنے لگا۔ نجانے کیا کیا خیال اس کے دل میں آ رہے تھے۔ ادھر کامران برق رفتاری سے اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''کیا میں آگے جا کر اس کا راستہ روکوں؟''

''نہیں...... چلتے رہو...... دیکھیں وہ کہاں جاتی ہے۔ ہم بعد میں اس کا پیچھا کریں گے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔''

آگے جانے والی کار آخر کار شہر کے آخری سرے پر پہنچ گئی اور یہاں سے وہ مضافاتی علاقے کی جانب چل پڑی۔

''وہ شہر سے باہر جا رہی ہے۔''

''یہ سڑک تو میرے خیال میں نور پور کی طرف جا رہی ہے۔''

''ہاں...... وہاں سے آگے بڑھ کر یہ سہائے پور کی طرف مڑ جائے گی۔ یہ وہ لانگ روٹ ہے۔''

''وہ دیکھو...... شاید وہ سہائے پور کی طرف ہی جا رہی ہو۔ پٹرول کتنا ہے جیپ میں؟''

''پٹرول......؟'' اچانک ہی کامران کی نگاہ فیول پمپ پر جا پڑی اور اس نے جیپ کے بریکوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... اگر ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے سہائے پور کی جانب گئے تو راستے ہی میں پٹرول ختم ہو جائے گا اور ہمارے پاس واپسی کی گنجائش نہیں رہے گی۔''

''دھت تیرے کی...... اس کا مطلب ہے......''

''ہاں دیوانگی سے کوئی فائدہ نہیں۔ خود سہائے پور کا فاصلہ یہاں سے جتنا ہے اگر سفید کار سہائے پور تک گئی تب بھی ہم اس کا تعاقب نہیں کر سکیں گے۔''

''جیپ واپس موڑ لو...... کسی اور الجھن کو مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جبکہ درحقیقت ہمارے علم میں ہے کہ ہم اس کا صحیح طور پر تعاقب نہیں کر سکیں گے۔''

کامران نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر جیپ روکی اور پھر اسے یوٹرن دے کر شہر کی جانب واپس موڑ دیا۔

البیلے دولہا طاہر علی کی کوٹھی پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ موبائل فون پر طاہر علی نے انہیں گھر آنے کی دعوت دی تھی اور البیلے دولہا مکمل تیاریوں کے ساتھ وہاں جا رہے تھے۔ ان کا مصاحب خاص جس کا نام رمضان تھا اور رمضو کہا جاتا تھا اسے ان کی نوک پلک سنوار رہا تھا۔ البیلے دولہا سچ مچ ایسے بنے بیٹھے تھے جیسے ان کی بارات جانے والی ہو۔ گیندے کے پھولوں کا سہرا تازہ تازہ تیار کیا ہوا رکھا تھا۔ رمضان نے کہا۔

''مرشد! چھبیلے لگ رہے ہو قسم اللہ کی۔ بس سماں باندھ دینا۔''

''بھوتنی کے تُو بھی تو چل رہا ہے ہمارے ساتھ۔''

''گالیاں مت دیا کرو ہمیشہ۔ ہم تو اتنے پیار سے بات کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ بھوتنی کے، حرامی، لچے اس کے علاوہ کچھ کہتے ہی نہیں ہیں۔''

''لے...... تُو نے سب کچھ خود کہہ دیا، اب ہمیں بھلا کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''آسامی کیسی ہے دولہا میاں''

''ارے تگڑی آسامی ہے...... اسی لئے تو بہت سی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ دس بیس ہزار لے ڈوبیں گے۔''

''پھر مجھے ایک ہفتے کی چھٹی دے دینا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے پانچ ہزار دو گے۔''

''اے اے...... اے بھوتنی کے......''

''پھر بھوتنی کے......؟''

''ابے پانچ ہزار دوں گا تجھے اور باقیوں کو کیا لوٹے میں بند کر کے دفنا دوں گا؟ سب پر ہی خرچ اٹھانا پڑتا ہے۔''

''وعدہ تو کیا تھا تم نے...... دیکھو بے ایمانی مت کرو۔ بد دعا لگ سکتی ہے کسی کی۔''

''بد دعا دے گا تو مجھے، ہیں؟ بد دُعا دے گا؟'' البیلے دولہا نے رمضان کے پیٹ میں کہنیاں مار کر کہا۔

''تو اور کیا؟''

''اچھا بک بک مت کر...... دیکھ، دیکھ، منہ دیکھ۔''

''بالکل ٹھیک...... چمک رہے ہو چاند کی تریوں۔ ویسے دولہا بھائی ایک بات بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے یہ کاٹھ کی ہنڈیا کب تک چولہے چڑھی رہے گی؟''

''پھر حرامی پن کی بات کی...... ابے دعائیں کیوں نہیں کرتے کہ ہمیشہ چڑھی رہے۔ بیس بندے آتے ہیں، ان میں سے تین کو تو فائدہ ہو ہی جاتا ہے اور وہ تین جو پبلسٹی کرتے ہیں بس سمجھ لو وہی پبلسٹی ہمارے کام آتی ہے۔ ورنہ سچ بتائیں، رکشہ چلاتے چلاتے کمر دکھ گئی تھی۔ بس وہ تو ایک دن موا نے کھوپڑی میں ڈال دی کہ آج کل سارے کالے پیلے یہی دھندہ کئے ہوئے ہیں، کوئی کچھ بنا ہوا ہے کوئی کچھ۔ ہم نے سوچا کہ یار البیلے دولہا تم بھی یہ دھندہ شروع کر دو۔''

''مگر تم یہ سہرا کیوں باندھتے ہو؟'' رمضان نے پوچھا۔

''لے...... پھر کہیں گے بھوتنی کے تو تو برا مانے گا۔ ابے نام جو دولہا ہے...... اور پھر یہ تو دور ہی ہے بیٹا ڈرامہ کرنے گا۔ ٹی وی پر، فلموں میں جو ڈرامے یا تھیٹروں میں یہ جو ڈرامے دیکھنے کو آتے ہیں وہ غلط تھوڑی ہوتے ہیں؟ یہی سارے ڈرامے تو ہوتے ہیں۔ بیٹا! انسان بڑی بے وقوف چیز ہے۔ اسے بے وقوف بننے میں بہت مزہ آتا ہے۔ جان بوجھ کر چڑیا بنا...... بن جاتے ہیں۔ البیلے میرا نام ہے۔ سہرا سر پر ہوتا ہے تو لوگ متاثر ہو جاتے ہیں۔''

''مگر یہ تمہیں سوجھی کیا؟'' رمضان نے البیلے دولہا کا چھچھ چیڑتے ہوئے کہا۔

''بس سوجھ گئی۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ دولہا بھائی۔''

''ہاں بول؟''

''کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی سچ مچ کا بھتنا ٹکرا گیا ہو تم سے؟''

''سالے گالی پر گالی دیئے جا رہا ہے...... ارے دعا مانگ کہ اللہ کبھی ایسا نہ کرے۔''

''ہوا ہے کبھی؟''

''کئی مرتبہ ہوا ہے۔''

''تو پھر کیا کرتے ہو تم؟''

''بھاگ جاتے ہیں بھوتنی کے، اور کیا کرتے ہیں؟''

''پھر بھوتنی کے؟''

''تو باتیں ہی ایسی خوفناک کر رہا ہے۔ چل ہٹ، ہو گیا کام۔ باہر جا کر دیکھ گاڑی آ گئی؟''

رمضان چلا گیا اور البیلے دولہا شیروانی کے بٹن لگانے لگے۔ پھر انہوں نے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور خود پر قربان ہونے لگے۔

''البیلے...... البیلے...... پتہ نہیں تیری قسمت کب کھلے گی۔ اب کوئی چمریا کا جنا داماد کی حیثیت سے بھی تو قبول کرے۔ بس ایک ہی آرزو ہے اب تو کہ مولا ہاتھ پیلے کرا دے۔''

رمضان واپس آ گیا۔

''کیا ہوا...... آ گئی گاڑی؟''

''نہیں دولہا بھائی! ابھی تک نہیں آئی۔''

''ذرا گھڑی میں وقت دیکھ۔''

''گھڑی تو آپ کے ہاتھ پر بندھی ہوئی ہے۔''

''ابے ہاں...... یاد نہیں رہتی ناں۔''

''عادت کہاں ہے آپ کو...... کبھی گھڑی باندھی ہو تو پتہ چلے۔''

البیلے دولہا نے گھور کر رمضان کو دیکھا۔

کوئی دس منٹ کے بعد ایک دوسرے آدمی نے آ کر اطلاع دی۔

''دولہا میاں! گاڑی آ گئی ہے۔''

''چل بھئی چل، تھیلا اٹھا۔''

رمضان نے چمڑے کا بنا ہوا ایک بڑا تھیلا اٹھا لیا جس میں نجانے کیا کیا الم غلم بھرا ہوا تھا۔

ڈرائیور کار لے کر آیا تھا۔ البیلے دولہا بڑے ٹھسے سے کار کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ رمضان پاس گھسنے لگا تو انہوں نے زور سے اس کی کمر پر لات ماری۔

''میرے سر پر بیٹھے گا؟ چل آگے بیٹھ۔''

رمضان تھیلا لے کر آگے بیٹھنے لگا تو ڈرائیور نے کہا۔

''یہ کیا ہے...... کیا اس میں پٹارہ ہے جس میں سانپ بند ہیں؟''

''کیا کہا...... تم ہمیں مداری سمجھتے ہو کیا؟''

''نہیں بھائی! میں کیوں مداری سمجھوں گا۔ لیکن اگر اس پٹارے میں سانپ نہیں ہیں تو اسے پیچھے ڈگی میں رکھو۔ یہاں تم بیٹھو گے یا یہ پٹارہ رکھو گے؟'' ڈرائیور نے نیچے اترتے ہوئے کہا اور رمضان نیچے اتر گیا۔ ڈرائیور نے ڈگی کھول کر وہ تھیلا اندر رکھا اور ڈگی بند کر کے واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پھر اس نے کار آگے بڑھا دی۔ سہرا قریب رکھا ہوا تھا۔ البیلے دولہا نے کہا۔

''ڈرائیور صاحب! کوٹھی قریب آ جائے تو ذرا گاڑی روک دیجئے گا۔ سہرا باندھیں گے۔''

''ایک بات پوچھوں بابا صاحب؟''

''ایں ایں...... بابا کسے کہا؟ تجھ سے دس پانچ سال چھوٹے ہی ہوں گے۔''

''نہیں...... میرا مطلب ہے آپ سائیں بابا ہیں نا؟''

''لے...... ابے فقیر سمجھ رہا ہے کیا؟''

''ارے آپ پیر بابا ہیں۔''

''البیلے دولہا ہیں ہم...... نہ پیر ہیں نہ ملنگ ہیں نہ بدھ ہیں۔ سیدھا سیدھا ہمارا نام کیوں نہیں لیتا تو؟''

''اب مجھے کیا معلوم...... ویسے کیا آپ نکاح کرنے جا رہے ہیں؟'' ڈرائیور بھی موڈ میں آ گیا۔

''بیٹا! نکاح بھی ہو جائے گا کسی سے اللہ نے چاہا تو۔''

ڈرائیور ہنس کر خاموش ہو گیا۔ اس سے زیادہ اس کی جرأت نہیں پڑ سکتی تھی کہ کوئی سوال یا جواب کرے۔ کوٹھی قریب آئی تو اس نے کہا۔

''گاڑی روک دوں ادھر......؟''

''کون سی کوٹھی ہے؟''

''وہ نیلی اور سفید۔''

''ہائے...... کیا کوٹھی ہے۔ اس کوٹھی میں البیلے دولہا کا آستانہ بنے تو دنیا کھنچی چلی آئے۔''

''چلوں؟''

''ارے ایک منٹ رک جا یار۔'' البیلے دولہا نے کہا اور سہرا سر پر باندھنے لگے۔ پیچھے گرہ نہ لگی تو رمضان کو آواز دی۔

''اوئے رجو! آ جا میرے یار، یار گٹھاں لگا دے۔''

رمضو نیچے اترا۔ ڈرائیور جھنجلائی ہوئی نگاہوں سے ان حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔

بہر حال سہرا بندھ گیا اور ڈرائیور نے گاڑی پھر آگے بڑھا دی۔ کار گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ برآمدے میں نیرہ بیگم اور طاہر علی استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ البیلے دولہا نیچے اترے تو نیرہ بیگم اچھل پڑیں۔

''یہ...... یہ...... یہ کون آ گیا؟''

''یہی بابا البیلے دولہا ہیں۔''

''تو یہ سہرا کیوں باندھے ہوئے ہیں؟''

''بس پیروں فقیروں کی شان ہی ایسی ہوتی ہے۔ لندن میں تو ایسی کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی۔''

''یہ موا مجھے تو عجیب لگ رہا ہے۔''

''نیرہ بیگم! اپنی زبان سنبھال کر رکھو۔ ان بزرگوں کے بارے میں ایسے نہیں کہتے۔''

رمضو نے ڈگی سے تھیلا نکالا۔ دونوں آگے بڑھنے لگے تو نیرہ بیگم پھر بولیں۔

''اس تھیلے میں کیا ہے...... کیا اب وہ تمہیں سانپ کا تماشہ دکھائے گا؟''

''خدا تمہیں سمجھے نیرہ بیگم! خدا کے لئے ذرا عقل سے کام لو۔ ہو سکتا ہے کوئی سچ مچ کا بزرگ ہی ہو۔ آستانہ تو بڑا زبردست ہے اس کا۔ بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ڈیرے لگے ہوئے تھے وہاں۔''

''طاہر علی! دیکھیں تقدیر کیا کیا کھیل دکھاتی ہے۔''

البیلے دولہا نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ چہرے پر سہرا پڑا ہوا تھا۔ بھرپور ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ سیڑھیوں پر جا پڑے۔ منہ سے چیخ نکل گئی۔ گھٹنوں سے خون نکل آیا۔ کہنیاں بھی چھل گئیں۔ رمضان نے جلدی سے اٹھایا۔ بدحواس ہو گئے تھے۔ پھرتی سے شیروانی پکڑ لی اور رخ بدل کر ازار بند کسنے لگے۔ نیرہ بیگم بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ اس کے بعد سیدھے ہوئے تو رمضان نے کہا۔

''حضور! زخمی ہو گئے؟''

''مر گئے۔ تُو صرف زخمی ہونے کی بات کر رہا ہے؟''

''انا للہ......''

''لات دیں گے کمر پر۔ چار قلابازیاں کھائے گا۔''

''اوپر کی طرف؟'' رمضان نے سوال کیا۔ اسی دوران طاہر علی آگے بڑھ آئے۔

''دیکھ کر چلئے مرشد! آپ نے سہرا گھنا ہی باندھ رکھا ہے۔ آئیے میں ہاتھ پکڑ لوں۔''

''نہیں حضورِ من! نہیں۔ یہ رمز کی باتیں ہیں۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ خون کی قربانی دینا ضروری ہوتی ہے۔ کسی بھی بڑے کام کے لئے بلیدان دینا ہوتا ہے۔ یہ خون کے چند چھینٹے آپ کی ہر مشکل کو حل کر دیں گے۔''

''آہ...... یہ بات ہے......'' طاہر علی نے نیرہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ نیرہ بیگم البتہ عجیب نگاہوں سے البیلے دولہا کو دیکھ رہی تھیں۔ طاہر علی انہیں ڈرائنگ روم میں لائے۔ البیلے دولہا ڈرائنگ روم کی شان و شوکت دیکھ کر منہ کھول کر رہ گئے تھے۔

''تشریف رکھئے قبلہ!''

''یہ آپ نے سہرا کیوں باندھا ہوا ہے؟''

''بزرگوں کا عطیہ ہے...... ولیوں اور درویشوں کا حکم ہے۔ انہوں نے ہی ہمیں البیلے دولہا کا خطاب دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب تک شادی نہ ہو جائے سہرا نہ کھولیں۔ بس بزرگوں کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔''

''اوہ...... تو شادی نہیں ہوئی آپ کی؟'' نیرہ بیگم نے سوال کیا۔

''جی نہیں...... جی نہیں...... ہو جائے گی۔''

''خیر، اب ہمیں یہ بتائیے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

''صاحب زادی کہاں ہیں جن کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا؟''

''اپنے بیڈ روم میں ہے۔''

''بلائیے انہیں...... ان سے کچھ سوالات کریں گے۔''

''ب...... بلائیے۔'' طاہر علی نے نیرہ بیگم سے کہا۔

''میں بلاؤں......؟''

''تت...... تو پھر......؟''

''اور اگر بگڑ گئی تو......؟''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔''

بہر حال نیرہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھیں کہ صفورہ خود دروازے سے اندر داخل

ہو گئی۔ یہاں کا منظر دیکھ کر وہ چونک پڑی اور پھر آنکھیں نکال کر بولی۔

''یہ کون صاحب ہیں ڈیڈی؟''

''البیلے دولہا۔''

''میں کہتی ہوں یہاں کیوں آئے ہیں؟'' صفورہ کچھ اور ہی مجھی تھی۔

طاہر علی نے نرم لہجے میں کہا۔

''صفورہ بیٹی! یہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ بڑا اونچا آستانہ ہے ان کا۔ تمہارے علاج کے لئے ہم نے ان سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ تمہیں بالکل ٹھیک کر دیں گے۔ یہ عملیات وغیرہ جانتے ہیں۔ بڑے بڑے جادو کے شکار لوگوں کا علاج کر چکے ہیں۔ ہم نے انہیں تمہارے علاج کے لئے یہاں بلایا ہے۔''

''یہ گھوڑے کی طرح سر پر جھول کیوں باندھ رکھا ہے انہوں نے؟''

البیلے دولہا نے جلدی سے گیندے کی لڑیاں ہٹائیں، صفورہ کو گھور کر دیکھا اور بولے۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا عزیزہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

صفورہ کو شرارت سوجھ گئی۔ ویسے بھی ضرورت سے زیادہ تیز اور طرار لڑکی تھی۔ اس نے ایک دم اپنا موڈ بدل لیا اور بولی۔

''یہ آپ نے مجھے کس طرح گھور کر دیکھا کیسے دیکھا آپ نے مجھے؟''

''خ...... خ...... خدا کی قسم، ماں بہن کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ رمضان سے پوچھ لو، آج تک کسی پر بری نظر نہیں ڈالی۔'' البیلے دولہا نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ہوں...... کیسے آنا ہوا؟'' صفورہ آہستہ آہستہ اپنے چہرے کے نقش بدلتی جا رہی تھی۔ طاہر علی اور نیرہ بیگم نے چونک کر بیٹی کو دیکھا۔ صفورہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی البیلے دولہا کے سامنے والے صوفے پر جا بیٹھی۔ البیلے دولہا نے اسے پھر دیکھا اور بولے۔

''تمہارا علاج کرنا ہے۔''

''کیسا علاج؟''

''پانی منگوا لیجئے ایک گلاس۔'' البیلے دولہا نے کہا اور نیرہ بیگم نے ملازم کو آواز دے لی۔ پانی آ گیا۔ رمضان نے تھیلا کھول لیا۔ البیلے دولہا نے اس میں سے پھولوں کی پتیاں، ماش کی دال کے دانے، سیندور کی پڑیا نکالی اور پانی میں گھولنے لگے۔ پھر انہوں نے پانی میں انگلی ڈال کر تین چار بار اسے صفورہ کی جانب جھٹکا اور صفورہ نے اچھل کر اپنا لباس بچایا۔

''بیٹھی رہو...... بیٹھی رہو...... تمہاری مہربانی ہو گی۔''

اچانک صفورہ نے اپنے چہرے کے نقوش تبدیل کئے۔ صوفے سے اٹھی اور دو زانو فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے گردن جھکا کر کہا۔

''مرشد! رازداری شرط ہے۔ اگر مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو تنہائی میں پوچھئے...... سب کے سامنے میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔''

البیلے دولہا میاں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر ان کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

''ارے یہ کیا...... یہ تو سچ مچ کوئی گھپلے والی بات معلوم ہوتی ہے۔''

''اٹھئے مرشد! میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اٹھئے اپنی جگہ سے۔'' یہ کہہ کر صفورہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی جانب چل پڑی۔ البیلے دولہا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''جاؤں......؟''

''جائیے دولہا صاحب...... جائیے......''

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' اس کی آواز ہی بدل گئی اور چہرے کا رنگ بھی۔

''رمضان تو آ، تو میرے پیچھے پیچھے۔''

''نہیں مرشد! آپ کو اکیلے ہی جانا پڑے گا۔'' رمضان نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''اے ہاں...... علاج تو ہمیں ہی کرنا ہے۔ اچھا جاتے ہیں۔'' وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔ صفورہ سامنے ہی جا رہی تھی۔

ادھر طاہر علی نے کہا۔ ''بھئی کمال ہے...... یہ تو ایک دم کام ہی دوسرا ہو گیا۔ یہ ہے جنتر منتر والی بات۔ لندن میں ہمیں کبھی ایسے کسی واقعے سے واسطہ نہیں پڑا۔ میں جاؤں۔''

''نہیں سرکار! یہ جناتوں والی باتیں جو ہوتی ہیں نا...... یہ اکیلے ہی میں ہوتی ہیں۔''

''پھر بھی ہمیں کچھ فاصلے سے ان کے آس پاس ہی ہونا چاہئے۔''

''جی جی، آئیے آئیے......''

صفورہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہو گئی۔ البیلے دولہا ڈرتے ڈرتے دروازے سے اندر پہنچے۔ تب صفورہ نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور بولی۔

''دروازہ بند کر دیجئے۔''

''جج..... جی..... بہتر ہے..... بہتر ہے۔''

''اور ادھر آ جائیے۔''

صفورہ مسہری پر جا بیٹھی۔ البیلے دولہا نے بمشکل تمام دروازہ اندر سے بند کیا۔ بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ صفورہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ سہاگ رات منانے آئے ہیں؟''

''بب..... بخدا جھوٹے سے بھی کوئی بری نیت دل میں نہیں ہے۔''

''پھر..... میرا بھوت اتارنے آئے ہیں؟''

''جج..... جی ہاں..... جج..... جی ہاں..... آپ کے والد نے..... پپ..... پیسے..... پیسے دیئے تھے۔''

''یہ سہرا کیوں باندھ رکھا ہے آپ نے؟''

''البیلے دولہا ہے ہمارا نام..... سہرا باندھے رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... آپ کے حکم پر میں اس لڑکی کے سر سے جانے کے لئے تیار ہوں۔''

''لل..... لڑکی.....؟''

''ہاں..... جس کا نام صفورہ ہے۔''

''وہ تو خود آپ کا نام ہے۔''

''میں تو بھوت بول رہا ہوں..... صفورہ کہاں بول رہی ہے؟''

''بھبھ..... بھوت..... بھوت..... سچ مچ کے بھوت.....؟''

''تو اور کیا جھوٹ موٹ کے سمجھ رہے ہو؟..... چلو سہرا اتارو۔''

''اتاریں.....؟''

''ہاں..... سہرا اتار کر بات کرو۔''

البیلے دولہا نے سہرا اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

''شیروانی بھی اتارو۔''

''اندر قمیض نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں پہنی؟''

''بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔''

''شیروانی اتارو۔''

''نن..... ننگے ہو جائیں گے قسم اللہ کی۔'' البیلے دولہا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہوں..... تو تم میرا بھوت اتارنے آئے ہو۔ مگر خود تمہارے اوپر تو ایک بھوت چڑھا ہوا ہے۔''

''مم..... میرے اوپر؟''

''ہاں..... شیروانی اتارو۔ ورنہ پھاڑ دوں گی۔''

''ارے باپ رے..... جانا چاہتے ہیں محترمہ! جانا چاہتے ہیں۔ آپ پر اگر کوئی بھوت وغیرہ ہے اور سچ مچ ہے تو کوئی اور علاج کر دے گا آپ کا۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں آتا۔''

''آپ اپنا علاج تو کرا لیجئے مجھ سے۔ تاکہ میرے ممی اور ڈیڈی کو عقل آئے۔'' صفورہ نے کہا اور ایک دم البیلے دولہا پر چھلانگ لگا دی۔ البیلے دولہا کٹتے ہوئے بکرے کی طرح چیخے تھے اور باہر موجود لوگ ان کی آواز سن کر اچھل پڑے تھے۔ صفورہ نے البیلے دولہا کی شیروانی کے سارے بٹن توڑ دیئے۔ شیروانی اتار کر پھینک دی۔ اندر واقعی قمیض نہیں تھی۔ ہڈیوں کا ایک پنجر نظر آ رہا تھا۔

''اب کہئے تو آپ کا باقی لباس بھی اتار دوں؟''

''تمہیں خدا کا واسطہ..... تمہیں اپنے ماں باپ کی قسم، ایسا مت کرنا۔''

''اس کے بعد کبھی آپ کسی کا بھوت اتارنے جائیں گے؟''

''اللہ قسم..... اللہ قسم..... وہیں آستانے پر کوئی آ مرا تو دیکھا جائے گا، گھر کسی کے نہیں جائیں گے۔ پہلی بار آ گئے تھے چکر میں۔''

''تو پھر ذرا اپنا حلیہ بھی صحیح کر لیجئے۔'' صفورہ نے ایک الٹا ہاتھ البیلے دولہا کے منہ پر دیا اور اس کے بعد انہیں خوب اچھی طرح زمین پر رگڑا۔ گھٹنے تو ویسے ہی ٹوٹے ہوئے تھے، کہنیوں سے خون نکلا تھا، ناک بھی رگڑ گئی۔ گالوں پر بھی نشان پڑ گئے۔ پھر صفورہ نے دو چار گھونسوں سے دانت بھی ہلا دیئے اور منہ سے خون ٹپکنے لگا۔ صفورہ نے ان کے بال مٹھی میں جکڑ کر زور زور سے کھینچے اور بہت سارے بال اس کے ہاتھ

میں آ گئے۔ اس کے بعد انہیں بالوں ہی سے پکڑ کر دروازے کی جانب بڑھی۔ دروازہ کھولا اور ایک زوردار لات کمر پر رسید کی۔ الیلے دولہا محاورتاً نہیں حقیقتاً فضا میں پرواز کرتے ہوئے دور جا کر گرے۔ رمضان ان کی زد میں آنے والا تھا۔ چیخ کر بولا۔

''مر گئے مرشد!''

''ہائے سچ مچ مر گئے...... ابے بھاگ...... ہم کہتے ہیں بھاگ۔''

رمضان نے الیلے دولہا سے بھی لمبی چھلانگ لگائی تھی۔ صفورہ دروازے سے باہر نکل آئی الیلے دولہا خود بھی رمضان کے پیچھے دوڑے تھے۔ دوڑتے دوڑتے انہوں نے کہا تھا۔

''حضور انور! شش...... شیروانی کی حفاظت فرمائیے۔ ہماری امانت ہے آپ کے پاس۔''

طاہر علی شدید پریشانی کے باوجود قہقہے کو ضبط نہ کر سکے۔ نیرہ بیگم البتہ خوفزدہ نگاہوں سے دونوں طرف دیکھ رہی تھیں۔ الیلے دولہا پھر نہیں رکے تھے۔ پاجامہ پہنے بھاگے جا رہے تھے اور رمضان ان سے کہیں زیادہ تیز رفتار تھا۔ الیلے دولہا کے گھٹنوں میں چوٹ لگی ہوئی تھی اس لیے تیز نہیں دوڑ پا رہے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ گیٹ سے باہر نکلے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

صفورہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ماں باپ کے قریب پہنچی اور پھر سرد لہجے میں بولی۔

''دیکھئے ڈیڈی! دیکھئے ممی! اس طرح کا کوئی تماشہ اب دوبارہ نہ کیجئے گا۔ میں آپ لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی۔ میری منزل الگ ہے۔ میرا راستہ بالکل الگ ہے۔ آپ براہ کرم میرے لئے پریشان نہ ہوں۔ اگر آئندہ آپ نے ایسی کوئی حرکت کی تو میں کسی بھی شخص کو قتل کر سکتی ہوں۔ پھر اس کے بعد آپ کو باقی معاملات میں الجھنا ہوگا۔ میں تو خیر قتل کر کے بچ جاؤں گی مگر آپ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ لوگ؟ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ ایک بار پھر آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ ایسے کسی مسئلے میں دوبارہ نہ پڑیں۔ یہ بے وقوف قسم کے لوگ اپنے آپ کو پیر اور بزرگ ظاہر کر کے جو حرکتیں کرتے ہیں آپ کو نہیں معلوم۔ آئندہ خیال رکھئے گا۔''

صفورہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی باہر نکلی اور پھر اس کی کار کوٹھی سے باہر نکل گئی۔

''میں یہ نہیں سمجھ پا رہا کامران! کہ میرے دشمن آخر چاہتے کیا ہیں؟ سچی بات یہ ہے کہ بڑی الجھن کا شکار ہوں۔ اصل میں یہ نہیں پتہ چل پا رہا کہ یہ قصہ کیا ہے؟ ویسے میں تمہیں پوری بات نہیں بتا سکا۔ اگر یہ صرف اتنا سا معاملہ ہے تو میں اسے اپنی انتہائی بدنصیبی کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں؟''

کامران ہمدردی کی نگاہوں سے ہارون کو دیکھتا رہا۔ ہارون تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔

''میرا خیال ہے میں نے تمہیں صفورہ کے بارے میں مختصر طور پر بتایا تھا۔ بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ میرے ایک مربی حاجی عطا تھے۔ حاجی عطا صاحب نے میرے لئے ایک رشتے کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن میرا ذہن افشاں کی طرف تھا۔ میں نے صفورہ کے رشتے کو ٹھکرا دیا اور افشاں سے شادی کر لی۔ میرے ذہن سے صفورہ کبھی کی نکل گئی تھی۔ مجھے جو ٹیلی فون ملا وہ صفورہ ہی کا تھا۔ وہ یورپ سے آئی تھی اور اس نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ میں اس سے ہوٹل کے اس کمرے میں ملوں۔ باقی تفصیلات تمہیں معلوم ہیں۔''

''مگر یہ نہیں معلوم کہ ہوٹل کے کمرے میں تمہاری اس سے کیا بات چیت ہوئی؟'' کامران نے کہا۔

''بڑی عجیب بات ہے کامران! وہ مجھے اپنی قربت کی پیشکش کر رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ چونکہ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا اس لئے وہ اب اپنا انتقام لینا چاہتی ہے اس لئے اس نے افشاں کو قید کر رکھا ہے۔ اس نے مجھے شرط پیش کی کہ اگر وہ یہ بات ثابت کر دے کہ اشعر اور افشاں اس کے قبضے میں ہیں تو مجھے اس کی ساری باتیں ماننی پڑیں گی۔ اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ وہ مجھے ان لوگوں سے ملانے لے گئی تھی لیکن وہ وہاں نہیں ملے۔ یہ ہے ساری داستان۔

حیرت کی بات ہے...... اگر اس مسئلے میں وہ لڑکی صرف اپنے انتقام کی آگ پوری کرنا چاہتی ہے اور اس نے افشاں کو اغواء کیا ہے تو واقعی بڑی حیرت ناک بات ہے۔ میں کسی لڑکی سے ایسی توقع نہیں رکھ سکتا۔ یہ تو بالکل ہی الٹ معاملہ ہو گیا۔''

''وہ یورپ سے واپس آئی ہے نا؟'' کامران نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''تو یہ کوئی الٹ معاملہ نہیں ہے...... کیونکہ یورپ بری طرح الٹ چکا ہے اور

وہاں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔''

''افشاں وہاں بھی نہیں ملی۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ واقعی وہاں ہو اور وہاں سے کہیں نکل گئی ہو۔''

کامران خاموشی سے کچھ سوچتا رہا پھر اچانک ہی اس نے کہا۔

''نہیں میرے دوست! بات صرف اتنی سی نہیں ہے، اس کے پس منظر میں کوئی اور کہانی بھی چھپی ہوئی ہے۔''

''اور کہانی؟''

''ہاں......''

''وہ کیا ہو سکتی ہے؟''

''اچھا یہ بتاؤ چندر بدن کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''دماغ خراب ہو گیا ہے میرا......''

''کیا مطلب؟''

''چندر بدن ایک ماڈرن لڑکی کے روپ میں۔ جبکہ اس سے پہلے وہ جس طرح ملتی رہی ہے تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہے۔ ایک قدیم روح۔ میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ اور اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟''

''ہاں، آگے بولو۔''

''ایک قدیم روح اتنے ماڈرن انداز میں۔''

''یہی چیز مجھے بھٹکا رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہو سکتا ہے جو لڑکی تم سے ہوٹل میں ملی، وہ صفورہ نہ ہو۔''

''صفورہ نہ ہو......؟''

''ہاں......''

''تو پھر......؟''

''مطلب یہ کہ چندر بدن نے صفورہ کا روپ دھارا ہوا ہو۔'' کامران نے کہا اور ہارون حیرت سے منہ کھول کر اسے دیکھنے لگا۔ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''میرے خدا...... میرے خدا...... میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ بلکہ

میں خود بھی حیران تھا کہ صفورہ مجھ سے اتنی زیادہ متاثر کیونکر ہوئی۔''

''اس بات کے پورے پورے امکانات ہیں کہ چندر بدن نے صفورہ کا روپ دھارا ہوا ہو۔ ایک روح کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اور پھر اس نے تمہیں اپنے بدن کی پیشکش کی۔ چندر بدن کی حیثیت سے نہ صحیح ایک مجبوری کے ساتھ صفورہ کی حیثیت سے چندر بدن تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہو۔ تاکہ تمہیں اپنے قبضے میں کر لے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ پرانے واقعات......''

''کون سے......؟''

''وہی جو میں نے تمہیں سنائے تھے، خواب کی شکل میں۔ جس میں خاقان نامی ایک شخص چندر بدن کو لے گیا تھا اور گجراج نے مجھ پر حملے کئے تھے اور کہا تھا کہ میرے بدن سے خاقان کی بو آتی ہے۔''

''دیکھو...... یہ سارے معاملات ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اس علاقے میں آنے کے بعد جہاں ہم نے کھدائی کا اور سروے کا کام کیا، ہم عجیب و غریب مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے۔''

''لیکن اب تو وہاں سے نکلنے کے بعد بھی ان مصیبتوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔''

''امتحان ہوتا ہے...... امتحان۔ اگر چندر بدن کوئی ناپاک روح ہے تو ہمیں اس کا مقابلہ کرنا ہو گا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ مجھے میری بیوی اور بیٹا مل جائیں تو میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے دور نکل جاؤں۔ میری تو زندگی داؤ پر لگ گئی ہے۔''

''انشاء اللہ تعالیٰ بھابی تمہیں زندہ اور سلامت ملیں گی ہارون! لیکن ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا ہے۔''

''تم نے ایک نیا انکشاف کر کے مجھے واقعی مشکل میں ڈال دیا ہے۔''

''ہم اس کی تصدیق کئے لیتے ہیں۔''

''کس طرح؟''

''حاجی عطا کا گھر معلوم نہیں تمہیں؟''

''اگر وہ پرانے ہی گھر میں ہیں تو میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ روایتی قسم

کے آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہیں ان کا قیام ہو۔ ایسے لوگ اپنے آبائی گھر نہیں چھوڑتے۔ ویسے بھی وہ ان کا قدیم گھر تھا۔

"چلو، وہیں سے بہت سے انکشافات ہو سکیں گے۔" کامران نے مشورہ دیا اور ہارون تیار ہو گیا۔ سارے بدن کی چولیں ہل گئی تھیں۔ دماغ الگ پریشان تھا۔ جس قدر وحشت کے عالم میں گزر رہی تھی، ہارون کا دل ہی جانتا تھا۔ اپنے دوست کامران کے بارے میں اس کے خیالات ہمیشہ سے اچھے تھے۔ کامران ایک بہت اچھا ساتھی ثابت ہوا تھا لیکن زندگی کی سب سے بڑی مشکل میں ہارون کا وہ اس طرح ساتھ دے گا خود ہارون نے بھی نہیں سوچا تھا۔ کامران بالکل اس طرح اس کے ساتھ لگا ہوا تھا جیسے یہ اس کا بالکل ذاتی مسئلہ ہو۔ ہارون اس کا بے حد شکر گزار تھا لیکن الفاظ میں اس کا اظہار کر کے وہ کامران کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بہر حال حاجی عطا کا گھر یاد کرنے میں ذرا دقت پیش آئی تھی کیونکہ بات کافی پرانی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ حاجی عطا کی حویلی پہنچ گئے۔ پرانے طرز کی حویلی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ایک ملازمہ ٹائپ کی عورت نے دروازہ کھولا۔

"جی صاحب..... کس سے ملنا ہے؟"

"یہاں حاجی عطا صاحب رہتے ہیں؟"

"رہتے ہیں..... وہ تو بہت پرانی بات ہے صاحب! اب تو ان کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔"

"کیا.....؟"

"جی ہاں..... کئی سال پہلے مر گئے وہ۔"

"اوہ..... یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔ ان کا کوئی بیٹا وغیرہ؟"

"صاحبزادی حمیرہ موجود ہیں۔ آپ ان سے مل لیجئے۔" عورت نے کہا۔

"آپ انہیں بتا دیجئے کہ حاجی عطا صاحب کے بہت پرانے رشتے دار ان کے پاس آئے ہیں۔"

بہت ہی خوبصورت سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھایا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک پُروقار خاتون اندر سے نمودار ہوئیں۔ کامران اور ہارون نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب دیا اور بولیں۔

"ابا جان کے بارے میں آپ کو علم نہیں تھا؟"

"نہیں..... ہم اس شہر میں نہیں تھے۔ یہاں سے چلے گئے تھے۔"

"خیر فرمائیے، میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

"آپ کو زحمت تو ہو گی، ایک صاحب جو حاجی عطا صاحب کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ طاہر علی ان کا نام تھا۔"

"ہاں..... ہاں..... طاہر علی..... نیرہ بیگم....."

"وہ یورپ چلے گئے تھے۔"

"واپس آ گئے ہیں..... ابھی تک میری ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن ٹیلی فون پر بات چیت ہوئی ہے۔ نیرہ باجی نے مجھے اپنی آمد کے بارے میں بتایا تھا اور کہا تھا کہ بہت جلد وہ مجھ سے ملیں گی۔ فی الحال وہ کسی الجھن میں پھنسی ہوئی ہیں۔"

"آپ بتا سکتی ہیں یہاں ان کا کہاں قیام ہے؟"

"ہاں..... ہاں..... میرے پاس ان کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر دونوں موجود ہیں۔ منگوا دوں آپ کے لئے؟"

"بڑی نوازش ہو گی۔"

"خیر یہ بتائیں، کیا پئیں گے آپ لوگ؟"

"نہیں، کوئی تکلف نہ فرمائیے گا۔"

حمیرہ بیگم نے ملازمہ کو آواز دی اور کہا۔ "صندل کا شربت لے آؤ۔ اور اس کے ساتھ ہی ظفر سے کہو کہ میرا انڈیکس دے دیں۔"

صندل کا شربت پینے کے بعد حمیرہ بیگم نے اپنی انڈیکس سے ٹیلی فون نمبر اور گھر کا پتہ نکال کر ایک کاغذ پر لکھ کر انہیں دے دیا اور کہنے لگیں۔

"کبھی بھی کوئی الجھن یا مشکل پیش آئے تو آپ لوگ میرے پاس آ سکتے ہیں۔"

"ہم صرف شکریہ ہی ادا کر سکیں گے آپ کا۔ بہت مہربان خاتون ہیں آپ۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔" حمیرا بیگم نے کہا اور کامران اور ہارون باہر نکل آئے۔

کامران نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"اس بات کا تو پتہ چل گیا کہ صفورہ اور اس کے والدین یورپ سے آ گئے ہیں۔"

"ابھی چلیں گے اس پتے پر..... ملیں گے ان سے؟"

"ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں؟" کامران نے کہا اور مطلوبہ پتے کی طرف

جیپ دوڑا دی۔ پتہ معلوم کرتے ہوئے وہ آخر کار اس عمارت تک پہنچ گئے جہاں کا پتہ انہیں ملا تھا۔ تھوڑی دیر میں ان کی رسائی نیرہ بیگم اور طاہر علی تک ہو گئی۔ طاہر علی نے پُر خیال انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری شکل شناسا لگتی ہے نوجوان! نام بتاؤ گے اپنا؟''

''میرا نام ہارون ہے۔ بہت پرانی بات ہے، حاجی عطا صاحب نے میری آپ سے ملاقات کرائی تھی۔''

''اوہو...... ہارون...... ہاں ...... یاد آ گیا، اچھی طرح یاد آ گیا۔ کہو بیٹے کیا حال ہیں تمہارے؟ حاجی عطا صاحب نے تمہارے رشتے کی بات کی تھی۔ مگر شاید تمہاری کچھ الجھنیں تھیں جن کی وجہ سے تم نے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔''

''جی...... میں وہی ہارون ہوں۔''

''سناؤ، کیسے مزاج ہیں تمہارے؟ کیا کر رہے ہو بھئی...... بڑا اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔ ہم تو ایک طرح سے یہاں بالکل اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں۔ انسان کو اتنے عرصے کے لئے اپنا ملک کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کیونکہ بہر حال کوئی کہیں بھی چلا جائے وطن سے اس کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ اگر اپنے آپ کو وطن سے اجنبی کرے تو اس کی بدنصیبی ہے۔ ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ حاجی عطا صاحب سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اصل میں بیٹا! ہم یہاں آنے کے بعد ایک بڑی مشکل اور الجھن کا شکار ہو گئے ہیں۔''

طاہر علی صاحب نہایت سادگی سے اپنے بارے میں بتا رہے تھے اور ہارون کامران کی صورت دیکھ رہا تھا۔ پھر ہارون نے کہا۔

''آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں ایک الجھن کا شکار ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''واہ...... یعنی ایک الجھا ہوا انسان دوسرے الجھے ہوئے انسان کے پاس آیا ہے۔ چلو بھائی کوئی بات نہیں ہے۔ اللہ تمہاری الجھن بھی دور کر دے اور ہماری بھی۔ چلو ایسا کرو الجھنوں کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ پہلے تم اپنی الجھن بتا دو پھر ہم اپنی بتا دیں گے۔ بتاؤ بیٹا، مذاق اپنی جگہ۔ حالانکہ اس وقت مذاق کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن نجانے کیوں تمہیں دیکھ کر ایک احساس دل میں جاگا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے درد کا درماں بن جاؤ۔''

''خدا کرے ایسا ہو۔ میں آپ کی صاحبزادی صفورہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

طاہر علی اور نیرہ بیگم بری طرح چونک پڑے تھے۔ طاہر علی نے غور سے ہارون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کس طرح کی معلومات؟''

''دیکھئے، آپ کی جگہ کوئی بھی ہوگا تو وہ میری باتوں پر سخت ناراض ہو جائے گا۔ اس بات کا مجھے بھرپور احساس ہے۔ لیکن انتہائی شرمندگی اور معذرت کے ساتھ آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں شدید مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ کیا آپ مجھے صاحبزادی صفورہ کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟''

''کس طرح کی تفصیل؟''

''کیا وہ بہتر حالت میں ہیں؟ کیا وہ اسی طرح زندگی گزار رہی ہیں جس طرح گزارتی تھیں؟ ان کی ذہنی کیفیت بالکل ٹھیک ہے؟ کسی مشکل کا شکار تو نہیں ہیں وہ؟''

طاہر علی اور نیرہ بیگم پریشان نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ طاہر علی تو کچھ نہ بول سکے لیکن نیرہ بیگم نے کہا۔

''ہاں...... ایسی ہی بات ہے بیٹا! تم ہمارے وطن میں ہوں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ایک دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث بنی ہو۔ ایسی صورت میں بیٹا ہم تم سے بالکل جھوٹ نہیں بولیں گے۔ مگر تم بھی ہمیں بتاؤ گے کہ واقعہ کیا ہوا ہے؟ یا کیا بات ہے؟ تم کیوں اس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟ تم چاہو تو ہم تمہیں بتا سکتے ہیں۔''

نیرہ بیگم نے طاہر علی کی طرف دیکھا اور طاہر علی نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

''ہاں...... اس طرح بے بسی اور تنہائی کا شکار ہو کر ظاہر ہے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کسی نہ کسی کو تو اپنا ساتھی بنانا ہی ہوگا۔ اور پھر واقعات اس طرح کے ہیں کہ ہم پولیس وغیرہ سے بھی کوئی مدد نہیں لے سکتے۔ کیا مدد لیں گے اور کس سلسلے میں لیں گے؟ ساری باتیں بے وقوفی کی ہی ہوں گی۔''

''بات کیا ہے...... آپ براہ کرم مجھے بتائیے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کی مدد کر

سکوں۔''

''بیٹے! لندن میں صفورہ وہاں کے آزاد ماحول میں ڈوب گئی تھی اور ہم ایک بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو گئے تھے۔ وہاں ایک ایسا ناپاک شخص جس کا تعلق ہمارے مذہب سے نہیں تھا ایک ادارہ یا آشرم کھولے بیٹھا ہوا تھا، جہاں وہ کالا جادو سکھاتا تھا۔ اس کا نام نٹڈن گوپال تھا۔ نٹڈن گوپال کالے جادو کا ماہر تھا۔ وہاں لندن میں اس نے مقامی اور غیر مقامی لوگوں کو بڑی تعداد میں اپنا شاگرد بنا رکھا تھا اور انہیں ناپاک علوم سکھاتا تھا۔ نجانے کس طرح ہماری صفورہ بھی اس تک پہنچ گئی اور اس نے اس کی شاگردی اختیار کر لی۔ ہم پر اس وقت انکشاف ہوا جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ صفورہ جادو کی غلاظت میں پھنس چکی تھی۔

جب ہمیں علم ہوا تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے دھوکے سے یہاں بھیج دیا جائے۔ تو ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم اسے لے کر یہاں آ گئے اور پھر میں نے لندن وغیرہ کا سارا کاروبار بند کر دیا۔ اب وہ یہیں رہتی ہے۔ انتہائی سرکش اور خوفناک ہو چکی ہے۔ تھوڑے بہت علم بھی آتے ہیں اسے۔ یوں سمجھو بیٹا! وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے...... آہ...... کاش کوئی ہماری مدد کر سکے...... ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں نے تمہیں ساری تفصیل بتا دی۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم اس کے بارے میں کیوں معلوم کر رہے ہو؟''

ہارون نے ایک بار پھر کامران کی طرف دیکھا تو کامران بولا۔

''ہارون! اس وقت صاف گوئی اور سچائی ہی دونوں کی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر تم اخلاق کے لبادے میں لپٹ گئے تو معاملات خراب ہو جائیں گے۔ جو کچھ بھی ہے، صاف گوئی کے ساتھ بتا دو۔''

''کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا بیٹا؟ بتاؤ کیا بات ہے؟'' طاہر علی نے نرمی اور شفقت سے کہا۔

''جناب! اس وقت جب صفورہ کے سلسلے میں آپ کی مجھ سے بات چیت ہوئی تھی تو میں ایک لڑکی سے زندگی کے عہد و پیمان کر چکا تھا اور میں نے اس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا جس کی وجہ سے میں نے صفورہ سے شادی سے معذرت کی۔ صفورہ صاحبہ سے میرے کسی قسم کے مراسم تھے نہ تعلقات نہ بہت زیادہ شناسائی۔ ایک آدھ بار ہی انہیں بس دیکھا تھا۔ میرے ذہن کے گوشے میں یہ وہم بھی نہیں تھا کہ انہوں

نے میرے انکار کو اپنی توہین سمجھا ہو گا۔ بہرحال افشاں سے میری شادی ہو گئی۔ میرا ایک سات سال کا بیٹا ہے۔ ہم لوگ پُرسکون زندگی گزار رہے تھے اور ہماری زندگی میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ میں سول انجینئر کی حیثیت سے اپنے گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔

پھر میں واپس آیا تو میری ملازمہ نے مجھے بتایا کہ ایک خاتون میری بیوی اور بیٹے کو اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ بہرحال میں نے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی ہے اور خود اپنے ان دوست کے ساتھ اپنی بیوی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ مجھے ایک ٹیلی فون موصول ہوا جس میں ایک خاتون نے مجھ سے ایک ہوٹل میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اور جب میں ہوٹل میں ان سے ملاقات کے لئے پہنچا تو وہ صفورہ بیگم تھیں۔ صفورہ نے مجھے بتایا کہ میں نے ان سے شادی سے انکار کر کے ان کی توہین کی تھی اس لئے انہوں نے میرے بیٹے اور بیوی کو اغواء کر لیا ہے۔''

''اغواء...... ؟'' نیرہ بیگم اور طاہر علی کے منہ سے خوفزدہ لہجے میں نکلا۔

''جی...... وہی خاتون تھیں جو انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ افشاں اور اشعر ان کے قبضے میں ہیں اور پھر میں معافی چاہتا ہوں آپ سے، انہوں نے مجھ سے ایک ایسا مطالبہ کیا جو کوئی بھی مشرقی دوشیزہ کسی نوجوان سے اپنی زبان سے نہیں کر سکتی۔ بالکل الٹا معاملہ تھا۔ بد باطن لوگ معصوم لڑکیوں کو ورغلا کر یا ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کر لیتے ہیں، صفورہ صاحبہ نے مجھ سے اس کی فرمائش کی۔ میں ایک شریف آدمی ہوں جناب! یہ کہتے ہوئے مجھے کوئی الجھن نہیں ہو رہی۔ انہوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تو میں حیران رہ گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میری بیوی اور بچہ ان کے قبضے میں ہیں۔ میں چونکہ اپنی بیوی اور بچے کے لئے سخت پریشان ہوں، ان کی بے انتہا فرمائش پر میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ میری بیوی اور بیٹا میرے حوالے کر دیتی ہیں تو میں ان کی ہر شرط پوری کروں گا۔'' ہارون نے جھجکتے ہوئے کہا۔

طاہر علی کی گردن شرم سے جھک گئی تھی۔ ہارون نے کہا۔

''میں نے ان سے کہا کہ پہلے وہ مجھے میرے بیٹے اور بیوی کی شکل دکھا دیں۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئیں اور مجھے لے کر چل پڑیں۔ ایک کچی آبادی کے گھر میں داخل ہو کر انہوں نے افشاں اور اشعر کو تلاش کیا لیکن وہ وہاں نہیں تھے۔ مجھے بھرپور طریقے سے یہ اندازہ ہے کہ یہ بات ان کے تصور کے خلاف تھی۔ وہ جھلائی ہوئی باہر آ گئیں۔

انہوں نے معلومات بھی حاصل کیں لیکن کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ تب انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں جاؤں۔ وہ ان دونوں کو تلاش کر کے بہت جلد مجھ سے رابطہ قائم کریں گی۔ وہ چلی گئیں۔ جناب عالی! میرے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ حاجی عطا صاحب کے گھر گیا، وہاں حمیرہ بیگم سے ملاقات ہوئی۔ ان سے آپ کا پتہ معلوم کیا اور یہاں تک پہنچا ہوں۔ کیا صفورہ بیگم آپ کے ساتھ رہتی ہیں؟''

طاہر علی اور نیرہ بیگم کا چہرہ غم سے سکڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد طاہر علی نے کہا۔

''ہاں...... وہ رہتی تو یہیں ہے لیکن وہ ہم میں سے نہیں رہی ہے۔ بدبخت اپنی تقدیر کے اندھیروں میں ڈوب چکی ہے۔ کالے جادو نے اسے تباہ کر دیا ہے۔ دین ایمان تو خیر اس کا کبھی کا مٹ ہی گیا لیکن وہ یہاں تک پہنچ جائے گی اور اس طرح اپنے آپ کو پامال کرے گی ہمیں اس کی امید نہیں تھی۔ اب تم ہی سوچو ہارون! تم ہی بتاؤ کیا کریں میرے بیٹے میرے دوست...... میرے بچے! میں تمہاری تکلیف میں برابر کا شریک ہوں۔ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوں۔ وہ دین ایمان سے گزر چکی ہے۔ وہ انسانیت سے گزر چکی ہے۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔ بے اولاد رہ جاؤں گا میں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔''

''نہیں طاہر علی صاحب! جلد بازی نہ کریں۔ ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ اس طرح کے عامل بھی مل جاتے ہیں جو کالے جادو کا توڑ کیا کرتے ہیں۔'' کامران نے کہا تو طاہر علی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے کوشش کی تھی۔ ایک شخص کو لے کر آیا تھا لیکن لگتا ہے وہ جھوٹا آدمی تھا۔ صفورہ نے اسے مار پیٹ کر بھگا دیا۔''

''اس طرح کے لوگ تو واقعی غلط ہوتے ہیں۔ آپ اس طرح کے چکروں میں کبھی نہ پڑیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم آپ سے رابطہ رکھیں؟''

''اجازت لے رہے ہو بیٹا...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ خدا کے واسطے میری مدد کرو اور جہاں تک ممکن ہو سکے، تھوڑا سا صبر کرو۔ خداوند عالم تمہاری بیوی اور بیٹے کو محفوظ رکھے۔ دیکھو صفورہ تم سے کیا کہتی ہے۔ ویسے ہم لوگ بھی اسے اس طرح تو نہیں چھوڑیں گے۔''

''اجازت دیجئے......'' ہارون نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

''نہیں بیٹا! کچھ کھا پی کر جاؤ۔''

''نہیں...... بالکل نہیں...... حمیرہ بیگم کے ہاں سے شربت پی لیا تھا، وہاں سے سیدھے ادھر آ رہے ہیں۔''

''تو پھر ہارون! ایک وعدہ کرو، مجھ سے ملتے رہو گے۔ مجھے چھوڑو گے نہیں۔ تمام تر صورتحال سے آگاہ رکھو گے۔''

''جی......'' ہارون نے وعدہ کیا اور اس کے بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔ جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھتے ہوئے کامران نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے چندر بدن اور صفورہ دو الگ الگ کردار ہیں۔''

''ہاں...... شاید......'' ہارون ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

البیلے دولہا کی درگت بنانے کے بعد صفورہ گھر سے باہر نکل آئی۔ اب وہ ایک آزاد زندگی گزار رہی تھی اور اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اپنی مرضی کی مالک، جس طرح چاہے جئے۔ لیکن ساری باتیں اس کے ذہن میں ایک عجیب سی الجھن پیدا کر رہی تھیں۔ وہ پریشان تھی کہ آخر بابو خاں، افشاں اور اشعر کو لے کر کہاں چلا گیا؟ کہیں کوئی اور عمل تو نہیں ہو گیا؟ یہ ذرا سوچنے کی بات تھی۔

آخر کار وہ اس ہوٹل پہنچ گئی جہاں اس نے اپنے لئے کمرہ حاصل کیا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اس کے بعد اپنا لباس اتارنے لگی۔ مکمل طور پر بے لباس ہونے کے بعد اس نے اپنے بدن کو اپنے ہاتھوں سے ملنا شروع کر دیا۔ سنگ مرمر جیسے سفید اور سڈول بدن کے مسامات کھلنے لگے اور پھر ان سے چھوٹے چھوٹے بیر نکلنے لگے۔ اس کے بعد وہ اس کے سامنے صفیں بنا کر دست بستہ ہو گئے۔

''جے دیوی......'' ان کی باریک باریک آوازیں ابھریں۔

''میرے بیرو! میں جب بھی تمہیں بلاتی ہوں کوئی ایسا کام ضرور ہوتا ہے جو میں تم سے لینا چاہتی ہوں۔ تمہیں اس طرح میری طلبی پر کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی۔''

''تو تکلیف کی بات کرتی ہے دیوی، ہم روتے ہوئے تیرے شریر سے باہر آتے ہیں۔''

''روتے ہوئے؟''

''ہاں دیوی!''

''کیوں؟''

''اس لئے دیوی کہ تیرے اس حسین قلعے سے باہر آنے کے بعد ہمارا جیون صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ ہم تیرے حکم کی تعمیل میں مصروف رہیں اور اس کے بعد ہم ہواؤں میں بکھر جاتے ہیں، تحلیل ہو جاتے ہیں یا دوسرے

لفظوں میں مر جاتے ہیں۔ جب تک ہم تیرے شریر کے اس محل میں موجود رہتے ہیں، ہمارا جیون قائم رہتا ہے اور ہم تیرے بدن کی رگوں میں ذرات بن کر دوڑتے رہتے ہیں۔ ہم میں سے جو بھی باہر آ جاتا ہے وہ پھر واپس تیرے شریر میں نہیں جا سکتا اسے تیرے حکم کی تعمیل کے بعد ختم ہونا ہوتا ہے۔''

''ہاں...... یہ تو افسوس کی بات ہے...... مجھے بتاؤ تمہارے جیون کی بقا کے لئے میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''نہیں دیوی! ہمارا کام ہی اتنا ہوتا ہے اور اس سنسار میں جس کا جتنا کام ہوتا ہے بس وہ اتنا ہی جیتا ہے اور اس کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔''

''میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''حکم کر دیوی!''

''وہ حرامی بابو خاں کہاں مر گیا جس کے سپرد میں نے افشاں اور اس کے بیٹے کو کیا تھا؟''

''ہم بتا سکتے ہیں دیوی!''

''تو بتاؤ؟''

''اس کے من میں دیا آ گئی تھی۔''

''تو پھر؟''

''وہ ان دونوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا اور اس نے انہیں اپنی ایک بہن جس کا نام رشیدہ ہے کے گھر پہنچا دیا۔ اب وہ وہیں ہیں۔''

صفورہ کا چہرہ اابھبھوکا ہو گیا۔ غصے سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور خود بابو خاں؟''

''وہ اپنے ایک دوست سعید خاں کے ہاں موجود ہے۔ وہیں رہ رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ وہیں چھپا ہوا ہے۔''

''ہوں...... پتہ بتاؤ مجھے اس کا۔'' صفورہ نے کہا اور بیر اسے اس کا پتہ بتانے لگے۔ صفورہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... اب تم جاؤ۔''

''جے دیوی......'' بیروں نے گردن لٹکا کر کہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے

مختلف کونوں کھدروں کے سوراخوں سے باہر نکل گئے۔ ہواؤں میں تحلیل ہونے کے لئے۔ صفورہ خاموشی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا لباس پہنا، بیروں کے بتائے ہوئے پتے کے بارے میں اندازہ لگایا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکل آئی۔

کار اب اس راستے پر جا رہی تھی جہاں سعید کا گھر تھا۔ بیروں نے جتنی تفصیل سے اس گھر کے بارے میں بتایا تھا، صفورہ کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ آخر کار تھوڑی دیر کے بعد سعید کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ چھوٹا سا غربت کا مارا ہوا گھر تھا جو اس طرح کے لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

کچھ منٹ بعد اندر سے ایک آواز سنائی دی۔

''کون ہے......؟''

''دروازہ کھولو...... میں پڑوسن ہوں۔'' صفورہ نے مدھم لہجے میں کہا۔ اندر سے آنے والی آواز کسی لڑکی کی تھی اور اس میں کچھ ٹیڑھا پن بھی تھا۔ پھر دروازہ کھلا تو صفورہ نے اندر موجود لڑکی کو دیکھا...... سانولے سلونے رنگ کی ایک پیاری سی شکل کی نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے صفورہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... کیا بولنے کو مانگتا ہے؟''

صفورہ نے اطمینان سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور اسے پیچھے دھکیل کر خود اندر داخل ہوگئی۔ لڑکی حیران رہ گئی تھی لیکن دالان میں اس نے ایک اور شخص کو دیکھا جو ایک تخت پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ اس کی آواز ابھری۔

''کون ہے روبی؟''

''کوئی عورت آئی ہے...... میرے کو دھکا دیا۔''

''کیا......؟'' تخت پر بیٹھا ہوا شخص کھڑا ہوگیا۔ صفورہ نے اسے غور سے دیکھا پھر پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور بولی۔

''تمہارا نام سعید ہے؟''

''ہاں...... لیکن یہ کیا بدتمیزی ہے...... تم کون ہو؟''

''مہمان ہوں تمہاری...... اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے؟''

''اس طرح سے دھکا دے کر کیوں اندر آئی ہو؟''

''کام تھا...... یہ بتاؤ بابو خاں کہاں ہے؟''

سعید ایک دم چونک پڑا۔ بابو خاں نے اسے مختصر الفاظ میں تفصیل بتا دی تھی۔ اس نے غور سے صفورہ کو دیکھا اور بولا۔

''ہوں...... تو تم صفورہ ہو۔''

''ہاں...... بابو خاں کہاں ہے؟''

''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''میں اسے کچھ دینے آئی ہوں...... اتنا کچھ دینے آئی ہوں کہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔''

''کیا......؟'' اسی وقت اندر سے آواز آئی۔ ''کون ہے سعید؟'' اور یہ الفاظ کہتا ہوا بابو خاں اندر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ لیکن صفورہ کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ صفورہ نے بابو خاں کو دیکھا اور پھر بولی۔

''بابو خاں...... مجھے تم سے کچھ کام ہے۔''

''تت...... تم...... تم یہاں کیسے آ گئیں؟''

''بابو خاں! میں نے تم سے کہا نا کہ مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ تنہائی میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ یا ان دونوں کو کہیں بھیج دو یا پھر آؤ میرے ساتھ چلو۔''

''مم...... مگر...... میں...... میں......''

''نہیں...... میری بات سنو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں میری ذات سے کوئی نقصان پہنچے گا تو اس بات کو بھول جاؤ۔ انسانی ہمدردی کا جو عمل تم نے کیا ہے اس نے میری بھی آنکھیں کھول دی ہیں بابو خاں! واقعی کئی بار انسان جذبات میں اندھا ہو کر کچھ ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے...... لڑکی! مجھے پانی پلاؤ گی؟'' صفورہ نے روبینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ سعید جلدی سے بولا۔

''آیئے، ادھر بیٹھئے...... آپ ہماری مہمان ہیں۔ آپ کی عزت کرتے ہیں۔''

''شکریہ......'' صفورہ نے مضمحل لہجے میں کہا اور تخت پر جا بیٹھی۔ سعید بولا۔

''یہ جگہ آپ کے قابل تو نہیں ہے پر جب غریب کی جھونپڑی میں آپ نے قدم رکھا ہی ہے تو آیئے، بیٹھئے۔ جاؤ روبینہ! شربت بنا لاؤ۔''

''شربت نہیں سعید! صرف پانی پیوں گی۔ پلیز! دیکھو انسان کی اپنی کوئی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیشہ وہی ضرورت پوری کرنی چاہئے۔ احمقانہ انداز میں تکلف

نہیں کرنا چاہئے۔" صفورہ کا لہجہ اتنا نرم تھا کہ خود بابو خاں بھی متاثر ہو گیا۔

"بیٹھو بابو خاں! یہ بتاؤ مجھے کہ ہوا کیا تھا؟"

"دیکھئے بی بی صاب! میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے مگر آپ یقین کرو......"

"یقین ہے مجھے بابو خاں ...... یقین ہے مجھے ...... انسان کے دل میں انسان جاگ جائے تو پھر وہ بڑے سے بڑے مفاد کو ٹھکرا دیتا ہے۔" صفورہ نے کہا اور بابو خاں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ صفورہ کے اندر اسے نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"تو کیا بی بی صاحب! آپ نے مجھے معاف کر دیا؟"

"بابو خاں! میرا خیال ہے تم نے ہی میرے دل میں یہ احساس جگایا ہے۔ اچھا ایک کام کریں۔ آؤ گے میرے ساتھ؟"

بابو خاں نے مشکوک نگاہوں سے صفورہ کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

"میں تم سے بالکل یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے افشاں یا اس کے بیٹے کے پاس لے چلو۔ میرا وعدہ ہے تم سے۔ تم غالباً یہی شک کر رہے ہو کہ میں تم سے ایسی باتیں کر کے وہاں تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ نہیں بابو خاں! جس طرح میں یہاں پر پہنچ گئی ہوں وہاں بھی پہنچ جاؤں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

لڑکی نے پانی کا گلاس صفورہ کو دیا تو وہ پانی پی کر شکریہ ادا کر کے اٹھ گئی۔

"بابو خاں ...... آؤ ...... کسی قسم کی فکر مت کرو۔"

"چلئے ......" بابو خاں ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور صفورہ اسے ساتھ لئے باہر آ گئی۔ بابو خاں کو اس نے اپنے پاس ہی بٹھا لیا تھا۔ پھر وہ کار اسٹارٹ کر کے چل پڑی۔

"اصل میں میرا اس لڑکی سے کوئی جھگڑا تھا بھی نہیں۔ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی تھی اور اس کا شوہر اس سے چھٹکارا حاصل کر کے مجھے اپنانا چاہتا تھا۔ مجھے بھی وہ آدمی پسند تھا لیکن پھر ایک خواب نے میری ذہنی کیفیت تبدیل کر دی۔"

"آپ نے کوئی خواب دیکھا تھا بی بی صاحب؟"

"ہاں بابو خاں ...... میں نے دیکھا کہ میں ایک سڑک پر چلی جا رہی ہوں۔ کافی فاصلہ طے کر چکی تھی میں کہ مجھے ایک کھنڈرات جیسی چیز نظر آئی۔ اس وقت میری کار کا انجن بند ہو گیا۔ میں نے ہر طرح سے انجن چیک کیا لیکن کوئی صحیح پتہ نہیں چل سکا کہ کیا

خرابی ہے۔ میں نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ سخت چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی اور باہر بڑی گرمی تھی۔ گرمی سے انتہائی بے چین ہو کر میں نے کار وہیں چھوڑی اور سڑک سے چند گز کے فاصلے پر بنے ہوئے ان کھنڈرات میں داخل ہو گئی۔ اور پھر وہاں میں نے ایک قبر دیکھی۔ بابو خاں! میں نے دیکھا کہ قبر کے کنارے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ صفورہ! کیوں دیوانگی کا شکار ہو رہی ہے؟ انسان کا انسان پر ظلم کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ جو کچھ تو کر رہی ہے تجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں بری طرح ڈر گئی بابو خاں! میں نے سوچا کہ اللہ جانے کیا ہو میرے ساتھ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور میرا گناہ کیا ہے؟ تو ان بزرگ نے مجھ سے کہا کہ جا، سب سے پہلے ان مظلوموں کو آزاد کر دے جنہیں تو نے قید کر رکھا ہے ...... جا۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ زندگی کی گاڑی کس طرح آگے بڑھائی ہے۔ بس بابو خاں! میرے دل پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے رو رو کر ان بزرگ سے وعدہ کیا کہ اب میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گی۔ وہ مجھے معاف کر دیں۔ تب بزرگ نے کہا کہ جا، بابو خاں کو بتا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ اس کے دل میں انسانیت پیدا ہو چکی ہے اور وہ پہلے ہی انہیں آزاد کر چکا ہے۔ جا، اس کے ذہن سے تمام کدورت نکال دے۔ اور بابو خاں! مجھے تمہارا راستہ بتایا گیا۔

میری آنکھ کھل گئی۔ لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ اس خواب میں کوئی سچائی بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے بس آزمائش کے لئے ہی اس پتے پر پہنچ کر تمہارے بارے میں پوچھا۔ تب پتہ چلا کہ تم وہیں موجود ہو۔ اب میرے دل میں عقیدت کے سوا کچھ نہیں بابو خاں! بہر حال بزرگوں کا اپنا ایک مقام تو ہوتا ہے۔"

"ہاں بی بی صاحب! ان بزرگوں کے دم سے ہی یہ آسمان ٹکا ہوا ہے ...... کیا اچھی بات ہوئی۔ پہلے ہماری اصلاح ہوئی، بعد میں آپ کی۔"

"کیا وہ اپنے ہوش و حواس میں واپس آ گئی؟ ...... میری مراد افشاں سے ہے۔"

"نہیں ...... وہ ماں بیٹا ایسی بے بسی کا شکار تھے اور ایسی درد بھری کیفیت ٹپکتی تھی ان کی آنکھوں سے کہ بس بی بی میرا تو پتہ پانی ہو گیا۔ میرے دل نے کہا کہ بابو خاں کیا کرے گا ان پیسوں کا جو تجھے اس درندگی کے بدلے ملتے ہیں۔ کیا فائدہ انسانوں سے ان کی آزادی چھیننے کا؟ جا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو خود قید کے عذاب کا شکار ہو جائے۔ بس بیگم صاحب! میں نے سوچا کہ میں ان کی مدد کروں اور میں نے انہیں

وہاں سے نکال دیا۔ مجھے آپ کا ڈر تھا اس لئے میں نے انہیں اپنی بہن کے ہاں چھپا دیا اور خود اپنے دوست کے ہاں چھپ گیا۔''

''ہوں...... ٹھیک ہے بابو خاں...... اس کے بعد تمہیں آزادی ہے۔ ان کے ساتھ چاہے جو مرضی سلوک کرو۔ ویسے بابو خاں! ایک بات بتاؤ...... یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک پچھائی ٹیلے نامی جگہ ہے۔ کیا وہاں کوئی مزار ہے؟''

''پچھائی ٹیلہ۔ وہاں تو ہم نے کوئی مزار نہیں دیکھا۔ وہ جو پیلی مٹی کے پہاڑوں کے پیچھے سڑک جا رہی ہے وہی پچھائی ٹیلہ کہلاتی ہے۔''

''ہاں وہی وہی...... اور وہ کھنڈر بھی وہاں موجود ہے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے کی کوئی عمارت ہے جو ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ چلیں ادھر؟''

''وہ تو بس جی تھوڑے فاصلے پر ہے...... مزار ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''آؤ چلتے ہیں...... میں ان بزرگ سے کہوں گی کہ دیکھو بزرگو! میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر ڈالی ہے۔''

''چلیں جی...... چلیں...... تھوڑا سا ہی فاصلہ ہے یہاں سے۔'' بابو خاں نے کہا اور صفورہ نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کھنڈر کے پاس پہنچ گئے تھے۔

''آؤ......'' صفورہ اطمینان سے نیچے اتری اور بابو خاں کو لئے ہوئے اس کھنڈر میں داخل ہو گئی۔ بابو خاں اب پوری طرح مطمئن ہو گیا تھا۔ کھنڈر میں داخل ہو کر اس نے کہا۔

''میں تو یہاں کئی بار آ چکا ہوں جی...... اصل میں جو دھندہ ہے نا ہم لوگوں کا اس میں ایسی جگہوں کے بارے میں پوری معلومات ہونی چاہئے۔ مگر قبر کی بات ہے۔ کدھر ہے وہ قبر...... کدھر ہے وہ مزار......؟''

''آؤ تو سہی میرے ساتھ......'' صفورہ نے کہا اور اسے لئے ہوئے اندر کھنڈر میں داخل ہو گئی۔

''کہاں ہے جی؟...... یہاں تو ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔''

''ہوتا تو نظر آتا......'' صفورہ نے پرس میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ بابو خاں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پستول دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

''یہاں کوئی قبر نہیں ہے...... اور نہ ہی یہ جگہ میں نے خواب میں دیکھی ہے۔ بلکہ تمہیں یہاں لانا چاہتی تھی میں۔''

''کک...... کک...... کیوں......؟''

''کیونکہ تم نے جھوٹ بولا۔ غداری کی۔ حالانکہ میں نے تمہیں ایک معقول معاوضہ دیا تھا۔ پھر اس کے بعد ایسا کیوں کیا تم نے؟''

''وو...... وو...... دیکھو جی...... دیکھو جی...... ہمارا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔''

''یہ ضمیر ہی تو مروا دیتا ہے انسان کو۔ غلطی اس ضمیر ہی کے ہاتھوں میں پھنس کر ہوتی ہے سمجھے بابو خاں! اصل میں میرے گرو نے مجھ سے کہا تھا کہ رحم جو ہوتا ہے نا، رحم انسان کی موت ہوتی ہے۔ موت کو رحم کا نام دیا جا سکتا ہے بابو خاں! اور کسی چیز کو نہیں۔''

''تو آپ کیا...... آپ کیا......''

''ہاں، میں تمہیں مار دوں گی...... سزا دوں گی میں تمہیں غداری کی۔''

''دیکھئے جی بات یہ ہے کہ م...... م...... معاف کر دیں...... معاف کر دیں ہمیں۔''

''نہیں بابو خاں! معاف وہ کرتے ہیں جن کے دل میں رحم ہوتا ہے۔ گرو مہاراج شنڈن گوپال کا حکم یہی ہے کہ کالے جادو کے تمام اصول پورے کئے جائیں اور کالے جادو کی چیزوں میں سب سے اہم ایک یہ چیز ہے کہ رحم نام کی کسی چیز کو اپنے پاس نہ آنے دیا جائے۔''

''بیگم صاب جی...... دیکھیں...... دیکھیں......''

''اب کیا دیکھنا...... عقل سے کام لیتے تو تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا...... او کے۔'' صفورہ نے کہا اور ریوالور کا رخ سیدھا کر کے بابو خان پر گولی چلا دی۔ ایک گولی اس کے دماغ میں اور دو سینے میں دل کے مقام پر اتارنے کے بعد اس نے پستول واپس اپنے پرس میں رکھ لیا۔ بابو خاں زمین پر تڑپ رہا تھا اور جب اس کے بدن کی دھڑکنیں ختم ہو گئیں تو صفورہ اس کے قریب پہنچی اور اس نے بابو خاں کو دیکھا۔

''کچھ سمجھے بابو خاں! جس چیز کا نام رحم ہوتا ہے نا وہ موت ہوتی ہے...... صرف موت...... میرے دل میں رحم آ جاتا تو مجھے مرنا پڑتا۔ تمہارے دل میں رحم آیا تم مر گئے۔ اب تمہاری لاش یہاں پڑی سڑتی رہے گی۔ پھر جب سڑک سے گزرنے والے تمہاری لاش کی بدبو محسوس کریں گے تو اس لاش کی اطلاع پولیس کو دی جائے گی۔ اور اس کے بعد پولیس ڈرامے کرتی رہے، صفورہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہو گا بابو خاں!'' یہ

کہہ کر وہ واپس پلٹی اور کار میں بیٹھ کر واپس چل پڑی۔

اب اس کا دوسرا قدم افشاں تک پہنچنا تھا۔ اس کے ذہن میں مختلف منصوبے بن رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ افشاں بابو خاں کی بہن رشیدہ کے پاس ہے۔ رشیدہ کے گھر کا پتہ بھی اسے معلوم ہو چکا تھا لیکن وہ پریشان تھی کہ افشاں کا کیا کرے۔ افشاں کو لے کر کہاں جائے۔ بہت سے خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ افشاں کو اگر رشیدہ کے پاس ہی رہنے دیا جائے تو فی الحال کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ گرو مہاراج نے کہا ہے۔ اگر میں ہارون کو افشاں سے ملا دوں یا اسے دکھا دوں تو اس کے بعد وہ میری بات ماننے کو تیار ہو جائے گا۔ آہ...... لیکن جس کے لئے میں اسے مجبور کر رہی ہوں بلکہ بلیک میل کر رہی ہوں وہ میرا نظریۂ حیات نہیں ہے۔ میں اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔

''بے وقوف...... احمق...... گدھی......''

کار کے پچھلے حصے سے آواز آئی اور صفورہ کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر لہرا گئے۔ اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا اور اس نے کار روک دی۔ تب پچھلی سیٹوں سے ٹنڈن گوپال کا چہرہ نمودار ہوا۔

''یہ ہے میری تعلیمات کا اثر تجھ پر؟ یہ سوچتی ہے تو؟ میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا تھا صفورہ کہ تیرے کنوار پن کو داغدار کرنے میں مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایک لمحے کے اندر جسے تو اپنی پاکیزگی سمجھتی ہے میں اسے ختم کر دوں گا۔ بے وقوف عورت، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے وجود کی ساری غلاظت تیرے وجود میں اتر چکی ہے اور یہ بیر جو ہیں تو انہیں میری اولاد سمجھ سکتی ہے۔ جو تیرے مسامات سے پیدا ہوتی ہے۔ سمجھ رہی ہے؟ کون سی پاکیزگی کی بات کرتی ہے تو؟ کالے جادو کا علم سب سے زیادہ پاکیزگی ہی سے نفرت کرتا ہے۔''

''گگ...... گرو مہاراج آپ......؟'' صفورہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیوں...... تیرا کیا خیال ہے ہم کہیں محدود ہو سکتے ہیں؟''

''نن...... نہیں گرو مہاراج! میں...... دراصل...... میں ایک قتل کر کے آئی ہوں۔''

''ٹھیک کیا تو نے...... کون کہتا ہے کہ تیرا وہ کام غلط تھا۔'' ٹنڈن گوپال بولا۔

''نہیں...... میرا مطلب ہے کہ اس کی وجہ سے میں تھوڑی سی بوکھلائی ہوئی ہوں۔''

''صفورہ...... صفورہ! تو بھاگیوان ہے کہ ہمارا ایک ذاتی کام تجھ سے آ پڑا ورنہ اتنے چیلے ہیں ہمارے کہ اکٹھا کر لیں تو دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔ تو جتنی شکتی رکھتی ہے تجھے خود اس کا اندازہ نہیں ہے۔ ایک قتل کر کے تو بوکھلائی ہوئی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں اگر تجھے قتل عام بھی کرنا پڑے تو تو کر سکتی ہے۔''

''جی مہاراج......''

''اور سن، اب تجھے کیا کرنا ہے، جانتی ہے؟''

''حکم دیں مہاراج!''

''گھر جا...... آرام کر...... پتہ تو تجھے چل ہی چکا ہے کہ اس نے افشاں اور اس کے بیٹے کو کہاں رکھا ہے۔ آج ذرا آرام کر، اپنے من کو شانت کر لے۔ اس کے بعد تو وہاں جا۔ اس لڑکے اور اس کی ماں کو ساتھ لے، گاڑی میں بیٹھ اور سہائے پور آ جا۔ سہائے پور کا راستہ تو اپنے بیروں سے معلوم کر سکتی ہے۔ اور سہائے پور میں پہنچنے کے بعد تو کال کھنڈی میں آ جا۔ کال کھنڈی ہم نے استھان بنائی ہے۔ جس کام سے ہم آئے ہیں وہ کام کال کھنڈی میں ہی ہو گا۔ ایک طرح سے تو یہ سمجھ لے وہ ہمارا آشرم ہے۔ ہم کال کھنڈی میں تیرا انتظار کریں گے۔ پھر تو دوبارہ اس کے پاس جانا اور وہی کوشش کرنا جو ہم نے تجھ سے کہی ہے۔ اگر وہ نہ مانے اور اپنی پتنی اور بیٹے کو دیکھنے کی ضد کرے تو اسے اپنے ساتھ کال کھنڈی لے آنا اور بتانا کہ وہاں اس کی پتنی اور بیٹا موجود ہیں۔ وہاں ہم اس سے ملاقات کر لیں گے۔ ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں؟''

''جی مہاراج!''

''اب تجھے ہوشیاری سے کام کرنے ہیں۔ ساری دکھدا من سے نکال دے۔ سارا خوف دل سے نکال دے۔ کچھ نہیں بگڑے گا تیرا۔ ایک کیا دس قتل کر۔ اور سن، آئندہ ہم تجھے وارننگ دے رہے ہیں کہ وہ باتیں مت کرنا جو دین دھرم والے کرتے ہیں۔ تیرا دھرم اب صرف کالا جادو ہے۔ کیا سمجھی؟ جا، کچھ کھا پی لے۔ اپنے گھر جا۔''

یہ کہہ کر ٹنڈن گوپال ایک بار پھر سیٹوں کے نیچے بیٹھ گیا۔

صفورہ پریشان ہو گئی تھی۔ کیا ٹنڈن گوپال اس کے ساتھ اس کے گھر جائے گا؟ اپنے دل میں خیال آتے ہی اسے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔

''مہاراج......''

لیکن اسے اس کی آواز کا جواب نہیں ملا تو وہ پھر بولی۔

''ٹنڈن گوپال مہاراج!''

جواب پھر بھی نہ ملا تو اس نے پیچھے جھانک کر دیکھا، وہاں کسی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ صفورہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کار آگے بڑھا دی۔

نیرہ بیگم اور طاہر علی پر زندگی عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بے حد پریشان تھے۔ طاہر علی حسرت بھرے لہجے میں بولے۔

''ایک بیٹی تھی ہماری..... اللہ نے وہ بھی چھین لی۔''

''اللہ سے توبہ کرو طاہر علی! اس نے نہیں چھینی ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم اپنا فرض پورا نہیں کر سکے۔ بے شمار افراد اپنی اولاد سے شدید محبت کرنے کے باوجود اولاد کو وہ صحیح توجہ نہیں دیتے جس کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ طاہر علی! ہمارا کاروبار اللہ تعالیٰ نے خاصا وسیع کیا تھا۔ اپنا وطن اپنا ہی وطن ہوتا ہے۔ یہاں کم از کم دین دھرم تو ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا بے شک خوبصورت لگتی ہے، انسان اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے کے گھر میں بیٹھ کر بغلیں بجا لیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنا گھر سب سے بہتر ہوتا ہے۔ غلطی ہم نے کی ہے۔ ایک بیٹی کے باپ ہو تم، بتاؤ کیوں نہیں سوچا تم نے کہ جس ماحول میں بیٹی کو لے جا رہے ہو وہاں نہ کوئی بیٹی، بیٹی ہے نہ کوئی باپ، باپ نہ کوئی ماں، ماں۔ وہ بری طرح بگڑے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ انسانیت اور تہذیب سے اتنی دور جا چکے ہیں کہ نہ انسانیت ان کے لئے کوئی چیز ہے نہ تہذیب۔ ہم جان بوجھ کر اپنی بچی کو وہاں لے گئے اور آخر کار وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔''

''اب جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا نیرہ بیگم! ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہوئی، میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ مجھے واقعی اپنی بیٹی کے ساتھ اسی ماحول میں رہنا چاہئے تھا جہاں مشرقیت ہے۔ لیکن اب کیا کریں؟ یہ بتاؤ۔''

''بس اللہ سے دعا کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟''

''وہ آدمی بھی بالکل رنگے سیار نکلا۔''

''ارے وہی کمبخت جو سہرا باندھ کر آیا تھا اور مار کھا کر بھاگ گیا۔''

''ہاں..... اب تو ہنسنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ ہمیں ایسے نہیں، کسی اچھے انسان کی ضرورت ہے۔ کوشش تو آخری وقت تک کرتے رہیں گے۔''

''صفورہ نے جو کچھ کیا ہے کیا تمہارے خیال میں بہتر ہے؟''

''نہیں، بہتر تو نہیں۔''

''اس سلسلے میں تو اسے ٹنڈن گوپال نے بھی آمادہ نہیں کیا ہوگا۔ اس نے ..... اس نے ..... کیسی بری بات کہی ہے اس لڑکے سے۔ کیا کوئی باپ نگاہیں ملا کر کسی سے بات کر سکتا ہے؟''

نیرہ بیگم خاموش ہو گئیں۔ باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی تھی اور انہوں نے چونک کر کہا۔

''میرا خیال ہے صفورہ آ گئی۔''

دونوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا..... صفورہ پارکنگ میں کار سے اتر رہی تھی۔ وہ دونوں وہاں سے بیٹی کو دیکھتے رہے۔ حسن و جمال کا مرقع، بے مثال خوبصورتی کی مالک، بہترین لباس میں ملبوس۔ لیکن کیا ہو گیا تھا اسے؟ یہ تو کسی گھر کی مہارانی بن سکتی تھی۔ اس مہارانی کو کون سا روگ لگ گیا تھا؟''

نیرہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ صفورہ آہستہ آہستہ اندر آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد صفورہ راہداری میں چلتی ہوئی نظر آئی۔ طاہر علی نے اسے آواز دی۔

''صفورہ!'' اور صفورہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

''کیا کر رہے ہیں آپ لوگ یہاں؟''

''کچھ نہیں صفورہ! بیٹھے ہوئے تھے۔''

''یہ آخر آپ لوگوں کے چہروں پر اداسی کیوں پھیل گئی ہے؟ ڈیڈی! میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔''

''بیٹھو بیٹا!''

''لوگوں کے ہاں بیٹے پیدا ہوتے ہیں، کبھی کبھی وہ اکلوتے بھی ہوتے ہیں۔ والدین اپنے بیٹوں سے آس لگاتے ہیں کہ بیٹے ان کے کاروبار میں، ان کی شخصیت میں چار چاند لگائیں گے۔ جن کے ہاں بیٹی پیدا ہو جاتی ہے، میں یہاں مشرق کی بات کر رہی ہوں، اپنے وطن کی بات کر رہی ہوں جس کے بارے میں اب مجھے تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوئی ہیں، یہاں بیٹی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ لوگ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں اولاد نرینہ پیدا نہیں ہوئی۔ وہ بیٹے کے پیدا ہونے کا

انتظار کرتے ہیں اور پھر اداسیاں ان کے چہروں پر اسی طرح مسلط ہو جاتی ہیں جس طرح اس وقت میں آپ کے چہروں پر دیکھ رہی ہوں۔''

''بیٹی! ہماری اداسی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ نے ہمیں بیٹی دی ہے۔''

''میری پوری بات سن لیجئے ..... میں ہزار بیٹوں کا ایک بیٹا ہوں آپ کا۔ مجھے استعمال کیجئے۔ آپ صرف ان فضول باتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ میں نے ٹنڈن گوپال کو اپنا گرو کیوں بنا لیا؟ میں نے کالا علم کہاں سیکھ لیا؟ ارے بابا! کوئی میڈیکل کی تعلیم حاصل کرتا ہے، کوئی انجینئر بن جاتا ہے، کوئی کچھ اور بن جاتا ہے اور اسے وہ اپنے مستقبل کے لئے استعمال کرتا ہے۔ میں نے اگر ایک علم سیکھ لیا تو اس میں کیا قیامت آ گئی؟ بلکہ یہ علم تو آپ لوگ یقین کریں کہ ہزاروں علموں پر بھاری ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اس کی قدر کریں، اس سے دکھی ہو گئے ہیں۔ مجھے بتایئے، آپ کو کیا چاہئے؟ ڈیڈی! آپ کا کاروبار؟ مجھے بتایئے کہ آپ جو کاروبار ختم کر کے آئے ہیں کیا میں اسے دوبارہ یہاں شروع کر دوں؟ آپ کو اگر کوئی بہت ہی شاندار عمارت چاہئے تو میں آپ کو مہیا کر دوں گی۔ آپ کو اگر دولت کے انبار چاہئیں تو میں آپ کو لا کر دوں گی۔ کہہ کر دیکھئے آپ ایک بار۔ بجائے اس کے کہ آپ لوگ میرے علم سے خوش ہوں، اس طرح افسردہ ہو گئے ہیں جیسے میں نے پتہ نہیں کیا کر ڈالا ہے۔''

''ہاں بیٹا ..... پیسے کا ہمیں کیا کرنا ہے؟ جو کچھ کمایا تھا وہ تمہارے لئے ہی کمایا تھا اور وہ اب تک اتنا پڑا ہے کہ تمہیں دوسرے گھر بھیج کر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی بھی انتہائی عیش و عشرت کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔''

''مجھے کسی کے گھر بھیج کر ..... یعنی مجھے کسی کی غلامی میں دے کر ڈیڈی! آپ مجھے کسی کا غلام کیوں بنانا چاہتے ہیں؟ میں آزاد ہوں، ماحول پر حکمران ہوں۔ تھوڑا وقت تو گزرنے دیجئے، آپ دیکھئے میں اپنے لئے بھی کیا کرتی ہوں۔ ڈیڈی! میں آپ کی پسند کے مطابق کسی بھی خوبصورت نوجوان کو غلام بنا کر آپ کے قدموں میں لا کر چھوڑ سکتی ہوں جسے آپ اپنا داماد کہہ سکتے ہیں۔ وہ داماد کبھی میرے سامنے سر نہیں اٹھائے گا، ہمیشہ میرے پاؤں چاٹتا رہے گا۔

ماما ..... ایک بات بتایئے ایمانداری کے ساتھ۔ ہر عورت کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ اسے ایک ایسا شوہر ملے جو بندر کی طرح اس کے اشاروں پر ناچتا رہے؟''

''نہیں بیٹا! کس نے کہا تم سے یہ؟ ..... تم مغرب کی زبان بول رہی ہو ..... وہاں واقعی ایسی سوچ ہوگی کہ عورتیں بندر نچاتی ہوں گی۔ تمہیں معلوم نہیں، شوہر کو ہمارے ہاں مجازی خدا کہا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پوجا کریں، اس کی اطاعت کریں۔ جو کچھ وہ کہے اس سے منہ نہ موڑیں۔ تم بندر نچانے کی بات کر رہی ہو۔ نہیں چاہئے ہمیں ایسا کوئی بندر۔''

''جی ..... آپ کو وہ چاہئے جو یہ کہے کہ جاؤ میرے لئے چائے بنا کر لاؤ ..... جاؤ میرے لئے کھانا بنا کر لاؤ۔ جو یہ کہے صفورہ! خبردار جو تم نے میری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی باہر نکالا۔ ماما ایسا داماد چاہئے آپ کو۔ ایسے گھر میں آپ مجھے بھیجنا چاہتی ہیں تو معاف کیجئے گا۔ صفورہ اس منزل سے نکل چکی ہے۔ میرا اپنا ایک مقام ہے۔ ایک زندگی ہے میری۔ اب مجھے غلاموں پر حکمرانی کرنے کا شوق ہے، غلامی کرنے کا نہیں۔''

نیرہ بیگم اور طاہر علی حیران نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ طاہر علی نے کہا۔

''نہیں بیٹی! یہ وہ روایتی باتیں ہیں جو تم نے صرف سن رکھی ہیں۔ ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہم ایسا تھوڑی ہونے دیتے۔ بیٹھو، ماں باپ سمجھو ہمیں اپنا۔ یا پھر تم نے ہمیں بھی غلام سمجھنا شروع کر دیا ہے؟''

''ایک آپ دونوں ہی تو ہیں جنہیں میں اپنا بزرگ، اپنا بڑا مانتی ہوں۔ ورنہ ماما! باقی اور کسی میں اب اتنی مجال نہیں رہی جو صفورہ کو کسی طرح نیچا ماننے پر مجبور کر دے۔''

''صفورہ! تم نے جرائم بھی شروع کر دیئے ہیں؟''

''جرائم .....؟'' صفورہ چونک کر بولی۔

''ہاں ..... تم نے جو کچھ کیا ہے تم بتاؤ کیا وہ بات مناسب تھی؟''

''پہیلیاں نہ بجھائیں ماما ..... مجھے بتائیں کون سی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں آپ؟''

''افشاں کون ہے .....؟'' نیرہ بیگم نے سوال کیا اور صفورہ چونک کر ماں کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ بدلنے لگے۔

''ایک عورت ہے .....''

''ہارون کی بیوی؟''

''ہاں ..... لیکن آپ کو اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''تم نے ہارون کی بیوی اور بیٹے کو قید کر رکھا ہے؟''

''ماما مجھے بتایئے، آپ کو اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''پہلے تم مجھے جواب دو ...... سمجھ رہی ہو نا؟ اور اگر اپنے آپ کو بہت زیادہ طاقتور سمجھتی ہو تو ہم دونوں تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ چھری نکالو اور ہماری گردنوں پر پھیر دو۔ یہ بھی ایک روایت ہو جائے گی۔''

''ماما ...... آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''ہارون یہاں آیا تھا۔''

''آپ کے پاس؟''

''ہاں ...... حمیرہ بیگم سے پتہ لے کر وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔''

''حمیرہ بیگم؟''

''حاجی عطا کی بیٹی۔''

''ہوگی ...... میں کسی کو نہیں جانتی۔''

''ہاں ...... تم کہاں جانو گی۔ شکر ہے ابھی تک ہم ہی تمہیں یاد ہیں۔''

''ایسی باتیں نہ کریں ...... مجھے بتائیں وہ یہاں کیوں آیا تھا؟''

''یہ بتانے کہ وہ قانون کا سہارا بھی لے سکتا ہے۔ وہ ہم لوگوں کو گرفتار بھی کرا سکتا ہے۔''

''اس نے یہ بات کہی تھی؟''

''اس نے نہیں کہی کیونکہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ وہ صرف درخواست کرتا رہا۔ اس نے ...... اس نے ہمیں تمہارے تمام گھناؤنے پہلوؤں سے آگاہ کر دیا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ تم اسے اپنے بدن کی پیشکش کر چکی ہو۔''

صفورہ کو ایک دم پھر شاک لگا تھا۔ چند لمحے تک اس کا ذہن جھنجھناتا رہا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور پھر اس کے اندر غصے کی لہر بیدار ہوگئی۔

''اس نے یہ کہا تھا آپ سے؟''

''ہاں ...... اور سچ کہا تھا۔''

''ہاں ...... میں خود آپ کو بتا رہی ہوں۔ واقعی اس نے سچ کہا تھا۔''

''صفورہ! تجھے بے غیرت تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ جو کچھ تیرے وجود میں اتر رہا ہے وہ بے غیرتی ہی کی نشانی ہے۔''

''اور اب میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اب مجھے آپ لوگوں کا ساتھ چھوڑ دینا چاہئے۔ بے شک آپ میرے بزرگ ہیں، میرے ماں باپ ہیں لیکن آپ کے الفاظ سے میری انا مجروح ہوتی ہے۔ میں کالے جادو کی ماہر ہوں ...... کالی دیوی ہوں میں ...... لوگ مجھے دیوی کہہ سکتے ہیں اور آپ لوگ مجھے نجانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتا دوں ماما اور ڈیڈی! میری عزت کریں ...... میرا احترام کریں۔ اگر مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو میرے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ خاموشی سے اس گھر میں زندگی گزاریں۔ اگر آپ کو کچھ چاہئے، کوئی آپ کا دشمن ہو، کسی پر آپ کو برتری حاصل کرنا ہو تو مجھے بتایئے۔ جو آپ چاہیں گے ہو جائے گا۔ لیکن جو الفاظ آپ میرے لئے استعمال کرتے ہیں پلیز آپ وہ الفاظ میرے لئے استعمال نہ کیا کریں۔ کیونکہ اب میری حیثیت بہت آگے کی ہو چکی ہے۔ میرا احترام کرنا ہوگا آپ کو۔ سمجھیں ماما ...... سمجھے ڈیڈی ......؟''

''ہاں بیٹا! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنے کئے کا پھل تو ہمیں بھگتنا ہی ہو گا۔ باقی جہاں تک تو بات کرتی ہے ہمارے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کی تو بیٹا یہ ایک مناسب حل ہے جو تو نے خود ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ تو خود کہیں اپنا ٹھکانہ کر لے۔ ہم کیا ہے کچھ نہ کچھ کہہ ہی دیں گے۔''

''ہو جائے گا ڈیڈی ...... ہو جائے گا۔ اور آپ میرے گھر آیا جایا کریں گے، سمجھے؟''

''تھوکیں گے بھی نہیں ہم اس غلاظت کدے کو جو تیری رہائش گاہ ہوگا۔''

''اچھا خیر ...... سنئے ...... میری بات سنئے ...... ناراض مت ہوں ...... آپ چاہتے ہیں کہ میں اس شخص کی بیوی اسے واپس کر دوں؟''

''میں تجھ سے صرف ایک سوال کرتا ہوں صفورہ! تیرے دل میں اس کے لئے برائی آئی ہی کیوں؟ تیرے لئے لڑکوں کی کمی تھی؟ ایک سے ایک حسین لڑکا تیری زندگی میں آ سکتا تھا ...... تو نے صرف اس لئے اسے عتاب کا نشانہ بنایا کہ اس نے تجھے ٹھکرایا تھا۔''

''یہ الفاظ استعمال نہ کریں ڈیڈی ...... یہ الفاظ استعمال نہ کریں۔ میرے غصے کو ہوا ملتی ہے۔ وہ ذلیل کا بچہ مجھے کیا ٹھکراتا یا کیا ٹھکرائے گا ...... میں تو اسے اس کے ان الفاظ کا بدلہ دینا چاہتی ہوں جو اس نے مجھے مسترد کرتے ہوئے ادا کئے ہوں گے۔''

"اس شکل میں کہ اسے اپنے بدن کا تحفہ دے دے؟" طاہر علی نے کہا۔

"وہ میری خواہش نہیں ہے ..... وہ میری خواہش نہیں ہے۔ وہ گرو مہاراج کی خواہش ہے۔"

"گرو مہاراج ..... خدا کی لعنت ہو اس کافر کتے پر۔"

"آپ ایک کام کریں۔ کیا آپ کا اس سے رابطہ ہے؟"

"نہیں ..... ہمارا کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔"

"وہ دوبارہ ضرور یہاں آئے گا۔ آپ اسے روک لیجئے، اس سے کہئے کہ آپ میرے والدین ہیں۔ مجھے جو حکم دیں گے میں اس سے انحراف نہیں کروں گی۔ آپ کی وجہ سے اس کی بیوی اسے واپس مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے ..... کم از کم تو نے ہمارا اتنا احترام تو کیا۔ اب تو ایسا کر کہ اس لڑکی افشاں اور اس کے بیٹے کو یہاں لے آ ..... وہ جب بھی آئے گا ہم ان دونوں کو اس کے حوالے کر دیں گے۔" طاہر علی نے کہا اور صفورہ غضب ناک ہو گئی۔

"اپنی تجویزیں میرے سامنے نہ پیش کیا کریں۔ آپ اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہئے۔" یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

رشیدہ ان دونوں ماں بیٹوں کی بڑی خدمت کر رہی تھی۔ بھائی سے بہت محبت کرتی تھی وہ اور پہلی بار بابو خاں نے کوئی کام اس کے سپرد کیا تھا۔ چنانچہ وہ سب کچھ کر رہی تھی ان کے لئے اور پھر یہ ماں بیٹا اسے لگتے بھی بہت اچھے تھے۔ خاموش، غمزدہ سے، کھوئے کھوئے سے۔ جیسے ان سے ان کا سب کچھ چھن گیا ہو۔

کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے افشاں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ اس وقت رشیدہ خود بھی غمزدہ ہو جایا کرتی تھی۔

"میری پیاری بٹی! کچھ تو بتا، تجھے کیا غم ہے؟"

افشاں ایسے موقع پر اسے آنکھیں اٹھا کر دیکھتی، بڑی مشکل سے اس نے زبان کھولی تھی۔

"یہی تو نہیں جانتی کہ مجھے کیا غم ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں ہے ..... مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ مجھے کیا غم ہے۔"

"تو پھر روتی کیوں ہے؟"

"بس دل اندر سے پتہ نہیں کیسا ہو جاتا ہے اور میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے ہیں۔"

"یہ کیسی بات ہے ..... ایسا کیا ہو جاتا ہے؟ کچھ نہ کچھ تو ہے ضرور۔ یہ الگ بات ہے بیٹا کہ تو ہم سے چھپانا چاہتی ہے۔ خیر میری بات سن، میں بھی اس دنیا میں اکیلی عورت ہوں۔ کوئی نہیں ہے میرا۔ میرے دل میں تیرے لئے بڑی ہمدردی ہے بٹی۔ اگر کبھی دل چاہے تو مجھے اپنا رازدار بنا لینا۔ میں تیری بڑی اچھی رازدار ثابت ہوں گی۔ مجال ہے تیری بات میرے منہ سے کہیں نکل جائے۔ اچھا ایک بات تو بتا دے۔"

"جی پوچھئے .....؟"

"کیا بابو بھائی تجھے زبردستی اٹھا لایا کہیں سے؟ میں جانتی ہوں اس کے کچھن اچھے نہیں ہیں، کیا کہوں میرا بھائی ہے۔ کوئی بری بات اس کے لئے زبان سے نہیں نکلتی۔ اللہ اسے نیک ہدایت دے۔ اس کی حفاظت کرے۔ وہ جیتا رہے۔ زندہ سلامت رہے۔ حالانکہ لوگ کہتے ہیں کہ برے کام کا برا انجام لیکن اللہ کرے اس کا انجام برا نہ ہو۔"

"نہیں، نہیں ..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بہت اچھے ہیں ..... بڑا خیال رکھتے ہیں ہمارا۔"

"یہ تیرا بیٹا بھی بالکل چپ چپ رہتا ہے۔"

"یہ ..... یہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ بہت بولتا تھا۔ پتہ نہیں اب کیوں چپ ہو گیا؟"

اشعر نے ویران آنکھوں سے ماں کو دیکھا، پھر رشیدہ کو اور پھر گردن جھکا لی۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم ماں بیٹے کے ساتھ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے کہ جس سے تمہاری زبانیں بند ہو گئی ہیں۔ خیر میری دعا ہے کہ اللہ تمہاری مشکل حل کرے۔" رشیدہ نے کہا اور افشاں کی آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات ابھر آئے۔ یہ دعا اس کے لئے بڑی قیمتی حیثیت رکھتی تھی۔ کئی دن ہو چکے تھے، بابو خاں واپس نہیں آیا تھا۔

پھر اس دن صفورہ وہاں پہنچ گئی۔ کار گھر کے دروازے کے پاس ہی رکی تھی اور صفورہ نے نیچے اتر کر زنجیر بجائی تھی۔ رشیدہ نے دروازہ کھولا اور صفورہ کو دیکھا اور پھر اس کی کار کو اور بری طرح مرعوب ہو گئی۔

''بیگم صاحب جی! کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''تمہارا نام رشیدہ ہے نا؟''

''ہاں......''

''تمہارے پاس ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ اندر نہیں بلاؤ گی مجھے؟''

''آپ کے قابل گھر نہیں ہے بیگم صاحب جی! آئیں گی تو اس گھر کی رونق ہی بڑھے گی۔'' رشیدہ نے کہا اور صفورہ اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی اشعر بیٹھا ہوا تھا۔ صفورہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہیلو اشعر! ممی کہاں ہیں تمہاری؟'' اس نے اشعر کو مخاطب کر کے کہا تو رشیدہ ایک دم چونک پڑی۔

''ارے...... آپ اسے جانتی ہیں؟''

''ہاں رشیدہ...... بابو خاں میرے ہی کہنے پر انہیں تم لوگوں کے پاس لایا تھا۔''

''جی...... بابو خاں نے ذکر ہی نہیں کیا اس کا۔ عجیب ہے۔ کم از کم بتاتا تو سہی۔''

''نہیں، میں نے منع کر دیا تھا۔ دراصل اس بے چاری کے کچھ دشمن ہو گئے ہیں۔ وہ اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اسے کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ بابو خاں نے میرے مشورے سے تمہارا تذکرہ کیا اور پھر کہنے لگا کہ اگر میں اسے اپنی بہن رشیدہ کے پاس چھوڑ دوں تو یہ وہاں آرام سے رہے گی۔''

''میں نے آنکھوں میں سرمے کی طرح رکھا ہے انہیں...... کوئی تکلیف نہیں ہونے دی ماں بیٹے کو۔ بہت خوش ہیں یہاں۔''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں۔ بابو خاں نے یہی بتایا تھا کہ میری بہن بہت اچھی ہے۔''

''مگر ایک بات بتاؤ...... قصہ کیا ہے؟ بے چاری نہ روتی ہے نہ ہنستی ہے۔ کچھ پوچھتی ہوں تو بس آنسو بہا کر خاموش ہو جاتی ہے۔''

''ہاں...... بس تقدیر ایسی ہی چیز ہوتی ہے۔ میں بتا رہی تھی کہ اس کے کچھ دشمن

ہیں جو اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن اب ہم نے ان پر قابو پا لیا ہے۔ حالات ٹھیک ہو گئے ہیں۔''

''اس کا قصہ کیا ہے؟...... بیٹھو تو سہی تھوڑی دیر۔ کچھ چائے پانی بناؤں تمہارے لئے۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' صفورہ نے کہا۔

''پھر بتاؤ تمہاری کیا خدمت کروں؟''

''کہاں ہے افشاں؟...... افشاں!...... افشاں!''

افشاں صفورہ کی آواز سن کر باہر نکل آئی۔ صفورہ نے کہا۔

''آؤ افشاں! چلو، سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ ہمیں چلنا ہے۔''

''لے جاؤ گی اسے......؟''

''تو آئی کس لئے ہوں؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے کہ اگر بابو خاں بھی آ جاتا تو اچھا تھا۔''

''کیوں...... بابو خاں کا کیا کرو گی؟''

''میرا مطلب ہے کہ اسے وہی میرے پاس لایا تھا۔ کہیں یہ نہ کہے کہ اس کی مرضی کے بغیر میں نے ان ماں بیٹے کو کہاں بھیج دیا۔''

''مجال ہے اس کی جو ایسی بات کہے۔ کیا سمجھیں؟ چلو افشاں، دیر مت کرو۔''

''میری بات تو سنو......'' رشیدہ بولی تو صفورہ نے خونی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

''بس، اس کے بعد کچھ مت سنانا۔ ورنہ تمہیں نقصان پہنچ جائے گا۔''

''ارے...... ارے...... تم شکل وصورت سے تو بڑی اچھی لگتی ہو۔ مگر ہو ذرا تنگ مزاج۔''

''ہاں...... میں واقعی تنگ مزاج ہوں۔ نقصان پہنچا دیتی ہوں کسی کو۔ سمجھیں؟''

پھر صفورہ افشاں کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی اور اسے کار میں بٹھا دیا۔ اشعر بھی ساتھ ساتھ ہی چلا آیا تھا۔

''تم بھی بیٹھو۔''

''بی بی! بابو خاں کو تم خود بتا دینا اور کہہ دینا میں نے تو منع کیا تھا۔ بس اس خیال سے رہنے دیا کہ شاید بابو خاں کو تم سے کوئی فائدہ پہنچتا ہو۔''

صفورہ نے پوری بات بھی نہیں سنی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ افشاں اور اشعر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ صفورہ کار ڈرائیو کرتی رہی۔ اس نے سہائے پور کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم کر لی تھیں۔ ایک لمبا فاصلہ طے کرنا تھا اسے اور سہائے پور کے کھنڈرات میں کالی کھنڈی تک جانا تھا جس کے بارے میں نٹذن گوپال نے اسے تفصیلات دی تھیں۔

بہت دیر تک خاموشی کا یہ سفر جاری رہا اور اس کے بعد صفورہ کو جھلاہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے پلٹ کر افشاں اور اشعر کو دیکھا اور بولی۔

''تم دونوں میرے ٹرانس سے نکل آؤ..... اپنی پرانی زندگی میں واپس آ جاؤ۔ تمہاری یہ خاموشی مجھے بہت بری لگ رہی ہے۔''

دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے اور پھر اس کے بعد دونوں ہی کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ اشعر نے کہا۔

''پاپا.....''

افشاں سسکی سی لے کر بولی۔ ''ارے..... یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہاں..... اب ذرا صورتحال کچھ بہتر لگ رہی ہے۔ کچھ کھاؤ گے تم لوگ؟ میں تمہارے لئے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آئی ہوں۔''

''آنٹی! آپ ہمیں کہاں لے جا رہی ہیں؟ میرے پاپا کہاں ہیں؟..... ہمیں ان کے پاس لے جائیے۔''

''وہیں لے جا رہی ہوں میں تمہیں۔ بہت خوشی ہو گی تمہارے پاپا کو تم سے مل کر۔ افشاں! میں تمہیں یاد ہوں؟''

''آپ..... آپ ہمارے گھر آئی تھیں اور اس کے بعد سے مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ مگر وہ مٹے مٹے نقوش..... وہ شاید..... وہ گھر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ سب کیا ہوا ہے ہمارے ساتھ؟''

''چلو اچھی بات ہے..... بہت سی باتوں کا سمجھ میں نہ آنا ہی بہتر ہے۔''

''آپ پلیز کچھ بتا دیجئے ہمیں کہ ہمیں کہاں لے جا رہی ہیں اور..... اور ہارون کہاں ہیں؟''

''جہاں میں تمہیں لئے جا رہی ہوں، ہارون وہیں ہیں اور ماضی کی ایک کہانی تمہارے لئے عذاب بن گئی ہے۔''

''ماضی کی کہانی؟''

''ہاں.....''

''کون سی کہانی.....؟ خدا کے لئے کچھ تو بتائیے ہمیں۔''

''افشاں! بہت پرانی بات ہے..... اس وقت جب ہارون کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میرے ایک عزیز جن کا نام حاجی عطا تھا انہوں نے چاہا کہ ہارون کی شادی مجھ سے ہو جائے۔ میں ہارون کو نہیں جانتی تھی کہ وہ کون تھا، کیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ صرف تمہارے لئے۔ اور افشاں! میں جھلا کر رہ گئی کہ کیا ایسا بھی ہے کوئی اس دنیا میں، جو مجھے قبول کرنے سے انکار کر دے؟ ہارون نے یہ جرأت کی تھی۔ اس کے بعد میرے والدین مجھے ملک سے باہر لے گئے اور باہر رہ کر میں نے بہت سی قوتیں حاصل کیں اور یہاں آ گئی۔ اور اس کے بعد میں نے ہارون کو سزا دینے کا فیصلہ کیا اور تم دونوں ماں بیٹے کو اپنے ساتھ لے آئی۔''

''دیکھئے، اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ ہارون کا بھی نہیں ہے۔ انہیں غالباً اس بات کا علم نہیں ہو گا کہ آپ اس انکار کو اپنی توہین سمجھیں گی۔''

''علم نہیں ہو گا..... اب علم ہو گیا ہو گا۔''

''معاف کر دیجئے ہمیں بھی اور ہارون کو بھی..... کیوں ہماری زندگی میں آگ لگا رہی ہیں آپ؟''

''ارے واہ..... ایک اچھا آئیڈیا دیا ہے تم نے..... واہ..... واہ..... اگر ہارون کو یہ پتہ چلے افشاں بیگم کہ تمہارا کردار بگڑ گیا ہے، تمہیں ہارون سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے تو کیسا رہے گا؟''

''کک..... کیا..... کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''میں ذرا گرو مہاراج سے مل لوں۔ یہ تجویز ان کے سامنے بھی رکھوں گی میں۔ اور ان سے کہوں گی کہ گرو جی مہاراج آپ کا جو دل چاہے مجھ سے کام لیں اور ایک کام میرا بھی کر دیں آپ، اور وہ یہ کہ افشاں کے لئے اجازت دے دیں کہ میں اسے ایک فاحشہ کی حیثیت سے ہارون کے سامنے پیش کر سکوں۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''میں یہ کام کر سکتی ہوں افشاں!''

''کیسے کر سکتی ہیں؟''
''اپنی جادو کی قوت سے...... اپنے علم سے۔''
''سنیں، کیا آپ جادوگر ہیں؟''
''ہاں ہوں...... تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ کس طرح تم میرے ساتھ چلی آئی تھیں؟''

''ایک بات کہوں آپ سے۔ وہاں آپ کا جادو کارگر ہو گیا تھا۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہمارا تعلق کہاں سے ہے؟''
''کہاں سے؟''
''اس وطن سے ہے...... اس مذہب سے ہے جس میں جادو ٹونے کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں۔ سمجھ رہی ہیں آپ؟ دنیا کا کوئی بھی کام کر لیں گی آپ، لیکن جو آپ کہہ رہی ہیں وہ نہیں کر سکیں گی۔''
''کیا تم یہ دیکھنا پسند کرو گی کہ تمہاری موجودگی میں بلکہ اپنے بیٹے کی موجودگی میں ہارون مجھے اپنی آغوش میں لے کر پیار کرے اور...... اور میرے ساتھ وہ سب کچھ کرے جو ایک شوہر بیوی کے ساتھ کرتا ہے؟''
''چھی...... چھی...... ہارون اور ایسا کرے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''
''ہوتا ہے...... بلکہ ہو چکا ہے یہ سوال۔''
''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا ہارون......''
''نہیں، میں ہارون کے ساتھ ایک وقت گزاروں گی لیکن تمہاری موجودگی میں۔''

''دیکھئے پہلی بات تو یہ کہ آپ مجھے کسی ایسے کام پر مجبور نہیں کر سکیں گی جس سے ہارون کے دل میں میرے لئے بد دلی پیدا ہو۔ میں آپ کو چیلنج کرتی ہوں، اگر کوئی قوت ہے آپ کے اندر تو مجھے کر کے دکھا دیجئے۔ دوسری بات یہ کہ آپ ہارون کے بارے میں جو کہہ رہی ہیں تو ہارون میرے سامنے نہیں ہیں لیکن ان کے لئے بھی میں آپ سے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ آپ ایسا نہیں کر سکیں گی۔''
''ہوں...... اچھا، چلو ٹھیک ہے۔ مجھے تمہارا یہ چیلنج منظور ہے۔ لیکن جو کچھ میں کروں گی، گرو مہاراج کی آگیا کے ساتھ کروں گی۔ سمجھیں؟''
''یہ آپ گرو مہاراج، گرو مہاراج کیا کر رہی ہیں؟ کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟''

''لیجئے ماما! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ یہ مسلمان کہاں سے ہو گئیں؟''
''مگر یہ کہتی ہیں کہ ان کا نام صفورہ ہے۔''
''بس ان کا نام صفورہ ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔'' اشعر نے پُرمزاح انداز میں کہا اور صفورہ نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن افشاں وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ عجیب و غریب انداز میں سوچ رہی تھی۔ اسے یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ کتنے دن گزر چکے ہیں۔ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار تھی۔ اشعر کو اس نے دیکھا...... اشعر کا حلیہ ہی کچھ بدلا ہوا تھا۔ کچھ کمزور کمزور سا لگ رہا تھا وہ۔
بہرحال وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ فاصلے طے ہوتے رہے۔ اچانک ہی صفورہ کی گاڑی کا انجن تیز آواز کرنے لگا۔ صفورہ کی کار جھٹکے لیتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک لمحے کے اندر اندر سمجھ لیا کہ ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں کب سے اس نے ریڈی ایٹر کا پانی چیک نہیں کیا تھا۔ خود ہی کار لئے لئے پھرتی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ پریشان سی ہو گئی۔ پھر اسے کافی فاصلے پر کچھ لوگ کام کرتے ہوئے نظر آئے۔ وہاں تک جانے کے لئے مناسب راستہ بنا ہوا تھا۔ صفورہ نے سوچا کسی طرح وہاں تک کار لے جائے۔ اس کے بعد ریڈی ایٹر ٹھنڈا کر کے اس میں پانی بھرے۔ چنانچہ اس نے کار کا رخ اس طرف موڑ دیا۔
کار جھٹکے لیتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ وہ شدید گرم ہوتی جا رہی تھی۔ اور پھر اس کے رخنوں سے دھواں اٹھنے لگا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اس جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جہاں کچھ خیمے لگے ہوئے تھے اور مزدور وہاں کام کر رہے تھے۔
صفورہ نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر کار روک دی۔ کام کرنے والے اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ صفورہ دروازہ کھول کر نیچے اتری اور پھر اس نے کار کا بونٹ اوپر اٹھا دیا۔ ریڈی ایٹر سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایک آدمی صفورہ کی جانب دوڑا۔
''ریڈی ایٹر کا ڈھکن نہ کھولئے گا، پانی اچھل کر منہ پر آ پڑے گا۔''
صفورہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اس شخص کو دیکھا اور بولی۔
''میرا خیال ہے ریڈی ایٹر کا پانی ختم ہو گیا ہے۔''
''ہاں...... آپ لمبا سفر طے کر کے آئی ہیں۔ کار کا انجن گرم ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کر لیجئے۔ ادھر آ جائیے۔ ادھر آرام کر لیجئے۔ آئیے، ذرا انجن ٹھنڈا ہو جائے تو۔

نیا پانی ڈال لیجئے گا۔'' اس آدمی نے مخلصانہ پیشکش کی پھر کار کی طرف دیکھ کر بولا۔

''جو کوئی اندر ہے اسے بھی اتار لیجئے۔''

''نہیں، انہیں بیٹھا رہنے دو۔ شکریہ۔'' صفورہ نے کہا اور اس آدمی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ تھوڑے فاصلے پر پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور بولی۔

''کیا کر رہے ہیں آپ لوگ یہاں؟''

''سروے کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ کا ایک پروجیکٹ یہاں بننے والا ہے۔''

''اچھا، اچھا...... ٹھیک...... کیا بنا رہے ہیں؟''

''بس کچھ سرکاری کارخانے بنیں گے۔''

''جگہ تو اتنی زیادہ وسیع نہیں ہے۔''

''نہیں...... ہمارا کام نیچے ڈھلانوں تک ہو گا۔ وہ سامنے سہائے پور کے کھنڈرات پھیلے ہوئے ہیں۔ بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہمیں یہ کھنڈرات بھی صاف کرنا ہوں گے۔ میرا مطلب ہے ہمارے یونٹوں کو۔ ہم تو صرف سروے کر کے یہاں مارکنگ کر رہے ہیں۔''

''سہائے پور ڈھلانوں میں پھیلا ہوا ہے۔''

''جی ہاں...... یہ سہائے پور کا چھوٹا راستہ ہے لیکن یہاں کاریں نہیں جا سکتی ہیں۔''

''اوہو...... اچھا، اچھا...... اگر ہم سہائے پور جانا چاہیں تو ہمیں گھوم کر جانا پڑے گا؟''

''جی ہاں...... آپ اگر اپنی کار سے جائیں گی تو آپ کو نئے سہائے پور جانا ہو گا۔ پھر وہاں سے کچی سڑک آپ کو پرانے سہائے پور لے آئے گی۔''

''یہاں کالی کھنڈی نامی کوئی جگہ ہے؟''

''پتہ نہیں جی...... ہمیں یہاں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ ہم تو باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ آپ کو چائے بنا کر پلائیں؟''

''نہیں، ایک گلاس پانی پلا دو۔ تمہاری مہربانی ہو گی۔'' صفورہ نے کہا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بڑی پراسرار اور بڑی عجیب سی جگہ تھی۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ڈھلانوں سے سہائے پور کے کھنڈرات کو دیکھے اور اگر ممکن ہو سکے تو انہی

ڈھلانوں کے ذریعے نیچے کا سفر کرے۔

ادھر افشاں اور اشعر گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر بیٹھے ہوئے انہیں گرمی لگ رہی تھی۔ افشاں نے اشعر سے کہا۔

''آؤ اشعر! ہم بھی یہاں سے نیچے چلتے ہیں۔''

''جی ماما! آیئے۔'' اشعر نے کہا اور پھر بولا۔ ''ماما! پاپا بھی تو ایسا ہی کوئی سروے کرنے اس طرف آئے تھے۔''

افشاں اچھل پڑی۔ پھر وہ دونوں کار سے نیچے اتر آئے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا احاطہ بنا ہوا تھا اور احاطے کے درمیان ایک لمبی سی قبر نظر آ رہی تھی جس پر اگربتیاں اور بہت سے چراغ رکھے ہوئے تھے جو دن کی روشنی میں بجھے ہوئے تھے۔ مختلف قسم کے جنگلی پھول بھی پڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس جگہ کی خوب صفائی کی جاتی ہو۔ افشاں نے کہا۔

''آؤ ذرا ادھر چلتے ہیں۔''

وہ اشعر کے ساتھ آگے بڑھی۔ احاطے میں ایک چھوٹا سا دروازہ بھی اندر جانے کے لئے بنا دیا گیا تھا۔ حالانکہ احاطہ زیادہ اونچا نہیں تھا اور باہر کھڑے ہو کر بھی قبر نظر آ جاتی تھی۔ بس ایک نشان جیسی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ لیکن افشاں نے دیکھا کہ احاطے کی اس دیوار پر ایک عمر رسیدہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ سفید داڑھی، سفید بال، سفید ہی رنگ کا ایک چوغہ پہنے ہوئے۔ سفید عمامہ بندھا ہوا تھا۔ خاموشی سے بیٹھے ہوئے ادھر دیکھ رہے تھے۔ افشاں، اشعر کا ہاتھ پکڑ کر اس احاطے کی طرف بڑھی تو بزرگ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

''بیٹی آؤ، اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے کہا اور افشاں اشعر کا ہاتھ پکڑ کر احاطے کی اس کھلی جگہ سے اندر داخل ہو گئی۔

''آؤ بیٹھو...... تھکی ہوئی ہو؟...... میں تمہارے لئے شربت منگواتا ہوں۔''

''شکریہ بابا صاحب! مگر شربت......''

''ہاں میں لاتا ہوں۔'' بزرگ نے کہا اور قبر کے سرہانے پہنچ گئے۔ اور پھر اچانک ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ افشاں اور اشعر حیرت سے اچھل پڑے تھے۔

''ماما! وہ کہاں گئے؟''

''خاموش......'' افشاں نے کہا۔

چند لمحوں کے بعد وہ بزرگ نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس میں دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ گلاسوں میں ایک مشروب نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔

''لو بیٹے! ایک گلاس اپنی امی کو دو، ایک خود لو۔'' یہ الفاظ انہوں نے اشعر سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔ اشعر نے دونوں گلاس اٹھا لئے اور بولا۔

''آپ نہیں لیں گے بابا جی؟''

''نہیں بیٹا! تم لو۔ یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں۔'' بزرگ نے کہا اور افشاں اور اشعر وہ خوش ذائقہ شربت پینے لگے۔

''بابا صاحب! آپ ایک دم غائب ہو گئے تھے؟''

''نہیں بیٹا! بس تمہاری آنکھیں مجھے نہیں دیکھ سکی ہوں گی۔ کچھ پردے ہوتے ہیں انسانوں کے درمیان۔ یہ پردے ختم نہیں کئے جا سکتے۔''

''اشعر! غیر ضروری سوالات مت کیا کرو۔''

''بچہ ہے بٹی...... بچہ ہے۔ کوئی بات نہیں ہے۔''

''بچہ تو ہوں...... لیکن سوال میرا اپنی جگہ مستحکم ہے۔'' اشعر نے اپنی منطق جھاڑی اور بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں...... سوال تمہارا اپنی جگہ مستحکم ہے۔ مگر ہمارا جواب بھی مستحکم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی دنیا تمہیں اس قدر سمجھ میں نہیں آئی کہ تم ہمارے جواب کو صحیح طور پر سمجھ لو۔''

''آپ نے کیا جواب دیا تھا؟''

''میں نے کہا تھا کہ کچھ پردے ہوتے ہیں انسانوں کے درمیان۔''

''اشعر! جب میں منع کر رہی ہوں تو تمہیں میری بات ماننی چاہئے۔ ماما ہوں تمہاری۔''

''سوری ماما...... سوری...... میں نے کوئی غلط سوال کر دیا تھا کیا؟''

''تم کوئی سوال مت کرو۔ ہمارے بزرگ ہیں وہ۔ ہم پر مہربان ہیں۔ بس اتنا کافی نہیں ہے؟ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جو کچھ وہ ہمیں بتا دیں وہ ہم معلوم کریں ورنہ خاموش ہو جائیں۔''

''جی ماما...... سوری...... سوری...... بابا جی! آپ سے بھی معذرت ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... بیٹھو، آرام کرو۔ کہاں جا رہے تھے تم لوگ؟''

''بابا جی! وہ ایک آنٹی ہیں جو یہ کار چلا کر یہاں تک لائی ہیں۔ وہ ہمیں ہمارے پاپا کے پاس لے جا رہی ہیں۔''

''ہوں...... وہ تمہیں تمہارے پاپا کے پاس نہیں لے جا رہی۔ اصل میں راستہ بھٹکانے والے بہت ہوتے ہیں اس کائنات میں۔ اس مردود کو اس کی اجازت ملی ہوئی ہے اور وہ مردود اپنی جیسی ہر سعی کرتا رہتا ہے۔ لعنت ہے اس پر۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔''

افشاں نے حیرانی سے بزرگ کو دیکھا اور بولی۔ ''بابا صاحب! کیا وہ ہمیں ہارون کے پاس نہیں لے جا رہی؟''

''نہیں...... وہ تمہیں راستہ بھٹکا رہی ہے۔ وہ تمہیں برائی کی منزل کی جانب لے جا رہی ہے۔ تمہیں وہاں نہیں جانا۔ میں تمہارے لئے مناسب بندوبست کر دوں گا۔''

''بابا صاحب! وہ کون ہے؟''

''وہ، وہ ہے جس نے تمہیں اتنے دن تک تمہاری زندگی سے دور رکھا ہے۔ اور ابھی بہت وقت لگے گا...... بہت وقت لگے گا۔ تمہیں پردہ اختیار کرنا ہو گا۔ سمجھ رہی ہو؟ بہت وقت لگے گا تمہیں...... ورنہ برائی تمہارے چاروں طرف منڈلا رہی ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا دے گی۔''

افشاں کا دل ہول کر رہ گیا۔ وہ ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگی۔ کافی فاصلے پر صفورہ نظر آ رہی تھی۔ پھر انہوں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ افشاں نے بزرگ سے کہا۔

''بابا صاحب! اب میں کیا کروں؟''

''نہیں بیٹا! خوش نصیبی ہے تمہاری کہ تم اس طرف نکل آئیں۔ ہم اسے خوش نصیبی اس لئے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔ اگر وہ مہربان نہ ہوتا تو راستے تبدیل نہ ہوتے اور تم اس جہنم میں پہنچ جاتیں جہاں پہنچنے کے بعد تم سے تمہارا ایمان چھین لیا جاتا۔ اور بیٹا! جس کا ایمان چھن جاتا ہے سمجھ لو اس سے زندگی چھن گئی۔''

افشاں کی آنکھوں میں خوف کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ پھر اس نے کسی قدر رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بابا صاحب! ہم کس جنجال میں پھنس گئے ہیں؟...... پتہ نہیں ہماری تقدیر پر اچانک نحوست کے سائے کیوں منڈلانے لگے ہیں؟''

''دنیا امتحان گاہ ہے بیٹا! بس امتحان بھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں سے ہی لیتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ سب ٹھیک ہو جائے گا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بابا جی...... اب ہم کیا کریں؟''

''کچھ نہیں...... بیٹھو۔ آرام سے بیٹھو۔ قدرت نے تمہارا رخ اس طرف موڑ دیا ہے۔ اس نے مجھے کچھ ذمہ داریاں سونپ دی ہیں۔ پوری کروں گا بیٹا ان ذمہ داریوں کو...... پوری کروں گا۔ یہ جگہ تمہارے لئے بہترین پناہ گاہ ہے۔''

''وہ واپس آ رہی ہے بابا جی...... وہ واپس آ رہی ہے۔''

''وہ...... ہاں آ تو رہی ہے...... آنے دو۔ بیٹھو، آرام سے یہاں بیٹھ جاؤ۔ تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' بزرگ نے کہا۔ افشاں اور اشعر پتھر کی اس دیوار پر بیٹھ گئے۔ دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ صفورہ کار کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ ایک خوبصورت لڑکی کی مدد کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا ہے۔ چنانچہ سب اس کے آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا گیا۔ صفورہ نے کار اسٹارٹ کر لی تھی تاکہ گرم ریڈی ایٹر میں پانی پڑے۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈال دیا گیا اور صفورہ نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ایک دم چونک کر بولی۔

''ارے...... یہ دونوں ماں بیٹا کدھر گئے؟'' اور پھر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کی نظر تھوڑے فاصلے پر احاطے پر پڑی اور اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''افشاں...... اشعر...... آ جاؤ۔'' لیکن دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ صفورہ زور سے چیخی۔ ''آتے کیوں نہیں ہو تم لوگ...... چلو دیر ہو رہی ہے۔ آ جاؤ۔''

لیکن افشاں اور اشعر نے کوئی جواب نہیں دیا تو صفورہ نے غصیلی نگاہوں سے انہیں دیکھا اور آگے بڑھ آئی۔ وہ احاطے کے قریب پہنچ کر بولی۔

''تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا، میں تمہیں آواز دے رہی ہوں، آ جاؤ۔''

افشاں نے بزرگ کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ افشاں بولی۔

''اب کیا کروں بابا صاحب؟''

''بیٹھی رہو بیٹا! تمہیں کوئی پریشانی ہے؟ وہ بھونک رہی ہے، بھونکنے دو۔''

صفورہ کی آواز پھر سنائی دی۔ ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟...... کیا کر رہے ہو تم وہاں میں؟ تمہارا انتظار کر رہی ہوں، تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔''

وہ آگے بڑھی اور اس جگہ پہنچ گئی جہاں سے احاطے میں اندر داخل ہوا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ کھلے راستے میں پہنچی اچانک ہی اس کے حلق سے چیخ سی نکل گئی اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے ایک ٹھنڈی آگ اس کے پیروں سے لپٹ گئی ہو۔ وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔

''یہ...... یہ...... یہ کیا ہے؟......'' پھر اس نے ایک دم چیخ کر کہا۔ ''اشعر! افشاں! تم دونوں کو معلوم نہیں ہے کہ میرا غصہ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ فوراً اٹھو اور باہر آ جاؤ۔ یہ کون سی جگہ ہے، میں نہیں جانتی۔''

لیکن وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ایک بار پھر صفورہ غصے سے آگے بڑھی اور اس بار اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی بہت ہی مضبوط سنگی دیوار سے ٹکرائی ہو۔ اسے خاصی چوٹ بھی آئی تھی۔ اس نے جھلا کر اِدھر اُدھر پاؤں مارے۔ اتنی دیر میں دو تین مزدور اس کے پاس پہنچ گئے۔

''کیا ہوا بی بی......؟''

''ان دونوں کو اٹھا کر باہر لے آؤ۔ حرام زادے یہاں آ کر اکڑ رہے ہیں۔''

''کن دونوں کو بی بی صاحب؟''

''ارے یہی عورت اور یہ بچہ جو اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''عورت اور بچہ اندر بیٹھے ہوئے ہیں؟'' مزدور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''تمہیں نظر نہیں آ رہے یہ دونوں؟''

''بی بی صاحب! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ تو مزار ہے...... ایک بزرگ کا مزار ہے یہ۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ یا آنکھیں خراب ہو گئی ہیں؟ تمہیں یہ ماں بیٹے نظر نہیں آ رہے؟''

مزدوروں نے پہلے تو حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ ہنسنے لگے۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ صفورہ کو پاگل سمجھ رہے ہوں۔

صفورہ کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ اس نے اشعر اور افشاں کو دیکھتے ہوئے

کہا۔ ''ٹھیک ہے...... دیکھتی ہوں کب تک تم یہاں بیٹھتے ہو۔ آخر کار یہاں سے نکلو گے۔ برا حشر نہ کر دوں تمہارا تو میرا نام بھی صفورہ نہیں ہے۔''

وہ انہیں گھورتی ہوئی وہاں سے ہٹ آئی۔ نفرت کی آگ اس کے سینے میں دہک رہی تھی۔ البتہ اسے حیرت تھی کہ وہ اشعر اور افشاں تک کیوں نہیں پہنچ پا رہی؟ اس کا ذہن فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ تاہم اس نے سوچا تھا کہ آخر کب تک وہ دونوں اس مزار پر بیٹھے رہیں گے۔ بھوک پیاس سے بے تاب ہو کر آخر کار وہ باہر آئیں گے اور پھر وہ انہیں مزہ چکھا دے گی۔''

دفعتہً اسے اپنے بیروں کا خیال آیا اور وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

''اب دیکھتی ہوں تمہیں۔'' اس نے کہا اور پھر اس نے اپنے بدن کے کھلے حصوں کے مسامات ملنا شروع کر دیئے۔ اور کچھ ہی لمحوں میں ننھے ننھے بدشکل انسان نمودار ہونے لگے۔ جب ان کی کافی تعداد جمع ہو گئی تو صفورہ نے کہا۔

''جاؤ...... ان دونوں ماں بیٹے کو گھسیٹ کر لے آؤ۔''

بیروں کی فوج اس طرف بڑھی لیکن وہ تھوڑے ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک ان کے جسموں سے دھواں اٹھنے لگا اور صفورہ نے انہیں چرمر ہوتے دیکھا۔ وہ جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔ صفورہ حیرت و خوف سے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔ بیروں کا اب کوئی نشان نہیں رہا تھا۔

''یہ کیا ہوا......؟'' اس کے منہ سے نکلا۔ پھر اس کے بعد اس کی کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ شام جھک آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا پھیل گیا۔ تب اس نے مجبور ہو کر شنڈن گوپال کو آواز دی۔

''گرو جی مہاراج......''

کئی بار پکارنے کے باوجود کوئی جواب نہیں ملا تو وہ مایوس ہو گئی۔ اشعر اور افشاں بھی اب وہاں نہیں نظر آ رہے تھے۔ خاصے فاصلے پر مزدوروں کے خیمے روشن ہو گئے تھے۔ وہ واپسی کا فیصلہ کر کے اپنی جگہ سے اٹھی لیکن اچانک ہی اسے زوردار چکر آیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ چکر اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں...... پھر اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔

نہ جانے کب تک ہوش و حواس سے دور رہی۔ پھر ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو بالکل اجنبی جگہ پایا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ خوب تیز روشنی ہو رہی تھی۔ تبھی

ایک سرگوشی ابھری۔

''ہوش آ گیا ہے......''

''فردِ جرم سنا دی جائے؟''

''ضروری نہیں ہے...... سزا دی جائے۔'' تیسری آواز آئی۔

''گردن اُڑا دو......''

''ہاں، یہ اسی قابل ہے۔''

''مار دو......!''

''ختم کر دو ایمان فروش کو......''

''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' ایک نرم آواز ابھری۔

''فرمایئے امامِ اعظم!''

''یہ ایک مسلمان لڑکی تھی۔ ہمیں علم ہے کہ یہ کس طرح ناپاک قوتوں کا شکار ہوئی۔ والدین نے آزادی دی تھی۔ وہ عاقبت نا اندیش والدین نہیں جانتے تھے کہ اس آزادی کا نتیجہ کیا نکلے گا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' ایک کرخت آواز ابھری۔

''ہاں...... کچھ بتانا چاہتا ہوں میں۔''

''بیکار ہے...... اس ناپاک لڑکی نے ساری حدیں توڑ دی ہیں۔ اب اس کے لئے صرف دردناک موت ہے...... صرف موت......'' کرخت آواز نے کہا۔

''تم امامِ اعظم کی آواز پر اپنی آواز بلند کر رہے ہو جاہ علی۔'' تیسری آواز نے کہا اور ہر طرف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اتنا شور ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

صفورہ کے پورے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا ...... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے طویل عرصہ کے بعد ہوش آیا ہو۔ جیسے کوئی طلسم ٹوٹ گیا ہو...... وہ حیران حیران سی نظروں سے اس سارے ماحول کو دیکھ رہی تھی۔

شور ہنگامہ بہت دیر تک جاری رہا، پھر آہستہ آہستہ خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر ایک معذرت آمیز آواز ابھری۔

''میں نادم ہوں امام اعظم!''

''کوئی بات نہیں ہے ...... اصل میں صدیوں کیا ہزاروں سال پہلے کی ایک داستان سنانا چاہتا ہوں۔ یہ انوکھی داستان ہندو دیو مالا میں رقم ہے۔ ہمارے عقیدوں سے بالکل مختلف۔ لیکن اس داستان کے ڈانڈے اس لڑکی کی صفائی پیش کرتے ہیں اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سارا قصور اس لڑکی کا نہیں ہے بلکہ یہ زمانہ قدیم کے ایک واقعے کا شاخسانہ ہے۔''

''آپ کو یقین ہے امام اعظم؟''

''ہاں...... میں اس کہانی کی اصلیت کا شناسا ہوں۔''

''کہانی کیا ہے؟''

''ایک انوکھے وجود کی کہانی۔''

''ہم جاننا چاہتے ہیں۔''

''ہاں...... میں بتاتا ہوں۔ داستان ایک لڑکی انگوری کی ہے جو ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق موجودہ دور کی چندر بدن ہے۔

راج نگری کے راجہ کشور کی آٹھویں نسل کا راجہ سوامی تھا۔ جس کی اولاد بسوامی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کی نسل کی چھٹی پشت میں راجہ چندر دیپ پیدا ہوا جس کی حکومت بہت وسیع تھی۔ راجہ چندر دیپ کے دو بیٹے تھے جن میں ایک کا نام راجوریہ تھا اور دوسرے کا نام ہریرتے تھے۔ راجوریہ بڑا لڑکا تھا لیکن وہ آنکھوں سے اندھا تھا

اس لئے چندر دیپ کے بعد حکومت ہریرتے کو ملی اور اس کی اولاد ہریرتو کہلائی۔

راجہ ہریرتے کے پانچ بیٹے پیدا ہوئے جن کا نام مہاویر، جتندر، چتر دیو اور کرشن تھے اور راجوریہ کے ایک سو ایک بیٹے تھے جو دو رانیوں سے پیدا ہوئے ان میں سے سب سے بڑا ست گرو تھا۔

راجہ چندر دیپ کے بیٹے راجوریہ کو اپنے اندھا ہونے کا بڑا ہی افسوس تھا کیونکہ صرف آنکھیں نہ ہونے کی وجہ سے حکومت اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ گو راجہ ہریرتے نے اس کے لئے دریائے مہاترکی کے کنارے ایک خوبصورت محل تعمیر کروا دیا تھا اور اسے ساری سہولتیں مہیا کر دی تھیں جو کسی راجہ کو حاصل ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود اندھے کے دل میں ہمیشہ یہی غم رہتا تھا کہ حکومت کا حقدار وہ تھا اور حکومت ملی ہریرتے کو۔

راجوریہ کی بیوی نندریتا، راجہ ہری کور کی بیٹی تھی جس کی وجہ سے راجہ ہری کور کی پوری پوری توجہ اور مدد اسے حاصل تھی اور راجہ ہری کور اس سے کہا کرتا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ اندھے ہونے کی وجہ سے تم حکومت کے قابل نہیں تھے لیکن آگے کی سوچو۔ اگر تم راجہ ہوتے تو تمہارے بعد کی حکومت تمہاری اولاد یعنی بسوامیوں کے پاس آتی لیکن اب یہ حکومت ہریرتے کی موت کے بعد ہریرتوں کے قبضے میں چلی جائے گی اور اس کے بعد سے نسل در نسل اسی کی اولادوں میں چلتی رہے گی اور آہستہ آہستہ لوگ بسوامیوں کو بھول جائیں گے۔ کیا تم نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟''

''میں کیا سوچوں مہاراج ...... اس کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''جس نے یہ سوچا وہ جیون میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ست گرو تمہارا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ ہریرتے کی موت کے بعد حکومت اسے ملنی چاہئے۔ ابھی سے اس کے لئے کچھ کرو۔ ورنہ بسوامیوں کی نسل ختم ہو جائے گی۔''

اور یہ بات ہمیشہ راجوریہ کے دل میں کھٹکتی رہتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر وہ مر گیا اور اس کی موت کے بعد راجہ ہریرتے کی موت ہوئی تو پھر کوئی طاقت حکومت بسوامیوں میں منتقل نہیں کر سکتی۔ لیکن راجوریہ اس کے باوجود اپنے بھائی کے خلاف کسی سازش کے حق میں نہیں تھا۔

اس کی یہ کیفیت تھی لیکن راجہ ہری کور کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی دلی

خواہش تھی کہ راج نگری کی عظیم حکومت اس کے نواسے ست گرو کے پاس آئے تا کہ سندر نگر کی حکومت کی توسیع ہو سکے۔ اس کے دشمن جان لیں کہ راج نگری کی مضبوط حکومت راجہ ہری کور کے نواسے کے پاس ہے اور اگر کسی نے سندر نگر کی طرف آنکھ اٹھائی تو اسے دو طاقتور حکومتوں سے ٹکرانا پڑے گا۔

کافی عرصہ تک وہ انتظار کرتا رہا کہ خود راجوریہ کے دل میں یہ بات آئے اور وہ کوئی عمل کرے لیکن جب وہ اس بات سے مایوس ہو گیا تو پھر اس نے خود ہی ترکیبیں سوچنا شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی بیٹی نندیرتا سے بھی مشورہ کیا۔

''کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہارے سو بیٹوں میں سے ایک راج نگری کا راجہ کہلائے؟'' اس نے نندیرتا سے پوچھا۔

''کیوں نہیں...... لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ ہریرتے کبھی یہ حکومت سوامیوں کے قبضے میں نہیں آنے دے گا۔''

''کوئی کام خود بخود نہیں ہوتا۔ حکومتیں حاصل کرنے کے لئے تو انسان کو بڑے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔''

''پر میں ناری ہوں مہاراج! میں کیا کروں؟''

''تم کبھی ہریرتے کے محل میں جاتی ہو؟''

''ہاں...... جب دل چاہتا ہے۔ مہاراج ہریرتے میری بڑی عزت کرتا ہے اور بار بار وہ اپنی کسی بھی الجھن میں ہم سے مشورہ کرتا ہے۔''

''کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ راجہ ہریرتے کو ختم کر دیا جائے؟''

''یہ کام میں کیسے کر سکتی ہوں؟''

''کچھ بھی کرو نندیرتا! سے نکل گیا تو پھر کچھ نہیں ہو گا۔ اگر راجہ ہریرتے جیتا رہا اور تمہارے پتی کا دیہانت ہو گیا تو پھر ہریرتے کی موت کے بعد حکومت اس کے بیٹوں کو مل جائے گی۔ لیکن اگر وہ پہلے مر گیا تو حکومت راجوریہ کی ہو گی۔ راج ست گرو کرے گا اور پھر ہریرتوں کی کچھ نہیں چلے گی۔ اس لئے جو کرنا ہے جلدی کرو۔ جتنی دیر کرو گی اتنے ہی خطرات بڑھ جائیں گے۔''

''مگر مہاراج! میں کیا کروں؟ راجوریہ کی مدد کے بغیر تو میں کچھ نہیں کر سکتی۔'' نندیرتا نے اپنے باپ سے کہا۔

''وہ اندھا تمہاری کبھی مدد نہیں کرے گا۔ جو کچھ کرنا ہے تم خود کرو۔ میں اس

سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں ست گرو کے ماتھے پر مجھے چندرما کی چمک نظر آتی ہے جس کا مطلب ہے وہ راج ضرور کرے گا۔ اب یہ تو کوئی اور ہی جانے کہ وہ راجہ کیسے بنے گا؟''

باپ کی بات نندیرتا کے دل کو لگی لیکن وہ پریشان تھی۔ راجہ ہریرتے کو قتل کرنا معمولی کام نہیں تھا۔ وہ ست گرو سے بھی یہ کام نہیں لینا چاہتی تھی۔ اگر ست گرو کا نام دوسروں کو پتہ چل گیا تو ممکن ہے آگے چل کر اسے ایک خونی کے نام سے پکارا جائے اور اسے حکومت کرنے میں مشکل پیش آئے۔

اب وہ دن رات اسی سوچ میں ڈوبی رہتی تھی۔ یہ کام وہ اس خاموشی سے کرنا چاہتی تھی کہ راجوریہ کو بھی نہ معلوم ہو۔ شاید وہ اس سے بدظن ہو جائے اور اس بنئے کی لڑکی کو نہ چاہنے لگے جس کے بطن سے اس کا ایک بیٹا شنکر تھا۔

کنٹھ بلاس کی پوتر رات کو راجہ ہریرتے کے محل میں خوب رونق تھی۔ طاق طاق دیے روشن تھے۔ پنڈت کتھا کر رہے تھے اور بتوں کے سامنے رقص ہو رہے تھے۔ تب نندیرتا کی نگاہ ایک رقاصہ پر پڑی اور اسے یوں لگا جیسے چندرما زمین پر اتر آیا ہو۔ کرنیں سمٹ کر انسانی بدن اختیار کر گئی ہوں۔ چاندنی رقص کر رہی ہو۔ وہ اپنی دھن میں ناچ رہی تھی اور دیکھنے والوں کے دل اس کے قدموں تلے کچل رہے تھے۔ خود رانی نندیرتا بھی اس کا حسن دیکھ کر انگشت بدنداں تھی۔ اسے خطرہ ہوا کہ اگر یہ لڑکی نوجوانوں کی نگاہ میں آ گئی تو بڑی قتل و غارت گری کا باعث بنے گی۔ نہ جانے کیوں اب تک اس کے چرچے نہیں ہوئے تھے۔

رانی نندیرتا اسے دیکھتی رہی۔ رقاصہ جی توڑ کر ناچ رہی تھی اور اس کا لوچ دار بدن سو سو بل کھا رہا تھا۔ پھر وہ تھک گئی اور اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ ناچ ختم ہو گیا اور لوگ بدھائی دینے لگے تو رقاصہ نے گھنگھرو کھول دیئے اور انہیں ہاتھوں میں سمیٹ کر چل پڑی۔ رانی نندیرتا کے جی میں نجانے کیا سمائی کہ وہ خود بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

جب لڑکی ہریرتے کے محل سے بھی نکل آئی تو نندیرتا کو فکر ہوئی، اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ اور جب وہ خود محل میں نہ ہو گی تو لوگ یہ سوچیں گے کہ رانی نندیرتا کہاں گئی۔

لیکن اس نے وسوسے دل سے نکال دیئے اور خاموشی سے لڑکی کا تعاقب کرتی رہی۔ اسے جنگل کی طرف جاتے دیکھ کر رانی کو حیرت ہوئی۔ اب تو اسے یوں لگ رہا

تھا جیسے کوئی خاص ہی معاملہ ہے اور یہ پراسرار لڑکی دل میں کچھ بھید رکھتی ہے۔ یعنی رانی نندیرتا کے دل میں تجسس نے سر ابھارا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ بھید معلوم کر کے ہی دم لے گی۔

رات کا وقت، تاریک جنگل جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔ کہیں سے درختوں کے چھپر ہٹتے تو تاروں کی چھاؤں میں لڑکی کا ہیولا نظر آ جاتا۔ نندیرتا اب اس طویل سفر سے پریشان ہونے لگی تھی اور سوچ رہی تھی کہ واپس لوٹ جائے۔ لیکن اتنی دور نکل آنے کے بعد اس طرح واپسی بھی عجیب تھی۔ یہ بھید اس کے من میں بھید ہی رہے گا۔ دیکھئے تو سہی یہ کون ہے؟ بالی سی عمر میں اتنا نڈر ہونا کمال کی بات ہے۔ کوئی جوان لڑکی تو اتنی رات گئے ان جنگلوں میں گھسنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ کیسے اطمینان سے جا رہی تھی۔

رانی نندیرتا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ جنگل آگے اور خطرناک ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں سے کپڑے الجھ رہے تھے۔ کون جانے کب کوئی ناگ نکلے اور ٹانگ سے لپٹ جائے۔ کوئی زہریلا بچھو پاؤں میں ڈس لے۔

وہ چلتے چلتے کئی بار رکی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مضبوط ڈوری اس کے اور آگے جانے والی لڑکی کے درمیان بندھی ہو جو اسے کھینچ رہی ہو۔ چنانچہ رکنے کے بعد وہ پھر چل پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا اور اب وہ ٹوٹے ہوئے قلعے کے پاس نکل آئیں۔

یہ چندن محل تھا جو صدیوں پہلے تعمیر ہوا تھا اور راجہ کشور کی پانچ نسلوں نے اس میں سکونت اختیار کی تھی۔ اس کا شمار خوبصورت ترین عمارتوں میں ہوتا تھا۔ لیکن چھٹی نسل کے آنے تک یہ بوسیدہ ہو گیا تھا اور اس کے نیچے نمک کی کانیں نکل آئی تھیں جس کی وجہ سے چھٹی نسل کے راجہ نے وہاں سے کافی دور ہٹ کر نیا محل تعمیر کر لیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد سے یہ محل راجاؤں کی اقامت گاہوں کے طور پر استعمال ہوتا آیا تھا اور ٹوٹے قلعہ کی حیثیت بس ایک تاریخ رہ گئی تھی۔

سال میں پورے چاند کی ایک رات کو یہاں آنے کا رواج تھا اور بوسیدہ بتوں کی پوجا کر کے بڑھوں کی یادیں تازہ کی جاتی تھیں۔ لیکن بس سال میں ایک رات۔ باقی دنوں میں قلعہ ویران پڑا رہتا تھا۔ راجہ ہریتے نے یہ رسم بھی ترک کر دی تھی اور چھ سال گزرے وہ یہاں سے سارے قدیم بت اٹھوا لے گیا تھا جن کے لئے اس

نے نئے محل میں ایک جگہ مخصوص کرا دی تھی۔ اس کے بعد سے پورن ماشی کی اس رات کی روایات بھی ختم ہو گئی تھیں اور وجہ اس کی یہ تھی کہ راجاؤں کے لئے ان جنگلوں کو پیدل عبور کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ اکثر یہاں آنے والوں کو سانپ اور بچھو ڈس لیا کرتے تھے۔ بہت سے مر چکے تھے اس لئے کسی نے اس رسم کو توڑنے کی مخالفت نہیں کی تھی۔

چھ سال کے بعد نندیرتا نے خود کو اس قلعے کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے پاس دیکھا تو اسے بہت خوف محسوس ہوا۔ لیکن نوجوان لڑکی کا تو جیسے یہی گھر تھا۔ وہ اطمینان سے اندر داخل ہو گئی اور ٹوٹی دیواروں کے درمیان چلتی ہوئی بالآخر ایک چبوترے کے پاس رک گئی۔ پھر اس نے ٹوٹے ہوئے چبوترے کی تین تین سیڑھیاں عبور کیں اور پھر اوپر پہنچ گئی۔ پورا قلعہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور رانی نندیرتا کا دل دہشت سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہاں تک چلی تو آئی تھی لیکن سوچ رہی تھی کہ کیا اب یہاں سے زندہ واپسی ممکن ہو گی۔ واپسی کا راستہ اور ٹوٹے ہوئے قلعے کی پراسرار دیواریں اسے نگل نہ لیں۔ یہ تو ایسی جگہ تھی جہاں دن میں آنے والوں کے دل ہول جائیں نہ کہ یہ رات کا وقت تھا۔

وہ خود بھی آگے بڑھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اس لڑکی کے سامنے آ جائے، اس سے باتیں کرے، اس کا راز پوچھے اور پھر اس سے کہے کہ وہ اسے واپس پہنچا دے۔ اکیلے واپس جانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ وہ خود بھی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچ گئی۔ لڑکی جھکی ہوئی کچھ کر رہی تھی۔ اور پھر چبوترے پر تیز روشنی پھیل گئی۔ لڑکی نے ایک دیا روشن کر دیا تھا۔

لیکن رانی نندیرتا نے کبھی ایسی روشنی نہیں دیکھی تھی۔ یہ روشنی سرخ تھی اور خوب تیز تھی۔ اتنی تیز کہ وہ دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔ اور پھر اس نے اس سرخ روشنی میں لڑکی کو دیکھا جو اب اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بے حد حسین اور مانوس تھی جیسے ننھے ننھے دیئے روشن ہو گئے ہوں اور اس روشنی میں اس کا چاند جیسا چہرہ بھی خوب چمک رہا تھا۔ پھر اس کی مدھر آواز ابھری۔

''رانی نندیرتا! میرے پاس آؤ۔''

اور نجانے اس کی آواز میں کیا سحر تھا کہ نندیرتا کھنچی چلی گئی۔ اب وہ اس اپسرا کے عین سامنے تھی۔ لڑکی بدستور مسکرا رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اس کے انگ انگ

میں دیے جل رہے ہوں۔ نہ جانے یہ روشنی کہاں سے منعکس ہو رہی تھی۔

"تم میرے پیچھے کیوں آئی تھیں؟" وہ بدستور مسکراتی ہوئی بولی۔

"تم کون ہو......؟ میں تمہارا بھید جاننا چاہتی تھی۔" نندریتا نے جواب دیا۔

"میرا بھید جان کر کیا کرو گی؟"

"بس میرے من میں آئی تھی۔ تم اتنی سندر ہو کہ راج میں ہلچل مچا سکتی ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ لوگ اب تک تم سے واقف کیوں نہیں ہیں۔" رانی نندریتا نے صاف لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ اس سے پہلے میں کبھی کسی کے سامنے نہیں آئی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیوں......؟"

"اس سوال کا جواب میرے لئے مشکل ہے۔ اس لئے اس کا جواب نہ مانگو۔" حسین لڑکی نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی کشش تھی کہ انسان اسے دیکھے تو بس دیکھتا رہ جائے۔ لیکن رانی نندریتا نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہوں میں ایک پختگی ہے۔ وہ الھڑپن اس کے چہرے پر نہیں ہے جو اس عمر کی لڑکیوں کے چہروں پر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یوں لگتا تھا جیسے اس نے سنسار کو بہت قریب سے دیکھا ہو اور اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ رانی نندریتا کو یہ دو متضاد کیفیتیں عجیب لگی تھیں۔

"ٹھیک ہے...... میں اس کا جواب نہیں مانگتی۔ پر دوسرے سوال تو کر سکتی ہوں۔"

"کرو......؟" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تم کہاں رہتی ہو؟"

"یہیں، اسی چندن نواس میں۔"

"یہاں...... اس ویرانے میں؟" نندریتا حیرت سے بولی۔

"ہاں...... مجھے یہی جگہ پسند ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"مگر یہاں تو تمہیں بڑی پریشانی ہوتی ہو گی۔ اور پھر آبادی کو چھوڑ کر تم یہاں کیوں رہتی ہو؟ اکیلی رہتی ہو یا تمہارے ماتا پتا اور دوسرے رشتے دار بھی یہاں رہتے ہیں؟"

"مجھے یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ جگہ تو بڑے سکون کی جگہ ہے۔ اس

سنسار میں میرے نہ کوئی ناتے دار ہیں اور نہ ماتا پتا۔"

"اکیلی ہو؟"

"ہاں...... جنم جنم سے......" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" نندریتا نے پوچھا۔

"انگوری۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"سندرتا میں تو تم انگور کی ڈالی سے بھی بڑھ کر ہو۔ پر ہو بڑی عجیب، تمہیں ناچتے دیکھ کر میں حیران ہو گئی تھی اور یہی حیرانی مجھے تمہارے پیچھے لے آئی۔ جب تم یہاں رہتی ہو تو پھر اتنا سفر کر کے وہاں کیوں گئی تھیں؟"

"ہریرتے کے محل میں؟"

"ہاں......"

"تم سے ملنے...... تمہیں یہاں لانے۔" اس نے بڑی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور رانی نندریتا حیران رہ گئی۔

"تمہیں کیسے معلوم تھا کہ میں وہاں آؤں گی؟"

"یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں۔ پورن ماشی کی رات بڑی مشہور ہے۔"

"مگر تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟"

"اس لئے کہ میرا ایک کام تم سے ہے اور تمہارا ایک کام مجھ سے ہے۔ اور اس رات سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ملے گا اس بات کو طے کرنے کا۔"

"میرا کام تم سے ہے؟" نندریتا پھر حیران رہ گئی۔

"ہاں...... میں نے ٹھیک کہا۔"

"انوکھی بات کر رہی ہو انگوری۔ بھلا نہ میں تمہیں جانوں نہ میں نے تمہیں کبھی دیکھا پھر میں کوئی کام تم سے کیوں لینے لگی؟" نندریتا نے ہنس کر کہا۔

"یہ بات نہیں نندریتا! تم بھول رہی ہو، تمہیں یاد نہیں ہے؟ یاد کرو، اسی محل میں، اسی چبوترے پر تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس بھید کو ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کیا تم یاد کر سکتی ہو؟"

"تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" نندریتا پریشانی سے بولی۔

"میں سمجھا دوں گی...... تم یہ بتاؤ نندریتا! تمہارے پاس ایک چندن ہار ہے جس میں چھ موتی لگے ہوئے ہیں اور ساتویں کنڈلی خالی ہے۔"

ہاں ہے ..... مگر وہ تو ..... وہ تو میں نے کبھی نہیں پہنا۔ کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔ تمہیں کیسے معلوم؟''

''اس کا ساتواں موتی کہاں گیا؟'' انگوری مسکرا کر بولی۔

''میں ..... میں کیا جانوں؟'' نندیتا تعجب سے بولی۔

''آؤ ..... میں تمہیں بتاؤں کہ ساتواں موتی کہاں ہے۔ ہم دونوں نے مل کر چنگھو کو زمین میں گاڑھ دیا تھا۔ جب تم نے اسے مارا تھا تو اس نے بچنے کی کوشش کی تھی اور چندن ہار کا موتی ٹوٹ کر اس کی مٹھی میں بند رہ گیا تھا۔ پھر تم اسے تلاش کرتی رہیں اور وہ تمہیں یاد بھی نہ آیا۔ لیکن میں نے اسے کھوج لیا۔ یہیں اسی چبوترے کے پیچھے ہم نے چنگھو کو دفن کر کے جیون کمار کو تخت پر بٹھایا تھا۔ کیا تمہیں اپنا بیٹا جیون کمار بھی یاد نہیں ہے؟ اس نے تمہارے جیون میں نو سال تک راج کیا تھا۔ آؤ، میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے کہا اور نندیتا نے محسوس کیا کہ آگے قدم بڑھانے میں اس کے اپنے کسی ارادے کو دخل نہیں ہے۔ وہ کسی غیر مرئی ڈور میں بندھی ہوئی ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔

تب خوبصورت لڑکی اسے چبوترے کی دوسری طرف کی سیڑھیاں اتار کر نیچے لے گئی اور آخری سیڑھی کے اختتام پر اسے ایک گڑھا نظر آیا۔ یہ گڑھا سیڑھی ٹوٹ جانے کی وجہ سے بن گیا تھا یا نمایاں ہو گیا تھا۔

چلتے وقت انگوری نے وہ سرخ روشنی کا دیا بھی اٹھا لیا تھا جو پیتل کا بنا ہوا تھا اور کافی بڑا تھا۔ اس نے دیے کی روشنی گڑھے میں اتاری اور نندیتا بھی خوفزدہ ہو گئی گڑھے میں چند انسانی ہڈیاں اور ایک کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔

''چنگھو ہے ..... راجہ چنگھو ..... جس کی حکومت بہت بڑی تھی اور چوبیس گھوڑوں کے سونے کے رتھ پر نکلتا تھا اور اس رتھ کے راستے میں آ جانے والے کی جان بخشی نہیں ہوتی تھی۔ کچھ یاد ہے؟''

''کب کی بات کر رہی ہو ..... مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔''

''اچھا ٹھہرو ..... میں تمہیں کچھ اور دکھاؤں۔''

انگوری نے دیا گڑھے کے کنارے رکھ دیا اور پھر جھک کر گڑھے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے اس پنجر کا ایک ہاتھ نکال لیا جس کی سوکھی ہوئی استخوانی انگلیوں کے پنجر کے درمیان ایک موتی چمک رہا تھا اور بلاشبہ یہ موتی نندیتا کے اس چندن ہار کا وہ

گمشدہ موتی تھا جس کی گمشدگی کے بارے میں اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔

نندیتا دنگ رہ گئی۔ انگوری نے موتی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اسے پہچانتی ہو؟''

''ہاں ..... یہ موتی اسی چندن ہار کا ہے۔''

''چلو آؤ یہاں سے ..... مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں ہے کہ تمہیں کچھ یاد آتا ہے یا نہیں۔ مجھے تو بس اس کہانی سے دلچسپی ہے جو اب دوبارہ دہرائی جا رہی ہے۔'' انگوری نے اس کے ساتھ واپس چبوترے پر آتے ہوئے کہا۔

''کون سی کہانی؟'' نندیتا کی آواز میں سرسراہٹ نمایاں تھی۔

''راجہ چنگھو کی کہانی۔ جو اب ہریتے کے نام سے مشہور ہے۔ جیون کمار کو اس سنسار میں ست گرو کہا جاتا ہے اور نندیتا آج بھی چنگھو کو ختم کر کے جیون کمار کو تخت پر بٹھانا چاہتی ہے۔ میں نے جھوٹ کہا؟''

نندیتا کا سر پھر چکرا گیا تھا۔ یہ رات اس کے لئے ایسی انوکھی ہو گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس حسین صورت کے پیچھے کوئی ایسی ہستی ہو گی اسے گمان بھی نہ تھا۔ اس کے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔

''مجھ سے جھوٹ کہنا چاہو گی تب بھی نہ کہہ سکو گی نندیتا! جو سچ ہے وہ سچ ہے اور میں نے اس لئے کہا کہ میرا ایک کام تم سے ہے اور تمہارا مجھ سے۔''

نندیتا سوچتی رہی پھر بولی۔ ''میرا کیا کام تم سے ہے؟''

''میں پہلے کی طرح چنگھو کے قتل میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ تمہارا کام کر دوں گی، اس کے بعد اپنا کام بتاؤں گی۔ لیکن وچن دو۔ اگر وچن دے کر تم نے میرا کام نہیں کیا تو میں تم سے بدلہ لوں گی۔''

''کیا تمہارا کام مشکل ہے؟''

''نہیں، پر تم اسے بھول بھی سکتی ہو۔ اس لئے تمہیں وچن دینا ہو گا۔'' حسین لڑکی نے پراسرار انداز میں کہا۔

نندیتا عجیب الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ یہ انوکھی لڑکی بڑی حیرت ناک تھی۔ اس کی باتیں ناقابل فہم تھیں۔ لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا، اس کے ٹھوس ثبوت بھی فراہم کئے تھے۔ اس کے علاوہ نندیتا کے دل میں جو بات تھی وہ بھی اس کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑی تھی۔

بے شک نندیتا یہی چاہتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ہر یرتے مر جائے اور اس کے بعد حکومت راجور یہ کومل جائے تاکہ باپ کے نام سے بیٹا حکومت کرے اور اس کے بعد راج نگری کی حکومت پشت در پشت بسوامیوں کے خاندان کو منتقل ہوتی رہے اور ہر یرتے اس سے محروم ہو جائیں۔

لیکن انوکھی لڑکی نے راجہ پنگھو اور دوسرے نام یعنی جیون کمار وغیرہ جو لئے تھے وہ نندیتا کی سمجھ سے باہر تھے۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب کہیں پچھلے جنموں کی بات تو نہیں ہے؟ لیکن گزری ہوئی باتیں کسے یاد رہتی ہیں۔ اسے بالکل یاد نہ آ سکا کہ کسی دور میں جیون کمار کی ماں تھی۔ لیکن لڑکی جو کچھ کہہ رہی تھی اس کا کوئی نہ کوئی مفہوم تو ضرور نکلتا تھا۔ جب اسے خود کچھ یاد نہ آ سکا تو بولی۔

''میں تیری باتیں نہیں سمجھ پا رہی انگوری! پر جو کچھ تو کہہ رہی ہے اس میں کچھ سچائی ضرور ہے۔ چنانچہ میں تیرے کہے پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔''

''کیا تو سچ کہہ رہی ہے نندیتا؟'' حسین لڑکی نے تیکھی چتون کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... وشواش کر۔'' انگوری بولی۔

''میں یہی چاہتی ہوں نندیتا کہ تو مجھ سے یہ وعدہ کرے اسے ہمیشہ یاد رکھے۔ میں تجھے وچن دیتی ہوں کہ میں اگر اپنے وچن میں کامیاب ہو گئی تو پھر سب کچھ کروں گی جو تیرے من کی بھاؤنا ہے۔''

''اس بات کو تو بھی یاد رکھ انگوری کہ میں بھی تیری ہر بھاؤنا پوری کروں گی۔''

''تو وچن دیتی ہے نندیتا؟''

''ہاں......'' رانی نندیتا نے کہا اور انگوری نے اپنا حسین ہاتھ پھیلا دیا۔

''اگر یہ بات ہے تو میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھگوان کی سوگند کھا کر مجھے وچن دے کہ اس کام کے بدلے میں تجھ سے کچھ مانگوں گی تو مجھے دے گی۔''

''ہاں...... میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ اپنا وچن پورا کروں گی۔'' رانی نندیتا نے اس کے خوبصورت ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ برف کی طرح ٹھنڈا یخ ہاتھ لیکن نہایت ملائم جیسے دھواں۔ یوں انگوری اور رانی نندیتا کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔

تب انگوری نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے دیے کے نزدیک لے گئی۔ اس نے دیے کے نزدیک پہنچ کر رانی نندیتا سے کہا۔

''اس میں جھانکو نندیتا...... دیکھو یہ کیا ہے؟''

اور پہلی بار رانی نندیتا نے دیے میں جلتے ہوئے تیل کو دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اب اسے سرخ روشنی کا راز معلوم ہو گیا تھا۔ دیے میں تیل کی جگہ گاڑھا گاڑھا انسانی خون بھرا ہوا تھا اور ایک انسانی ہتھیلی اس خون میں ڈوبی ہوئی تھی جس کا اوپری سرا آگ کی طرح روشن تھا۔ گویا وہ انگلی دیے کی بتی کا کام دے رہی تھی۔

نندیتا کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ سرخ روشنی کے سائے اس کے لرزیدہ بدن کو دیواروں پر منعکس کر رہے تھے۔ تب اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ...... یہ کیا ہے انگوری؟'' اس نے پوچھا اور انگوری کے ہونٹوں پر وہی حسین اور پر اسرار مسکراہٹ پھیل گئی جو اب تک رانی نندیتا اس کے چہرے پر دیکھتی آئی تھی۔

''یہ میرا عہد ہے کہ جب تک میں اپنا عہد پورا نہیں کراؤں گی خون کا یہ دیا روشن رہے گا۔ لیکن میں تمہیں اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔ آنے والا سمے بھی کچھ خود ہی بتا دے گا۔'' انگوری نے کہا۔

''لیکن یہ خون کس کا ہے انگوری؟''

''افسوس رانی نندیتا! میں ابھی یہ نہیں بتا سکتی۔ مجبوری ہے۔''

''تو پھر تم نے مجھے یہ انوکھی چیز کیوں دکھائی ہے؟''

''اس لئے کہ تم اپنے وچن کا خیال رکھو اور سمے پورا ہو جانے کے بعد اس کا پالن کرو۔''

''میں تم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ میرے اپنے کام کے سلسلے میں میری کیا سہائتا کرو گی؟'' رانی نندیتا نے پوچھا۔

''رانی نندیتا! تمہارے پتا راجہ ہری کور نے جو مشورہ تمہیں دیا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر حکومت بسوامیوں کو منتقل نہ ہوئی تو تاریخ میں ایک بہت بڑا خلاء رہ جائے گا۔ تاریخ کا یہ خلاء پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

راجہ ہریتے اس سنسار میں نہ رہے۔ لیکن راجہ ہریتے کی ہلاکت اتنی آسان نہیں ہے جتنی تم لوگوں نے سمجھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ بات تمہیں معلوم نہ ہو رانی نندریتا! لیکن اپنے پتی راجوریہ سے پوچھو کہ راجہ ہریتے کی جنم کنڈلی میں کیا لکھا گیا ہے۔ اس کی جنم کنڈلی جن سادھوؤں نے بنائی تھی انہوں نے راجہ ہریتے کے پتا چندر دیپ کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ جنم کنڈلی کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ چنانچہ جنم کنڈلی محفوظ رہتی چلی آئی ہے اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ خود راجہ ہریتے کو بھی اس بارے میں نہیں معلوم۔ چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ جنم کنڈلی کھول کر دیکھی جائے اور اس سے راجہ ہریتے پر اثر ڈالا جائے۔'' انگوری نے کہا۔

''جنم کنڈلی میں کیا لکھا ہے...... کیا تمہیں اس بارے میں کچھ معلوم ہے انگوری؟'' رانی نندریتا نے پُرتجسس نگاہوں سے انگوری کی صورت دیکھتے ہوئے کہا اور مسکراتی ہوئی لڑکی کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

''ہاں...... پنڈتوں نے راجہ ہریتے کے جیون کے بارے میں جیوتش ودیا سے کام لیتے ہوئے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ راجہ ہریتے کی موت فطری نہیں ہوگی۔ وہ سانپ کے کاٹے سے ہلاک ہوگا اور یہ سانپ اس کے دشمن اس تک پہنچائیں گے۔ پنڈتوں نے یہ بھی کہا کہ راجہ ہریتے اپنی تمام تر حفاظتی کوششوں میں ناکام ہو جائے گا۔ تمہارا کام یہ ہے رانی نندریتا کہ تم اپنے پتی راجوریہ سے کہو کہ تم نے ایک سپنا دیکھا ہے اور اس سپنے میں تمہیں کسی نے بتایا ہے کہ راجہ ہریتے کی موت قریب ہے۔ تم اس سے یہ بھی کہو کہ راجہ ہریتے کو چاہئے کہ اپنی جنم کنڈلی دیکھ لے۔ اب اس کی موت قریب ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہو اسے تم ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتی رہو۔ البتہ اس دوران اپنی ساری کوششیں مکمل کر لو کہ ہریتے کی موت کے بعد حکومت تمہارے اندھے پتی کو مل جائے۔ اگر حکومت کے حصول کے لئے کچھ اور لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو بعد میں تمہیں پریشانی ہوگی۔''

انگوری نے بتایا اور رانی نندریتا پُرخیال انداز میں اس کی صورت دیکھنے لگی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں انگوری وہ بڑی عجیب اور بڑی ہی تعجب خیز ہیں۔ لیکن تم مجھے جن حالات کے تحت ملی ہو اس کے تحت مجھے مجبور ہونا پڑا کہ میں

تمہاری باتوں پر پورا پورا وشواس کروں۔''

''دیکھو رانی نندریتا! تم اس سارے معاملے کو اس طرح نہ سوچو کہ میں تمہیں کوئی دھوکا بھی دے سکتی ہوں۔ میں نے ایک طویل سفر کیا ہے۔ اتنا لمبا سفر کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں اور یہ سفر کرنے کے بعد میں یہاں تک پہنچی اور یہاں سے تمہارے پاس۔ کیونکہ میرا اور تمہارا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ تم مجھے نہیں پہچان سکیں رانی نندریتا! لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں اور اس کی وجہ جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں ابھی نہیں بتاؤں گی۔'' انگوری نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں تمہارے کہے پر عمل کروں گی۔'' رانی نندریتا نے کہا پھر بولی۔ ''اب تم مجھے واپس پہنچا آؤ۔ ورنہ اگر میری تلاش شروع ہوگئی تو مجھے یہ جواب دینا مشکل ہو جائے گا کہ میں نے یہ سمے کہاں بتایا۔'' رانی نندریتا نے کہا اور انگوری مسکرانے لگی، پھر بولی۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ نئے محل تک جانے کا راستہ نیچے ہی نیچے، اسی محل کے نیچے سے ہی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' رانی نندریتا چونک پڑی۔

''آؤ رانی نندریتا! تمہیں تمہاری سسرال کی کچھ اور باتیں بھی بتاؤں۔ میں تمہیں وہ چیزیں بھی دکھاؤں جن کے بارے میں تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ آؤ میرے ساتھ۔'' انگوری آگے بڑھ گئی اور رانی نندریتا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

اس حسین لڑکی کی چال بھی بڑی دلکش تھی۔ سرخ دیا اس نے چلتے سے بجھا دیا تھا اور یہ دیا ایک طاق میں محفوظ تھا۔ انگوری اسے لئے ہوئے محل کے اندرونی گوشوں میں پہنچ گئی۔ پھر اس نے ایک ٹوٹے ہوئے سوراخ کی چند اینٹیں اٹھائیں اور اندر تاریکی نظر آنے لگی۔

''آؤ میرے ساتھ......'' اس نے نندریتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نندریتا اس بھیانک غار میں اترتے ہوئے خوفزدہ تھی لیکن انگوری نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بولی۔

''تم بالکل چنتا مت کرو...... میں تمہارے ساتھ ہوں اور جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' اس نے کہا اور رانی نندریتا اس کے ساتھ غار میں اتر گئی۔

یہ ایک ہی سرنگ تھی جس میں وہ دونوں با آسانی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ سرنگ میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی لیکن انگوری اس طرح آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی جیسے یہ سارے راستے اس کے اچھی طرح جانے پہچانے ہوں اور وہ ان راستوں کے پیچ و خم سے اچھی طرح واقف ہو یا پھر رات کی تاریکی میں وہ اسی طرح دیکھ سکتی ہو جیسے دن کی روشنی میں۔

یہ سرنگیں زیادہ لمبی نہیں تھی حالانکہ جتنا فاصلہ طے کر کے نندیرتا اُس جنگل کو عبور کر کے انگوری کے پیچھے پیچھے آئی تھی اس کے تحت واپس جانے میں کافی وقت لگ جاتا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ کھلی اور تازہ ہوا میں نکل آئی ہے۔ اور جب وہ غار کے دوسرے دہانے سے باہر نکلی تو ششدر رہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا لمبا راستہ کسی بھی طریقے سے اتنا چھوٹا ہو سکتا ہے۔

وہ ہریرتے کے محل کے پاس کھڑی تھی جہاں کی رونقیں بدستور جاری تھیں۔ یہ رونقیں ساری رات جاری رہتی تھیں اور صبح کو جب چاند کی روشنی پھیکی پڑ جاتی اور ستارے ماند پڑ جاتے تب اس جشن کا خاتمہ ہوتا تھا۔

رانی نندیرتا نے حیران نگاہوں سے محل کے اس حصے کو دیکھا اور چکرانے لگی۔

''تعجب ہے انگوری! جو فاصلہ میں نے اتنی دیر میں طے کیا تھا وہ اتنا چھوٹا کیسے ہو گیا؟''

انگوری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو رانی نندیرتا ایک بار پھر حیران رہ گئی۔ وہاں انگوری کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ پتہ نہیں زمین میں سما گئی تھی یا فضاؤں میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ جس سوراخ سے وہ باہر نکلی تھی اب اس کا بھی وجود نہیں تھا۔ رانی نندیرتا منہ پھاڑ کر رہ گئی۔

کافی دیر وہ انگوری کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑاتی رہی لیکن انگوری کا اب کوئی وجود نہیں تھا۔

راجوریہ کو راج نگری کی حکومت نہیں ملی تھی لیکن اسے اپنی اس کمی کا احساس تھا جو آنکھوں کے نہ ہونے سے تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بن آنکھوں کے حکومت سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہریرتے کو اس نے دل و جان سے تسلیم کیا تھا اور بھائی کے لئے اس کے دل میں گنجائش بھی تھی۔

لیکن کبھی کبھی اس کے دل کے گوشوں میں یہ خیال بھی ضرور آتا تھا کہ اس کی یہ کمی اس کی اولاد کو بھی حکومت سے محروم رکھے گی اور ہریرتے راج نگری اور اس کے نواحوں میں حکومت کرتے رہیں گے۔ حالانکہ یہ ضروری تھا کہ ہریرتے کے بعد حکومت ست گرو کو دی جائے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ چندر دیپ کی اولادوں میں سے دوسری نسل کا سب سے بڑا بیٹا ست گرو ہی تھا لیکن اس نے ہریرتے کے سامنے کبھی یہ بات منہ سے نہیں نکالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت بڑی چیز ہوتی ہے۔ اقتدار کا نشہ سارے رشتے بھلا دیتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی اس خواہش کا اظہار ہریرتے کے دل میں تشویش بن جائے اور اس نے راجوریہ، اس کی اولادوں اور اس کی رانیوں کو جو سہولتیں دے رکھی ہیں وہ انہیں اس سے محروم کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اپنے ذہن میں آنے والے اس فاسد خیال کو وہ ہمیشہ جھٹک دیا کرتا تھا۔

نندیرتا ایک چالاک عورت تھی۔ حالانکہ راجہ ہرکور سے بھی پہلے یہ باتیں اس کے ذہن میں آتی تھیں اور وہ محسوس کرتی تھی کہ خود اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ لیکن راجوریہ کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس نے یہ بات کبھی زبان سے نہیں نکالی تھی۔ البتہ دل ہی دل میں وہ جلتی رہتی۔ چنانچہ راجوریہ کو یہ بات کبھی معلوم نہ ہو سکی کہ اس کی بیوی کے دل میں کیا ہے۔

جشن کی رات کے اختتام پر وہ واپس دریا کے کنارے اپنے اس محل میں آ گیا جو ہریرتے نے اس کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ بلاشبہ یہ محل چھوٹا تھا اور اس پائے کا نہ تھا جس پائے کے محل میں راجہ ہریرتے رہتا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ راجہ اور دوسرے افراد میں کوئی نہ کوئی فرق ہونا لازمی امر ہے۔ چنانچہ اس نے اس بات پر بھی کبھی کسی پریشانی یا افسوس کا اظہار نہیں کیا۔

اس وقت بھی وہ اپنے محل کی چھوٹی سی بارہ دری میں بیٹھا سوچ میں گم تھا کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس آہٹ کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ آنکھوں کی غیر موجودگی نے اس کے ذہن میں دوسری حسیات جگا دی تھیں۔ چنانچہ وہ آوازوں کو پہچان لیا کرتا تھا۔ تبھی اس کی گمبھیر آواز ابھری۔

''نندیرتا! شاید تم ہو۔''

''ہاں مہاراج ...... میں ہی ہوں۔'' نندیرتا نے لمبی سانس لے کر جواب دیا۔

''اوہ ...... تمہاری سانس میں اس قدر فکر مندی کے آثار ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم کسی قدر پریشان ہو۔ میری آنکھیں نہیں دیکھ رہیں، پر میرا من دیکھ رہا ہے کہ تمہارے چہرے پر اور خاص طور سے تمہاری پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں پھیلی ہوئی ہیں۔ آؤ میرے پاس، مجھے اپنی پریشانی بتاؤ۔'' راجوریہ نے نرمی سے کہا اور رانی نندیرتا اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔

''میں ...... میں سچ مچ بڑی پریشان ہوں مہاراج!'' رانی نندیرتا نے فکر مند لہجے میں کہا اور راجوریہ کسی قدر مضطرب ہو گیا۔

''مجھے اس پریشانی کی وجہ بتاؤ نندیرتا!''

''میں نے رات کو ایک عجیب سپنا دیکھا ہے ...... یہ سپنا میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' راجوریہ نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں ...... میں جاگ رہی تھی اور میری آنکھیں ایک انوکھا سپنا دیکھ رہی تھیں۔''

''کیا سپنا تھا وہ؟'' راجوریہ نے پوچھا۔

''میں نے دیکھا مہاراج کہ آسمان سے ایک تارہ ٹوٹا اور ایک روشن لکیر بناتا ہوا میرے قدموں میں آ گرا۔ میں نے ڈرتی ہوئی نگاہوں سے اس چیز کو دیکھا جو میرے پیروں میں آ پڑی تھی تو وہ چمڑے میں لپٹی ہوئی ایک کتاب تھی۔''

''کتاب؟'' راجوریہ متعجب ہو گیا۔

''ہاں مہاراج ...... کتاب کا چمڑا کھولا تو مجھے اس میں راجہ ہریرتے کی جنم کنڈلی نظر آئی۔''

''اوہ ......'' راجوریہ حیرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ ''کیا تم نے اس جنم کنڈلی کو کھول کر دیکھا؟''

''ہاں ...... یہی تو پریشانی ہے۔''

''کیوں؟'' راجوریہ متحیر لہجے میں بولا۔

''میں نے اسے کھول کر دیکھا اور بڑی انوکھی باتیں دیکھیں۔ بڑی ہی عجیب باتیں لکھی ہوئی تھیں اس میں۔''

''اوہ ...... اوہ ...... مجھے بتاؤ، مجھے بتاؤ کیا انوکھی باتیں تھیں؟'' راجوریہ اب پوری طرح اس پراسرار داستان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''میں نے جنم کنڈلی پڑھی مہاراج تو اس میں انوکھے انکشاف پائے۔ اس میں لکھا تھا کہ راجہ ہریرتے کی موت اس عمر میں ہوگی جب اس کے پانچ بیٹے ہوں گے اور وہ اپنی حکومت کے گیارہ سال پورے کر چکا ہوگا۔''

''اچھا پھر ...... اور کیا پڑھا تم نے اس میں؟''

''لکھا تھا کہ مہاراجہ ہریرتے کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوگی۔ وہ ایسی جگہ مرے گا جہاں عام لوگ نہیں مرتے۔''

''بڑے افسوس کی بات ہے۔ بڑی تشویش کی بات ہے۔ نجانے تم نے یہ سپنا کیوں دیکھا؟''

''اس سے میرا دل ڈر رہا ہے مہاراج! میں جانتی ہوں کہ راجہ ہریرتے ہم لوگوں پر بہت مہربان ہے۔ وہ ہمارا اپنا ہے۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ ہریرتے کی موت کے بعد حکومت ہمارے بیٹوں کو ملنی چاہئے لیکن میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ یہ تو بھگوان کی مرضی پر ہوتا ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ راجہ ہریرتے کی زندگی ہی ہم لوگوں کے لئے بہتر ہے۔ ہمیں یہ بات سوچنا بھی نہیں چاہئے کہ وہ مر جائے۔''

''بھگوان نہ کرے ...... وہ میرا بھائی ہے۔'' راجوریہ نے کہا۔

''میں جانتی ہوں مہاراج! مگر ایک بات کبھی کبھی میرے من میں کرودھ پیدا کرتی ہے۔''

''وہ کیا؟'' راجوریہ نے کہا۔

''وہ یہ مہاراج کہ خاندانی ریت کے مطابق ہریرتے کے بعد حکومت ست گرو کو ملنی چاہئے۔ مگر میرا خیال ہے کہ حکومت ست گرو کی بجائے چتر دیو کو ملے گی۔ کیونکہ ہریرتے کے بیٹوں میں وہ سب سے بڑا ہے۔''

''اگر حکومت چتر دیو کو بھی ملے تو ہمیں کیا۔ چتر دیو بھی تو ہمارا اپنا ہی ہے۔''
''ٹھیک ہے..... مگر بہت سے لوگ اس بات کو نہیں مانیں گے۔''
''نہ مانیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب ہم کہہ دیں گے کہ ہمیں حکومت نہیں چاہئے تو لوگوں کی زبانیں خودبخود بند ہو جائیں گی۔ مگر ہم یہ سوچیں ہی کیوں؟ ابھی ہریرتے کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو وہ جئے گا۔ اور ایسے سپنے بس کیا کہا جائے، دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔'' راجوریہ نے کہا اور نندیرتا مسکرانے لگی۔
اس کی یہ مسکراہٹ راجوریہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن نندیرتا کے تاثرات پتہ چلانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہی اور پھر اسی فکرمندانہ انداز میں بولی۔
''میری تو ایک رائے ہے مہاراج۔''
''کیا؟'' راجوریہ نے پوچھا۔
''جیسا کہ تم نے کہا ہریرتے ہمارا اپنا ہے تو اگر میرا یہ سپنا تم اسے بتا دو تو اس میں کیا حرج ہے۔''
''اس سے فائدہ کیا ہوگا نندیرتا؟'' راجوریہ نے کہا۔
''کچھ نہیں..... ہریرتے کی جنم کنڈلی تو اس کے پاس محفوظ ہوگی۔''
''ہاں..... مجھے معلوم ہے، اس کی جنم کنڈلی بنائی گئی تھی۔ بڑے بڑے پنڈتوں نے اس کی جنم کنڈلی بنائی تھی اور اسے محفوظ کر دیا تھا۔ نجانے کیوں مہاراج چندر دیپ نے اسے دوسروں کے سامنے نہیں رکھا۔ شاید پنڈتوں ہی کی ہدایت تھی۔'' راجوریہ نے کہا۔
''اوہ..... آپ کو یہ بات معلوم ہے؟'' رانی نے پوچھا۔
''ہاں، کیوں نہیں۔''
''تو مہاراج آپ نے اس بارے میں کیا سوچا؟'' نندیرتا نے پوچھا۔
''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ہریرتے سے اس کا ذکر کرنا مناسب بھی ہوگا یا نہیں۔''
''میری رائے یہ ہے کہ تم بھیا جی سے یوں کہو کہ وہ اپنی جنم کنڈلی کھول کر دیکھیں۔'' رانی نندیرتا بولی۔
''اور اگر اس نے مجھ سے اس کی وجہ پوچھی تو؟'' راجوریہ نے سوال کیا۔

''تو پھر تم اسے بتا دینا کہ بھابی جی اس کے لئے پریشان ہے۔ وہ ایک سپنا دیکھ چکی ہے اور اس کے بعد سے اس کی حالت خراب ہے۔''
راجوریہ خیالات میں ڈوب گیا۔ راجہ ہریرتے اس کی عزت کرتا تھا لیکن اس بات سے کہیں وہ غلط تصور دل میں نہ ڈال لے۔ اور پھر اگر جنم کنڈلی میں یہ بات نکل آئی تو وہ بھی کتنی پریشانی کی بات ہوگی۔ وہ سوچتا رہا اور پھر اس نے خود ہی گردن جھٹک دی۔
''ہنہ..... یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟ سپنوں کی بات سپنوں ہی کی بات ہوتی ہے۔ اس میں حقیقت کا کیا دخل۔ لیکن اگر رانی نندیرتا کی یہ پریشانی اور سپنا راجہ ہریرتے کو سنا دیا جائے تو کم از کم وہ دل میں اس بات کا احساس ضرور کرے گا کہ اس کی بھابی نندیرتا اسے کتنا چاہتی ہے۔ اسی خیال کے تحت اس نے فیصلہ کر لیا کہ راجہ ہریرتے سے اس سلسلے میں ملاقات ضرور کرے گا۔
راجہ ہریرتے نے راجوریہ کی تشویش سنی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں بھائی جی مہاراج! اگر بھگوان نے میری موت اسی طرح لکھی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' راجہ ہریرتے نے کہا۔
''نہیں ہریرتے! میں جانتا ہوں کہ عورت کی بات قابل توجہ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر تم چاہو تو صرف ہمارے من کو شانتی دینے کے لئے جنم کنڈلی کھول کر دیکھو۔ اس میں کیا حرج ہے۔ یوں بھی تم نے اپنی جنم کنڈلی آج تک کھول کر نہیں دیکھی۔ دیکھیں تو سہی اس میں ایسی کون سی بات ہے جس کی وجہ سے مہاراج نے اسے پوشیدہ رکھا۔''
''اور بھائی جی مہاراج! اگر بھابی جی کی یہ بات سچ نکلی تو؟'' ہریرتے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس نہیں تھا کہ سچ مچ ایسی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ساری بیکار باتیں ہیں۔ سپنوں کی بھلا کیا حقیقت۔ چنانچہ اس نے ہنستے ہوئے یہ سوال کیا تھا۔
''تو پھر ہم اس کا کوئی اپائے کریں گے۔ پنڈتوں کو بلائیں گے۔ ان سے پوچھیں گے، مشورہ لیں گے کہ کیا، کیا جائے۔'' راجوریہ نے کہا اور ہریرتے ہنسنے لگا۔
''میں صرف آپ کی آگیا کے پالن کے لئے یہ سب کچھ کروں گا بھائی جی! اور یہ سچی بات ہے کہ میں نے آج تک اپنی جنم کنڈلی کھول کر نہیں دیکھی اور اس کی وجہ

یہ ہے کہ میں نے آج تک اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میرے ذہن میں بھی یہ خیال جاگ اٹھا ہے کہ اسے دیکھ لوں۔'' راجہ ہریرتے نے کہا۔

''تو پھر میرے سامنے ہی دیکھ لو۔'' راجوریہ نے کہا اور راجہ ہریرتے بڑے بھائی کی بات ماننے کے لئے تیار ہو گیا۔

جنم کنڈلی خزانے میں نہایت محفوظ جگہ رکھی گئی تھی لیکن لوگوں کو ہدایت دے کر اسے حاصل کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جنم کنڈلی سامنے آ گئی اور طویل عرصے کے بعد راجہ ہریرتے نے اپنی قسمت کے لکھے کو کھولا۔

جنم کنڈلی کے اوراق اس کے سامنے تھے۔ انہیں نہایت حفاظت سے محفوظ کیا گیا تھا۔ راجہ ہریرتے نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ وہ زور زور سے پڑھ رہا تھا۔ اس کے بارے میں بہت سی دعاؤں اور اشلوکوں کے بعد لکھا ہوا تھا۔ جسے ہریرتے روانی سے پڑھتا چلا گیا۔

''اور ہریرتے کی عمر کا ایک مخصوص حصہ اس سے جب اس کی حکومت کے گیارہ سال بیت جائیں گے اس کے لئے خراب ہو گا۔ اس کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہو گی اور یہ ان مٹ ہے۔''

ہریرتے کی آواز لرز گئی۔ اس نے متحیرانہ نگاہوں سے راجوریہ کو دیکھا اور پھر جنم کنڈلی کو آگے پڑھنے لگا۔ بہت سی باتیں تھیں لیکن سب سے اہم بات یہی تھی جو رانی نندیرتا نے سپنے میں دیکھی تھی اور اس جنم کنڈلی میں موجود تھی جس کی تخلیق آج سے بہت پہلے ہوئی تھی۔ لیکن ہریرتے اسے پڑھ کر حیران رہ گیا تھا اور راجوریہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔

کافی دیر تک دونوں خاموش رہے پھر ہریرتے نے کہا۔

''تعجب کی بات ہے بھائی جی مہاراج ۔۔۔۔ یہ الفاظ تو اس میں لکھے ہوئے ہیں۔'' اس کی آواز کی لرزش راجوریہ نے صاف محسوس کی تھی۔

اب جبکہ موت کی تصدیق ہو گئی تھی تو ہریرتے کے اندر ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑتا جا رہا تھا۔ راجوریہ کی کیفیت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔

''تو ۔۔۔۔ تو کیا، کیا جائے؟ یہ تو سچ مچ بڑی پریشانی کی بات ہے۔''

''یہ تو اچھا نہیں ہوا بھائی جی!'' ہریرتے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' راجوریہ نے پوچھا۔

''اس سے تو بہتر تھا ہم اس جنم کنڈلی کو کھول کر ہی نہ دیکھتے۔'' ہریرتے نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

''نہیں ہریرتے! اس کا دیکھنا اچھا ہی ہوا۔ مجھے اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ یہ بات میری زبانی تمہارے کانوں تک پہنچی۔ لیکن اس کا معلوم ہونا بہت ضروری تھا۔ بھگوان نے سنسار میں اپنے بہت سے روپ چھوڑے ہیں۔ کبھی کبھی انسان پر کرودھ بھی آتا ہے اور اس کا ستارہ برج میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن پنڈت اشلوک پڑھ کر اور پوجا کر کے بری گھڑی ٹال دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سارے پنڈتوں کو جمع کرو اور بھگوان کیرتن شروع کرا دو۔'' ہریرتے نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی جی مہاراج! میں کچھ کروں گا۔'' اس نے کہا اور اندھے بھائی کو اطمینان دلا کر رخصت کر دیا۔ لیکن خود اس کا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ موت کا خوف اس کی آنکھوں میں پھیل گیا تھا۔ رانی نندیرتا کا سپنا اور پھر جنم کنڈلی میں لکھے ہوئے الفاظ اس کے لئے شدید خوف کا باعث بن گئے تھے۔ وہ اپنے سائے سے بھی خوف محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے محل کے کونے کونے میں سانپ لہرا رہے تھے۔ کالے کالے زہریلے سانپ جن کی زبانیں اسے ڈسنے کے لئے باہر نکل رہی ہوں اور جن کی ننھی ننھی چمکدار آنکھیں للچائے ہوئے انداز میں اسے گھور رہی ہوں۔

وہ وحشت زدہ ہو کر اس جگہ سے نکل آیا۔ جنم کنڈلی کو پہلے کی طرح بند کر کے واپس خزانے میں رکھ دیا گیا تھا لیکن ہریرتے کا سکون رخصت ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ چلتے سے اس نے راجوریہ کو بھی یہی ہدایت کر دی تھی کہ اس بات کا تذکرہ دوسروں سے نہ کیا جائے ورنہ زبانیں نجانے کیا کیا کہیں گی۔ کیا کیا افواہیں تراش لی جائیں گی۔

دوسری طرف رانی نندیرتا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ست گرد کے راجہ بننے کے خواب لہرانے لگے تھے اور اس بات کی شدت سے منتظر تھی کہ دیکھو اب کس وقت راجہ ہریرتے کے مرنے کی خبر سننے میں آتی ہے۔

راجوریہ کے واپس آنے پر اس نے پوچھا تھا کہ کیا اس نے راجہ ہریرتے کو

سمجھانے کی کوشش کی؟ اس کے جواب میں راجوریہ نے ساری تفصیل اسے سمجھا دی تھی۔ رانی نندیتا نے یہ سن کر بڑے افسوس کا اظہار کیا تھا کہ جنم کنڈلی میں بھی وہی بات نکلی جو کچھ اس نے سپنے میں دیکھا تھا۔ تب اس نے راجوریہ سے پوچھا۔

''مہاراج! کیا آپ نے اس بارے میں راجہ ہریتے کو کوئی ہدایات دیں؟''

تب راجوریہ نے اسے بتایا کہ ہریتے نہیں چاہتا کہ خبر عام ہو جائے۔

''مگر مہاراج! بھیا جی نے اپنی حفاظت کے لئے بھی کچھ کیا؟''

''میں نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ بھیا جی نے ابھی اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اور یوں بھی رانی نندیتا! جو بات جوتشیوں نے برسوں پہلے بتائی ہے اب اس میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے؟ یوں بھی ہم لوگ اپنے طور پر بھگوان کی کیرتن کرائیں گے اور بھگوان سے دعائیں مانگیں گے کہ ہریتے اس کشٹ سے نکل جائے۔''

لیکن نندیتا نے نفرت بھری نگاہوں سے اس اندھے کو دیکھا تھا جس نے سارا جیون بھائی کے زیر سایہ گزار دیا تھا اور کبھی اپنا حق مانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راجوریہ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے بیٹوں کو راج گدی پر بٹھا دے۔ لیکن اس کے دل میں اس بات کی شدید خواہش تھی۔ تب اس نے سوچا کہ کیوں نہ ست گرو سے بھی اس بارے میں بات کرے تاکہ اس کے من کا حال بھی اس کے سامنے کھل کر آ جائے۔ سو اس نے اسی رات اپنے سب سے بڑے بیٹے ست گرو کو بلا بھیجا اور ست گرو اپنی ماتا کے چرنوں کو چھو کر ایک جانب بیٹھ گیا۔

''میں نے اس وقت تجھے ایک ایسے کام سے بلایا ہے ست گرو! یہ سن کر میں نہیں جانتی تیرے من میں کیا خیال ابھرے۔ لیکن میری بات غور سے سن۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہی کچھ تیرے نانا جی نے بھی کہا تھا۔

''ایسی کیا بات ہے ماتا جی؟''

''کیا تو نے کبھی یہ سوچا ہے ست گرو کہ تو چندر دیپ کا سب سے بڑا پوتا ہے؟''

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ماتا جی! وہ تو میں ہوں۔'' ست گرو نے سادگی سے کہا۔

''راجہ ہریتے کے بھی تو بیٹے ہیں جن میں سب سے بڑا چتر دیو ہے۔''

''ہاں ہے اور چتر دیو میرا بھائی ہے۔''

''پگلے! اس سنسار میں سب رشتے اپنے لئے ہوتے ہیں۔ منش سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے اس کے بعد دوسرے رشتے ناتوں کے بارے میں۔ راجہ ہریتے کو حکومت صرف اس لئے مل گئی کہ تیرا باپ اندھا تھا ورنہ بڑا ہونے کے ناطے حکومت تیرے پتا جی کو ملنی چاہئے تھی۔ پرنتو میں جانتی ہوں کہ راجہ ہریتے نے یہ بات کبھی نہیں سوچی ہو گی کہ حکومت، حکومت کے حق دار ست گرو کو ملے۔ کیونکہ تو مہاراج چندر دیپ کا سب سے بڑا پوتا ہے۔ مگر تیرے اندر ایک بہت بڑی خامی ہے ست گرو! وہ یہ کہ تو ایک ایسے باپ کا بیٹا ہے جو کسی طور حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔'' نندیتا نے کہا اور ست گرو سوچ میں ڈوب گیا۔

سچ بات تو یہ تھی کہ ست گرو نے اس بارے میں کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ آج رانی نندیتا کے احساس دلانے پر اسے احساس ہوا تھا کہ حکومت کا جائز حقدار تو وہ خود ہے۔ اور جب یہ احساس اس کے من میں جاگ اٹھا تو گرمی کی تیز لہریں اس کے تن بدن میں دوڑ گئیں۔

''آپ نے ٹھیک کہا ماتا جی! حکومت چتر دیو کی بجائے مجھے ملنی چاہئے۔''

''تو غور سے سن اور میں تجھ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ صرف میں نہیں تیرے نانا جی بھی یہی کہتے ہیں کہ راجہ ہریتے تجھے حکومت کبھی بھی نہیں دے گا۔ لیکن اگر راجہ ہریتے مر جائے تو حکومت اس کے بیٹے کو منتقل نہیں ہو گی۔ جب تک راجوریہ زندہ ہے، حکومت راجوریہ کو ہی ملے گی اور اس کے نام پر تو راج گدی سنبھالے گا کیونکہ اب تو موجود ہے اور یہ کام سنبھال سکتا ہے۔ کیا تو اس کے لئے تیار ہے؟'' رانی نندیتا نے غور سے ست گرو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تیار ہوں ماتا جی! یہ کام تو ہونا چاہئے۔ بھگوان کی سوگند اس سے پہلے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چاچا جی ہمیں اس طرح نظر انداز کریں گے۔ یہ تو انہیں خود کرنا چاہئے تھا۔''

''اس سنسار میں کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کرتا ست گرو۔ اپنا حق مانگو۔ نہ ملے تو چھین لو۔ اس سنسار کا وطیرہ ہی یہ ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ پیچھے رہتے ہیں جو آگے بڑھ کر اپنا حق نہ چھین لیں۔'' نندیتا نے کہا اور ست گرو گردن ہلانے لگا۔ تب ماں اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ کچھ کہتی رہی اور ست گرو کی آنکھیں خوشی سے چمکتی رہیں۔

آخر میں اس نے گردن ہلا کر کہا۔

''ٹھیک ہے ماتا جی! اب تم دیکھو گی کہ ست گرو اتنا کچا بھی نہیں ہے۔ میں خود کو حکومت کرنے کے قابل ثابت کر دوں گا۔'' ست گرو نے کہا اور ماں کے چرن چھو کر باہر نکل گیا۔

لیکن ہریرتے کا سکون ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا۔ موت کے بھیانک ہاتھ اسے اپنی گردن کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک ایک چیز سے چونکتا تھا۔ ہر لمحے یہی خطرہ رہتا تھا کہ بس ابھی کہیں سے کئی سانپ نکلے گا اور اسے ڈس لے گا۔ اس خوف کی وجہ سے وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ راج پاٹ کے کاموں پر بھی وہ صحیح طور پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا جس کا احساس مہامنتری کو ہو گیا اور انہوں نے اس سے یہ سوال کر ڈالا۔

ہریرتے تو خود بھی اس سے بات کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس کے ذہن میں ترکیب آ ہی گئی تھی۔

مہامنتری کو اس نے سارے حالات بتائے اور منتری بھی کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ ''آپ نے اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے مہاراج کہ جنم کنڈلی میں یہی لکھا ہے؟''

''ہاں ..... اس بات کو ٹالنا ہو گا منتری جی اور اس کے لئے میرے من میں ایک ترکیب آئی ہے۔''

''کیا مہاراج؟''

''میں چاہتا ہوں منتری جی کہ ایک ایسا مینار بنایا جائے جو زمین سے بہت اونچا ہو اور اس مینار پر ایک ایسی جگہ ہو جہاں میں رہ سکوں۔ راج پاٹ کے اب سارے کام میں وہیں پر بیٹھ کر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری خواہش ہے کہ یہ کام جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہو جائے۔ مجھے اب اپنے چاروں طرف سانپ ہی سانپ لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

''آپ چنتا نہ کریں مہاراج! جو کام آپ نے میرے سپرد کیا ہے اسے میں بہت جلد پورا کر لوں گا۔''

راجہ کا حکم تھا۔ دیر کس بات میں ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد راج محل سے کچھ فاصلے پر ایک ایسا مینار تعمیر ہو گیا جس کے اوپر ایک خوبصورت رہائش گاہ بنائی گئی۔

مینار اتنا سپاٹ اور چکنا تھا کہ اس کے اوپر ایک چیونٹی بھی چڑھنا چاہتی تو گر کر پھسل جاتی۔ راجہ ہریرتے نے اپنے لئے انتہائی معقول بندوبست کر لیا تھا اور پھر وہ مینار کی اوپری رہائش گاہ میں منتقل ہو گیا۔

رانی نندیتا کو بھی ساری اطلاعات مل رہی تھیں اور وہ کسی قدر تشویش کا شکار تھی۔ انگوری نے جو کچھ اس سے کہا تھا اسے پورا ہونا چاہئے اور اس بات کا اسے اب یوں بھی یقین ہو گیا تھا کہ راجہ ہریرتے کی کنڈلی میں وہی کچھ لکھا تھا جو کچھ انگوری نے اسے بتایا تھا۔ لیکن کیا راجہ ہریرتے اپنی جان کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا؟ کیا جیوتش ودیا جھوٹی پڑ جائے گی؟ اب ہر وقت اس کے ذہن میں یہی خیال رہتا تھا۔

دوسری جانب راجہ ہریرتے اپنے اس اقدام سے کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے جو اقدامات کئے تھے اس کے خیال میں وہ کافی تھے۔ مینار کے چاروں طرف سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ انہیں یہ ہدایات دے دی گئی تھیں کہ اگر کوئی کیڑا مکوڑا بھی اس طرف آنے کی کوشش کرے تو اسے کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔

راجہ کے لئے جو غذا لائی جاتی اسے بھی اچھی طرح دیکھ لیا جاتا تھا۔ اس طرح مینار محل کے حفاظتی اقدامات نہایت اطمینان بخش تھے۔ مینار محل میں جو کوئی بھی آتا اسے ہدایت تھی کہ وہ اپنا لباس اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر راجہ کے پاس آنے کی کوشش کرے۔

عام طور پر کھانے پینے کی چیزیں ایک مخصوص ذریعے سے اوپر پہنچ جاتی تھیں۔ ملنے والوں پر بھی خاص طور سے پابندی تھی۔ یعنی صرف ایسے لوگ راجہ سے ملنے آ سکتے تھے جن پر راجہ کو مکمل بھروسہ ہوتا تھا۔ یہ بات بھی راجہ ہریرتے ذہن میں تھی کہ کہیں کوئی سازش نہ کی جائے۔ حالانکہ سازش کرنے والوں کا کوئی تصور راجہ کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس نے اپنی حکومت کو بے حد مستحکم کر لیا تھا اور اپنے مخالفوں کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ یوں بظاہر اب اسے کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ راجہ ہریرتے کا خیال تھا کہ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ حکومت بس یہاں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ ملنے جلنے کی کوئی آسانی نہ رانیوں اور اولادوں کے درمیان وقت گزارنے کی فرصت۔ اس کے پانچوں بیٹے اس سے باری

باری ملاقات کرنے کے لئے آتے تھے۔ رانیاں بھی یہاں آ جاتی تھیں لیکن کسی کو یہاں قیام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ گنگا کے کنارے پجاریوں کی ایک فوج بٹھا دی گئی تھی جو دن رات مالائیں جپ جپ کر راجا کی تقدیر کا سیاہ داغ دھونے کی کوششوں میں مصروف تھی۔

راجہ ہریرتے کا خیال تھا کہ جب یہ جیوتش بتا دیں گے کہ راجہ ہریرتے کا ستارہ برج کی نحوست سے نکل آیا ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا اور حسب سابق اپنا کام جاری کر دے گا۔ لیکن بعض اوقات وہ سب کچھ حقیقت بن جاتا ہے جسے عام حالات میں ایک وہم کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا۔

راجہ کی خوراک کے لئے جو کچھ لایا جاتا تھا اسے اچھی طرح دیکھ بھال لیا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت راجہ ہریرتے نے خوبصورت سیبوں میں سے ایک خوشنما سیب اٹھایا تو اسے اس میں ایک سوراخ نظر آیا۔

ننھا سا سوراخ جس کے گرد کا حصہ خشک تھا۔ اس سیب کو دیکھ کر راجہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ لوگوں نے اس سے پہلے بھیجے جانے والے پھل پر کوئی توجہ نہیں دی ورنہ اگر توجہ دی جاتی تو یہ کانا سیب راجہ ہریرتے کی خدمت میں کس طرح آتا۔

کس کی یہ مجال ہوئی؟ اس نے غصے سے فیصلہ کیا کہ کانا سیب لانے والوں کو سزا دے گا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ تقدیر خود اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی ہے۔

کانا سیب اٹھا کر اس نے ایک جانب رکھ دیا اور پھر ایک دوسرا سیب اٹھا کر اسے دانتوں سے کترنے لگا۔ لیکن اتفاقیہ طور پر اس کی نگاہ کانے سیب کی جانب اٹھ گئی۔ سیب کے سوراخ میں سے کوئی پتلی سی چیز آہستہ آہستہ باہر نکل رہی تھی۔

راجہ اس ہلتی ہوئی چیز کو دیکھ کر یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ کیا ہے اور پرتجسس انداز میں اس کے نزدیک آ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئی تھیں ۔۔۔۔ کانے سیب میں سے ایک خوبصورت پتلا سا سانپ نکل رہا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے سوراخ سے باہر نکل آیا اور باہر نکلنے کے بعد دفعتہ اس کا جسم بڑھنے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سیاہ زہریلا سانپ بن گیا جس کے نچلے حصے پر سفیدی نظر آ رہی تھی۔

راجہ کی تو قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگے۔ باہر

جا کر اپنے آدمیوں کو آواز دے۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے راجہ کے تن بدن میں جان ہی نہ ہو ۔۔۔۔ سانپ کی پراسرار نگاہیں راجہ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی زبان آہستہ آہستہ باہر نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ پھیل گیا تھا اور خوفناک انداز میں راجہ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ راجہ چند ساعت اسی طرح کھڑا رہا اور دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی۔ اس نے پلٹ کر بھاگنا چاہا لیکن سانپ اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے اچھل کر راجہ کی گردن پر دانت گاڑ دیئے۔ راجہ نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن چکنا سانپ پھسل کر اس کی گرفت سے نکل گیا اور راجہ کی گردن سے خون بہنے لگا۔

راجہ خوف اور دہشت سے چیخنا چاہتا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز ہی گھٹ کر رہ گئی ہو۔ چند ساعت بعد اس کے ہاتھ تشنجی انداز میں پھیلتے رہے پھر آہستہ آہستہ اس کے جسم پر نیلاہٹ دوڑ گئی۔ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا تھا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

سانپ اپنا کام کر کے واپس اسی جگہ آیا اور پھر اس کا جسم اسی انداز میں گھٹنے لگا اور پھر وہ سیب کے اندر داخل ہو گیا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راجہ کی موت اس طرح واقع ہو جائے گی۔ چنانچہ حالات حسب معمول رہے۔

دوسری صبح جب راجہ جھروکوں میں نہ آیا تو نیچے کھڑے ہوئے پہرے داروں کو تشویش ہوئی۔ پھر جب دیوان اس سے ملنے آیا تو اس نے راجہ کے بارے میں پہرے داروں سے پوچھا۔

پہرے داروں نے جواب دیا کہ آج صبح سے راجہ جھروکوں میں نہیں آیا۔ دیوان کو حیرت ہوئی اور پھر اس نے معلومات کرنے کی غرض سے وہ تیاریاں مکمل کر لیں جس کے ذریعے اوپر جایا جا سکتا تھا۔

اور پھر تھوڑی دیر میں پوری راج نگری میں کہرام مچ گیا۔ وہی ہوا تھا جو کنڈلی میں لکھا تھا۔ راجہ ہریرتے کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ مر گیا تھا۔

ہریتے کی موت کسی بھی شبے کا باعث نہیں تھی۔ یہ سب کچھ تو اس کے بھاگ میں لکھا ہوا تھا۔ دوش کس کو دیا جاتا۔ لیکن اس کے بعد ہریتے کے پانچوں بیٹوں نے حکومت کا دعویٰ کر دیا۔ ان دعویٰ کرنے والوں کے نام چتر دیو، جتندر، کرشن، رام پرکاش تھے۔ یہ لوگ امراء کے ساتھ مل کر حکومت کے دعویدار بن گئے۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اصول کے مطابق راجہ ہریتے کی اولاد کو حکومت منتقل ہونی چاہئے۔ لیکن دوسری طرف راجوریہ کو نندیتا نے اکسانا شروع کر دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم اپنے بھائی سے بہت پریم کرتے ہو مگر وہ اب اس سنسار میں نہیں ہے۔ حکومت کے کاموں کو سنبھالنا اب تمہاری ذمہ داری ہے اور راجہ چندر دیپ کے خاندان کے سبھی لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت اب تمہاری ہے۔ تم چونکہ حکومت کا کام نہیں سنبھال سکتے اس لئے چندر دیپ کے سب سے بڑے پوتے کی حیثیت سے ست گرو تمہارے نام کی حکومت کرے گا۔

ابتدا میں تو راجوریہ نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا لیکن نندیتا کی مسلسل کوششوں سے وہ اس بات پر رضامند ہو گیا کہ حکومت اسے ملنی چاہئے۔ تب اس نے امراء کے ساتھ مل کر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

راجوریہ نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ اندھا ضرور ہے لیکن اس کا بڑا بیٹا امور سلطنت سنبھالے گا۔ لوگ اس کی اس حیثیت کو ماننے پر تیار ہو گئے اور یوں راجوریہ راجہ بن گیا۔ لیکن اصل راجہ دراصل ست گرو ہی تھا۔

ست گرو بے حد چالاک اور کسی قدر سنگ دل نوجوان تھا۔ وہ کسی حد تک انتہائی مکاری سے کام کرنے کا عادی تھا۔ اس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تھی کہ ہریتوں نے سلطنت کے دعویدار ہونے کا اعلان کیا ہے اور وہ آئندہ اس کی سلطنت میں کوئی رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کی تباہی کے منصوبے سوچنے لگا۔

دوسری طرف راجوریہ کو بھی چتر دیو، جتندر اور رام پرکاش کی کارروائیوں کا علم ہو

گیا تھا۔ ان پانچوں نے وہ رشتے نہیں نبھائے تھے جو ان کے اور ہریتے کے درمیان تھے۔ پانچوں ہی باغیوں کی شکل میں نظر آنے لگے تھے اور اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر منصوبے بناتے تھے جن کا علم اکثر راجوریہ کو ہو جاتا تھا۔

اس کے سامنے ست گرو بھی تھا جس کے بارے میں راجوریہ ایک باپ ہونے کی حیثیت سے بہتر طور پر جانتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ست گرو ہریتوں کی تباہی پر اتر آیا تو پھر ہریتوں کو جان بچانا بہت مشکل ہو جائے گا اور راجوریہ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ کے شعلے بھڑکیں۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ ہریتوں کو شہر سے باہر آباد کر دیا جائے اور اس فیصلے پر عمل درآمد ہونے لگا۔

لیکن جب ست گرو کو اس بارے میں معلوم ہوا تو اس نے معماروں کے سربراہ کو اپنے پاس طلب کیا۔

سنیل گپتا کو یہ حکم ملا تھا کہ وہ ہریتوں کے لئے شہر سے باہر گھر تعمیر کریں اور سنیل گپتا ہی ست گرو کے پاس پہنچا تھا۔ ست گرو نے اس دبلے پتلے معمار کا استقبال کیا اور سنیل گپتا کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''سنیل گپتا! میں نے تمہیں ایک خاص کام کے لئے بلایا ہے۔ کیا یہ بات تمہارے کان تک پہنچ چکی ہے کہ میرا پتا اندھا ہے اور اندھا ہونے کی وجہ سے مہاراج چندر دیپ نے انہیں حکومت سے محروم کر دیا۔ لیکن جب اس کے پاس ست گرو کی آنکھیں پہنچ گئیں تو ہریتے کی حکومت بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔

راجوریہ اگر حکومت کے قابل ہوتا تو پہلے ہی اسے یہ حکومت کیوں نہ مل جاتی جبکہ وہ حکومت کا حقدار بھی تھا۔ اس بات سے میرا مطلب یہ ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے کہ اصل حکومت راجوریہ کی نہیں بلکہ میری ہے۔

''اوش مہاراج، اوش۔ یہ بات میں ہی کیا سب اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ راجاؤں کے تم ہوا میں رستے کے لئے ہوتے ہیں اور ان کے راز امانت ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی انسان یہ امانت کھو بیٹھے تو پھر اسے موت کے سوا کہیں اور پناہ نہیں ملتی۔''

سنیل گپتا نے گہری نگاہوں سے ست گرو کو دیکھا۔ زیرک آدمی تھا، سمجھ گیا کہ ست گرو کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔ اس نے مسکرا کر گردن ہلائی اور بولا۔

''سنیل گپتا خود بھی یہی چاہتا ہے مہاراج کہ آنے والا وقت مہاراج راجوریہ

کے بعد راجہ ست گرو کو جب مطلق العنان دیکھے تو اس کے چند دوستو کا تعاون بھی مانے اور سنیل گپتا انہی جانثاروں اور وفاداروں میں سے ہو۔'' سنیل گپتا نے کہا اور ست گرو کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اوہ ... تم یقیناً اس قابل ہو سنیل گپتا کہ ہمارے خاص آدمی کہلاؤ۔''

''شکریہ مہاراج!'' سنیل گپتا عیارانہ انداز میں بولا۔ ''اب آپ بتائیں کہ وہ خاص کام کیا ہے جس کی وجہ سے مہاراج نے سنیل گپتا کو یاد کیا۔''

''ہاں، میں جو بات تم سے کرنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں غور سے سن لو اور یہاں سے یہ فیصلہ کر کے اٹھو کہ تم اسے انجام دے سکتے ہو یا نہیں۔''

''مہاراج! فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے۔ جب آپ سنیل گپتا پہ بھروسہ کر بیٹھے ہیں تو پھر اس کے فیصلے کی بات نہ کریں۔ سنیل گپتا کا فیصلہ وہی ہوگا جو مہاراج کے ہونٹوں سے نکلے گا۔''

''بدھائی ہو سنیل گپتا، بدھائی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہریتوں کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جائے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ چتر دیو اور اس کے بھائی راجہ ہریتے کی حکومت پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ حالانکہ راجہ ہریتے کا بھائی ابھی زندہ ہے اور حکومت کے لئے اس سے بہتر ابھی اور کوئی نہیں۔ اگر وہ نہ بھی ہوتا تو مہاراج چندر دیپ کا سب سے بڑا پوتا میں ہوں اور حکومت بھی مجھے ملنی چاہئے تھی۔ یہ حکومت ہریتے کی اپنی نہیں ہے جو اس کے بیٹوں تک آسانی سے منتقل ہو جاتی۔ بلکہ یہ حکومت ہریتے کے باپ کی ہے اور ہریتے کو اسی سے ملی ہے۔ حکومت کا اصل حقدار آنکھوں سے اندھا تھا اور اصل حق دار وہی ہوتا ہے جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔ تب یہ چتر دیو کیوں سلطنت کا دعویدار بنتا ہے؟''

''بالکل غلط ہے مہاراج ...'' سنیل گپتا نے جواب دیا۔

''کیا ہم ایسے لوگوں کو باغی قرار نہیں دے سکتے؟'' ست گرو نے پوچھا۔

''وہ باغی ہیں مہاراج۔'' سنیل گپتا اپنے لہجے کے اندر زور پیدا کرتا ہوا بولا۔

''اور باغیوں کی سزا؟'' ست گرو نے پوچھا۔

''موت سرکار ..... موت۔'' سنیل گپتا سفاکی سے بولا اور ست گرو نے رخ پھیر لیا۔

''لیکن گپتا! ہم یہ چاہتے ہیں کہ موت اس طرح واقع ہو کہ ہمارے پتا جی کو نہ

پتہ چل سکے مجھے۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا مہاراج! لیکن کیا اس سلسلے میں آپ کی کوئی خاص ہدایت ہے؟'' گپتا نے پوچھا۔

''ہاں ....''

''حکم کریں مہاراج! بندہ وہی کرے گا جو مہاراج چاہیں گے۔''

''تم واقعی کام کے آدمی ہو سنیل گپتا! خیر سنو۔ مکان تعمیر کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم اس میں جو مسالہ استعمال کرو گے وہ رال اور راکھ ہونا چاہئے۔ دونوں چیزیں چنگاری دکھانے ہی سے بھڑک اٹھتی ہے۔ اور پھر یوں ہوگا کہ ایک رات ہریتوں کا یہ گھر جلتی ہوئی مشعل میں تبدیل ہو جائے گا اور ہریتے کی اولاد کو حکومت ملنے کا حصہ اور باغیوں کی ساری احمقانہ باتیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ یہ ہے میرا خیال سنیل! چنانچہ تمہیں میرے اس خیال کی تکمیل کے لئے سخت محنت کرنا ہوگی اور خبردار اس سلسلے کی تکمیل کے لئے کسی کو علم نہ ہونے پائے۔ یہاں تک کہ راجوریہ کو بھی نہیں۔ ہاں، ذرا یہ بتاؤ کہ اس سلسلے میں تمہارے ساتھ کام کرنے والے معمار اور کاریگر تمہارے ساتھ تعاون کرنے پہ تیار ہوں گے؟'' ست گرو نے پوچھا۔

''آپ اس کی چنتا نہ کریں مہاراج!'' سنیل گپتا نے کہا۔ ''یہ سارا کام میرا ہے۔ اور ہاں، جب میں اپنے فرض سے فارغ ہو جاؤں تو پھر مہاراج سے امید رکھتا ہوں کہ سنیل گپتا کو بھی ذہن سے نہیں نکالیں گے۔'' سنیل گپتا نے کہا اور ست گرو مسکرانے لگا۔

''پھر ہمارا کام رہ جاتا ہے سنیل گپتا! اور یہ سوچنا پھر ہمارا ہی کام ہوگا کہ ہم تمہارے لئے کیا کرتے ہیں۔''

''تو پھر آگیا دیں مہاراج!'' سنیل گپتا نے ایک عزم سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

ہریتوں کو شہر نکالا مل گیا تھا لیکن وہ خاموش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حکومت راجوریہ کی ہے اور ست گرو ان کا خاص دشمن ہے۔ وہ ہر طرح سے ان کے خلاف کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی بھی سلسلے میں انکار نہیں کیا اور خاموشی سے اس مکان میں چلے گئے جو ان کے لئے رال اور راکھ سے تعمیر کروایا گیا تھا۔ لیکن کچھ تجربے کاروں نے مکان سے اٹھنے والی خوشبو اور اس کی تعمیر کے لئے استعمال ہونے

والے مسالوں کو غور سے دیکھا تو انہیں علم ہو گیا کہ مکان کی تعمیر میں رال اور راکھ استعمال کی گئی ہے جو کسی بھی وقت ہلکی سی چنگاری سے بھڑک سکتی ہے اور یوں ہریرتے کی تمام اولاد رال اور راکھ کے بنے ہوئے اس مکان میں راکھ بن سکتی ہے۔

چنانچہ تمام لوگ چوکنے ہو گئے۔ انہیں اس سازش سے شدید خوف محسوس ہو رہا تھا اور وہ دن رات نہایت دہشت میں گزارنے لگے۔ حالانکہ وہ لوگ بڑے جرأت مند تھے لیکن راجوریہ کی حکومت نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ایک رات چتر دیو نے اپنے چاروں بھائیوں کو جمع کیا اور اپنی ماں رانی چندر لکھی کو بھی بلا لیا۔

"میں ایک بار پھر تمہیں راجہ راجوریہ اور ست گرو کے اس خیال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ ہمارے رشتے دار ہیں جو ہمارے باپ کے سگے بھائی ہیں۔ ہم ہریرتوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں حالانکہ ہمارے باپ راجہ ہریرتے نے ان سے ساتھ کبھی برائی نہیں کی۔ اس کے باوجود وہ لوگ ہمیں صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اور ان کی پہلی خواہش یہی ہے کہ حکومت کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے اور ہم لوگوں کو جو سلطنت کے دعویدار ہیں کچل دیا جائے تاکہ سلطنت خطرے سے محفوظ ہو جائے اور اس سلسلے میں ہم ان کی آنکھوں کا سب سے بڑا کانٹا ہیں۔ چنانچہ ہم لوگوں کو چاہیے کہ اس سلسلے میں خاموشی اختیار کریں اور آنے والے وقت کا انتظار کریں تاکہ ایک مضبوط حیثیت سے ہم اپنے اس دعوے کو داخل کریں جو ہمیں اس حکومت پر ہے۔"

رانی چندر لکھی جو ہریرتے کی بیوی اور پانچوں بیٹوں کی ماں تھی سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے دکھ ہوا تھا کہ اس کے سورگباشی پتی نے کبھی راجوریہ کے خلاف کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جو اس کے یا اس کی اولاد کے خلاف ہوتا لیکن ست گرو نے باپ کی شہ پا کر وہ سب کچھ کر ڈالا جو اپنوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ تب اس نے کہا۔

"میرے بیٹو! پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

چتر دیو آگے بڑھا اور بولا۔

"ماتا جی! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس گھر کی تعمیر میں کیا استعمال کیا گیا ہے؟"

"کیا مطلب چتر دیو؟" رانی چندر لکھی حیران ہو گئی تھی۔

"ماتا جی! یہ گھر رال اور راکھ کا بنایا گیا ہے۔ سو اب ہم لوگوں کو چاہیے کہ ہم خود اس گھر کو آگ لگا دیں اور خاموشی سے یہاں سے کہیں دور نکل جائیں۔ مجھے جو

باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک عورت ہمارے گھر کو آگ لگانے کے لئے مخصوص کی گئی ہے وہ اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ یہاں آئے گی اور اس گھر کو راکھ کا ڈھیر بنا کر یہاں سے چلی جائے گی۔ مگر ہم اس کی شہرت سے فائدہ اٹھائیں گے اور اسے اور اس کے بیٹوں کو جلا کر راکھ کر دیں گے تاکہ جب جلے ہوئے گھر سے ان کی لاشیں ملیں تو لوگ یہی سمجھیں کہ ہریرتے کی نسل کا خاتمہ ہو گیا ہے۔"

رانی چندر لکھی نے یہ بات پسند کی اور یہی ہوا۔ ہریرتوں نے اس عورت اور اس کے پانچوں بیٹوں کو اس مکان میں زندہ جلا دیا اور پورا مکان آن کی آن میں شعلوں میں گھر گیا اور وہ عورت جس کا نام شانتی تھا اپنے بچوں کے ساتھ آگ میں جل کر خاکستر ہو گئی۔ ست گرو کے جاسوسوں نے اس عورت اور اس کے پانچ بیٹوں کے جلنے سے یہ سمجھا کہ ہریرتے کا پورا گھرانہ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ ست گرو جو بعد میں سوامی کہلایا یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اب روئے زمین پر اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو دشمن سے محفوظ سمجھنے لگا۔

دوسری طرف ہریرتے کے پانچوں بیٹے اپنی وضع قطع بدل کر اور نام تبدیل کر کے جنگل سے شہر میں آ گئے اور سنگرانی میں آ کر آباد ہو گئے۔

سنگرانی پہنچ کر ہریرتوں نے یہاں کے راجہ کی لڑکی موہنی سے شادی کر لی۔ یعنی پانچوں بھائی موہنی کے شوہر تھے۔ ان کے نزدیک یہ مشترک شادی باہمی اتحاد و محبت کا سبب تھی۔ موہنی کے لئے یہ طے کیا گیا کہ وہ ان بھائیوں کے ساتھ بہتر بہتر روز باری باری سے رہا کرے گی۔ چنانچہ ہریرتے ایک نئی حیثیت سے سنگرانی میں مشہور ہونے لگے۔ ان کی شہرت اور اقبال مندی کے قصے دور دور تک پھیل گئے۔ ہریرتوں کی پیشانی سے اقبال مندی کے آثار نمایاں تھے۔ اس لئے ان کی عظمت اور شان دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی شان کے قصے سنگرانی سے نکل کر دور دور تک پھیل گئے اور جلد ہی یہ اطلاع سوامیوں تک پہنچ گئی۔

ست گرو کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اب وہ دشمنوں سے محفوظ تھا اور راج پاٹ کے کاموں کو نہایت دلچسپی سے انجام دے رہا تھا۔ رانی سندریتا بھی بہت خوش تھی۔ اس کا باپ راجہ ہری کور جو سندر نگر کا راجہ تھا ست گرو کو حکومت مل جانے کی خوشی میں بے شمار تحائف لے کر راج نگری پہنچا تھا۔ اس نے راج نگری کی توسیع کے لئے بے شمار منصوبے پیش کئے اور اپنی مدد کی پیشکش کر دی تھی۔ رانی سندریتا ہر طرح

سے اپنے باپ کے ساتھ تھی اور وہ سب کچھ کرنے کے لئے ست گرو کو مجبور کرتی تھی جو اس کا باپ کہتا تھا۔ راجو ریہ کی حیثیت صرف ایک مہرے کی تھی جو ماں بیٹے کے کہنے پر ایک خانے سے دوسرے خانے میں چل رہا تھا۔

رانی سندریتا اس خاص محل میں جہاں کبھی وہ ایک مہمان کی حیثیت سے آتی تھی اور چند گھنٹے قیام کر کے چلی جاتی تھی اب رانی کی حیثیت سے رہنے لگی تھی۔

ایک روز جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، رانی سندریتا محل کے اس حصے میں بیٹھی تھی جو اس کا پسندیدہ تھا۔ جہاں چاروں طرف ہری بھری گھاس اور پھولوں کے کنج تھے۔ ایک چھوٹی سی بارہ دری میں بیٹھی وہ کسی سوچ میں گم سم تھی کہ ایک باندی نے کسی خوبصورت لڑکی کے آنے کی اطلاع دی۔ باندی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''رانی جی! وہ لڑکی بڑی ہی سندر ہے اور بڑی ہی بے باک۔''

''کون لڑکی؟'' رانی سندریتا نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

''ایک حسین دوشیزہ ہے۔ نام انگوری بتاتی ہے۔ ہم نے اس سے کہا کہ وہ رانی سندریتا سے کیوں ملنا چاہتی ہے تو کہنے لگی یہ بات وہ انہی کو بتائے گی۔ ہم نے اسے آنے سے روکا تو اس نے بڑے غرور سے کہا کہ جا اور جا کر رانی سے کہہ دے کہ انگوری اس سے ملنے آئی ہے۔''

''کون......؟'' رانی نے مورچھل جھلنے والی کنیزوں کو دونوں ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔

''انگوری نام بتایا ہے اس نے رانی جی!'' باندی نے جواب دیا۔

''اکیلی ہے وہ؟'' رانی نے پوچھا۔

''ہاں...... بالکل اکیلی۔''

''ہاں ٹھیک ہے...... تم اسے میرے پاس بلاؤ۔ اور تم سب یہاں سے چلی جاؤ۔ یہاں کسی کو نہیں آنا چاہئے۔ میں انگوری سے کچھ خاص باتیں کروں گی۔'' رانی سندریتا نے کہا اور ساری باندیاں اس کے پاس سے ہٹ گئیں۔

ہرے بھرے باغ کی خوبصورت سی فضا میں کچھ اور خوبصورتی اس وقت بڑھ گئی جب انگوری ناز و انداز سے اٹھلاتی، بل کھاتی رانی سندریتا کے پاس پہنچی۔ اتنی ہی حسین، اتنی ہی کومل کہ منش دیکھے تو دل پکڑ کر رہ جائے۔ ایک ایک قدم پر سو سو فتنے

جگاتی وہ رانی سندریتا کے پاس پہنچ گئی اور رانی سندریتا اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر کسی قدر پریشان سی ہو گئی۔ نجانے کیوں اس بالی سی عمر والی لڑکی کے سامنے وہ خود کو ایک بے وقوف اور احمق سی عورت سمجھنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ جبکہ انگوری کی آنکھوں میں ایک گمبھیرتا اور ایک ایسا برتری کا احساس ہوتا جیسے وہ راج نگری ہی کی نہیں بلکہ پوری دنیا کی رانی ہو اور سندریتا اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

تاہم سندریتا کو احساس تھا کہ اس نے انگوری کو وچن دیا ہے اور اس وچن کا پالن ضروری ہے۔ اگر انگوری اسے ترکیب نہ بتاتی اور ان سارے رازوں سے آگاہ نہ کرتی جس کی وجہ سے آج ست گرو راج نگری کا راجہ ہے تو شاید سندریتا اس کام میں اتنی آسانی سے کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک جھوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اس نے انگوری کا سواگت کیا۔

''آؤ انگوری۔''

''میری صورت یاد ہے رانی سندریتا؟'' انگوری کے انداز میں کسی قدر طنز تھا۔

''کیوں نہیں...... تم بھی کیا بھولنے کی چیز ہو؟'' رانی سندریتا نے بڑے پریم سے کہا اور انگوری کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر بارہ دری میں بلا لیا۔ پھر اس نے اسے اپنے نزدیک بیٹھنے کی جگہ دی اور بولی۔

''تمہاری سندرتا کو دیکھ کر بھگوان جانے ہے میں بھی اتنی متاثر ہو جاتی ہوں کہ سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ میں تو بس یہ سوچتی ہوں کہ میں تو ایک عورت ہوں۔ مرد تمہیں دیکھ کر اپنے دل کی کیا کیفیت محسوس کرتے ہوں گے؟'' رانی سندریتا نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

''مرد مجھے دیکھتے ہی نہیں رانی سندریتا!'' انگوری نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''بس...... وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی انگوری! آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''بس، میں مردوں کو نظر نہیں آ سکتی۔ اس کے آگے کچھ مت پوچھنا۔'' انگوری نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں دیکھ لیں گے تو لوبھی ہو جائیں گے سسرے۔'' رانی سندریتا ہنستے ہوئے بولی اور انگوری بھی مسکرانے لگی۔

''میں تمہیں بدھائی دینے آئی ہوں رانی نندریتا! ست گرو مہاراج ابھی راجکمار ہی سہی لیکن حکومت اب انہی کی ہے۔''

''تمہیں بھی بدھائی ہو انگوری! اگر تم ہماری سہائتا نہ کرتیں تو ہم کچھ نہ کر سکتے۔''

''لیکن رانی نندریتا! اس سہائتا کے پیچھے میرا بھی ایک مقصد چھپا ہوا تھا۔''

''ہاں...... ہاں...... ہمیں یاد ہے۔''

''تو تم اپنے وچن کا پالن کرو گی؟''

''ضرور انگوری۔'' رانی نندریتا نے جواب دیا۔ ''تم نے کہا تھا کہ میرا کام کرنے کے بعد مجھے تمہارا ایک کام بھی کرنا ہوگا۔'' رانی نندریتا نے انگوری سے پوچھا۔

''کیا تم اس کے لئے تیار ہو رانی نندریتا؟''

''کیوں نہیں...... رانیاں جب وچن دیتی ہیں تو وہ اس لئے نہیں ہوتے کہ توڑ دیئے جائیں۔'' رانی نندریتا نے جواب دیا اور انگوری کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے گردن اٹھائی اور نندریتا کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''تو ہمیں آگیا ہے رانی کہ اپنا وچن پورا کروائیں؟''

''مجھے بتاؤ انگوری...... تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ تمہارا کون سا کام میں کر سکتی ہوں؟ اور یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ اس سمے میری حیثیت بدلی ہوئی ہے۔ جو چاہو گی حاصل کر سکو گی۔ بتاؤ، اپنے وچن کے تحت میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟''

''رانی نندریتا! اپنے وچن کے تحت میری شادی تم ست گرو مہاراج سے کر دو۔'' انگوری نے کہا اور نندریتا چونک پڑی۔

اس نے حیرت سے انگوری کو دیکھا اور اس کے اس سوال پر دیر تک پریشان سی رہی پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہی ہے تمہارا کام انگوری؟''

''ہاں......'' انگوری کی آواز پتھر کی طرح سخت تھی۔

''پرنتو یہ تو ایسا کام ہے نہیں جو میرے بس میں ہو۔ ست گرو راجہ ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے وہ اپنے باپ کے نام سے حکومت کر رہا ہے لیکن اسے حکومت پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں سے اپنی مرضی سے تو سارے کام کر سکتی ہوں لیکن ایسا کوئی کام جو کسی دوسرے کا ہو، میرے لئے مشکل ہوگا انگوری!''

''رانی نندریتا! ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ وچن اس لئے نہیں ہوتے کہ توڑ دیئے جائیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ رانیاں وچن اس لئے نہیں دیتیں کہ پورا نہ کر سکیں۔ تو اب تمہیں کیا کشٹ پڑ گیا؟''

''میں نے اپنا وچن پورا کرنے سے انکار نہیں کیا انگوری۔ میں اپنے وچن کا پالن کروں گی۔ لیکن بات صرف اتنی سی ہے کہ ست گرو کیسے تیار ہوگا؟''

''رانی جی! کام تو وہ بھی آسان نہیں تھا اور تم نے دیکھا نہیں کہ راجہ ہریرتے موت سے بچنے کے لئے اپنا محل اور آسائشیں چھوڑ کر زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہو گیا تھا۔ پر موت نے اسے نہیں چھوڑا۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں رانی نندریتا! اگر وہ اس محل میں نہ جاتا تو ہلاک نہ ہوتا۔ اس کے ہلاک ہونے کے لئے یہی پیش گوئی کی گئی تھی کہ اگر وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہو جائے تو اس کی موت با آسانی ہو سکتی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے نہایت چالاکی سے کیا اور رانی نندریتا جس طرح اس میں شریک تھی، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس طرح میں نے رانی نندریتا کی مدد کی اور راجہ ہریرتے کو ہلاک کر کے ہریرتوں کی حکومت چھین لی اور بسوامیوں کو دلوا دی تو کیا رانی نندریتا یہ معمولی کام نہیں کر سکتی کہ وہ ست گرو کو ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے پر تیار کرے جو بقول رانی نندریتا کے خوبصورت بھی ہے۔'' انگوری نے کہا اور رانی نندریتا تو اس بات پر حیران رہ گئی تھی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انگوری اس سے اتنا بڑا مطالبہ کر سکتی ہے۔''

انگوری ست گرو کی پتنی بننے کے بعد ظاہر ہے رانی بن جائے گی۔ راجہ ست گرو ہوگا۔ اب انگوری جیسی رانی ست گرو کو مل جائے گی تو باقی لوگوں کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟ وہی حکومت کریں گے۔ اور پھر انگوری کی عمر بھی رانی نندریتا کے لئے بے حد پراسرار تھی۔ بلاشبہ وہ ایک نوعمر اور حسین لڑکی تھی لیکن جس طرح اس نے محل میں رقص کیا تھا اور جس طرح وہ رانی نندریتا کو ساتھ لگائے لوٹے ہوئے محل میں سے نکال کر لے گئی بلاشبہ یہ بڑی عجیب باتیں تھیں اور پھر اس نے کچھ ایسی باتوں کا بھی انکشاف کیا تھا جو صدیوں پرانی تھیں۔ چنگھو کی لاش اور اس کے ہاتھ سے ملنے والا نولکھے ہار کا موتی آج تک رانی نندریتا کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا اور یہ بات رانی نندریتا کو ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ ساری باتیں انگوری کو کیسے معلوم ہو گئیں۔

اس نے چنگھو اور جیون کمار کی جو کہانی سنائی تھی وہ بھی رانی نندریتا کے لئے بڑی

عجیب تھی۔ لیکن چونکہ انگوری اس کا کام کر رہی تھی اور رانی نندیتا بھی یہی چاہتی تھی کہ راجہ ہریتے سے حکومت بسوامیوں کو منتقل ہو جائے اس لئے اس نے انگوری کی کسی بات کی بھی تردید نہیں کی تھی اور اس سے تو حالات بھی ایسے نہیں تھے۔ لیکن اب انگوری کے بارے جاننا ضروری تھا۔ آخر یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اور کیا کرتی ہے؟ اور پھر ست گرو سے شادی کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ کسی ایسی ویسی لڑکی کو تو ست گرو کی رانی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ لڑکی راج نگری کی تقدیر کی مالک ہوتی۔

رانی نندیتا کی طویل خاموشی کو انگوری نے بری طرح محسوس کیا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ مفقود ہو گئی اور آنکھوں کی تیز چمک بھی دھندلا گئی۔ البتہ اب اس کی جگہ ایک پراسرار چمک نے لے لی تھی۔ اس کی آنکھوں کی عین پتلیوں کے درمیان چمکتے ہوئے ستارے کسی قدر سرخ ہو گئے تھے اور ان سرخ ستاروں سے رانی نندیتا کو دیکھ رہی تھی۔ تب اس کی آواز ابھری۔

''تم بہت گہری سوچ میں ہو رانی نندیتا۔''

''ایں......'' رانی نندیتا نے اس کی آواز سنی اور چونک پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ انگوری معمولی عورت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سنبھل کر مسکرائی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔

''سوچ تو کچھ بھی نہیں ہے انگوری! تم جیسی سندر لڑکی ہے ہی رانی بننے کے قابل۔ مگر بات صرف ست گرو کی ہے۔'' رانی نندیتا نے کہا۔

''دیکھو رانی نندیتا! میں اگر چاہوں تو میں خود ست گرو مہاراج کے سامنے جا سکتی ہوں اور اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کر کے اپنے بھاگوں کا فیصلہ کر سکتی ہوں۔ مگر یہ کام میرے لئے کرنا اتنا مناسب نہیں ہے۔ تم مجھے ایک ایسی لڑکی کی حیثیت سے راجہ ست گرو کی رانی بناؤ گی جو بے حد پوتر اور پاک ہے اور جسے تم اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ کام صرف تمہیں کرنا ہے رانی نندیتا! صرف تمہیں۔'' انگوری نے سرد لہجے میں کہا۔

رانی نندیتا نے اس کا لہجہ سنا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ انگوری اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔ تب اس نے ہارے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں اپنا وچن ضرور پورا کروں گی۔ لیکن تم مجھے کچھ وقت دے

سکتی ہو انگوری؟''

''کتنا سے چاہتی ہو؟''

''بس اتنا کہ ست گرو کو تیار کر لوں۔'' رانی نندیتا نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... اور اس سے تک مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تمہیں...... تم یوں کرو کہ محل کے ہی کسی حصے میں رہائش اختیار کر لو۔ میں تمہارے لئے بندوبست کر دوں گی۔'' رانی نندیتا نے کہا اور انگوری نے اس پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

یوں لگتا تھا جیسے یہ لڑکی نہایت مضبوط اور پراسرار قوتوں کی مالک ہو۔ وہ بات کرتے ہوئے اپنا لہجہ اتنا سخت اور سرد کر لیتی تھی کہ نندیتا جو اب رانی بن چکی تھی اس کے سامنے تھرتھراہٹ محسوس کرتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ جیسے کوئی ایسی عورت اس کے سامنے ہے جو، جو کچھ نظر آتی ہے وہ نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔

انگوری نے اس کی بات منظور کر لی تھی اور اس نے اپنی رہائش کے لئے محل کے ایک دور افتادہ گوشے کو پسند کیا تھا اور رانی نندیتا کو ہدایت کر دی تھی کہ زیادہ لوگوں کو اس کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ بلکہ بہتر تو یہی ہوگا کہ باندیوں اور دوسرے لوگوں کو اس سے دور ہی رکھا جائے۔''

''مگر تمہاری سیوا کون کرے گا انگوری؟'' رانی نندیتا نے تعجب سے کہا۔

''مجھے کسی کی سیوا کی ضرورت نہیں ہے رانی نندیتا!'' انگوری نے جواب دیا، پھر بولی۔ ''رانی! تم اپنا کام جلد از جلد پورا کرو۔''

''ٹھیک ہے انگوری! میں تمہیں وچن دے چکی ہوں۔ اس لئے اپنے وچن کا پالن ضرور کروں گی۔ پر ایک انسان کی حیثیت سے میرے من میں کچھ سوال اٹھ رہے ہیں انگوری! کیا تم میری سکھی ہونے کی حیثیت سے ان سوالوں کا جواب دینا پسند کرو گی؟''

''کیا سوال ہیں رانی نندیتا؟''

''دیکھو انگوری! ٹوٹے محل میں تم نے مجھے راجہ چنگھو کی لاش دکھائی تھی۔ تمہارا کہنا ہے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے جبکہ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ تم پچھلے جنم کی بات کرتی ہو۔ بہت کم ہی ایسے ہوں گے جنہیں پچھلے جنموں کی باتیں یاد رہتی ہوں گی۔ لیکن میں تم سے یہ سوال نہیں کروں گی کہ تم میرے پہلے جنم کے بارے میں کیونکر جانتی ہو۔ حالانکہ میں تم پر شبہ کر سکتی تھی۔ میں یہ بھی سوچ سکتی تھی کہ تم جھوٹ بول

رہی ہو۔ لیکن نولکھے ہار کا وہ سچا موتی تمہارے ذریعے مجھے واپس ملا اور یہ وہی موتی
ہے جو غائب تھا۔ اس لئے میں نے تمہاری بات پر یقین کر لیا۔ اس کے علاوہ تم نے
جو کچھ کہا وہ تم نے پورا کر دکھایا۔ مجھے بتاؤ کہ یہ شکتی تمہیں کہاں سے حاصل ہوئی؟''
''نہیں رانی نندیتا! میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ کچھ باتیں تو میں تمہیں ابھی بتا
دوں گی اور کچھ باتیں اس سمے بتاؤں گی جب ان کا سمے ہوگا۔''
''یہ وقت میری سمجھ میں نہیں آتا انگوری!''
''آ جائے گا...... دھیرج رکھو...... آ جائے گا۔ سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔
تمہاری یادداشت بھی تو گم ہو چکی ہے۔ تمہیں وہ ساری باتیں یاد نہیں جو مجھے یاد ہیں۔
اس لئے ابھی تمہیں سب کچھ بتانا بیکار ہے۔ ہاں آنے والا سمے ساری باتوں کے بھید
کھول دے گا۔ تم اس کی چنتا مت کرو اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔''
''حالانکہ میرے من میں ایک کرودھ ہے انگوری!'' نندیتا نے کہا۔
''وہ کیا؟'' انگوری نے [illegible] لہجے میں کہا۔
''وہ یہ کہ ست گرو میرا بیٹا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ دنیا کی ساری خرابیوں
سے محفوظ رہے اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے اس کے ساتھ جو اسے نقصان
پہنچائے۔ اس لئے میں چاہتی تھی کہ جو لڑکی اس کی رانی بنے میں اس کے بارے میں
سب کچھ جان لوں۔ لیکن ٹھیک ہے، ابھی تم کچھ بتانا نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔'' رانی
نندیتا نے کہا۔ مقصد یہی تھا کہ انگوری کے بارے میں سب کچھ جانے بغیر وہ اس
بات پر آمادہ نہیں ہو سکتی کہ ست گرو سے اس کی شادی کرے۔ تاہم انگوری اسے چند
ساعت دیکھتی رہی، پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
''دیکھو رانی نندیتا! میں نے تم سے جس بات کا وعدہ کیا تھا وہ بغیر کسی شرط کے
پورا کر دیا۔ میں نے تو اس سے تمہیں اپنا یہ کام نہیں بتایا تھا۔ چنانچہ اب تمہارا بھی یہ
فرض ہے کہ تم مجھ سے ساری باتیں پوچھے بغیر میرا یہ کام کر دو۔ تمہارے ست گرو کو
میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ اور اگر تم نے ایسا کر دیا تو
میری جنم جنم کی آشا پوری ہو جائے گی۔ ایک ایسی آشا جس کے لئے میں نجانے کب
سے بے کل ہوں، کب سے پریشان ہوں۔ یہ میرا من ہی جانتا ہے۔''
انگوری کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی، ایک عجیب سا اضطراب نظر آیا۔
اس کی آنکھیں پاتال سے بھی گہری ہو گئیں اور رانی نندیتا اس پراسرار لڑکی کو تعجب

سے دیکھنے لگی۔ اس کے بعد اسے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔
انگوری نے اسے آخری ہدایت دی اور رانی نندیتا اس جگہ سے واپس لوٹ آئی
جہاں وہ انگوری کے ساتھ اس کی رہائش گاہ دکھانے گئی تھی اور جسے انگوری نے پسند کر
لیا تھا۔ راستے میں بھی وہ یہ سوچتی چلی آئی تھی کہ انگوری نے باندیوں اور نوکروں کو دور
رہنے کے لئے کہا ہے۔ وہ اپنے کھانے پینے اور آرام کا بندوبست کیسے کرے گی؟ وہ
کون ہے، کیا ہے؟ کوئی بات رانی نندیتا کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔
اپنے کمرۂ خاص میں آنے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ انگوری نے جو
فرمائش کی تھی وہ اس کی توقع سے بالکل ہی مختلف تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر انگوری
اس وچن کے پالن میں دولت، زمین یا کوئی ایسی چیز مانگتی جو بہت ہی قیمتی ہوتی تو
رانی نندیتا راجہ راجور یہ سے کہہ کر اپنا وچن پورا کر دیتی۔ لیکن انگوری نے وہ مانگا تھا
جو رانی نندیتا کے بس کی بات نہیں تھی۔ ست گرو بہت ہی سرپھرا تھا۔ وہ کوئی ایسی
بات نہیں مان سکتا تھا جو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ اس طرح رانی نندیتا کو اس سلسلے
میں بہت سی مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ انگوری جیسی پراسرار لڑکی کے
بارے میں سب کچھ جانے بغیر وہ اسے ست گرو کی رانی کیسے بنا سکتی تھی۔
رانی نندیتا بہت دیر تک سوچتی رہی اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا تو اس
نے سوچا کہ وہ اپنے پتا راجہ ہری کور سے اس سلسلے میں مشورہ لے گی۔
رات بیتی، دن چڑھ آیا۔ راجہ ہری کور بیٹی کے بلانے پر دوڑا چلا آیا۔ یوں بھی
باپ بیٹی ایک دوسرے کے گہرے رازدار تھے۔ اس نے راجہ ہری کور کو ساری
صورتحال بتانا چاہی لیکن رانی نندیتا کو اس بات سے خوف محسوس ہوا کہ کہیں انگوری
جیسی پراسرار عورت اس بات سے واقف نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے باپ سے محل
میں گفتگو نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور یونہی سرسری انداز میں پوچھا۔
''پتا جی! اگر میں آپ سے کوئی ایسی بات کہوں جو کسی کے خلاف ہو تو کیا یہ
اسے معلوم ہو سکتی ہے؟''
''میں سمجھا نہیں نندیتا، کیا تجھے مجھ پر شبہ ہے؟'' راجہ ہری کور نے اپنی بیٹی
نندیتا سے کہا۔
''یہ بات نہیں ہے پتا جی! میں تو یہ کہنا چاہتی تھی کہ کوئی ایسی ہستی، کوئی ایسی
ذات جو سمجھ میں نہ آنے والی ہو اور اسے بے شمار باتیں معلوم ہو جائیں تو کیا وہ

ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو دور بیٹھ کر بھی سن سکتی ہے؟'' نندیتا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ ..... میں سمجھ گیا۔ کہیں تو اس لڑکی کی بات تو نہیں کر رہی جس نے ہریرتے سے تجھے حکومت دلانے میں سہاتا کی تھی؟'' راجہ ہری کور زیرک اور سمجھدار آدمی تھا۔ وہ جلد ہی بیٹی کی پریشانی سمجھ گیا۔ تب نندیتا نے بھی گردن ہلا دی۔

''ہاں پتا جی! میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ جو باتیں میں کروں گی وہ اسے پسند نہیں آئیں گی۔ اور میں اس سے اتنا ڈرتی ہوں مہاراج کہ میرا من خوف سے کانپ رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ میری باتیں سنے۔''

''مگر وہ ہے کہاں؟ اور یہاں سے اس کا کیا تعلق؟''

''نہیں مہاراج! وہ محل ہی میں ہے۔''

''محل میں کس جگہ؟'' راجہ ہری کور نے پوچھا۔

''میں نے اس کی رہائش کا بندوبست محل میں ہی کروایا ہے جہاں وہ اکیلی رہتی ہے۔ اور یہ رہائش گاہ محل ہی کے ایک حصے میں ہے۔''

''اوہو ..... یہ تو تو نے اچھا نہیں کیا۔ جب تجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو تو نے اس پر وشواش کیسے کرلیا'' راجہ ہری کور نے کہا۔

''مہاراج! آپ نہیں جانتے وہ کیا چیز ہے۔ اگر میں اسے یہاں رہنے کی اجازت نہ دیتی تب بھی وہ یہاں ہی رہتی۔ وہ بڑی چالاک اور پراسرار لڑکی ہے۔ عجیب، انوکھی سی۔ دیکھنے میں ایسی سندر کہ من موہ لے پر اندر سے بے حد پراسرار، عجیب سی۔'' نندیتا نے کہا اور راجہ ہری کور گردن ہلانے لگا۔

''ہوں ..... اس کا مطلب ہے وہ کچھ دھیان گیان بھی جانتی ہے۔''

''نہ جانتی ہوتی تو ہمیں ہریرتے کے بارے میں کیسے بتاتی؟''

''ہاں ..... یہ تو ٹھیک ہے۔ پرنتو تو اس کے بارے میں کیا باتیں کرنا چاہتی ہے؟''

''میں نے کہا ناں مہاراج! جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ یہاں نہیں کہہ سکتی۔ یہاں سے کہیں اور چلیں۔''

''پھر تو نے مجھے یہاں کیوں بلایا؟ اچھا ہی ہوتا کہ تو میرے پاس ہی آ جاتی۔''

''میں اب ایسے حالات میں محل چھوڑ کر نہیں آ سکتی تھی مہاراج!'' رانی نندیتا

پریشانی سے بولی۔

''تب پھر تو ہی بتا، میں کیا کروں؟''

''کچھ نہیں مہاراج! یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں آرام سے باتیں کر سکیں۔'' رانی نندیتا نے کہا اور اس کا باپ تیار ہو گیا۔

پھر وہ محل سے نکل کر ایسی دور دراز جگہ آئے جہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ یہاں وہ بے تکلفی اور آزادی سے گفتگو کر سکتے تھے۔ تب رانی نندیتا نے راجہ کو اپنا مافی الضمیر بتاتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس سے چندن محل میں ملاقات کی تھی۔ یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ اس نے مجھے انوکھی کہانیاں سنائی تھیں۔ مثلاً راجہ چنگھو کو میں نے قتل کر دیا تھا۔ اس نے مجھے راجہ چنگھو کی لاش بھی دکھائی پتا جی! اور سب سے بڑی بات یہ کہ راجہ چنگھو کی لاش کے ہاتھ میں وہ موتی دبا ہوا تھا جو میرے نولکھا ہار سے غائب ہے۔ اس نے وہ موتی مجھے نکال کر دیا اور جب میں نے اسے نولکھے ہار کے دوسرے موتیوں سے ملا کر دیکھا تو وہ وہی موتی تھا۔ اس بار کی تاریخ بھی نہ مجھے معلوم ہے اور نہ آپ کو۔''

''ہاں ..... یہ حقیقت ہے۔''

''اور نہ ہی یہ معلوم ہے پتا جی کہ اس میں سے یہ موتی کیسے غائب ہوا۔''

''بالکل ..... ہمیں یہ بات بھی نہیں معلوم۔'' راجہ ہری کور نے اعتراف کیا۔

''مگر پتا جی! وہ جانتی ہے۔ اس نے میرے بیٹے جیون کمار کا بھی حوالہ دیا جسے میں گدی پر بٹھانا چاہتی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے پتا جی کہ اسے پہلے جنم کی باتیں یاد ہوں اور پچھلے جنم میں وہ کوئی ایسی ہستی ہو جو میرے نزدیک رہی ہو؟''

''بھگوان ہی جانے۔ تیری باتیں سن کر تو میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے ہیں۔ پر چنتا نہ کر، میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو ہماری مشکلوں کا حل پیش کر سکتا ہے۔''

''کون؟''

''میں تجھے اس کے بارے میں پھر بتاؤں گا۔ تو مجھے پہلے پوری بات بتا ..... کیا کہہ رہی تھی؟''

''میں کہہ رہی تھی کہ جب چندن محل میں میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس

نے مجھے ایک چراغ دکھایا۔ اس میں خون بھرا ہوا تھا۔ ایک کٹی ہوئی انگلی خون کے اس پیالے میں یوں کھڑی ہوئی تھی جیسے چراغ کی بتی ہو۔ وہ چراغ سرخ روشنی دے رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انگلی کے اوپری سرے پر روشنی ہو رہی ہو۔''

''کیا...... واقعی وہ روشنی بھی دے رہا تھا؟'' راجہ ہری کور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ...... وہ چراغ بالکل اسی طرح جل رہا تھا جیسے دیے میں تیل جلتا ہے۔''

''اچھا تو پھر؟''

''پھر اس نے مجھے راجہ ہریتے کی جنم کنڈلی کے بارے میں بتایا۔ مجھے وہ سب کچھ سمجھایا جو مجھے کرنا تھا۔ اور پھر پتا جی یہ ہوا کہ میں نے اس کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کیا اور اس عمل کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں مہاراج۔ اس کی سہائتا نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ ہریتوں کا خاندان جل کر ہلاک ہو گیا ہے اور اب ست گرو کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ ساری آسانیاں ہمیں انگوری کی بدولت نصیب ہوئی ہیں۔ جب مجھے اس نے ہریتے کی موت کا طریقہ بتایا تھا تو اس نے مجھ سے ایک وچن لیا تھا۔''

''وہ وچن کیا تھا؟''

''یہ کہ میرا کام ہو جائے تو مجھے اس کا بھی ایک کام کرنا پڑے گا۔''

''تو تم نے وچن دے دیا تھا؟'' راجہ ہری کور نے پوچھا۔

''ہاں مہاراج! میں نے وچن دے دیا تھا۔ اتنا بڑا کام ہونے کی خوشی میں، میں یہ بھول گئی تھی کہ وہ بات کوئی ایسی بھی ہو سکتی ہے جو میرے لئے مشکل ہو۔''

''اوہ...... تو کیا اس نے کوئی ایسا مطالبہ کر دیا ہے جو تم پورا نہیں کر پا رہیں؟'' راجہ ہری کور نے پوچھا۔

''ہاں مہاراج...... ایسا ہی مطالبہ ہے۔'' رانی نندیتا نے کسی قدر مضمحل لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' راجہ ہری کور نے کہا۔

''اس نے کہا کہ ست گرو کی شادی اس سے کر دی جائے اور راج نگری کی راج کماری اسے بنا دیا جائے۔''

''اوہ......'' راجہ ہری کور گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا

رہا پھر بولا۔

''نہیں...... یہ تو کسی طور ممکن نہیں ہے۔ ست گرو بے شک چالاک ہے۔ وہ جس طرح حکومت سنبھالے ہوئے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والا وقت اسے تاریخ میں ایک نمایاں مقام دے گا۔ لیکن کوئی ایسی لڑکی جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہ ہو جو سندر ضرور ہو لیکن اس کے ساتھ ہی پراسرار قوتوں کی مالک بھی ہو تو بھلا اس کے ساتھ گرو کی شادی کیسے کی جا سکتی ہے؟ تم نے اس کا حسب نسب، اس کی ذات پوچھی؟''

''نہیں پتا جی! وہ یہ سب کچھ بتانے پر راضی نہیں ہے۔ حالانکہ میں نے کئی بار اس سے اس بارے میں پوچھا لیکن وہ یہی کہتی ہے کہ آنے والا سمے ساری باتیں بتا دے گا۔''

''تب تو یہ کام بڑا مشکل ہو جائے گا۔''

''لیکن میرے وچن کا کیا ہو گا پتا جی؟'' رانی نندیتا نے پوچھا اور راجہ ہری کور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کافی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

''یہی بہتر ہو گا کہ مہاراج وجے کپور سے اس سلسلے میں بات کر لی جائے۔''

''کون...... کون مہاراج؟''

''تو نہیں جانتی...... وہ ایک مہان گیانی ہے جس کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہت بوڑھا ہے۔ میں بچپن سے اسے اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ نجانے کون کون اسے اسی حالت میں دیکھ چکا ہے۔ وہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اور جب دو عجیب و غریب شخصیتیں ایک دوسرے کے بارے میں سوچیں گی تو نتائج کچھ عجیب ہی نکلیں گے۔'' راجہ ہری کور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وجے کپور مہاراج کہاں ہیں؟''

''تو اس کی چنتا مت کر...... ان سے بات کرنا میرا کام ہے۔'' راجہ ہری کور بولا۔

''مگر میں اس سے اپنے وچن کے سلسلے میں کیا کہوں؟''

''بس تو اسے یہ کہہ کر ٹالتی رہ کہ میں ست گرو سے بات کرنے کے لئے کسی مناسب وقت کے انتظار میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے پتا جی۔''

"ہاں ... تجھے معلوم ہے ست گرو آج کل کیا کر رہا ہے؟"
"نہیں ... میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا۔"
"معلومات حاصل کر اور ان سے مجھے مطلع کر۔ دوسری طرف میں وجے کپور سے تیری اس پریشانی کا ذکر کروں گا۔ مجھے وشواش ہے کہ وہ ہماری سہاتا پر آمادہ ہو جائیں گے۔" راجہ ہری کور نے کہا اور رانی نندیرتا کسی حد تک مطمئن ہو گئی۔ تب اس کا باپ واپس چلا گیا اور وہ ست گرو سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے چل پڑی۔

ادھر تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور دوسری طرف ست گرو اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جس سے اسے قرب و جوار کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں۔ ہریرتوں سے تو اب اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا۔ ان کا اب اس سنسار میں کوئی وجود نہیں تھا اس لئے ان کی طرف سے وہ بے فکر ہو گیا۔

لیکن یہ بے فکری زیادہ دیر تک نہ رہی۔ آہستہ آہستہ اسے خبریں ملنے لگیں جن سے گرو متفکر ہونے لگا۔ اسے علم ہوا تھا کہ سنگرانی اور اس کے قرب و جوار میں پانچ ایسے بھائی ابھر رہے ہیں جن میں ہریرتوں کی سی خصوصیات نمایاں ہیں۔ گو ان کے نام بدلے ہوئے ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ راجہ ہریرتے کی اولادوں میں سے ہوں جن کے نام چتر دیو، جتندر، مہاویر، رام پرکاش اور کرشن تھے۔

چنانچہ ست گرو نے ان کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے چند افراد کو مختص کر دیا اور اس کے آدمیوں نے اسے جو اطلاعات دیں وہ بڑی ہی توجہ خیز تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہریرتوں کے جلنے کی اطلاع غلط تھی۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور سنگرانی میں مقیم ہیں۔ ان پانچوں بھائیوں نے سنگرانی کے راجہ کی بیٹی موہنی سے مشترکہ شادی کر لی ہے۔

ست گرو کو یہ تمام تفصیلات سن کر بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے سوچا کہ ہریرتوں نے اپنی جرأت مندی سے حالات کا مقابلہ کر ہی لیا۔ وہ جلنے سے بھی بچ گئے اور انہوں نے ایک ایسی مضبوط حکومت بھی حاصل کر لی جو آگے چل کر راج نگری پر حملہ بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے دن رات کوئی نئی چال چلنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس نے اپنے مشیروں سے مشورہ کرنا شروع کر دیا اور اپنے چچا زاد بھائیوں سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کی کوشش کی اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انہیں راج نگری آنے کی دعوت دی۔

ہریرتوں نے بسوامیوں کی یہ دوستی قبول کر لی اور راج نگری جا پہنچے۔

ست گرو نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور خاطر و تواضع کی۔ دونوں خاندانوں میں حکومت کی تقسیم کا فیصلہ ہوا کہ اندھیر گڑھی مع آدھی سلطنت ہریرتوں کے قبضے میں رہے گی اور راج نگری بسوامیوں کے زیرنگیں رہے گی۔ حکومت کی اس تقسیم کے بعد سلطنت کے بعض امیروں نے ہریرتوں کی اقبال مندی، جرأت مندی اور بلند ظرفی کو دیکھ کر ان کی اطاعت قبول کر لی۔ اس پر ست گرو بظاہر تو خاموش رہا لیکن اس کے اندر خاصی تشویش پیدا ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں ہریرتوں کی تباہی کے منصوبے باندھنے لگا۔ راجہ راجو رہ جو صرف نام کا حکمران تھا اور سچ مچ کا اندھا حکمران تھا۔ اس کی حیثیت ایک طرح سے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اور لوگ اب ست گرو کو ہی راجہ سمجھنے لگے تھے۔ لیکن ست گرو کے دل کی حالت بہت خراب تھی۔

ہریرتوں کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا اس پر اس کا دل اسے ندامت کرتا تھا۔ لیکن حسد کی آگ اس کے وجود کو جلا کر خاکستر کئے دے رہی تھی۔ امیروں اور سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں کی اطاعت پر بظاہر وہ خاموش رہا لیکن اس کے دل میں ہریرتوں کی تباہی کے لئے بہت سے منصوبے تھے۔

دوسری طرف چتر دیو، مہاویر اور اس کے سارے بھائیوں نے مل کر سلطنت کو جمع کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنی فوجوں کو لے کر مختلف علاقوں کی سمت چل پڑے۔ چونکہ خدا تعالیٰ بھی ہریرتوں پر مہربان تھا اس لئے انہوں نے جو کچھ سوچا وہی ہوا۔ پانچوں باہمت بھائیوں نے خدا کی مدد سے ساری دنیا میں اپنی فتح کا نقارہ بجا دیا اور ملک کے فرمانرواؤں، امیروں اور راجاؤں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا لیا۔ یہ چاروں بھائی فتح و نصرت سے کامیاب و کامران ہوئے اور ان علاقوں کو انہوں نے فتح کر لیا۔

بے شمار زر و جواہر لے کر وہ اپنے دارالحکومت اندھیر گڑھی میں پہنچے۔ ان کے پہنچنے پر ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا اور ان کے اہتمام میں جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔

ست گرو نے جب ہریرتوں کی یہ شان و عظمت اور رعب و جلال دیکھا اور ان کی

سلطنت کی وسعت پر نظر کی تو اس کے دل میں حسد کی آگ جو دبک رہی تھی، اور بھڑک اٹھی۔ اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کا خیال اس کے دل میں تیزی سے سر اٹھانے لگا اور اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگا۔

ست گرو کے دربار میں بہت سے مکار، حیلہ باز قسم کے لوگ جمع تھے۔ وہ دن رات ان سے مشورے کرنے لگا۔ اس کے دل میں شدید خواہش تھی کہ کسی طرح ہریرتوں کا اقتدار اور اقبال ختم کر دے اور اپنی سلطنت وسیع تر کر لے۔

چالاک درباریوں نے بالآخر ست گرو کو ایک مشورہ دیا اور اس مشورے پر عمل کرنے کے لئے ست گرو دن رات غور و خوض کرنے لگا۔

اس زمانے میں جواء کھیلنے کا رواج عام تھا۔ چالاک درباریوں نے ست گرو کو جوئے میں بسوامیوں کی قسمت کا پانسہ پلٹنے کا مشورہ دیا اور ایک خاص قسم کی چوسر پر جواء کھیلنے کو کہا۔ اس مقصد کے لئے یہ طے پایا کہ جواء کھیلنے کے لئے ایسا پانسہ بنایا جائے جو ہر بار دشمن کے خلاف پڑے۔

ست گرو کو یہ تجویز بے حد پسند آئی اور اس نے اس خاص قسم کے پانسہ سے مہاویر، چتر دیو اور ان کے باقی بھائیوں سے جواء کھیلنے کا ارادہ کیا۔

جب یہ سب کچھ طے ہو گیا تو اس نے بڑی لجاجت اور ملائمت کے ساتھ مہاویر، چتر دیو اور ان کے بھائیوں کو راج نگری آنے کی دعوت دی۔

مہاویر جو اب اندھیر گڑھی کا راجہ تھا اپنے چچا زاد بھائی کی مکاریوں کو نہیں جانتا تھا۔ اپنی بے خبری میں راج نگری پہنچا تو ست گرو نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور خوب اچھی طرح اس کی مدارت کی۔ اس نے ان پانچوں بھائیوں کے اعزاز میں بڑی بڑی دعوتیں کیں اور سارے امراء اور روٗسا سے بڑے فخر کے ساتھ ملایا جیسے ان سے بڑا اس کا ہمدرد اور کوئی نہیں ہے۔ اس نے بڑی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ پانچوں میرے بھائی ہیں اور اس نے اپنے پانچوں بھائیوں کا حق تسلیم کرتے ہوئے حکومت تقسیم کر دی ہے۔

لوگوں نے اس بات کا بڑا چرچا کیا اور خود مہاویر اور اس کے بھائی بھی اپنی یہ شان و عظمت دیکھ کر ست گرو کے پہلے سلوک کو بھول گئے کیونکہ وہ سچے تھے۔

تفریح کے طور پر ست گرو نے مہاویر سے جواء کھیلنے کے لئے کہا۔ ہریرتوں کو چونکہ ست گرو کی عیاری کا حال معلوم نہ تھا اس لئے وہ بغیر کسی حیل و حجت کے جواء

کھیلنے پر راضی ہو گئے۔ اس پر ست گرو نے اپنا وہی مخصوص پانسہ نکالا اور کھیلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہریرتے اپنا سب کچھ ہار بیٹھے اور اب بات ملک و مال پر جا پہنچی۔ لیکن پانسہ جب بھی پڑتا گرو ہر چیز کا مالک بنتا چلا گیا۔ لیکن ست گرو نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔

جب پانچوں بھائی اپنی بیوی موہنی کو بھی ہار گئے تو ست گرو نے ایک آخری بازی اس شرط پر لگانے کو کہا کہ اگر ہریرتے جیت جائیں تو انہیں ان کا سارا ہارا ہوا مال و ملک اور بیوی واپس کر دی جائے گی اور اگر ہار جائیں تو وہ آبادی چھوڑ کر جنگل میں نکل جائیں گے۔ اور وہاں بارہ سال تک پرندوں اور چرندوں کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔ اور جب جلا وطنی کی یہ رات ختم ہو جائے تو وہ واپس آئیں اور ایک سال تک گمنامی کی زندگی بسر کریں۔ کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ کون ہیں۔ اور اگر یہ راز کھل گیا تو پھر انہیں بارہ سال کی جلا وطنی بھگتنی ہو گی۔

بدقسمت ہریرتے اپنی سچائی کی وجہ سے اور ست گرو کی مکاری اور چالبازی کی وجہ سے یہ آخری بازی بھی ہار گئے۔ شرط کے مطابق انہوں نے شہر کی سکونت ترک کر کے جنگل میں ڈیرا کر لیا اور یوں بارہ سال کے لئے ست گرو نے اپنی حکومت کو ہریرتوں سے محفوظ کر لیا۔

ست گرو اپنی چالاکی سے اپنے راستے کے سب سے بڑے کانٹے کو ختم کر چکا تھا اور اب تو اسے یہ خطرہ بھی نہیں رہ گیا تھا کہ ہریرتے کسی اور طریقے سے کوئی حیثیت حاصل کر کے اقتدار دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ چنانچہ رزم کی محفل سے ہٹ کر وہ بزم کی جانب آیا اور ایک دن اس نے اپنی ماں نندیرتا سے فرمائش کی کہ اس کی شادی کر دی جائے۔

خود رانی نندیرتا کے دل میں بھی یہ خیال بہت عرصے سے تھا لیکن وہ پریشان تھی۔ انگوری اب بڑے محل میں بڑے کروفر سے رہ رہی تھی اور اس کے وچن پورا کرنے کا انتظار کر رہی تھی۔

دوسری طرف راجہ ہری کور اپنی کوششوں میں مصروف تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی پریشانی کو سمجھتا تھا اور پھر اس کے دل میں یہ بھی خواہش تھی کہ وہ معلوم کرے کہ وہ خوبصورت عورت انگوری کون ہے۔

اس سلسلے میں اس نے راج نگری کے ایک سب سے بوڑھے سادھو کا انتخاب کیا جو گیان دھیان کا ماہر اور پراسرار علوم میں ماہر تھا۔ لیکن وجے کپور کی عادت تھی کہ وہ دنیا کی نگاہوں سے عام طور پر پردہ پوش رہتا تھا اور طویل عرصے کے بعد باہر آتا تھا۔ اس دوران وہ ایک غار جس کو باہر سے ایک بہت بڑے پتھر سے بند کر دیا گیا تھا فروکش تھا اور لوگوں کو ہدایت تھی کہ وہ اس غار میں داخل ہو کر اسے پریشان کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ راجہ ہری کور اس کے غار سے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے بہت سے لوگوں کو غار سے باہر متعین کر دیا تھا کہ وہ نگاہ رکھیں کہ وجے کپور مہاراج کب اس غار سے باہر آتے ہیں۔

ایک دن اسے اطلاع ملی کہ وجے کپور مہاراج نے غار کا پتھر ہٹایا ہے اور غار سے باہر آ گئے ہیں۔ لہٰذا راجہ ہری کور اپنے خاص حواریوں کے ساتھ وجے کپور مہاراج کے چرنوں میں پہنچ گیا۔ اس نے وجے کپور کے چرن چھوئے اور بوڑھے وجے کپور مہاراج کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وجے کپور کے سر کے سارے بال سفید تھے۔ اس کی بھنوؤں کے بال اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ اس کی آدھی آنکھیں بالوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔ اسی طرح مونچھوں اور داڑھی کے بال لمبے لمبے اور برف کی طرح سفید تھے۔ لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود اس کا بدن خاصا گھٹا ہوا تھا اور مضبوط تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن میں کچھ خاص قوتیں کارفرما ہوں۔

راجہ ہری کور نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا شروع کر دیا۔ وجے کپور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ لیکن ہری کور محسوس کر رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک

خاص چمک پیدا ہو گئی ہے۔ تب اس نے پراسرار انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گیا تو کس کا ذکر کر رہا ہے...... لیکن اس کے لئے تجھے چالاکی سے کام کرنا ہوگا۔''

''مجھے بتائیں مہاراج! مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''چلتے پانی کی پوترتا امر ہے۔ سارے جادو پانی میں آ کر ختم ہو جاتے ہیں اور وہ طاقتیں قائم نہیں رہتیں جو انسانی بدن میں حلول کر جاتی ہیں۔ تو یوں مشورہ دے اپنی بیٹی نندیتا کو کہ وہ اس خوبصورت عورت کو لے کر پانی کے بیچوں بیچ آ جائے اور پھر اس سے سوال کرے کہ اس کی ذات پات کیا ہے۔''

''مہاراج! کیا آپ کا گیان یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کون ہے؟''

''بتا سکتا ہے...... پرنتو بتانے سے وہ نہیں ہوگا جو ست گرو کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ میں تجھے بتاؤں گا کہ ستارے ست گرو کے راج پاٹ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ لیکن پہلے تو اس مسئلے سے نمٹ لے۔''

''مجھے ایک بات تو بتا دیں مہاراج!''

''پوچھ......''

''کیا وہ سندر لڑکی یا عورت سچ مچ کوئی معصوم یا سندر ناری ہے یا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟''

''پگلا ہے تو راجہ ہری کور۔ اگر وہ خوبصورت اور معصوم ہوتی تو ہریرتے جیسا راجہ اس کے ہاتھوں نہ مارا جاتا۔ بس میں تجھے اتنا بتاؤں گا کہ وہ بہت ہی انوکھی عورت ہے اور تجھے اس کے لئے بہت کچھ کرنا ہوگا۔''

''مہاراج! میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ساری باتیں بتا دیں تاکہ جب میری بیٹی نندیتا اسے پانی کے بیچوں بیچ لائے تو وہ سب کچھ کر سکے جو اسے اس بلا سے نجات دلا سکے۔'' راجہ ہری کور نے کہا۔

''میں تجھے بتاتا ہوں۔'' وجے کپور مہاراج نے کہا۔ اور پھر وہ راجہ ہری کور کو آہستہ آہستہ کچھ بتانے لگا۔ راجہ ہری کور نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔

''کیا آپ میرے ساتھ اس جگہ تک چل سکیں گے مہاراج جہاں آپ کو یہ سب کچھ کرنا ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں...... میں اس سلسلے میں خود تیرے ساتھ رہوں گا۔'' وجے کپور

مہاراج نے کہا اور راجہ ہری کور خوش ہو گیا۔

رات کی تاریکی میں وہ دریائے سقراط کے بیچوں بیچ اس مقام تک پہنچے جس کو جزیرہ سمجھا جا سکتا تھا۔ گویا چھوٹی سی جگہ تھی لیکن بہت خوبصورت تھی۔ اور دریا کے بیچوں بیچ اس کے سبزہ زار بہت خوبصورت نظر آتے تھے۔ راجہ ہری کور کو مہاراج وجے کپور نے ساری تفصیلات بتائیں اور راجہ ہری کور نے تیاریاں شروع کر دیں۔ چند ہفتوں کی مسلسل کوششوں کے بعد دریائے سقراط کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت عمارت تیار ہو گئی اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وجے کپور مہاراج نے وہ دائرہ کھینچ دیا جس کے بارے میں انہوں نے راجہ ہری کور کو بتایا تھا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد راجہ ہری کور راج نگری پہنچا جہاں نندیرتا شدت سے اس کی منتظر تھی۔ وہ بیچاری بہت پریشان تھی۔ انگوری کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ وہ اپنے وچن سے کترانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن نندیرتا نے اسے یہی جواب دیا کہ وہ ست گرو کو تیار کر رہی ہے۔ جونہی ست گرو تیار ہو گا اس کی شادی فوراً انگوری سے کر دی جائے گی۔

چنانچہ جب ہری کور نے اپنی بچی کو ساری تفصیلات بتائیں تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے وجے کپور سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ تب راجہ ہری کور نے اس سے کہا کہ وجے کپور مہاراج سے ملیں گے مگر ابھی نہیں۔ وہ اس کے اس سے ملیں گے جب انگوری کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔

''لیکن کیا وجے کپور مہاراج نے یہ نہیں بتلایا کہ انگوری کون ہے؟''

''نہیں..... ان سادھو سنتوں کو اپنے بھی کچھ کام ہوتے ہیں نندیرتا'' راجہ ہری کور نے کہا۔

''اچھا پتا جی..... میں کوشش کرتی ہوں کہ انگوری کو لے کر کسی طرح اس مقام تک پہنچوں۔'' رانی نندیرتا نے کہا اور اس رات جب رانی کی ملاقات انگوری سے ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر بڑی پُر تپاک مسکراہٹ تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر انگوری کو سینے سے لگا لیا اور انگوری بھی مسکرانے لگی۔

''آج یہ محبت کیسے پھوٹ پڑی رانی نندیرتا؟''

''تو میری بہو بننے والی ہے نا..... میرے من میں تیرے لئے محبت نہ پھوٹے گی تو اور کیا ہو گا۔''

''اوہو..... تو کیا تم نے ست گرو سے بات کر لی؟''

''نہیں..... میں نے ست گرو سے یہ بات نہیں کی بلکہ دوسری بات کی ہے۔''

''وہ کیا؟'' انگوری نے پوچھا۔

''ست گرو اپنے سب سے بڑے دشمن ہریرتوں سے جیت چکا ہے اور اب ست گرو آزاد ہے۔ اس نے مجھ سے اپنی شادی کی بات کی تو میں نے کہا کہ محل کے ہنگاموں میں یہ سب کچھ مناسب نہ ہو گا۔ یوں کرتے ہیں کہ دریائے سقراط کے بیچوں بیچ جو خشک جگہ ہے وہاں بیٹھ کر ساری باتیں کر لی جائیں گی تو ست گرو نے کہا کہ انگوری کو بھی وہیں بلا لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ تو یوں کرتے ہیں انگوری! کہ ہم دونوں وہاں چلتے ہیں اور ست گرو بھی وہاں پہنچ جائے گا۔'' انگوری اس بات پر تیار ہو گئی اور ساری تیاریاں کرنے کے بعد وہ لوگ چل پڑے۔

انگوری کو یہ خوبصورت جگہ بہت پسند آئی تھی اور خاص طور سے یہ عمارت اس کے لئے بڑی دلکش تھی۔ یہاں بیٹھ کر اس نے سوال کیا۔

''کیا ست گرو مہاراج ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔''

''نہیں..... پہنچنے ہی والا ہو گا۔'' رانی نندیرتا نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''تو چنتا مت کر انگوری! تو جو چاہے گی وہی ہو گا۔'' اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اس دائرے میں داخل ہو گئی جو وجے کپور مہارج نے کھینچا تھا اور جس کے بارے میں راجہ ہری کور، نندیرتا کو اطلاع دے گیا تھا۔

دائرے کے بیچوں بیچ پہنچ کر رانی نندیرتا رک گئی۔ اس نے کسی خاص بات کا اظہار نہ ہونے دیا لیکن اچانک انگوری کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہو گئے۔ رانی نندیرتا تو دائرے سے نکل گئی تھی لیکن انگوری نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو نہ نکل سکی۔ دائرے کے گرد نظر نہ آنے والی طلسمی دیواریں کھڑی ہو گئی تھیں۔

انگوری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور رانی نندیرتا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آہستہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اب تو مجھے اپنے جیون کی کتھا سنائے گی انگوری تو مجھے بتائے گی کہ تو کون ہے تو یہاں سے نہ نکلے گی اگر تو اچھی اور سچی بات ہوئی تو میں وچن پورا کروں گی اگر تو نے اپنے بارے میں جھوٹ بولا تو..... تو خود جانتی ہے کہ آگے کیا ہو گا۔ تیرا گیان مجھے آگے کی باتیں ضرور بتا سکتا ہے۔''

انگوری کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''تو نے پھر وہی کیا نندیتا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ لیکن میں جانتی ہوں یہ سب تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ تیری پشت پر صموالالہ پہنچ گیا ہے۔ ہاں وہ منحوس پھر ہمارے قریب آ گیا ہے۔''

''کون صموالالہ ...... میں کسی صموالالہ کو نہیں جانتی۔'' رانی نندیتا نے پراعتماد انداز میں کہا۔

''یہ عمارت پانی کے بیچوں بیچ ہے۔ تو نے پہلے سے یہ انتظام کر رکھا تھا تاکہ میں یہاں سے نکل نہ سکوں لیکن نندیتا! کہانی اس موڑ پر آ گئی ہے جہاں سے ختم ہوئی تھی ...... کوئی بات نہیں ہے نندیتا ...... جگ بیتے رہتے ہیں ...... آواگون ہوتا رہتا ہے ...... میں پھر آؤں گی ...... میں پھر آؤں گی نندیتا ...... !''

''اس کے بجائے تو مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا کیوں نہیں دیتی۔ سن انگوری میں تیری دشمن نہیں ہوں بلکہ میں تو تیری احسان مند ہوں کہ تو نے میری سہائتہ کی اور راجہ ہریرتے سے حکومت میرے بیٹے ست گرو کو دلائی لیکن انگوری تو ایک انوکھی لڑکی ہے اور میں اپنے بیٹے کا جیون چاہتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیری وجہ سے کسی کشٹ میں پڑ جائے۔ اس لئے میں تیرے بارے میں جاننے کی خواہش مند ہوں۔ تو مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دے اس کے بعد میں تجھے یہاں سے نکال لے جاؤں گی اور اپنا وچن پورا کر دوں گی۔''

انگوری کے چہرے پر ایک حزن آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے [illegible] بھری نگاہوں سے نندیتا کو دیکھا اور اس کے گالوں پر آنسو ٹپک پڑے۔ رانی نندیتا کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر جاگی تھی لیکن پھر وہ سنبھل گئی۔

''آخر تو مجھے اپنے بارے میں بتانے سے ہچکچا کیوں رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تو ...... تو وہ سب کچھ کر چکی ہے نندیتا جو ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اب تو خود بھی مجھے اس دائرے سے نہیں نکال سکتی۔''

''کیوں ......؟'' نندیتا چونک پڑی اور انگوری کے ہونٹوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

''اس لئے کہ تو نے جس سے مدد لی ہے وہ ہمارا جنم جنمان کا دشمن ہے۔ منش

کے جیون میں سات کشٹ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ کشٹ ایک جنم میں ہی ختم ہو جاتے ہیں اور اس کا دوسرا جنم پاک صاف ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ چکر جنم جنم چلتا ہے۔ یہ تو بھاگ کی بات ہے۔ ہاں نندیتا! میں نے تیرے ساتھ کوئی خراب کام نہیں کیا تھا۔ میں نے تو تیری ایسی منوکامنا پوری کی تھی جو تو کسی اور طرح پوری نہیں کر سکتی تھی۔ پر اس کے بدلے میں تو نے مجھے کیا دیا۔''

انگوری کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور نجانے کیوں نندیتا کے دل میں اس کے لئے ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ تاسف بھری نگاہوں سے انگوری کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''پر تو اپنے بارے میں بتا کیوں نہیں دیتی انگوری ......!''

''کیا بتا دوں نندیتا! تیرا پچھلا جنم تیرے دماغ سے نکل گیا ہے۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں یا تو اسے میری کوئی کہانی سمجھے گی یا میرا اچھل سمجھے گی۔ اس کے علاوہ میں تجھ پر بھروسہ کر کے صموالالہ کے جال میں پھنس گئی ہوں۔ مجھے تجھ سے شکایت ہے نندیتا۔ اس لئے میں تجھے کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' اس بار انگوری کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''تو پھر تو یہاں سے نکل سکے گی ......؟'' نندیتا بولی۔

''بے وقوف رانی تو نجانے کس بھول میں ہے تو کسی طور راجہ ہریرتے کو قتل کر کے حکومت اپنے بیٹے ست گرو کو نہیں دلا سکتی تھی۔ میں نے تیری سہائتا کی۔ سن رانی وہ سانپ میں ہی تھی جس نے راجہ ہریرتے کو ڈسا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ تیرے لئے کیا تھا لیکن تو نے میرے ساتھ جو کچھ کیا بھگوان کی سوگند میں تجھ سے اس کا بدلہ ضرور لوں گی۔ اب تو جا۔''

''انگوری ہوش میں آ ...... میرے من میں یہ بات نہیں تھی کہ میں تیرا جیون لوں میں تو بس ......''

''ساری باتیں بے کار ہیں اب ......'' انگوری بولی۔

''لیکن تو ......؟''

''میں کہہ چکی ہوں کہ میں اگر تجھے اپنے بارے میں بتا دوں تو بھی تو مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتی۔''

''میں اس بات کو نہیں مانتی۔'' نندیتا نے کہا۔

''نہ مان اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے اگر اندازہ کرنا چاہے تو تو اب خود ہی اس حصار کو دیکھ لے۔''

''کیا مطلب ......'' نندیتا نے پوچھا۔
''تو خود بھی ان دیواروں کو پار نہیں کر سکتی۔ جو تجھے نظر نہیں آ رہیں۔'' انگوری نے جواب دیا۔
''اوہ تو ...اب میرے لئے چال چل رہی ہے۔'' نندیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''تیرے لئے چال .....'' انگوری نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
''ہاں تا کہ جونہی میں حصار میں داخل ہوں تو میرے خلاف کوئی حرکت کرے۔ تو مجھ سے بدلہ جو لینا چاہتی ہے۔''
''تو پھر واپس چلی جا نندیتا! بس اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ جو میرے بھاگ میں تھا وہی ہوا۔ جنم جنم کا کشٹ ابھی ختم نہیں ہوا... جب ہو گا تبھی مجھے شانتی ملے گی۔''
''ٹھیک ہے انگوری! میں جا رہی ہوں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر آؤں گی تو سوچ لے۔ اگر تو مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتانے پر تیار ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے بعد میں پھر کبھی نہ آؤں گی۔'' نندیتا نے کہا اور پھر وہ اس جگہ سے نکل آئی۔ لیکن اس کا دل شانت نہیں تھا۔ انگوری کی اداس صورت اس کے دل میں کھب رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ آخر یہ پراسرار لڑکی ہے کون؟ ویسے اس کے دل میں چور بھی تھا۔

وہ انگوری کو دھوکہ دے کر یہاں لائی تھی۔ یہ کہہ کر کہ اس کا بیٹا ست گرو اس سے یہاں ملاقات کرے گا اور یہاں لا کر اس نے انگوری کو ایک کشٹ میں مبتلا کر دیا ا۔ اس انگوری کو جس نے اس کی منوکامنا پوری کر دی تھی اور اس انگوری ہی کی وجہ سے تھا۔ اس کا بیٹا ست گرو راجہ بن گیا تھا اور اس کے من میں ست گرو کے راجہ بن جانے کی منوکامنا بڑی شدید تھی۔ انگوری نے اس کی اس خواہش کو پورا کر دیا تھا۔ ہریرتے نہ مرتا تو شاید ست گرو کو یہ راج پاٹ کبھی نصیب نہ ہوتا۔
وہ انگوری کے خلاف نہیں تھی لیکن اس کے من میں بار بار یہ بات گردش کرنے لگتی تھی کہ آخر یہ لڑکی ہے کون اور اس کی پراسرار شخصیت ست گرو کو کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔
راجہ ہری کور نے ہمیشہ اس کے معاملات میں اسے بہتر مشورہ دیا تھا اور اس سلسلے میں اس نے راجہ ہری کور سے ہی مشورہ لیا تھا اور ہری کور نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا وہ نندیتا کے سامنے تھا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر انگوری نے اب بھی اپنے

بارے میں کچھ نہیں بتایا تو وہ کیا کرے گی۔
''ہنہ ..... اپنا جیون خود خراب کر رہی ہے۔ میرا کیا ہے۔'' رانی نندیتا نے حقارت سے سوچا۔ ''آخر میں اپنے لڑکے کے ساتھ کسی ایسی لڑکی کی شادی تو نہیں کر سکتی جس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ اس کو بتا دینا چاہیے کہ وہ کون ہے۔''
رانی نندیتا دیر تک باہر بیٹھی سوچتی رہی بجرا اسے دریا کے پار لے جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ چنانچہ وہ بجرے کی طرف بڑھ گئی اور بجرے میں بیٹھ کر چل پڑی۔ دریا کے دوسرے کنارے پہنچ کر وہ رتھ پر سوار ہو کر محل میں پہنچ گئی۔ اب اسے راجہ ہری کور سے ملنا تھا لیکن ہری کور جا چکا تھا تب اس نے ایک قاصد ہری کور کے پاس دوڑایا۔
سندر نگر کا راجہ اپنے کام کر کے واپس جا چکا تھا۔ اسے جو کچھ بتایا گیا تھا اس کے تحت راج پاٹ اور ست گرو، انگوری سے محفوظ تھا۔ جب اسے نندیتا کا پیغام ملا تو وہ الجھ گیا۔ راج پاٹ کے کاموں میں اسے خاصہ مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں نندیتا کے پاس جانا اسے ممکن نہ محسوس ہوا۔ پھر بھی بیٹی کا بلاوہ تھا اور بیٹی یقیناً کسی پریشانی کا شکار ہو گی اور پھر بہت سی سیاسی باتیں ہوں گی۔ راجہ ہری کور ست گرو سے مل کر اپنے راج پاٹ کو بھی مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ بیٹی کی بات سننے میں ہی نجات تھی وہ چل پڑا۔
رانی نندیتا نے پتا کا سواگت کیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ تھی۔
''بڑی بھول ہو گئی پتا جی! ابھی آپ کو واپس نہیں جانا چاہیے تھا۔'' وہ اسے اپنے محل میں لے جاتے ہوئے بولی۔
''کیوں بیٹی کیا بات ہے......؟''
''بس وہی انگوری کا کھیل۔''
''ارے کیوں ..... کیا تو اسے دریا پار اس عمارت میں نہیں لے گئی ..... کیا تو نے اسے اس دائرے میں قید نہیں کر دیا......؟'' راجہ ہری کور نے تعجب سے پوچھا۔
''یہ سب کچھ ہو گیا مہاراج پر میرا من شانت نہیں ہے۔'' نندیتا نے کہا اور راجہ ہری کور اپنی بیٹی کے سامنے ایک نشست پر بیٹھ گیا پھر بولا۔
''کیا بات ہے مجھے بتا ''
''میں نے آپ کی آگیا کے مطابق اسے اس دائرے میں بند کر دیا اور پھر میں نے اس سے پوچھا لیکن وہ انوکھی باتیں بتاتی ہے۔ ایسی باتیں جنہیں سن کر ڈر لگتا

ہے۔''

''کیا......'' ہری کور نے کہا۔

''وہ کہتی ہے کہ یہ سب جنم جنم کا کھیل ہے اور مجھے یہاں قید کرنے والی تو نہیں ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' راجہ ہری کور تعجب سے بولا۔

''ہاں......وہ کسی صمولالہ کا نام لیتی ہے۔''

''کون صمولالہ؟''

''میں نہیں جانتی مہاراج! پر وہ بڑے اعتماد سے کہتی ہے کہ اس کے پیچھے کسی صمولالہ کا ہاتھ ہے۔ ورنہ میں اسے قید کرنے کے قابل نہیں تھی۔'' رانی نندریتا نے کہا۔

''وہ تجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔'' راجہ ہری کور مسکرا کر بولا۔ ''تُو تو خود جانتی ہے کہ ہمارے درمیان کوئی صمولالہ نہیں۔ ہم نے تو یہ سب مہاراج وجے کپور کی مدد سے کیا ہے اور وجے کپور نے مجھے اس سلسلے میں چند باتیں بھی بتائی تھیں۔''

''خاص باتیں؟''

''ہاں......''

''بھگوان کے لئے مجھے وہ باتیں بتائیں۔ میں ان کے لئے بہت پریشان ہوں۔'' نندریتا نے کہا۔

''تُو آخر کیوں پریشان ہے نندریتا؟ تجھے چنتا کس بات کی ہے؟ ست گرو کا دواہ کسی بڑے دیش کی راجکماری سے ہونا چاہئے۔ انگوری خوبصورت ضرور تھی لیکن ایک ایسی لڑکی سے ست گرو کا دواہ کسی طور مناسب نہیں ہوتا جس کے نہ ماں باپ کا پتہ نہ ذات پات کا ٹھکانہ۔''

''یہ تو ٹھیک ہے مہاراج...... پر نجانے کیوں مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔'' نندریتا نے کہا۔

''رہی نا عورت کی عورت۔ عورت ذات میں یہی تو ایک خرابی ہے۔ بڑی نرم دل ہوتی ہے۔'' راجہ ہری کور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مہاراج......مگر آپ مجھے بتائیں کہ مہاراج وجے کپور نے آپ کو کیا بتایا تھا؟''

''وجے کپور مہاراج نے کہا تھا کہ یہ ایک لمبا کھیل ہے۔ وہ پترو کا ایک پاٹھ

ہے جو انسانی روپ میں آیا ہے۔ کتابوں کی ایک کہانی ہے جسے کھولنا ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اس سے نجات ضروری ہے۔''

''اور کیا وجے کپور مہاراج نے یہی کیا تھا؟''

''ہاں......''

''لیکن انہوں نے یہ تو بتایا ہوگا کہ آخر انگوری کا سروپ کیا ہے۔''

''نہیں...... یہ انہوں نے نہیں بتایا۔''

''آپ ان سے پوچھیں۔''

''پوچھ لوں گا۔''

''نہیں مہاراج! میرے من کو شانتی اس سے ملے گی جب آپ یہ سب کچھ مجھے بتا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے...... میں واپس جا کر وجے کپور مہاراج سے ملوں گا۔'' راجہ ہری کور نے کہا اور پھر وہ واپس چلے گئے۔

رانی نندریتا کے دل کو اب بھی سکون نہیں ملا تھا۔ انگوری سے جلدی ملنے کا کہہ آئی تھی لیکن اس کو راجہ ہری کور کے انتظار میں کافی وقت گزر گیا تھا۔ چنانچہ راجہ کے جانے کے بعد اس نے فوری طور پر دریا کے پار جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شاہی بجرا نندریتا کو لے کر چل پڑا۔ دریا کے بیچوں بیچ وہ پراسرار سفید قید خانہ نظر آ رہا تھا جو انگوری کا قید خانہ تھا۔ اس قید خانے پر آٹھ طاقتور پہرے دار پہرہ دے رہے تھے۔

رانی نندریتا نے بجرے سے اتر کر اس محل کا رخ کیا تھا اور دروازے سے نکل کر اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں حصار بنا ہوا تھا۔ حصار کے درمیان انگوری نیم مردہ سی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے نظر آ رہے تھے۔ ہونٹ بالکل سوکھ گئے تھے اور اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔

''انگوری......'' رانی نندریتا نے اسے آواز دی اور انگوری نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں زمانے بھر کے غم سمٹ آئے تھے۔ ایسی اداسی، ایسی ویرانی تھی ان آنکھوں میں کہ نندریتا کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں مسل دیا ہو۔

''انگوری......'' اس بار وہ بے اختیار ہو کر چیخی اور انگوری نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ تب اس کی کمزور آواز بہت آہستہ سے ابھری۔

''میں اٹھ نہیں سکتی نندیرتا۔''

''تمہیں کیا ہوا انگوری؟'' نندیرتا نے تاسف سے کہا۔

''میں بھوکی پیاسی ہوں نندیرتا......'' انگوری نے اسی کمزور آواز میں کہا اور رانی نندیرتا کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

''کیوں......؟'' وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں کیا جانوں نندیرتا۔'' انگوری نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''تم کب سے بھوکی ہو؟''

''جب سے تم یہاں سے گئی ہو، ان ملا نہ پانی۔'' انگوری نے کہا اور رانی نندیرتا کے دماغ میں آگ سلگ اٹھی۔ وہ وحشیانہ انداز میں وہاں سے باہر نکل آئی۔ محافظوں کے سردار کو اس نے طلب کیا اور قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

''قیدی کو ان پانی دینے سے کس نے منع کیا تھا؟ کیا تمہارا یہ فرض نہیں تھا کہ تم اسے ان پانی دیتے؟''

''ہم نے کوشش کی تھی رانی جی۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے...... کوشش سے تیرا کیا مطلب ہے؟''

''جس جگہ وہ قید ہے وہاں کوئی نہیں جا سکتا وہ دیواریں نظر تو نہیں آتیں لیکن ان کی دوسری طرف جانا ممکن نہیں ہے۔''

''کون سی دیواریں؟''

''جہاں وہ قید ہے۔''

''تو بکواس کر رہا ہے پاپی...... جا جلدی سے ان پانی لا...... نے خود مجھے اپنی نگاہوں میں ذلیل کر دیا ہے۔''

محافظ دوڑ گیا اور نندیرتا اس وقت تک انتظار کرتی رہی جب تک وہ تھال لے کر نہ آ گیا۔ رانی نندیرتا خود تھال لے کر چل پڑی۔ اسے شدید رنج تھا۔

لیکن جب وہ سب کچھ بھول کر دائرے کے پاس پہنچی اور اس دائرے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو کسی غیر مرئی دیوار سے ٹکرائی۔ اس نے بے چینی سے اس دیوار کو ٹٹولا اور پھر دائرے کے گرد چکر لگانے لگی لیکن کہیں سے اندر جانے کا راستہ نہیں تھا۔

دائرے کے اندر سے انگوری اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ بے بسی سے نندیرتا کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''انگوری! میں اندر کیسے آؤں...... میں کیسے اندر آؤں انگوری؟'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا تم نے میری بات کو جھوٹ سمجھا تھا رانی نندیرتا؟'' انگوری کمزور آواز میں بولی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ جو کچھ تُو نے کیا ہے اس میں صرف تمہارا ہی ہاتھ نہیں ہے بلکہ میرا ایک پرانا دشمن صموالالہ تمہارے ذریعے اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ یہ دھوکے بازی نہ کرتیں تو میرے بیری صموالالہ کو کامیابی نہ ہوتی۔ میں جب تک آزاد تھی وہ مجھ سے دور دور رہا۔ اس کی کبھی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ مجھ پر وار کرنے کی کوشش کرتا یا کبھی میرے سامنے آتا۔ لیکن افسوس کی بات یہی ہے کہ اس نے تمہارے ذریعے یہ فائدہ اٹھایا۔ تمہارے ذریعے نندیرتا! جس کی سب سے بڑی ہمدرد میں تھی۔ تم نے جو کچھ سمجھا تھا غلط سمجھا تھا نندیرتا! میں تمہارے بیٹے ست گرو کے لئے کسی طور بھی تکلیف دہ ثابت نہ ہوتی۔ میں تو اس کی زندگی کی محافظ تھی۔'' انگوری نے کمزور اور ٹھہرے ٹھہرے انداز میں یہ جملے ادا کئے۔ رانی نندیرتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''انگوری...... انگوری! جو کچھ تم کہہ رہی ہو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پر مجھے اس بات کا بہت ہی افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم بھوکی پیاسی پڑی ہو۔''

''تمہارا شکریہ رانی نندیرتا کہ تم نے میرے لئے دو آنسو تو بہا لئے۔ پر میں اسے کیا سمجھوں، میرا دشمن میرے لئے رو رہا ہے۔ وہ میرے لئے رو رہا ہے جو میری اس درگت کا باعث بنا ہے۔ وہ رو رہا ہے میرے لئے جس نے میری جنم جنم کی آشاؤں کو خاک میں ملا دیا۔ اب نجانے کب تک مجھے اس حال میں رہنا پڑے۔ میں اپنے اس دشمن کو کیا سمجھوں جس نے خود ہی میری راہ میں کانٹے بچھائے اور اب خود ہی افسردہ ہے۔''

''بھگوان کے لئے انگوری...... مجھے اپنا دشمن مت سمجھو۔ تم مجھے صرف ایک ماں سمجھو۔ وہ ماں جس نے اپنے بیٹے کے لئے تمہاری حقیقت جاننا چاہی تھی۔ بس اس سے زیادہ میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔''

''اب ان باتوں کو چھوڑو رانی نندیرتا! اب ان باتوں میں تمہیں کیا ملے گا؟''

''نہیں انگوری! تو اگر ضد پر اڑی ہوئی ہے تو لے، میں اپنی ضد توڑے دیتی ہوں۔ میں تجھے اس طرح مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ بھگوان کی سوگند تجھے بھوکا پیاسا دیکھ

کر میری آتما تڑپ اٹھی ہے۔ میں اس سے تک بھوجن نہیں کروں گی جب تک کہ تیرے پیٹ میں اَن نہ پہنچا دوں۔''

''ایسی باتیں کر رہی ہو نندیتا جو تمہارے بس کی بات نہیں ہیں۔'' انگوری نے کہا۔

''بس، تُو دیکھتی رہ ...... میں ہنگامہ کر دوں گی۔ کچھ بھی ہو جائے میں تیرے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کروں گی۔ میں جا رہی ہوں انگوری! میں ایک بار پھر جا رہی ہوں۔ مگر میرے آنے سے پہلے مر نہ جانا۔ ورنہ میں سارا جیون خود کو معاف نہیں کروں گی۔'' رانی نندیتا نے کہا اور پھر وہ روتی ہوئی وہاں سے پلٹ پڑی۔ اس بار اس نے انگوری سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

راجہ ہری کور واپس جا چکا تھا لیکن رانی نندیتا سکون سے نہیں تھی۔ اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ اٹل تھا۔ چنانچہ نندیتا سیدھی راجوریہ کے پاس گئی اور پہلی بار اس نے انگوری کی کہانی اسے سنائی۔ لیکن اس کہانی میں سے اس نے وہ جملے حذف کر دیئے تھے جس میں راجہ ہریرتے کے قتل کی بات تھی۔ البتہ انگوری کے بارے میں اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ ایک سندر ناری ہے اور اس طرح سے اسے ملی تھی اور وہ کئی خوبیوں کی مالک ہے۔

''انوکھی بات ہے ...... ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔'' راجوریہ نے کہا۔

''میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں مہاراج کہ اب کیا، کیا جائے؟''

''کیا کرنا چاہتی ہو نندیتا؟'' راجوریہ نے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ سارے اندیشے نظر انداز کر کے اسے سب سے پہلے اس قید خانے سے نکالوں۔ بھگوان کی سوگند میں نے بھی سوگند کھائی ہے کہ جب تک اسے اَن پانی نہیں دے دوں گی خود بھی کچھ نہ کھاؤں گی۔''

''اوہ ...... اگر یہ بات ہے تو جاؤ اپنے پتا جی سے ملو۔ ان سے کہو کہ وہ وجے کپور مہاراج کو لے کر یہاں آئیں اور اس بے چاری لڑکی کو اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ اس کے بعد تم انگوری سے اس کی اصلیت پوچھ لینا۔ اگر وہ اس قابل ہو کہ اس کا دواہ گرو سے کیا جا سکے تو پھر کر دینا ورنہ جیسے بھی حالات ہوں۔'' راجوریہ نے کہا۔

''میرے سندر نگر جانے کی تیاریاں کریں مہاراج! میں تیز رفتار گھوڑوں پر جاؤں گی تاکہ جلد از جلد سندر نگر پہنچ سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے پتا جی کو جانے دیا۔ میں تو بلاوجہ ایک مصیبت میں پھنس گئی۔'' رانی نندیتا نے کہا۔

''ٹھیک ہے ...... تم گھوڑے کی بجائے زیادہ گھوڑوں کے رتھ پر سوار ہو کر چلی جاؤ۔ مہاراج ہری کور اور وجے کپور مہاراج کو اپنے ساتھ لے آنا۔'' راجوریہ نے کہا اور رانی نندیتا نے تیاریوں کا حکم دے دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ رانی نندیتا کے دل پر سخت چوٹ لگی تھی۔ انگوری اس کی نگاہوں میں پراسرار ضرور تھی پر اسے اس لڑکی سے کوئی بیر نہیں تھا۔ ایسی سندر، ایسی من موہنی تھی کہ دیکھ کر دل میں سرور اترتا تھا۔ اگر ست گرو کے دواہ کی بات نہ کرتی اور اس کے علاوہ سنسار کی کوئی بھی چیز مانگ لیتی تو رانی نندیتا اسے منع نہ کرتی۔ لیکن بات ایسی تھی کہ رانی نندیتا پریشان ہو گئی تھی اور سوچ میں مبتلا ہو گئی تھی۔ لیکن اب انگوری کی یہ نئی افتاد دیکھ کر رانی نندیتا کا دل بالکل ہی ڈانواں ڈال ہو گیا تھا۔

اس کی محسنہ جس نے اسے زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سے ہمکنار کیا تھا، ایسی کامیابی جس نے بسوامیوں کو گمنامی کی زندگی سے نکال کر حکومت دلا دی تھی اور اب یہ حکومت پشتوں کے لئے بسوامیوں کے قبضے میں تھی۔ اس محسنہ کو نندیتا نے بھوک پیاس میں مبتلا کر کے موت کے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔

رتھ سفر کر رہے تھے اور رانی نندیتا دن رات کی پرواہ کئے بغیر سندر نگر جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے باپ کی راج دھانی میں داخل ہو گئی۔ راجہ ہری کور کو بیٹی کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے محل سے بہت دور راستے میں اس کا سواگت کیا اور بڑے پیار سے اسے محل میں لے گیا۔

نندیتا کے چہرے پر پھیلی آزردگی سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔

''سمے آ گیا ہے مہاراج کہ ہمارا راز کھل جائے۔ وہ راز جو میں نے اپنے پتی سے چھپا کر رکھا ہے۔ اگر میرے پتی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ راجہ ہریرتے کی موت کا باعث میں ہی ہوں تو اس کے بعد میں نہیں کہہ سکتی مہاراج کہ کیا ہو۔''

راجہ ہری کور یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ اس نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن یہ راز کھل کیسے سکتا ہے نندیتا؟''

''اس لئے کہ میں نے راجوریہ کو انگوری کے بارے میں بتا دیا ہے۔''

''تم نے؟''

''ہاں پتا جی مہاراج! وجے کپور مہاراج نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم قید کے

دوران اسے اَن پانی بھی نہیں دے سکتے۔''

''کیا مطلب؟''

''اُن کے کھینچے ہوئے حصار میں سے اَن پانی بھی نہیں گزر سکتا۔ میں اس کی موت تو نہیں چاہتی تھی مہاراج!''

''پھر تم کیا چاہتی تھیں تندریتا؟'' راجہ ہری کور نے کسی قدر جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''پتا جی مہاراج! بات اگر ایک ایسے انسان کے جیون کی نہ ہوتی جس نے بسوامیوں کی نسلوں پر احسان کیا ہو، جس نے حکومت بسوامیوں کے لئے آسان کر دی ہو تو میں آپ کو کبھی پریشان نہ کرتی۔''

''لیکن اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''پتا جی مہاراج! وجے کپور مہاراج سے کہیں کہ وہ اپنا حصار توڑ دیں۔ اگر انگوری میرے لئے غلط ثابت ہوئی تو میں نہ دوبارہ آپ کو تکلیف دوں گی نہ وجے کپور مہاراج کو۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو تندریتا ...... اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خود بھی تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔ تم ایک خطرناک شخص کی آزادی کے لئے کوششیں کر رہی ہو۔ انگوری جس قدر پراسرار ہے ہمیں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔''

''لیکن وہ میرے لئے بری نہیں ہے۔''

''بری ہو سکتی ہے ......''

''یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا تندریتا!'' راجہ ہری کور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوں مہاراج!''

''لیکن میں تجھے یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔''

''میں مشورہ لینے نہیں آئی مہاراج! عمل کرنے آئی ہوں۔''

''میں اگر انکار کر دوں تو؟''

''تو پتا جی میں جان پر کھیل جاؤں گی۔''

''تندریتا ...... تندریتا ...... ہوش میں آ ...... یوں لگتا ہے کہ جیسے اس کا جادو تجھ پر

چل گیا ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں پتا جی! اس کے سارے جادو تو اس حصار میں جا کر ختم ہو گئے ہیں۔''

''بہر حال تندریتا! اب میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''سوچ لیں پتا جی! اگر بسوامیوں کی حکومت ہلی تو سندر نگر بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ ہریرتے کی اولاد بن باس کے لئے چلی گئی ہے لیکن مہاراج! راجوریہ کو حقیقت معلوم ہوئی تو وہ برداشت نہ کر سکیں گے۔ اور پھر ست گرو میرا سپوت ہے۔ وہ میری مرضی پر چلے گا۔''

''تو ...... تو اپنے پتا کو دھمکی دے رہی ہے؟'' راجہ ہری کور حیرت سے بولا۔

یہ حقیقت تھی۔ بسوامیوں کی حکومت کی مضبوطی خود اس کی حکومت کی مضبوطی تھی ورنہ شاید ہریرتے سندر نگر کو بھی الٹ پلٹ کر دیتے۔ چنانچہ راجہ کسی قدر پریشان ہو گیا۔

''دھمکی نہیں دے رہی پتا جی! اصول کی بات کر رہی ہوں۔''

''یہ اصول کی بات ہے؟''

''ہاں پتا جی!''

''پھر سوچ لے تندریتا ...... اچھی طرح سوچ لے۔''

''اچھی طرح سوچ لیا ہے مہاراج!''

''ہوں ...... اچھا چل کچھ جل پانی کھا پی، میں اس مسئلے پر سوچوں گا۔'' راجہ ہری کور نے کہا۔

''آپ کو ایک اور بات معلوم نہیں ہے پتا جی!'' تندریتا نے کہا۔

''کیا؟''

''میں نے ایک سوگند اٹھائی ہے۔''

''کیسی سوگند؟''

''یہی کہ جب تک انگوری کے پیٹ میں اَن نہیں جائے گا میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔''

''کیا کہہ رہی ہو تندریتا؟'' راجہ ہری کور چونک پڑا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"ہاں پتا جی! میں نے یہ سوگند کھائی ہے۔"

"اوہ...... تو نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے نندیرتا! اچھا تو تھوڑی دیر آرام کر، میں وجے کپور مہاراج کے پاس چلنے کی تیاری کرتا ہوں۔" راجہ ہری کور نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلوں گی مہاراج!" رانی نندیرتا نے کہا اور راجہ ہری کور نے گردن ہلا دی۔

بیٹی کی ضد سے وہ کافی پریشان ہو گیا تھا اور یہ پریشانی دوہری تھی۔ رانی نندیرتا کے ذہن پر جس طرح انگوری اثر انداز ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ کر بیٹھے گی جو وہ کر سکتی ہو۔ اور ظاہر ہے راجہ ہری کور یہ بات نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حکومت کمزور پڑے اور بسوامیوں کے درمیان کوئی انتشار پیدا ہو۔ ظاہر ہے یہ انتشار خود اس کی حکومت کے لئے بے حد خوفناک تھا۔ آنے والا سمے نہ جانے کیسا ہو اور راجہ ہری کور کو اپنا تخت بچانے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑے۔ اس لئے وہ نندیرتا کے ساتھ مصالحت پر راضی ہو گیا۔ تیاریاں کرانے کے بعد وہ اسی جانب چل پڑا جہاں وہ پہلی بار وجے کپور مہاراج سے ملا تھا۔ رانی نندیرتا بھی اس کے ساتھ تھی۔

وجے کپور کی خانقاہ ایک ویرانے میں تھی جہاں وہ غار میں بند رہا کرتے تھے۔ اور جب وہ غار سے باہر آتے تو ان کے چیلے چانٹے ان کی یاترا کا بندوبست کر دیتے۔

چنانچہ جب راجہ ہری کور اور رانی نندیرتا پہاڑوں میں اس جگہ پہنچے جہاں وجے کپور مہاراج کی خانقاہ تھی تو نیچے سے ہی انہیں چیلے چانٹوں کا ہجوم نظر آیا جو لمبی لمبی ہزارہ تسبیح ہاتھ میں لئے انہیں جپ رہے تھے۔ وہاں ایک انوکھا ماحول اور ایک عجیب منظر تھا۔

راجہ ہری کور اس جگہ پہنچ گیا لیکن وہاں اس کی کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی۔ یہ سادھوؤں کا ڈیرہ تھا اور یہاں پر راجاؤں کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ تب راجہ ہری کور نے ایک سادھو سے کہا کہ وہ وجے کپور مہاراج سے ملنے آیا ہے۔ انہیں اس کے آنے کی اطلاع دی جائے اور یہ کہ وہ بڑی دور سے آیا ہے اور ہر حالت میں ان سے مل کے جانے کا خواہش مند ہے۔"

سادھو گردن ہلانے لگا۔

"یہ ممکن نہیں ہے مہاراج!" سادھو نے تسبیح کے دانے روکتے ہوئے دانت نکال کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وجے کپور مہاراج اب آپ سے نہیں مل سکتے۔" سادھو نے تسبیح کے دانے دوبارہ پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔

"میں راجہ ہری کور ہوں۔ تم انہیں جا کر یہ اطلاع دو کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔"

"میں کیسے جا سکتا ہوں مہاراج...... وہ تو غار میں بند ہو چکے ہیں اور اب اس سمے تک کسی کو ان کی یاترا نہیں ہو سکتی جب تک وہ خود غار سے باہر نہ آئیں۔ آپ کو شاید ان کے بارے میں معلوم نہیں ہے مہاراج! وہ اپنی مرضی سے غار سے باہر آتے ہیں اور اپنی مرضی سے غار میں بند ہو جاتے ہیں اور جب وہ غار میں چلے جاتے ہیں تو ہمارا کام صرف یہی ہوتا ہے کہ یہاں بیٹھے مالا جپتے رہیں۔"

"اوہ......" راجہ ہری کور نے پریشانی سے کہا۔ "تو کیا وہ غار کے اندر جا چکے ہیں؟"

"ہاں مہاراج......"

"کتنے سمے کی بات ہے؟"

"تیسرا دن ہے آج۔" سادھو نے جواب دیا اور راجہ ہری کور نے پریشانی سے رانی نندیرتا کی طرف دیکھا۔ رانی نندیرتا کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی پھر ضدی لہجے میں بولی۔

"کچھ بھی ہو مہاراج...... انہیں ہم سے ملنا ہی ہوگا۔"

"ارے...... ارے پگلی سادھو سنت ایسے نہیں ہوتے کہ راجا مہاراجاؤں اور طاقتوروں کے سامنے جھک جائیں۔ یہ لوگ مر جاتے ہیں پر جھکتے نہیں کسی کے آگے۔ یہ تو ان کی مرضی کی بات ہے۔"

"میں کہتی ہوں پتا جی مہاراج! انہیں ہم سے ملنا ہی ہوگا۔" رانی نندیرتا ہٹیلے لہجے میں بولی۔

"اب تو مجھے پریشان کرنے پر تلی ہوئی ہے نندیرتا! بتا میں کیا کروں؟"

"وجے کپور مہاراج کو غار سے نکالو۔" رانی نندیرتا نے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''ہر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے پتا جی! یہ کسی کے جیون کا سوال ہے۔ وجے کپور مہاراج سادھو ہیں۔ اگر وہ سادھو ہیں تو انہیں یہ بات ماننی چاہئے کہ کسی کے جیون کو بچانے کے لئے سارے آرام قربان کر دیئے جاتے ہیں۔ اپنا آپ تیاگ دینا پڑتا ہے دوسروں کے لئے۔ تب آدمی بھگوان کے نزدیک ہوتا ہے۔''

''پر وہ آرام تو نہیں کر رہے ہوں گے نندیتا! یہ تو ان کی تپسیا کا وقت ہے۔'' راجہ ہری کور نے کہا۔

''یہ کسی کے جیون جانے کی بات ہے۔ اگر آپ مہاراج وجے کپور کو غار سے نہیں نکال سکتے تو پھر میں یہ کوشش کرتی ہوں۔'' رانی نندیتا نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

چیلے چانٹوں نے اسے رکنے کی درخواست کی تھی لیکن رانی نندیتا نے انہیں اپنا مرتبہ بتایا اور وہ سب اس کے آگے سے ہٹ گئے۔ رانی نندیتا غار کی اس چٹان کی طرف بڑھ گئی جس کے غار کا دہانہ ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے چٹان کے نزدیک پہنچ کر وجے کپور مہاراج کو بے شمار آوازیں دیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ تب اس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے چٹان کو ہٹانے کی کوشش کی لیکن ایک کمزور عورت کے ہاتھوں ایک وزنی چٹان کس طرح ہٹ سکتی تھی۔ تب رانی نندیتا نے سادھوؤں کی جانب دیکھا اور پھر تنتناتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اس پتھر کو ہٹاؤ...... میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اس پتھر کو ہٹاؤ۔''

''نہیں دیوی! تم ہماری گردنیں کاٹ سکتی ہو پر ہمیں مہاراج وجے کپور کی تپسیا بھنگ کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتیں۔'' سادھوؤں نے ادب سے جواب دیا۔

''پتا جی مہاراج! یہ لوگ عقیدت میں پاگل ہو گئے ہیں لیکن کیا آپ بھی یہ کام نہیں کر سکتے؟''

''کر سکتا ہوں نندیتا! مگر یوں لگتا ہے تیری وجہ سے میں کسی کشٹ میں پڑنے والا ہوں۔ سادھو سنتوں کو ان کے ابھاگ سے ہٹانا اچھی بات نہیں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں پتا جی! اس کے بعد میں کبھی آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔ مجھے اس مشکل سے نکال لیجئے۔''

راجہ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ غار کا پتھر ہٹا دیں اور اس کے حکم پر وہ لوگ پتھر پر زور لگانے لگے۔

پتھر ہٹ جانے کے بعد وہ راجہ ہری کور کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ یہ ایک لمبی اور تاریک سرنگ تھی جس میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن دور، بہت دور روشنی کا ایک سرا نظر آ رہا تھا۔

وہ دونوں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ تب نندیتا بولی۔

''وہ اس طرف روشنی ہے مہاراج!''

''کون جانے اس طرف کیا ہے؟''

''آپ آگیا دیں تو میں اس طرف جاؤں۔''

''نہیں...... میں بھی چل رہا ہوں۔'' راجہ نے کہا اور دونوں باپ بیٹی چل پڑے۔ کافی دیر کے بعد وہ لمبی سرنگ کے اس سرے پر پہنچ سکے جس کی دوسری طرف سورج کی روشنی چمک رہی تھی۔

یہ گپھاہ کا دروازہ تھا۔ دونوں چند ساعت یہاں رکے اور پھر اندر داخل ہو گئے۔ دوسری سمت ایک روشن اور کشادہ غار تھا جس میں ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔ سورج کی روشنی بلندی کے ایک سوراخ سے آ رہی تھی اور اس سوراخ سے نیلا آکاش صاف نظر آ رہا تھا۔

انہوں نے غار میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر ایک منظر دیکھ کر وہ دونوں ساکت و جامد رہ گئے۔ غار کے بیچوں بیچ ایک مرگ چھالہ بنا ہوا تھا۔ مرگ چھالہ کے پاس پانی کا بھرا ہوا ایک کلسہ رکھا تھا۔ کلسے کے پاس ایک سیاہ رنگ کا کنڈل اور لکڑی کی کھڑاؤں رکھی تھیں اور سب سے حیرت انگیز چیز جو تھی وہ مرگ چھالہ پر بیٹھا ہوا ایک استخوانی ڈھانچہ تھا۔

ہاں...... ایک انسانی ڈھانچہ جس کے پورے بدن پر گوشت یا کھال کا ایک نشان بھی نہیں تھا۔ ڈھانچہ پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے، بالکل تپسیا کے انداز میں۔

راجہ ہری کور ہیبت سے لرز اٹھا تھا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے اس استخوانی وجود کو دیکھ رہا تھا جو بے جان تھا۔ رانی نندیتا بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ دیر تک خاموشی رہی اور پھر راجہ ہری کور کی سرسراتی آواز ابھری۔

''اب کچھ اور بھی دیکھنا چاہتی ہے نندیتا؟''

''مہاراج...... مہاراج...... کہاں ہیں؟'' نندیتا کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''من کی آنکھوں سے دیکھ...... تو ان کی کھڑاؤں اور کنڈل نہیں پہچان رہی؟''

''مگر پتا جی مہاراج......''

''سادھو سنتوں کے کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ ان کی حکومت الگ ہوتی ہے نندیتا! تم نے غار کا دہانہ کھلوا لیا۔ اب کوئی طاقت مہاراج کو ہمارے سامنے آنے پر مجبور کر سکتی ہے؟''

''تو کیا انگوری یونہی مر جائے گی؟ آہ...... میں یہ نہیں چاہتی۔'' نندیتا زار و قطار رونے لگی۔ پھر وہ دھیرے لہجے میں بولی۔ ''وجے کپور مہاراج! واپس آ جائیے...... ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ واپس آ جائیے وجے کپور جی!''

''آؤ نندیتا! ہم نے جو پاپ کیا ہے وہی بہت ہے۔ اب تم ان کی آتما کو اور تو پریشان مت کرو۔''

رانی نندیتا روتی ہوئی غار سے نکل آئی۔ وہ واپسی میں بھی سارے راستے روتی رہی۔ راجہ اسے سمجھا رہا تھا کہ رانی کو اتنا دل نہیں ہونا چاہئے۔

''نندیتا! ہمت سے کام لو۔ اگر اس کا جیون ہمارے لئے بہت ہوتا تو مہاراج اس کی سہائتہ ضرور کرتے۔''

''پر میں کیا کروں پتا جی مہاراج! میں اس کی موت تو نہیں چاہتی تھی۔ کاش اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم ہو جاتا...... اب وہ بھوکی پیاسی تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔'' نندیتا نے روتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے اس کی موت ہی ہمارے حق میں بہتر ہو۔''

''نہیں مہاراج! وہ اتنی بری نہیں ہے مہاراج! وہ اتنی بری نہیں ہے۔'' نندیتا نے کہا اور پھر وہ محل واپس پہنچ گئی۔ ''میں ابھی واپس جاؤں گی۔ میرا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''تھکی ہوئی ہو نندیتا! کچھ دیر آرام کرو۔ ایک آدھ دن میں واپس چلی جانا۔''

''نہیں مہاراج! میں اب نہیں رک سکتی۔'' نندیتا نے کہا اور پھر راجہ کی لاکھ کوشش کے باوجود یہاں نہیں رکی اور واپس چل پڑی۔ اس نے خود ہی انگوری کو اس جال میں پھانسا تھا لیکن اب اس کا دل انگوری کے لئے خون کے آنسو رو رہا تھا۔

واپسی کا سفر کرتے ہوئے وہ اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔ ہے رام کیا کروں؟

اس سے تو میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں تو بلاوجہ اس کی ہتھیاری بن گئی اب میں اسے کیا منہ دکھاؤں گی؟ دوسری مجھ سے بڑی غلطی یہ ہو گئی کہ میں تے اپنے پتی کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اب اگر یہ بھید کھل گیا تو کیا راجہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو معاف کرے گا؟ مجھے عقل سے کام لینا چاہئے...... مجھے سمجھنا چاہئے۔

لیکن انگوری کی آگ کچھ اس طرح دل میں سلگ رہی تھی کہ واپس پہنچ کر بھی اس نے دریا کا ہی رخ کیا۔ شاہی بجرا ہمیشہ دریا کے کنارے رہتا تھا اور اس کے اشارے پر اسے دریا کے درمیان خوبصورت جزیرے پر لے گیا۔

رانی نندیتا نے کسی کو اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ وہ جزیرے پر پہنچنے کے بعد اس حسین عمارت کی طرف بڑھ گئی جو درحقیقت انگوری کے لئے قید خانہ تھی۔ اتنے خوبصورت قید خانے میں اتنی ہی خوبصورت لڑکی کو قید کیا جا سکتا تھا۔ لیکن عمارت کے دروازے کے اندر قدم رکھتے ہوئے رانی نندیتا کا دل ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اسے اپنے مجرم ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ شرمساری اس جگہ پہنچی جہاں دائرے کے اندر انگوری کا وجود پڑا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت اور دلکش لڑکی جسے پہلی بار رقص کرتے دیکھ کر رانی نندیتا نے سوچا تھا کہ اگر یہ لوگوں کے درمیان آ جائے تو قیامت برپا ہو جائے اب اپنی دلکشی کھو چکی تھی۔

اس کے رخسار کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ نازک ہونٹ سوکھی ہوئی گلاب کی پتیوں کی مانند کملائے کملائے نظر آ رہے تھے۔ اس کی حسین آنکھیں جو کبھی فتح مندی کی چمک رکھتی تھیں اب اس طرح بے نور نظر آ رہی تھیں جیسے ان کی روشنی جاتی رہی ہو۔ ادھ کھلی آنکھیں جو نقاہت کے باوجود پوری طرح کھولی جا سکتی تھیں دروازے کی جانب نگراں تھیں۔

رانی نندیتا پہلی نگاہ میں تو یہی سمجھی کہ انگوری مر چکی ہے اور اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں اس کی راہ تکتے تکتے اپنا حُسن کھو بیٹھی ہیں لیکن جب نندیتا کو دیکھ کر ان میں ہلکی سی جنبش ہوئی تو نندیتا کو احساس ہوا کہ اس کا پہلا خیال غلط تھا۔

رانی نندیتا دائرے کے قریب پہنچ کر ان غیر مرئی دیواروں کو ٹٹولنے لگی جو اس کے اور انگوری کے درمیان حائل تھیں۔ اس کے دل میں ایک آرزو پیدا ہوئی کہ کاش...... وہ دیواریں خودبخود ختم ہو گئی ہوں۔ لیکن بھلا سوچی ہوئی بات بھی کبھی پوری ہوتی ہے؟

دیواریں بدستور قائم تھیں۔ رانی نندیتا سسک پڑی اور انگوری اپنے کمزور ہاتھوں سے سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ بمشکل تمام وہ اٹھ کر بیٹھ سکی تھی۔ پھر اس کی سوالیہ نگاہیں نندیتا پر جم گئیں اور اس کی مہین سی آواز ابھری۔ آواز جو نقاہت سے بھرپور تھی۔

''رانی نندیتا! میرا خیال ہے کہ تم سندر نگر گئی تھیں۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں انگوری ...... تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔''

''کس لئے گئی تھیں رانی نندیتا؟''

''اس لئے کہ جو پاپ کر بیٹھی ہوں اس کا پراشچت کروں۔'' رانی نندیتا نے سسکتے ہوئے کہا اور انگوری آہستہ سے ہنس پڑی۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے ہڈیوں پر کوئی چیز آہستہ آہستہ بجائی جا رہی ہو۔ پھر اس نے نیم مردہ آواز میں کہا۔

''تم نے بلاوجہ تکلیف کی رانی نندیتا! مجھ سے پوچھتی تو میں تمہیں منع کر دیتی۔''

''کیوں انگوری ...... کیوں؟'' رانی نندیتا نے تعجب سے کہا۔

''نندیتا! ظلم کر کے اب اس کا تدارک کرنا چاہتی ہو۔ اگر تمہیں میرا اتنا ہی خیال تھا تو پہلے ہی اس حرکت سے باز رہتیں۔'' انگوری نے نفرت سے کہا۔

''نہیں انگوری، نہیں ...... تم جانتی ہو میں نے یہ سب اس لئے نہیں کیا کہ تمہیں تکلیف پہنچے۔ بلکہ صرف اپنے ست گرو کے لئے یہ چاہتی تھی کہ تمہاری حقیقت میرے علم میں آ جائے۔''

''بس اب ان فضول باتوں کو چھوڑو نندیتا! اگر تم جاتے وقت مجھ سے پوچھ لیتیں تو میں تمہیں بتا دیتی کہ صمورالہ کبھی وہ سب کچھ نہ کرے گا جو تم چاہتی ہو۔ وہ تو سدا سے میرا بیری ہے اور بھلا وہ کام جو اس کی سب سے بڑی منو کامنا تھی ہونے کے بعد کیا اس کا ازالہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا؟'' انگوری نے لرزتے ہوئے کہا۔

''انگوری ...... انگوری! بھگوان کی سوگندھ، میں نے جیون میں بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ میں اس پاپ کے لئے کبھی خود کو معاف نہ کروں گی۔''

''ہاں نندیتا! بھگوان بھی تمہیں اس پاپ کے لئے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ تم نے وشواش گھات کیا ہے۔ میں تمہارے لئے بری نہیں تھی۔ اگر تمہیں ست گرو سے میرا بیواہ منظور نہ تھا تو منع کر دیتیں۔ یہ کہہ دیتیں کہ تم اب اپنا وچن پورا نہیں کر

سکتیں۔ پر تم نے میرا جیون ہی لے لیا۔''

انگوری نے ایسے درد بھرے لہجے میں کہا کہ نندیتا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے اور اس کے دونوں ہاتھ اس طرح دیواروں کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے جیسے وہ ان دیواروں کو چکنا چور کر کے انگوری کے پاس جانا چاہتی ہو۔ پھر اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''انگوری ...... انگوری! بھگوان کی سوگندھ، میرے من میں یہ نہیں تھا ...... یہ نہیں تھا میرے من میں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تیرے ساتھ اتنا بڑا انیائے ہونے والا ہے۔ مجھے شما کر دے۔ انگوری! مجھے شما کر دے۔ ورنہ میں سارا جیون جلتی رہوں گی۔ جب تک جیتی رہوں گی جلتی رہوں گی۔''

''نہیں نندیتا! میں تمہیں شما نہیں کر سکتی۔ تو نے مجھ سے میرا پورا جنم چھین لیا ہے۔ تم نے وہ سب کچھ کر ڈالا ہے نندیتا جس کی میں تم سے توقع نہیں رکھتی تھی۔ سنو، صمورالہ چاہے کچھ بھی بن جائے، وہ تمہارے ساتھ مل کر میرے لئے کتنا ہی برا کیوں نہ کرے لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب میں جیون کمار کو پا لوں گی۔ سنا تم نے نندیتا ...... تمہارا جیون کمار، میرا جیون کمارا، تمہارا ست گرو میرا نہیں بن سکا تو نہ سہی۔ کسی نہ کسی جنم میں، میں اسے ضرور پا لوں گی۔ اب میری بات بھی سن لو رانی نندیتا! یہ میری پیشین گوئی ہے کہ ست گرو تمہارا من شانت نہیں کر سکے گا۔ وہ سمے بہت جلد آنے والا ہے ...... وہ سمے بہت جلد آئے گا جب تمہیں ست گرو کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔ رانی نندیتا! تمہارا ست گرو مارا جائے گا ...... اس طرح مارا جائے گا کہ تم اسے رو بھی نہ سکو گی۔ تمہارے آنسو اس کی موت پر خشک ہو جائیں گے۔ یہ میری پیشین گوئی ہے۔''

انگوری نے کہا اور پھر اس نے دونوں گھٹنے سمیٹ لئے اور دونوں بازو گھٹنوں کے اردگرد کر کے اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

رانی نندیتا بلک بلک کر ان غیر مرئی دیواروں سے سر ٹکرانے لگی۔

''بھگوان کے لئے مجھے اتنا بڑا شراپ نہ دو ...... میں نردوش ہوں۔ میں ...... میں کسی کی آلۂ کار بن گئی تھی انگوری! میں خود کسی کے جال میں پھنس گئی تھی ...... مجھے اتنا بڑا شراپ نہ دو۔ میری طرف دیکھو ...... بھگوان کی سوگندھ میری طرف دیکھو۔''

رانی نندریتا نے کہا لیکن انگوری نے گھٹنوں سے سر نہیں اٹھایا تھا۔

رانی نندریتا کی پیشانی خون آلود ہو گئی۔ غیر مرئی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اس کے ماتھے سے خون نکل آیا تھا اور خون بہہ بہہ کر اس کی آنکھوں پر آ رہا تھا لیکن اسے اس سے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن وہ اپنے اردگرد ہزاروں آنکھوں کو محسوس کر رہی تھی جو اسے نفرت سے دیکھ رہی تھیں، جو اسے لعنت ملامت کر رہی تھیں۔ دبی دبی بھنبھناہٹیں اسے کچھ کہہ رہی تھیں اور ان کی آوازیں رانی نندریتا کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

''پاپی ہے۔''

''قاتل ہے۔''

''خونی ہے۔''

''ہلاک کر دو اسے۔''

''مار ڈالو اسے۔''

''نیچ ہے یہ۔''

''اس نے وشواش گھات کیا ہے۔''

''اس نے معصوم انگوری کی جان لی ہے۔''

ایسی بہت سی آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ یہ اس کے من کی آوازیں تھیں۔ پھر اس نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے بہنے والے خون کو صاف کیا اور انگوری کی طرف دیکھا پھر بولی۔ اس کا لہجہ بہت واویلا تھا۔

''آہ انگوری ..... آہ، تو ..... تو مجھے معاف نہیں کرے گی۔ نہ کر۔ میں اپنے آپ کو اس بات کی سزا دوں گی انگوری کہ میں نے تیرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ مگر آخری بار تجھ سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے یہ سب کچھ نہیں کیا انگوری۔''

رانی نندریتا نے ہاتھ آگے بڑھایا اور دفعتہً اسے محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ دیوار سے پار ہو گیا ہو۔

ہاں ..... اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کے آگے اب دیوار نہ تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ان غیر مرئی دیواروں کو ٹٹولا اور اس کے من میں اچانک خوشی پھوٹ پڑی۔ دیواریں خود بخود غائب ہو گئی تھیں۔

یا تو وجے کپور مہاراج کو اس پر رحم آ گیا تھا یا پھر اور کوئی چمتکار ہوا تھا۔ کوئی اور

بات ہوئی تھی۔

اس نے دیوار سے گزر کر دائرے میں قدم رکھ دیا اور دوسرے ہی لمحے وہ انگوری کے پاس تھی۔

''انگوری ..... انگوری .....'' اس نے انگوری کے بازوؤں کو اس کے چہرے سے ہٹانے کی کوشش کی اور انگوری ایک جانب لڑھک گئی۔

دوسرے ہی لمحے رانی نندریتا کے حلق سے ایک چیخ کی آواز ابھری تھی۔

ایک دلدوز اور وحشت ناک چیخ۔ انگوری مر چکی تھی۔ اس کی بے نور اُداس آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اب اس کے شریر میں سانس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

رانی نندریتا کی چیخ کی آواز اتنی دلدوز تھی کہ عمارت کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں نے بھی سن لی۔ بات چونکہ رانی نندریتا کی تھی اس لئے وہ لوگ برداشت نہ کر سکے اور ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر اندر کود پڑے۔

رانی نندریتا بے ہوش پڑی تھی اور اس کے نزدیک ہی انگوری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

محافظوں نے فوری طور پر آدمی محل کی طرف دوڑائے اور محل سے بہت سی کنیزیں، بہت سے جوان اور یہاں تک کہ خود ست گرو اس عمارت کی جانب چل پڑا اور اپنی ماں کے حضور پہنچ گیا جو ابھی تک بے ہوش تھی۔

اس نے خادماؤں کی مدد سے اپنی ماں کو اٹھوایا اور پھر اس کی نگاہیں انگوری پر پڑیں اور وہ حیرت سے دنگ رہ گیا تھا۔

ایسی سندر اور ایسی حسین لڑکی اس نے سارا جیون کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن یہ لڑکی زندہ نہیں تھی۔ اس نے لوگوں سے اس لاش کا راز پوچھا لیکن اس کی تشفی نہ ہو سکی۔ اسے یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ یہ لڑکی کون تھی اور اس کی لاش یہاں کیوں پڑی ہوئی ہے اور اس کی ماں بے ہوشی کی حالت میں یہاں کیوں موجود ہے۔

یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں ایک معمہ بنی ہوئی تھیں۔ لیکن ماں کی دگرگوں حالت دیکھ کر وہ فی الوقت اس معمے کو حل کرنے سے باز رہا اور رانی نندریتا کو شاہی محل لے گیا۔

شاہی ویدوں نے یہاں رانی نندریتا کو ہوش میں لانے کے لئے کارروائی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد رانی نندریتا ہوش میں آ گئی۔

رانی نندریتا کے سامنے ست گرو موجود تھا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر نندریتا کا اندھا پتی راجوریہ بیٹھا ہوا تھا۔ راجوریہ کے چہرے پر عجیب اور گہرے غور وفکر کے آثار تھے۔

رانی نندریتا نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ست گرو کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ کافی دیر تک وہ اس سے لپٹ کر روتی رہی۔ ست گرو ماں کی اس گریہ و زاری کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نندریتا اس عجیب وغریب عمارت میں کیوں گئی تھی اور وہ لاش کس کی تھی؟ البتہ اس حسین لڑکی کی لاش دیکھ کر اس کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آ پڑا تھا۔

اگر وہ لڑکی زندہ ہوتی تو کتنی سندر ہوتی۔ پرنتو یہ مر کیسے گئی؟ اس نے رانی نندریتا کی طرف دیکھا۔ یہ سوال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ پھر وہ مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ رانی نندریتا کی حالت کچھ بہتر ہو جائے تو پھر اس سے اس بارے میں پوچھے گا۔

نندریتا اسے کافی دیر تک اپنے ساتھ چمٹائے رہی اور وہ بھی ماں کو تسلیاں دیتا رہا۔ لیکن اس نے ابھی تک اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس عمارت میں کیوں گئی تھی۔

رانی نندریتا ہوش میں آنے کے بعد اس بات پر سراسیمہ تھی کہ اب یہ راز کھلنے والا ہے۔ لیکن اس نے بہت سی باتیں اپنے من میں سوچ رکھی تھیں۔ کچھ بھی ہو جائے وہ انگوری کے راز کو عام نہیں کرے گی۔ یہ بسوامیوں کی تقدیر کا سوال تھا۔ البتہ راجوریہ کے چہرے پر غور وفکر کے آثار دیکھ کر رانی نندریتا دہشت سے سہم گئی تھی۔

"آہ ...... آہ ...... یہ کیا ہو گیا؟" اس نے سوچا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راجوریہ کو کس طرح مطمئن کرے۔ تب اس نے بھگوان سے پراتھنا کی کہ بھگوان اسے اس کے جھوٹ پر معاف کر دے۔

پتی سے جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں ہے۔ مگر اپنے جرم کو چھپانے کے لئے، بسوامیوں کی تقدیر بدلنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ جھوٹ بولا جائے اور اب اس جھوٹ کو بولنے کے لئے اسے اپنے آپ کو کئی باتوں کا مجرم سمجھنا پڑ رہا تھا۔

ست گرو کو اس نے یہ کہہ کر روانہ کر دیا۔

"ست گرو ...... اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ تم کافی تھکے ہوئے ہو گے۔ میں تمہیں

بعد میں ان حالات کے بارے میں بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے ماں ...... اور یوں بھی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تم تندرست ہو جاؤ، باقی ساری باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" ست گرو نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب کمرے میں راجوریہ اور رانی نندریتا تنہا رہ گئے تھے۔ تب راجوریہ نے نندریتا سے پوچھا۔

"نندریتا! تم سندر نگر گئی تھیں؟"

"ہاں مہاراج!" اس نے جواب دیا۔

"کیا ہوا ...... تم نے اپنے پتا جی سے اس بارے میں بات کی؟" راجوریہ نے پوچھا۔

"ہاں مہاراج۔ میں وجے کپور کے ہاں گئی تھی۔ پر وجے کپور مہاراج ہمیں نہیں مل سکے۔"

"اوہ ...... پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں واپس آئی تو انگوری مر چکی تھی مہاراج!" رانی نندریتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تم نے ایک بہت بڑا پاپ کیا ہے رانی نندریتا! لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔"

"وہ کیا مہاراج؟" رانی نندریتا نے پوچھا۔

"آخر انگوری یہ سب کچھ کیوں چاہتی تھی؟"

"بس مہاراج! یہ ساری باتیں بھگوان ہی جانے۔ اگر وہ مجھے بتا دیتی تو شاید میں اسے اس طرح نہ مرنے دیتی۔" رانی نندریتا نے کہا۔

راجوریہ اس کی اس بات سے مطمئن نہ ہو سکا تھا۔ تاہم خاموش ہو گیا۔ یا نجانے اس کے دل میں کیا خیال آیا تھا یا اس نے یہ خاموشی مصلحتاً اختیار کر لی تھی، اس بات کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

انگوری کو مرے ہوئے تیسرا دن تھا جب ست گرو ماں کے پاس پہنچ گیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''ماتا جی! میں سخت پریشان ہوں۔''

''کیوں ست گرو؟'' رانی نندیتا نے بے چینی سے پوچھا۔ ویسے وہ ست گرو کے آنے کا مقصد سمجھ گئی تھی۔

''وہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم کیوں بے ہوش ہوگئی تھیں؟''

''کوئی بات نہیں ہے ست گرو! تو چنتا نہ کر۔ بس انگوری کی موت نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔''

''اوہ...... تو وہ لڑکی انگوری تھی؟''

''ہاں ست گرو۔''

''کون تھی وہ ماتا جی؟''

''کون تھی ......'' نندیتا ایک لمحے خاموش سی ہو گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ اس کا چپ رہنا ست گرو کو کھٹک بھی سکتا ہے چنانچہ وہ فوراً بولی۔

''نجانے کون تھی بدنصیب، کہاں سے آئی تھی۔ ہماری سہائتا تو اس نے کی مگر باقی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا ہمیں۔'' رانی نندیتا نے کہا۔

''مگر تم نے اسے اس عمارت میں کیوں بھیجا تھا ماتا جی؟ وہ وہاں کیوں گئی تھی اور پھر مر کیسے گئی؟''

''بھگوان جانے ...... یہ ساری باتیں بھگوان ہی جانے۔ خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں تو اسے دیکھنے گئی تھی پر وہ وہاں مری پڑی تھی۔''

''تعجب کی بات ہے۔ پر تھی بڑی سندر ماتا جی۔ بھگوان کی سوگندھ میرا من اس کے لئے بڑا دکھی ہے۔''

''تیرا من ......؟'' رانی نندیتا نے تعجب بھرے انداز میں پوچھا۔

''ہاں ماتا جی! وہ بہت سندر تھی۔ اس قابل کہ ہندوستان کی رانی بنے۔''

رانی نندیتا کے دل پر یہ سن کر چوٹ لگی تھی۔ اگر وہ ست گرو سے انگوری کے بارے میں بات کرتی اور ست گرو انگوری کو ایک بار دیکھ لیتا تو پھر کبھی وہ اس کو انگوری سے شادی کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ خود انگوری کی بھی تو یہی آرزو تھی۔ لیکن اس نے یہ آرزو اس کے سینے میں گھونٹ کر اس کے پران لے لئے تھے۔

تاہم جو بیتنی تھی وہ بیت چکی تھی۔ اس نے ست گرو کے من کو میلا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنا اطمینان ظاہر کر کے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ست گرو ماں کے پاس سے خاموشی سے اٹھ گیا تھا۔

لیکن اپنے دل کے بوجھ کو وہ طویل عرصے تک نہ بھول سکا۔ انگوری کا حسین چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں آجاتا تھا اور وہ حسنِ خوابیدہ کو بھول نہیں سکا تھا۔

بہرحال گزرنے والا وقت بہت ظالم ہوتا ہے اور وقت اگر نقش مٹاتا نہیں ہے تو کچھ ہلکے ضرور کر دیتا ہے۔ اس طرح ست گرو بھی اس حسین صورت کو بھول گیا۔ لیکن رانی نندیتا طویل عرصے تک کانٹوں پر لوٹتی رہی تھی۔

وہ خوبصورت جزیرہ جو راجاؤں کی سیر گاہ تھا، اس عمارت کی وجہ سے اور حسین ہو گیا تھا اور اس عمارت کے اندر انگوری کی سمادھی بنا دی گئی تھی۔

یہ سمادھی رانی نندیتا نے خود کھڑے ہو کر بنوائی تھی اور اس سمادھی کی تکمیل ہونے کے بعد وہ اتنا روئی تھی کہ کئی دن بیمار پڑی رہی تھی۔

لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ ان ساری باتوں کو بھول گئی۔ ہاں جب کبھی وہ دریا کا رخ کرتی اسے انگوری ضرور یاد آتی۔

❁

اس طرح وقت گزرتا رہا۔ ست گرو راج کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بارہ سال گزر گئے۔ جنگل میں چرندوں اور پرندوں کے ساتھ زندگی گزارنے والے ہریرتے گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کرنے کے بعد بالآخر واپس چل پڑے۔

بارہ سال پورے ہو چکے تھے۔ ہریرتے ایک چھوٹے سے گاؤں گنگا پور میں آئے اور گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کرنے لگے۔

ست گرو نے اپنے چچا زادوں کا کھوج لگانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے کہیں ان کا سراغ نہ ملا اور پھر ہریرتے حسبِ شرط ایک سال تک گمنامی کی حالت میں رہے۔ اور جب جلاوطنی کی تمام شرائط پوری ہو گئیں تو ہریرتوں نے اس وقت کے ایک بہت بڑے

شخص کو ایلچی بنا کر ست گرو کے دربار میں بھیجا اور ملک کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

ست گرو ہریرتوں کی زندگی کے بارے میں سن کر ششدر رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہریرتے اس طرح واپس آ جائیں گے اور پھر اپنے ملک کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ اول تو وہ ان بارہ سالوں میں ہریرتوں کو بھول ہی گیا تھا اور اپنے دورِ حکومت میں اس نے بے شمار فتوحات حاصل کی تھیں اور اس کا راج دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اب یہ ہریرتے نجانے کہاں سے آ گئے تھے۔

چنانچہ ست گرو بھلا اس بات کو کیسے تسلیم کر لیتا۔ اس نے اس مطالبے کو رد کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہریرتوں نے جنگ کرنے کا اعلان کر دیا۔

ست گرو کو اپنی فوجوں پر بڑا ناز تھا۔ اس نے اپنی فوج کو سامانِ جنگ سے آراستہ کرنا شروع کر دیا۔

لیکن رانی نندیتا اس جنگ کا سن کر بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ طویل عرصہ قبل کی بات تھی لیکن انگوری کی پیشین گوئی اسے آج بھی یاد تھی۔

راجہ ہری کور مر چکا تھا اور اس وقت اس کا بھائی سندر نگر پر حکمرانی کر رہا تھا۔ یہ ایک طرح سے ست گرو کا اطاعت گزار تھا اور ہمیشہ اس کے آگے سر جھکائے رہتا تھا۔

رانی نندیتا اب خاصی بوڑھی ہو گئی تھی لیکن بہرصورت اس نے بیٹے سے چھپا کر ایک بار پھر سفر کیا۔ وجے کپور مہاراج کی تلاش میں انہی غاروں تک گئی تھی۔

غار پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وجے کپور مہاراج اسی حجرے میں ہیں۔ حالانکہ تھوڑے عرصے پہلے وجے کپور مہاراج اپنے حجرے سے باہر آئے تھے۔ رانی نندیتا ان کے باہر آنے کا حال سن کر ششدر رہ گئی تھی۔

طویل عرصے کے بعد وجے کپور مہاراج کی آواز کانوں میں پڑی تھی۔ حالانکہ آخری بار اس نے انہیں ہڈیوں کے پنجر کی شکل میں دیکھا تھا۔ لیکن سادھو سنتوں کی باتیں سادھو سنت ہی جانیں۔ رانی نندیتا کو اندازہ تھا کہ وجے کپور مہاراج بہت بڑے رشی اور منی ہیں اس لئے ان کی زندگی اور موت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

چنانچہ اس بار بھی وہ وجے کپور مہاراج سے ملنے سے معذور رہی اور واپس اپنے محل میں آ گئی۔

ایک طرف ست گرو اپنی فوجوں کی تیاریوں میں مصروف تھا اور مہا بھارت کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف سے رانی نندیتا سادھو سنتوں سے اور جادو ٹونوں

سے اس جنگ کو روکنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ست گرو اس جنگ میں مارا جائے گا۔ حالانکہ اس کے باقی بیٹے بھی جنگ میں شریک ہونے کے لئے تیار تھے لیکن اسے سب سے زیادہ ست گرو پیارا تھا اور وہ ست گرو کی زندگی کے بارے میں سخت خلفشار کا شکار تھی۔

انہی حالات میں اس کی ملاقات ایک ایسے سادھو سے ہوئی جس نے اسے ایک خاص بات بتائی۔

سادھو نے رانی نندیتا کو بتایا کہ اگر رانی نندیتا ایک خاص جاپ کرے تو اسکے بیٹے ست گرو کا بدن ان تمام آفات سے محفوظ ہو جائے گا جو اس پر نازل ہونے والی ہوں گی۔

رانی نندیتا اس پر تیار ہو گئی اور اس نے ست گرو کو ہدایت بھیج دی۔

لیکن ایک بہت بڑے شخص نے جو ان کے لئے اوتار کی حیثیت رکھتا تھا، ست گرو کو مشورہ دیا کہ وہ ماں کے سامنے برہنہ نہ جائے اور کم از کم ستر پوشی کے لئے پھولوں کا ایک ہار پہن لے۔ ست گرو نے اس شخص کے مشورے پر عمل کیا۔

رانی نندیتا نے جاپ مکمل کرنے کے بعد جب ست گرو کو دیکھا تو اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ پھولوں کا یہ ہار جن جن حصوں کو اس کی نگاہوں سے چھپائے ہوئے ہے وہی اس کی موت کا باعث بن سکتے ہیں۔ پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا تھا۔

عظیم الشان معرکۂ جنگ شروع ہونے والا تھا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ وقت قریب آ گیا جب انہیں جنگ کرنا تھی۔

یہ عظیم الشان معرکۂ جنگ ''کل جگ'' کے شروع کے دور میں برپا ہوا۔ دونوں لشکر اس بری طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے کہ الامان الحفیظ۔

اٹھارہ روز تک یہ جنگ جاری رہی اور اس طرح سے ہوئی کہ دونوں طرف کے لشکریوں کو حریفوں اور حلیفوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔

اس جنگ میں بسوامیوں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر گیارہ کشون پر اور ہریرتوں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر سات کشون پر مشتمل تھا۔ کشون کی اصطلاح کے مطابق ایک کشون اکیس ہزار چھ سو ستر فیل سواروں، اتنے ہی سانڈنی سواروں، پینسٹھ ہزار چودہ گھوڑے سواروں اور ایک لاکھ نو ہزار چار سو پچاس پیادہ سپاہیوں پر مشتمل

ہوتا ہے۔ اس خوفناک جنگ میں اس بھاری تعداد میں سے صرف بارہ آدمی زندہ بچے تھے۔ چار آدمی بسوامیوں کے لشکر میں سے جن کے نام یہ تھے۔

ایک سیون کمار جو فریقین کا استاد تھا اور مالک سیف قلم تھا، چندر نامی ایک شخص، عالم کا بیٹا راجندر جو سیون مار کی طرح فریقین کا استاد تھا، مہاتما گرو پرکاش نامی ایک شخص جو چتر داس خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور ست گرو کے باپ کا رتھ بان جس کا نام چناری تھا۔

آٹھ آدمی ہریتوں کے بچے تھے۔ پانچوں ہریتے بھائی، کرن نامی چتر داس خاندان کا فرد اور ست گرو کا سوتیلا بھائی جے پال اور آٹھویں سندر ناتھ کہ جو اپنی شہرت کی وجہ سے تعریف سے بے نیاز ہیں۔ ست گرو کا سوتیلا بھائی ایک بنیے کی بیٹی سے پیدا ہوا تھا۔

سندر ناتھ اس زمانے میں سادھو کی حیثیت رکھتا تھا۔ لوگ اسے اوتار مانتے تھے۔ اس شخص کے بارے میں بے شمار روائتیں مشہور تھیں۔ ان کے بارے میں مختلف عقیدے مروج ہیں۔ بعض انہیں دنیا بھر کے فریبیوں کا سردار اور حیلہ گروں سے اعلیٰ مانتے ہیں اور بعض ان کی پیغمبری کے قائل ہیں اور بعض انہیں خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔

مہا بھارت میں مکاری اور غداری کا کام اپنا سامنے آ گیا تھا۔ ست گرو کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے لشکری اور خاندان کے لوگ بھی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

بسوامیوں کے خاندان کی تباہی اور ست گرو کے قتل کے بعد ہریتوں کے خاندان کا مہا ویر ہندوستان کا فرمانروا ہوا اور ساری دنیا میں اس کی سلطنت کا شہرہ ہوا۔ مہا بھارت کے پورے تیس سال بعد تک مہاویر نے حکومت کی۔ لیکن وہ درویش منش تھا۔ اس نے خود ہی دنیا کی حقیقت اور ماہیت پر غور کر کے تخت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس نے چاروں بھائیوں کو ساتھ لے کر گوشہ نشینی میں بقیہ زندگی گزار دی اور اسی عالم میں دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔

اس کے بعد مہاویر کے چچا زاد بھائیوں نے حکومت کی۔ پھر ہریتوں کے خاندان میں چتر دیو کی اولاد میں سے تیسری نسل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا ہر طرح کی ظاہری اور باطنی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ نہایت عادل اور انصاف پسند تھا اور اس کے دور میں کتاب مہا بھارت لکھی گئی جو ایک شخص سین گیتا نامی نے لکھی تھی۔

ہندو عقیدہ جو کچھ بھی کہتا ہو، ہمارا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ دنیا میں حضرت آدمؑ سے پہلے کوئی خاکی پیدا نہیں ہوا اور طوفانِ نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ کی اولاد یعنی سام، یافث اور حام اس دنیا کی آزادی اور افتخار کا باعث بنے۔ اور ظاہر ہے یہ ہندوستان بھی انہی کی اولادوں سے آباد ہوا۔ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے تینوں بیٹوں یعنی یافث، سام اور حام کو ازروئے کھیتی باڑی اور کاروبار کا حکم دے کر دنیا کے چاروں طرف روانہ کر دیا۔

سام حضرت نوحؑ کے سب سے بڑے بیٹے اور جانشین تھے۔ ان کے فرزندوں کی تعداد ننانوے تھی۔ عرب کے تمام قبیلے حضرت سام کی اولاد کے نام پر ہیں اور ان کی نسل میں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور فخشد جو حضرت سام کے بیٹے ہیں ان کا بیٹا عجم کا مورثِ اعلیٰ ہے اور فخشد کے اس بیٹے کا نام کیمورث ہے۔ کیمورث کے چھ بیٹے تھے۔ سیامک، عراق، فارس، شام، تور اور دمنان۔ کیمورث کے بیٹے جس جگہ گئے وہ جگہ ان کے نام سے موسوم ہوئی اور وہاں انہی کی اولاد آباد ہوئی۔ سیامک کے بڑے بیٹے کا نام ہوشنگ تھا اور عجم کے تمام بادشاہ یزدجرد تک اس کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت نوحؑ کے دوسرے بیٹے یافث باپ کے ایماء پر مشرق اور شمال گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان کے ہاں بھی بہت سے بیٹے پیدا ہوئے جن میں سب سے زیادہ مشہور بیٹا ترک نام کا ہے۔ ترکستان کی تمام قومیں یعنی مغل، ازبک، ترکمانی سب انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ یافث کے دوسرے بیٹے کا نام چین ہے۔ ملک چین کا نام اسی پر ہے۔ تیسرے بیٹے کا نام آردیسی ہے، اس کی اولاد شمالی ملکوں کی سرحد پر بحیرۂ ظلمات تک آباد ہوئی۔ اہل تاجیک بھی اسی کی نسل سے ہیں۔

حضرت نوحؑ کا تیسرا بیٹا حام اپنے والد گرامی کے حکم سے دنیا کے جنوبی حصے کی طرف گیا اور اس کو آباد اور خوشحال کیا۔ حام کے چھ بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ ہند، سندھ، حبش، انرنج، ہرمزا اور بویہ...... ان سب بیٹوں کے نام پر ایک ایک شہر آباد ہوا۔ حام کے سب سے بڑے بیٹے ہند نے ملک ہندوستان اپنایا اور اسے خوب آباد کیا اور سرسبز و شاداب کیا۔

حام کے دوسرے بیٹے سندھ نے ملک سندھ میں قیام کیا اور ٹھٹھہ اور ملتان کو اپنے بیٹوں کے نام سے آباد کیا۔

ہند کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام ہیں پورب، دکن، بنگ اور نہروال۔

جو ملک اور شہر ان ناموں سے مشہور ہیں وہ انہی کے آباد کئے ہوئے ہیں۔

ہند کے بیٹے دکن کے گھر تین بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام مرہٹ، کنڑا اور تلنگ ہیں۔ آج کل دکن میں جتنی قومیں آباد ہیں وہ سب انہی کی نسل میں سے ہیں۔

ہند کے چوتھے بیٹے نہروال کے ہاں بھی تین بیٹے ہوئے جن کے نام بھروج، کنباج اور مالداج ہیں۔ ان تینوں کے نام پر مختلف شہر آباد ہوئے ...... بہت سے شہروں میں ان کی اولادیں آج تک آباد ہیں۔

ہند کے تیسرے بیٹے کی اولاد نے ملک بنگال آباد کیا۔ ان کی اولادیں بھی آج تک بنگال میں آباد ہیں۔

ہندو عقیدے کے مطابق ست یگ، ترتیگ، دوا پریگ اور کل یگ آتے جاتے رہتے ہیں اور کسی بھی یگ میں جس شخص کا اختتام ہو اسی یگ میں اس شخص کی دوبارہ نمود ہوتی ہے اور ان یگوں میں اتنے طویل برسوں کا فاصلہ ہوتا ہے کہ انسان تصور نہیں کر سکتا۔

بہر حال یہ ہندو عقیدہ ہے۔ اور انگوری کی کہانی بھی اسی عقیدے سے تعلق رکھتی ہے۔ مہا بھارت ہو چکی۔ ہندوستان میں بسوائیوں اور ہریرتوں کا دور ختم ہو گیا۔ مہاراج کی حکومت آئی جس نے حکومت کے سرداروں اور اپنے بھائی بندوں کی مدد سے اور مشورے سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور ملک کو آباد کرنے اور حکومت کو بہترین طریقے پر چلانے کے لئے سخت محنت کی۔ مہاراج نے زراعت کی طرف بھی بہت زیادہ توجہ دی اور بے شمار نئے شہر آباد کئے۔

ان شہروں میں پھولنگر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ مہاراج نے دور دور سے اہل علم کو بلوا کر اس شہر کو آباد کیا۔ شہر میں بے شمار مدرسے اور عبادت گاہیں بنوائیں اور نواحی محاصل کی آمدن کو ان عبادت گاہوں کے مصارف کے لئے وقف کر دیا۔ مہاراج نے سات سو برس حکومت کی اور اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کی حالت بدل گئی۔ اس نے شاہان ایران کے ساتھ ہمیشہ خلوص و محبت کا برتاؤ کیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد اس کا بھتیجا ناراض ہو کر فریدون کے پاس چلا گیا اور اس سے اپنے چچا کے خلاف مدد کی درخواست کی۔

فریدون نے ایک بہت بڑی فوج اس کی مدد کے لئے روانہ کی۔ اور جب اس کی فوج کا سربراہ ہندوستان آیا تو اس نے بہت سے آباد شہروں کو ویران کر دیا۔

مہاراج نے جب یہ عالم دیکھا تو اس نے اپنے ملک کا ایک حصہ دے کر اپنے بھتیجے کو راضی کر لیا اور چند عمدہ اور قیمتی چیزیں فریدون کے لئے بطور تحفہ بھیجیں۔

مہاراج کے آخری زمانے میں جے پور اور وجے نگر کے زمینداروں نے آپس میں مل کر پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا۔ طرفین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ مہاراج کا بیٹا لڑائی میں مارا گیا۔ مہاراج کی باقی ماندہ فوج زخمی اور پریشان ہو کر بھاگ نکلی اور اپنے مال و اسباب اور ہاتھیوں کو میدان میں چھوڑ گئی۔

مہاراج نے جب یہ خبر سنی تو اسے سخت طیش آیا۔ وہ دُم بریدہ سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس پیچ و تاب اور غم و غصہ کا اصل سبب یہ تھا کہ یہ سرکشی معمولی زمینداروں کی تھی۔

مہاراج نے اس شکست کا انتقام لینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس زمانے میں بادشاہ ایران کے حکم سے ایرانی سردار سام بن نریمان ہندوستان فتح کرنے کے لئے پنجاب کی سرحد تک پہنچ چکا تھا اور سلاسیہ سپہ سالار بقیہ فوج لے کر اس کے مقابلے پر گیا ہوا تھا۔ چنانچہ مہاراج کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑا جب تک کہ سلاسیہ سردار سے صلح کر کے واپس نہیں آ گیا۔

سلاسیہ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے بڑی حیثیت رکھتا تھا۔ ملک سلاسیہ ابھی تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ جب وہ واپس مہاراج کے پاس پہنچا تو اسے دوسرے ملک جانے کا حکم دیا اور اس نے فوراً بڑے استقلال اور شان و شوکت کے ساتھ اس ملک کا رخ کیا۔ جب دشمنوں نے اس کی آمد کی خبر سنی تو ہراساں ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔

سلاسیہ نے فساد پھیلانے والے گروہ کو بری طرح تہہ تیغ کر دیا اور اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس نے جابجا تھانے اور چوکیاں قائم کیں اور فاتح و کامران ہو کر واپس آیا۔ راستے میں اس نے دو قلعے تعمیر کروائے اور راگ کا علم جو موسیقی کے نام سے مشہور ہے دوسرے ممالک سے لا کر ہندوستان میں مروّج کیا۔

مہاراج نے سات سو سال عمر پائی۔ اس کے چودہ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑا سولیا راج اپنے باپ کا جانشین تھا۔

یوں ادوار بدلتے رہے۔ حکومتیں آتی رہیں، ختم ہوتی رہیں اور ہندوستان میں بُت پرستی کا رواج عام ہو گیا۔

مہاراج ہی کے زمانے میں ایک شخص ایران سے ہندوستان آیا اور اس نے یہاں

کے لوگوں کو آفتاب پرستی کی تعلیم دی۔ اس کی تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ ستارہ پرست لوگ بھی آگ کی پرستش کرنے لگے۔ لیکن اس کے بعد جب بُت پرستی کا رواج مروّج ہوا تو یہی طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ بُت پرستی کو اس درجہ مقبولیت اس سبب سے ہوئی کہ ایک برہمن نے راجہ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جو شخص اپنے بزرگوں کی سونے چاندی یا پتھر کی شبیہہ بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے وہ سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اس عقیدے کو لوگوں نے اس حد تک اپنایا کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے بزرگوں کے بُت بنا کر اس کی پرستش کرنے لگا اور انہیں پوجنے لگا۔

اس زمانے کے راجہ گرداس نے بھی خود دریائے گنگا کے کنارے شہر آباد کر کے وہاں بُت پرستی شروع کر دی اور اس کی رعیت نے اپنے فرمانروا کی تقلید کی اور ہر کوئی اپنے طور پر بُت پرستی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں بُت پرستوں کے 90 گروہ پیدا ہو گئے۔

راجہ گرداس نے چونکہ قلوطشہ کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا تھا اس لئے اس شہر کی آبادی میں بے حد اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ شہر کا پھیلاؤ پچیس کوس تک بڑھ گیا۔ راجہ گرداس مان کی مدت حکومت دو سو پچاس برس ہے۔ اس مدت کے بعد اس نے انتقال کیا۔

راجہ گرداس ایک مسلم بادشاہ کا ہم عصر تھا اور ہر سال اسے خراج ادا کرتا تھا۔ راجہ گرداس کے ہاں پینتیس بیٹے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑا گجراد تھا اور جو راجہ گرداس کے مرنے کے بعد اس کا جانشین ہوا۔

وہ دور جو گجراد کو ملا، بُت پرستی کا دور تھا۔ گجراد نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنے نام کی مناسبت سے ایک شہر آباد کیا جس کا نام گجراد رکھا گیا۔ ہندوستان کے اس بادشاہ کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ اس شغف میں گزارا۔ راجہ گرداس نے اپنی زندگی میں شہر چنارہ کی بنیاد رکھی لیکن وہ اپنی زندگی میں اس شہر کو بسا نہیں سکا تھا۔ گجراد نے اس شہر کو بسانے کی پوری پوری کوشش کی۔ بہر حال گجراد اپنے بے شمار نشان چھوڑ کر، اپنی حکومت چھوڑ کر پریم ناتھ کے ہاتھوں ہار کر مر گیا۔ گجراد نے چھبیس سال حکومت کی۔

پریم ناتھ نے اُنیس سال حکومت کی اور اسکے بعد شنکر داس نے پریم ناتھ کو شکست دے کر خود کو اس ملک کا فرمانروا بنا لیا۔ دیال نامی شہر شنکر داس کا آباد کردہ ہے۔ شنکر نے ہند پر چونسٹھ برس حکومت کی۔

شنکر داس کے بعد اس کا بیٹا سواشتر تخت نشین ہوا۔ سواشتر نے اکیاسی سال حکومت کی اور مر گیا۔ اس راجہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے اس کے مرنے کے بعد ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ تب جوامیہ قوم کے ایک شخص یشونت نے قنوط پر قبضہ کر لیا اور وہاں کا راجہ بن گیا۔

مہاراجہ یشونت نے چالیس سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی اور حکومت کی باگ ڈور مہاراج یشونت کی وصیت کی مطابق اس کے بھانجے پران کے ہاتھ آئی۔ پران کی موت کے بعد چندر پرکاش نے حکومت کی جو پران کا سپہ سالار تھا۔ اس نے پران کے مرتے ہی قوت و اقتدار حاصل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور راجہ بن بیٹھا۔ یہ وہی یگ تھا جس میں ست گرو اپنے غلط فیصلے کا شکار ہوا تھا اور رانی نندیتا نے انگوری پر ستم ڈھایا تھا۔

چندر پرکاش کے دورِ حکومت میں بہت بڑا قحط پڑا اور چونکہ وہ شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے خدا کے بندوں کی پرواہ نہ کی اور خود دادِ عیش دیتا رہا۔ خدا کی مخلوق کی جانیں ضائع ہوئیں اور اکثر گاؤں اور قصبے تباہ ہو گئے اس کے نتیجے میں ایک طویل عرصے تک یہ علاقے شدید مشکلات کا شکار رہے۔ امراء اور سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں نے اسے خاطر میں لانا چھوڑ دیا اور ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں ابھرنے لگیں یوں چندر پرکاش ہزار مشکلات میں پڑ گیا۔ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن لوگ اس کے سخت خلاف تھے۔ البتہ اس کی رانی پھول وتی جو ایک چھوٹے سے راجہ سنیل چندر کی بیٹی تھی۔ بڑی زیرک اور سمجھدار تھی۔ پھول وتی چندر پرکاش کی پانچویں بیوی تھی۔ اس سے پہلے چندر پرکاش چار شادیاں کر چکا تھا۔ ہندو دھرم کے خلاف اس نے بہت سی عورتوں کو یوں بھی رکھ چھوڑا تھا۔

رانی پھول وتی زندگی میں صرف چند بار چندر پرکاش کی خلوت حاصل کر سکی تھی۔ چندر پرکاش کی اتنی رانیاں تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہاں جب رانی پھول وتی اس کی بیوی بنی تو اس کے کچھ عرصے بعد اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ یوں رانی پھول وتی چندر پرکاش کی منظورِ نظر بن گئی۔

چندر پرکاش نے بیٹے کی پیدائش پر پورے ملک میں خوشیاں منائی تھیں۔ لیکن اس کی خوشیوں میں اس کا ساتھ دینے والے بہت کم لوگ تھے۔ صرف راجدھانی میں کچھ گھرانے ایسے تھے جو چندر پرکاش کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔ ورنہ زیادہ تر

لوگ صرف چندر پرکاش کی فوجوں کی وجہ سے اس جشن میں شریک تھے۔

چندر پرکاش کا بیٹا جب گیارہ سال کا ہوا تو چندر پرکاش کو ایک بہت بڑا خطرہ درپیش تھا۔

یہ خطرہ راجہ روون کا تھا جس نے چندر پرکاش کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ چندر پرکاش چونکہ اپنی پوری زندگی میں سکون نہیں پا سکا تھا اس لئے وہ صحت کی طرف سے بھی فکرمند تھا۔ اس کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے وزراء امراء اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ روون کو خراج ادا کر دے۔ لیکن اس کے لئے یہ بات بڑی ہتک آمیز تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے امراء اور وزراء کی بات نہ مانی اور جنگ کی تیاریاں کرنے میں مصروف ہو گیا۔

رانی پھول وتی کو یہ امید تھی کہ چندر پرکاش نے اپنی زندگی میں اس کے ساتھ جو بھی سلوک کیا ہو یہ الگ بات ہے لیکن کم از کم اس کی موت کے بعد حکومت اس کے بیٹے کو ضرور مل جائے گی۔ اور جب راجندر کی حکومت ہو گی تو رانی پھول وتی یقیناً ایک مطلق العنان رانی بن جائے گی۔

چنانچہ راجندر کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی اور راجندر کو فنونِ سپاہ گری میں طاق کرنے کے لئے اس نے بہت سے لوگ رکھے ہوئے تھے۔

رانی پھول وتی پنڈت لال چند سے بہت عقیدت رکھتی تھی جو دریا پار کے ایک مندر میں جیون بتاتے تھے۔ ان کی عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ سر کے سارے بال اور بھنوئیں سفید ہو چکی تھیں لیکن لوگ ان کے گیان اور علم کے بڑے قائل تھے اور مہینے کے پہلے منگل کو دریا پار کر کے لوگ پنڈت لال چند کے مندر ضرور جاتے تھے اور وہاں جا کر پوجا کرتے تھے۔

چندر پرکاش خود بھی گرو پنڈت لال چند کا بڑا عقیدت مند تھا اور جب بھی اسے فرصت ملتی وہ ان سے مشورہ لینے کے لئے چلا جاتا تھا۔

ایک بار رانی پھول وتی بھی پنڈت لال چند کے مندر میں راجہ چندر پرکاش کے ساتھ چلی گئی اور اسے پنڈت لال چند سے بڑی عقیدت ہو گئی۔

پنڈت نے اسے آشیرواد دیا تھا اور کہا تھا کہ جلد ہی تیرے یہاں ایک بیٹا پیدا ہو گا۔ اس کا نام تُو راجندر رکھنا اور رانی پھول وتی نے گردن ہلا دی۔

چنانچہ جب راجندر پیدا ہوا اور رانی چلّے سے باہر آئی تو سب سے پہلے اس نے

پنڈت کے مندر کا رخ کیا تھا اور کشتی میں بیٹھ کر ان کے پاس پہنچی تھی۔

پنڈت لال چند نے راجندر کو دیکھا اور دیر تک کسی خیال میں گم رہے۔ انہوں نے اسے آشیرواد تک نہ دیا تھا۔ جب رانی پھول وتی نے انہیں چونکایا تو وہ ہڑبڑا کر چونکے۔

''مہاراج! کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' رانی پھول وتی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں دیوی...... بس بچے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' پنڈت لال چند نے کہا۔

''کیوں...... کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''ایں......'' مہاراج جیسے چونک پڑے۔ ''نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی نجانے اسے دیکھ کر میرے من میں ایک عجیب سا خیال اُبھر آتا ہے۔''

''کیا خیال آتا ہے؟''

''میں اس خیال کو کوئی لفظ نہیں دے سکتا دیوی، لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس گرہ کو توڑ سکوں۔''

رانی پھول وتی پنڈت لال چند کی بڑی عقیدت مند تھی۔ اس لئے وہ خود بھی یہ سن کر پریشان ہو گئی۔ اور جب مہینے کے پہلے منگل کو وہ دوبارہ ان کے پاس گئی تو اس نے پھر وہی سوال کر دیا۔

''میں جاننا چاہتی ہوں پنڈت جی کہ آخر وہ کون سی گرہ تھی جو راجندر کو دیکھ کر آپ کے من میں پیدا ہو گئی؟''

''تُو وشواش کر پھول وتی کہ ہم خود اس سلسلے میں پریشان ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے دیکھ کر ہمارے من میں کچھ مٹے مٹے سے خیالات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں؟ لیکن تُو چنتا مت کر۔ اب کہ منگل کو جب تُو آئے گی تو ہم اس کے بارے میں تجھے بہت کچھ بتائیں گے۔ ہم اس سلسلے میں جاپ کر رہے ہیں جو ہمیں ہماری کھوئی ہوئی یادداشت واپس دلا دے گا۔'' پنڈت لال چند نے کہا۔

رانی پھول وتی ویسے بھی چندر پرکاش کی عدم توجہی کا شکار تھی۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد چندر پرکاش کے رویے میں کچھ تبدیلیاں ضرور ہوئی تھیں لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں تھیں کہ رانی پھول وتی کسی خوش فہمی کا شکار ہو جاتی یا کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتی۔ تاہم اسے امید ضرور بندھ گئی تھی کہ راجندر جے پرکاش کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ اگر دوسری

رانیوں سے کوئی بیٹا پیدا ہو بھی گیا تو وہ کم از کم حکومت کا دعویدار نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے دل میں بہت سے خیالات تھے۔

اور جس بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا وہ پنڈت لال چند کی بات تھی۔ چنانچہ ایک ماہ تک اس نے کانٹوں کے بستر پر لیٹ کر وقت گزارا اور بالآخر پنڈت جی کے پاس پہنچ گئی۔

پنڈت لال چند کی عبادت گاہ پر بے پناہ ہجوم تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ یاترا کرنے آئے ہوئے تھے اور پوجا پاٹ کا میدان بھرا ہوا تھا۔

رانی پھول وتی نے بھی عام لوگوں کی مانند پوجا شروع کر دی۔ پنڈت لال چند کی ہدایت تھی کہ مندر میں آنے کے بعد خود کو نہ کوئی راجہ سمجھے نہ رانی۔ یہاں آنے کے بعد سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے خود کو کوئی بھی بھگوان کے دوار آ کر بڑائی نہ دے۔ چنانچہ یہ یہاں کا اصول تھا کہ اگر چندر پرکاش بھی یہاں آتا تو عام لوگوں کی طرح آتا اور پوجا پاٹ کر کے چلا جاتا تھا۔

ہاں جب تمام لوگ چلے جاتے تو پنڈت لال چند اگر کوئی خاص بات ہوتی تو چندر پرکاش یا رانی پھول وتی کو کوئی خاص وقت دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ پوجا پاٹ میں خاصی رات بیت گئی۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ یاتری آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے اور رانی پھول وتی ایک کونے میں بیٹھی ان سب کے چلے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ پرشاد تقسیم ہو چکی تھی۔ تھوڑی سی پرشاد انہیں بھی ملی تھی۔ جس میں ننھا سا حصہ راجندر کا بھی تھا۔ جو ابھی رانی کی گود میں ہی تھا۔

جب تمام یاتری چلے گئے تو پنڈت لال چند نے پھول وتی کو بلا لیا۔

پھول وتی نے آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے اور پنڈت جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ پھر انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور بولا۔

''میں جانتا ہوں پھول وتی تیرے من میں بھی وہی کشٹ ہوگا جو میرے من میں ہے۔ پرنتو یہ کشٹ تیرے من میں زیادہ ہوگا۔ کیونکہ تُو ماں ہے۔ راجندر کمار کی ماں۔ میں نے پچھلے سات دن جاپ کیا اور گرہ کو کھولنے کی کوشش کرتا رہا جو میرے ذہن میں موجود تھی۔ تُو وشواش کر کہ اس بات کا تعلق راجندر سے نہیں ہے۔ البتہ راجندر کسی حد تک ملوث ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ میری زندگی کا بڑا عجیب اور بڑا انوکھا انکشاف ہوا ہے۔''

''میں پوچھ سکتی ہوں مہاراج کہ وہ انکشاف کیا ہے؟'' رانی پھول وتی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں رانی پھول وتی! میں نے جاپ کیا اور مجھے کچھ ایسی باتیں یاد آئیں کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے ایک گپھا یاد آئی جو پہاڑوں میں تھی۔ یہ گپھا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ میں نے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ جیون بتایا ہے پرنتو کبھی کسی نے اس گپھا کا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ رانی! میں نے اس کی تلاش میں ایک لمبا سفر کیا اور بالآخر میں ان پہاڑوں تک پہنچ گیا جو مجھے جاگتے میں نظر آئے تھے۔

جاپ کے دوران میں نے ان پہاڑوں کو دیکھا۔ پہاڑ کے دامن میں دریا کے اس کنارے ایک عجیب سی جگہ ہے۔ مجھے اس جگہ سے تھوڑی دور ایک بستی کے آثار بھی ملے ہیں۔ بس ایسے آثار جنہیں کوئی دیکھے تو یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں کوئی بستی آباد تھی۔

لیکن میری آنکھوں نے چونکہ جاپ کے دوران یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اس لئے میں نے ڈھونڈ کر وہ نشانات تلاش کر ہی لئے۔ پھر ان نشانوں سے کچھ دور مجھے وہ پہاڑی بھی نظر آ گئی جو میں نے جاپ کے دوران اپنے من میں دیکھی تھی۔

اس پہاڑی کی گپھا کے سامنے ایک پتھر موجود ہے۔ یہ پتھر اگر کوئی گزرنے والا دیکھے تو اسے ایسی چٹان سمجھے جو عام چٹانوں کی طرح ہو۔ لیکن مجھے چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اس پتھر کے نیچے ایک گپھا موجود ہے، چنانچہ میں نے اس پر زور لگایا اور رانی پھول وتی! تُو وشواش کر وہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ پتھر کے ہٹ جانے کے بعد مجھے ایک لمبی سرنگ نظر آئی جس میں سے گزر کر میں ایک ایسے سوراخ پر پہنچ گیا جس کے دوسری طرف سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہ روشنی سورج کی تھی جو ایک سوراخ سے غار میں پڑ رہی تھی۔

میں غار میں داخل ہوا تو مجھے وہاں صرف چند چیزیں ملیں۔ ایک مرگ چھالہ جو اتنی خستہ اور خراب ہو چکی تھی کہ جیسے چھوؤ تو ٹوٹ کر بکھر جائے۔ پانی کا ایک کلسا جو جُوں کا توں موجود ہے۔ البتہ اس پر زمانے کی گرد جم چکی ہے۔ ہاں گپھا میں پانی کا ایک کنڈل بھی تھا اور دو کھڑاویں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ کھڑاویں اپنے پاؤں میں پہن کر دیکھیں تو وہ مجھے بالکل ٹھیک تھیں۔ گو ان کی لکڑی اب اتنی بوسیدہ ہو چکی تھی کہ جونہی میرے پاؤں کا وزن ان پر پڑا، وہ ٹوٹ گئیں۔ لیکن وہ میرے پاؤں میں بالکل ٹھیک تھیں۔ کنڈل بھی میرے اٹھانے سے بالکل ٹوٹ گیا۔ صرف پانی کا کلسا جسے میں اٹھا کر

لے آیا ہوں۔ گو یہ چیزیں میری نہیں تھیں لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرا
ہو۔ ان چار چیزوں کے علاوہ گپھاہ میں کچھ نہیں تھا۔ آ پھول وتی! میں تجھے اس کلسا کے
درشن کراؤں۔''

رانی پھول وتی اٹھ گئی۔ حالانکہ ان تمام باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن
پنڈت لال چند کی عقیدت کی وجہ سے اس نے اس کلسے کے درشن کر لئے۔

کلسے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں رانی پھول وتی کے ذہن میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔
ایک عجیب سا احساس جیسے پہلے کبھی اس نے اس کلسے کو دیکھا ہو۔ لیکن پھر یہ احساس
ایک لمحے میں مفقود ہو گیا۔ پنڈت لال چند البتہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے جیون سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ میں
کچھ سمجھ نہیں پایا۔ بہرصورت میں ان گپھاؤں سے واپس آ گیا اور اس کے بعد میں اپنے
گیان کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر کار اس گپھا کا کیا راز ہے۔
تب رانی پھول وتی! میرے من میں راجندر ابھرا اور راجندر کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔
اسے دیکھ کر میرے من میں جو گرہ پڑ گئی تھی اس کی گتھیاں الجھتی سلجھتی رہیں۔ بالآخر پھر
راجندر تک پہنچ گئیں۔ اب میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ راجندر کا آخر ان باتوں
سے کیا تعلق ہے۔''

''مہاراج! کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟'' رانی پھول وتی نے پوچھا۔

''نہیں رانی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا گیان کہتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق کسی
بھی طرح راجندر سے ہو۔ لیکن اس میں راجندر کے جیون کے لئے کوئی ایسی بات نہیں
ہے جسے خطرناک کہا جا سکے۔''

''بس میں من کی یہی شانتی چاہتی تھی۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''تو اپنے من کو شانت رکھ پھول وتی! تیرے لئے چنتا کی کوئی بات نہیں ہے۔
میں جو موجود ہوں۔ اور پھر اس مسئلے کو یوں ہی نہ چھوڑ دوں گا۔ ابھی میں ایک بڑا جاپ
کروں گا۔ یہ جاپ اُنتالیس دن کا ہو گا۔ لیکن یہ میں اس سے شروع کروں گا جب اس
کا صحیح وقت ہو گا۔ چنانچہ اس جاپ کے بعد ممکن ہے مجھے کچھ معلوم ہو جائے۔''

رانی پھول وتی نے گردن ہلا دی اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''مہاراج! رات بہت بیت گئی ہے۔ ہمیں ابھی دریا پار کرنا ہے۔ یوں بھی یہ موسم
ایسا ہے کہ دریا کے پانی کا بہاؤ کافی تیز ہے۔ چنانچہ اب میں آ گیا چاہتی ہوں۔''

''بھگوان تجھے سکھی رکھیں پھول وتی۔'' پنڈت لال چند نے کہا اور رانی پھول وتی
مندر سے نکل آئی۔ شاہی کشتی کے کشتی بان دریا کے کنارے بیٹھے رانی پھول وتی کی
واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

پھول وتی اپنے بچے کو کاندھے سے لگائے باندیوں کے ساتھ کشتی کے نزدیک پہنچ
گئی۔ باندیاں اپنی کشتیوں میں بیٹھ گئیں۔

دریا میں کافی شور ہو رہا تھا۔ پانی کی روانی کچھ اور بڑھ گئی اور ملاحوں کے چہرے
متفکر تھے۔

''کیا بات ہے...... تم لوگ کچھ پریشان سے ہو۔'' رانی پھول وتی نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے رانی جی۔ بس ندی کا بہاؤ کچھ تیز ہے۔ یوں لگتا ہے
جیسے کہیں پہاڑوں پر بارش ہوئی ہو اور بارش کا پانی اکٹھا ہو کر ندی میں اضافے کا باعث
بن گیا ہو۔'' کشتی بانوں نے جواب دیا۔

''کیا اس باڑ میں کشتی کا کھینا خطرناک تو نہیں ہو سکتا؟'' رانی پھول وتی نے
پوچھا۔

''نہیں رانی جی! ابھی باڑ اتنی تیز نہیں ہوئی ہے۔ ہم اطمینان سے جائیں گے۔''
کشتی بانوں نے جواب دیا۔ وہ تجربہ کار ملاح تھے اور کشتی کی باڑ ان کے لئے کوئی خاص
حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے کشتی دھکیل کر پانی میں ڈال دی۔ رانی پھول وتی کشتی
میں سوار ہو گئی۔

لیکن ابھی کشتی تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ پیچھے سے پانی کا ایک خوفناک ریلا آیا اور
کشتی اس پر ڈول گئی۔ رانی نے پوری قوت سے بچے کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔ پھر وہ
متوحش لہجے میں ملاحوں سے بولی۔

''یہ کیا بات ہے...... کیا کشتی خطرے میں ہے؟''

ملاحوں کے چہروں پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ انہوں نے کسی قدر
متفکر لہجے میں کہا۔

''نہیں رانی جی! ابھی کوئی بڑا خطرہ تو نہیں ہے۔ لیکن آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ
پانی کی ایک بہت بڑی باڑ اس پانی میں اور شامل ہو گئی ہے۔ اس لئے کشتی کافی پریشانی
میں پھنس چکی ہے۔'' ملاح نے جواب دیا۔

''میں تم لوگوں سے پہلے ہی پوچھ رہی تھی کہ اگر خطرہ ہو تو اس سے کشتی کو پانی میں

نہ ڈالو۔ مگر تم لوگوں نے اپنی حد سے زیادہ تجربہ کاری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے اس
کشٹ میں ڈال دیا ہے۔''

''ہم شما چاہتے ہیں رانی جی! لیکن آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس میں ہمارا کوئی دوش
نہیں ہے۔ پانی اچانک ہی آیا ہے۔'' ملاح نے جواب دیا۔

رانی پھول وتی خاموش ہو گئی۔ لیکن اس کی نگاہیں خوفزدہ انداز میں پانی کو دیکھ رہی
تھیں جس میں بڑے بڑے بلبلے اٹھ رہے تھے اور پانی پوری قوت سے بہتا ہوا آ رہا
تھا۔ کشتی کی رفتار ملاحوں کے بس سے باہر ہوتی جا رہی تھی اور تیز رفتاری سے بہنے لگی
تھی۔ ملاحوں کے چہروں پر کچھ اور خوف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

''رانی جی! ایک اور پریشانی آ گئی ہے۔ اگر آپ ہمیں جان کی معافی دیں تو
بتائیں؟''

''بتاؤ...... بتاؤ......'' رانی پھول وتی خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''باڑ اب اتنی تیز ہو گئی ہے کہ کشتی کو اب کنارے کی طرف کاٹنا بہت مشکل ہو گیا
ہے۔''

''کیا مطلب ہے اس بات کا؟ کیا کشتی کنارے تک نہیں پہنچ سکے گی؟'' رانی
پھول وتی نے کہا۔

''نہیں دیوی جی! کشتی کنارے تک پہنچ جائے گی لیکن ہم اسے کاٹیں گے نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''بادبانوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چپوار اس تیز بہاؤ میں ہمارے بازوؤں کا
ساتھ نہیں دے سکتے چنانچہ ہمیں ایک ہی ترکیب کرنی ہے۔''

''وہ کیا؟'' رانی پھول وتی نے کپکپائے سے لہجے میں پوچھا۔

''ہم کشتی کو بائیں سمت آہستہ آہستہ چھوڑے دیتے ہیں۔ یہ اپنی رفتار سے جس
تیزی سے آگے بڑھے گی ہم اس وقت اسے پوری قوت سے کناروں کی طرف کاٹیں
گے۔ یوں آہستہ آہستہ اس کا رخ بدلتا جائے گا اور کشتی کے ٹوٹنے کا خطرہ بھی نہ رہے
گا۔'' ملاح نے جواب دیا۔

''ہائے رام...... تو کیا کشتی ٹوٹنے کا بھی خطرہ ہے؟'' رانی پھول وتی نے پوچھا۔

''دیوی جی! بھگوان پر بھروسہ کریں۔ بھگوان جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔''
ملاحوں نے جواب دیا۔ ان کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے اور وہ خود زندگی اور

موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے چند کو تو اپنی موت کا
خیال بھی نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ سوچ رہے تھے کہ اگر رانی پھول وتی کسی حادثے کا شکار
ہو گئی تو ان کے خاندان تک کی خیر نہیں ہے۔ وہ اپنے جسم کی پوری قوت سے کشتی کو
کنارے کی جانب کاٹ رہے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کی کوئی کوشش کارگر ہی نہ ہونے پا
رہی تھی۔

کشتی کی رفتار طوفانی ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھی، اس کی
رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ پانی پر کسی تنکے کی طرح ڈول رہی تھی۔
بادبانوں سے خاص طور سے خطرہ تھا۔ اگر بادبان میں ہوا بھر گئی اور کشتی ایک طرف ہو گئی
تو پانی کی تیز باڑ اسے الٹ دے گی۔ چنانچہ ملاحوں نے پہلی کوشش یہی کی کہ بادبان
اُتار دیئے جائیں۔ اس تیز رفتار سفر میں بادبانوں کا اتارنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ
انہوں نے لمبے لمبے چاقوؤں سے بادبانوں کے رسے کاٹ دیئے اور بادبان ہوا میں
اُڑتے ہوئے نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

کشتی کی برق رفتاری اسے آن کی آن میں میلوں دور لے گئی تھی اور کشتی کے
بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اصل جگہ سے کتنی دور نکل آئی ہے۔ ملاحوں کی ہر
تدبیر ناکام ہو رہی تھی۔ اور پھر جب امید کی آخری ڈور بھی ٹوٹ گئی تو ملاح ہاتھ جوڑ کر
کھڑے ہو گئے۔

''رانی جی...... بھگوان کی سوگند اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہے...... ہمیں شما کر
دیں۔ ہم نے اپنے نمک کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

رانی پھول وتی ان کے چہروں کی سراسیمگی سے ان کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ اس نے
آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے خوبصورت بچے کی جانب۔ اس کی آنکھوں سے آنسو
ٹپک پڑے۔

''ہائے رام، کیا راجندر! تو اتنی سی عمر کے لئے اس سنسار میں آیا تھا؟''
پھر اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''ہائے بھگوان...... تیری دیا ہو جائے تو میں اپنا جیون اپنے بچے کو دینے کو تیار
ہوں۔ تو میرا جیون چھین لے اور میرے راجندر کو میرا جیون دے دے۔''

رانی پھول وتی نے درد بھری آواز میں کہا اور باندیوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ
سب اپنی زندگی سے ہی خوفزدہ تھیں لیکن رانی کی درد بھری بات سن کر وہ اپنا دکھ بھول

گئیں۔ ان سب کے آنسو رواں ہو گئے۔

ملاح جی چھوڑ بیٹھے تھے۔ کشتی اب کسی دم کی مہمان تھی اور کبھی کبھی وہ پوری کی پوری گھوم جاتی تھی۔ جس وقت وہ گھومتی تو باندیاں ایک دوسرے پر گر پڑتیں۔ لیکن اب باندیوں نے رانی پھول وتی کے گرد حلقہ بنالیا تھا تاکہ رانی پھول وتی ادھر اُدھر گرنے نہ پائے۔

پانی کی ایک بہت تیز لہر نے کشتی کو بہت اونچا اٹھا لیا۔ ملاحوں کو یقین ہو گیا کہ اس کے بعد کشتی نیچے آئے گی تو فوری طور پر یا تو بیچ میں سے ٹوٹ جائے گی یا پھر ڈوب جائے گی۔ وہ اپنی موت کا انتظار کرنے لگے۔ نجانے کیا ہوا، کشتی کی رفتار ایک دم کم ہو گئی۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی چیز پر چڑھ گئی ہو۔ لہروں کے جو ہلکورے کشتی کے نیچے محسوس ہوتے رہے تھے یک لخت تھم گئے اور وہ لوگ جواب کسی بھی لمحہ موت کے منتظر تھے اس اچانک سکوت اور خاموشی پر اس انداز میں ساکت رہ گئے تھے جیسے متوقع ہوں کہ اب زندگی کا وہ آخری لمحہ آن پہنچا ہے جو انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دے گا اور وہ زندہ نہ بچ سکیں گے۔ یہ خاموشی اور سکوت موت کی آمد کے استقبال کا سکوت ہے۔

لیکن موت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کب آ جائے۔ کوئی اس کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب وہ زندگی کی طرف دوڑ رہے تھے تو موت ان کا خوفناک تعاقب کر رہی تھی۔ اور جب وہ موت سے شکست کھا کر اس کے پہلو میں جانے کے لئے تیار ہو گئے تو اچانک زندگی نے موت کے سامنے لوادی دیوار بنا دی۔

ملاحوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کشتی خشکی پر چڑھی ہوئی تھی۔ یہ کیسی خشکی تھی اور کون سا ساحل تھا؟ اس کے بارے میں اس تاریک اور طوفانی رات میں ملاح کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔

لیکن یہ یقین کرنے میں انہیں کافی دقت پیش آئی کہ کشتی خشکی پر ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ساحل کو دیکھ رہے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

بہرصورت جگہ کوئی سی بھی ہو لیکن چند ساعت کے بعد وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس وقت جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ درحقیقت یہ کوئی واہمہ نہیں ہے بلکہ وہ ساحل سے آ

لگے ہیں اور تیز رفتار دریا اس ساحل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

رانی پھول وتی بھی آنکھیں بند کئے اپنے بچے کو سینے سے بھینچے بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ وہ اپنے نونہال کی بہار نہ دیکھ سکی اور اس حادثے کا شکار ہو گئی۔

لیکن جب اسے بھی کچھ سکوت سا محسوس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور ملاح کو آواز دی۔

''یہ کیا ہوا ہے؟ ...... یہ اچانک کشتی کا بہنا کیسے بند ہو گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''بدھائی ہو مہارانی جی! بدھائی ہو ...... بھگوان نے ہمارا جیون بچا لیا ہے۔'' ملاح نے خوشی سے کہا اور رانی پھول وتی بھی بچوں کی مانند خوش ہو گئی۔

''سچ ......؟'' اس نے تحیر بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں رانی جی ...... بھگوان نے ہماری لاج رکھ لی۔ ورنہ ہم تو موت کے بعد بھی اس بات پر شرمندہ رہتے کہ رانی جی کو ہمارے ہاتھوں تکلیف پہنچی۔''

''اب فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ جلدی سے کشتی سے اترو۔ میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔'' رانی پھول وتی نے کہا اور اس کے نزدیک بیٹھی باندیاں چونک پڑیں۔

سب کے سب موت کے خوف کا شکار تھے اور چند ساعت کے لئے وہ سب حفظ و مراتب بھول گئے تھے۔ باندیاں یہ بھول گئی تھیں کہ وہ رانی کے ساتھ سفر کر رہی ہیں اور ان کی ذمہ داری کیا ہے۔ موت بڑی خوفناک چیز ہے اور زندگی بھر آدمی اقتدار کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ لیکن جب موت نزدیک آ جائے تو سارے اقدار، سارے حفظ و مراتب سمندر میں بہہ جاتے ہیں۔ باندیوں کا بھی اس وقت یہی حال تھا۔ لیکن اب جبکہ انہیں زندگی کی امید ہو گئی تھی تو انہیں یہ خیال بھی آیا کہ رانی پھول وتی کی خدمت ہی ان کا جیون ہے۔ اور اگر انہوں نے رانی کے لئے کچھ نہ کیا تو پھر جیون میں ان کے لئے کانٹے ہی کانٹے ہوں گے۔

چنانچہ باندیوں نے جلدی جلدی خشکی پر کود کر رانی کو سنبھالا۔ رانی نے اپنے بچے کو سینے سے جدا نہ کیا۔ ایک باندی نے اسے لینے کی کوشش کی تو رانی نے اسے منع کر دیا۔

''نہیں ...... میں اسے کسی کے حوالے نہیں کروں گی ...... بھگوان نے اسے دوبارہ میرے پاس بھیجا ہے۔ تم مجھے ایسے ہی سہارا دے کر اتار دو۔''

باندیوں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا۔ ملاحوں نے کشتی کو کچھ اور اوپر کھینچ لیا

تھا۔

یہ تو بعد میں دیکھنے کی بات تھی یہ کون سی جگہ ہے، کون سا ساحل ہے۔ فی الوقت تو انہیں زندگی بچ جانے کی بے حد خوشی تھی۔

کشتی کو محفوظ جگہ لانے کے بعد وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ رانی باندیوں کے ساتھ جا بیٹھی۔ وہ اب تک سینے سے اپنے بچے کو بھینچے ہوئے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ باندیوں نے اس کے گرد حلقہ قائم کر لیا تھا۔

ملاح اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کون سی جگہ ہے۔ کشتی تو دریا کے بیچوں و بیچ بہہ رہی تھی۔ پھر یہ ساحل اچانک کہاں سے آ گیا اور ساحل بھی ایسا کہ اتنا ڈھلان تھا کہ کشتی اس پر با آسانی چڑھ گئی تھی۔ ورنہ دریا کے ساحل تو ناہموار تھے۔

وہ رات کی تاریکی میں آگے بڑھے تو ان کے قدموں کے نیچے حسین سبزہ زار آ گئے۔ گھاس کا یہ میدان دور تک چلا گیا تھا۔ گو تھوڑی سی چڑھائی تھی لیکن اتنی نہیں کہ وہ کسی تکلیف کا شکار ہو جاتے۔

پھر انہوں نے درختوں کی قطاریں دیکھیں۔ درخت سرسبز و شاداب تھے۔ یہ حسین جگہ ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی اس حسین جگہ کو نہیں دیکھا تھا۔

گو درختوں کے سوکھے ہوئے پتے اور اس جگہ کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی انسانی وجود نہیں ہے جو اس جگہ کو صاف ستھرا کرتا۔ لیکن بہرصورت یہ انوکھی جگہ ان کی سمجھ میں بالکل نہ آئی۔

کافی دور تک جانے کے بعد بھی جب انہیں کوئی اندازہ نہیں ہوا تو وہ واپس پلٹ کر رانی کے پاس چل پڑے اور رانی پھول وتی کے پاس پہنچ گئے۔

''رانی جی! کیا آپ اس جگہ کو پہچانتی ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں ...... کیوں، کیا بات ہے؟''

''ہماری تو سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔'' ملاحوں نے جواب دیا۔

''اوہ......'' رانی پھول وتی کے ہونٹ سکڑ گئے۔ پھر وہ بولی۔

''کوئی بات نہیں ...... اگر رات یہاں بیت جائے تو ہم یہاں بتا لیں گے۔ صبح کو پتہ چل جائے گا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ تم لوگ چنتا مت کرو۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''جو آ گیا مہارانی جی! پھر اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟''

''تم خود سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ یوں کرو کہ اگر یہاں خشک ٹہنیاں ملیں تو انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ جلا دو۔ ممکن ہے یہاں خطرناک جانور بھی ہوں۔ ساری رات ہمیں جاگنا ہو گا۔ ہم اس سے تک نہیں سو سکیں گے جب تک کہ ہمیں معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا مہارانی جی!''

اور پھر وہ رانی کی مرضی کے مطابق کام کرنے لگے۔

ساری رات رانی نے وہیں بیٹھ کر گزار دی۔ جگہ جگہ الاؤ روشن کر دیئے گئے اور ملاح ساری رات الاؤ میں خشک لکڑیاں ڈالتے رہے اور مختلف چیزیں ہاتھوں میں لے کر پہرہ دیتے رہے کہ اگر کہیں سے کوئی جنگلی جانور نکل آیا تو اس سے حفاظت کی جا سکے۔ لیکن یہاں کسی جانور کا وجود نہیں تھا۔

ساری رات گزر گئی اور صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ پچھلی رات کا وہ خوفناک سفر اور پھر وہ حادثہ جس سے نجانے کس طرح جان بچ گئی تھی، رانی کے اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہوا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ لیکن اس کے سینے سے گوشت کا جو لوتھڑا چمٹا ہوا تھا وہ اس کی زندگی میں حرارت دوڑا رہا تھا اور اولاد جب ماں کی آغوش میں ہو تو ماں کی آغوش کبھی تھکن محسوس نہیں کرتی۔ خاص طور سے اس وقت جبکہ بچہ خطرہ میں ہو۔

صبح کی روشنی ہوئی تو ملاح دوڑ کر دریا سے پانی لے آئے اور اس پانی سے رانی نے منہ ہاتھ دھویا، بال سنوار کر جب وہ تیار ہوئی تو باندیاں اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

''اب تو راجکمار کو ہمیں دے دیجئے مہارانی! آپ تھک گئی ہوں گی۔ اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

رانی پھول وتی نے راجندر کمار کو اپنی خاص خادمہ کی آغوش میں دے دیا۔ پھر بولی۔ ''اس کا خیال رکھنا۔''

''آپ چنتا نہ کریں رانی جی!'' باندی نے جواب دیا اور رانی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''پتہ نہیں کون سی جگہ ہے...... اس سے پہلے تو ہم نے کبھی یہ جگہ نہیں دیکھی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم کافی دور نکل آئے۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''ہاں رانی جی!'' ایک باندی نے جواب دیا۔

''لیکن یہ فاصلہ اتنا ہے کہ کبھی ہم نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔'' ایک دوسری باندی نے کہا۔

''ہاں ...... ہم کافی دور آ چکے ہیں اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ دور ہونے کی وجہ سے ہم اس راستے پر کبھی نہیں آئے۔'' رانی پھول وتی نے جواب دیا۔ ''لیکن اب کیا ہو گا؟''

''کچھ نہیں ہو گا رانی جی! اب تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ رات کی بات دوسری تھی۔ آپ فکر نہ کریں ...... ہم کسی نہ کسی طرح راستہ تلاش کر لیں گے اور اس کے بعد اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔'' ملاحوں نے رانی کو یقین دلایا اور رانی سر ہلانے لگی۔

''لیکن تم لوگ پتہ تو چلاؤ آخر یہ کون سی جگہ ہے؟''

''بس دن کی روشنی پھوٹ چکی ہے ...... اب ہم اس جگہ کے بارے میں اندازہ لگانے کے لئے نکلتے ہیں۔'' ایک ملاح نے جواب دیا اور رانی نے گردن ہلا دی۔

ملاح تو ایک طرف چلے گئے لیکن رانی کو بھی اس جگہ کے بارے میں تجسس تھا۔ چنانچہ وہ اپنی باندیوں کے ساتھ ایک طرف چل پڑی۔

اس نے جس طرف کا رخ کیا وہ چڑھائی تھی اور اس چڑھائی کا اندازہ رات کی تاریکی میں تو نہیں ہو سکا تھا۔

لیکن جب دن کی روشنی میں انہیں اس جگہ کے بیچوں بیچ درختوں میں گھری ایک بوسیدہ عمارت نظر آئی تو وہ سب چونک پڑیں۔

یہ عمارت بہت بوسیدہ تھی اور اس پر کائی کی تہیں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ عمارت بالکل سیاہ اور تاریک نظر آ رہی تھی۔ ٹوٹی ہوئی عمارت بے حد عجیب تھی۔ لیکن رانی کے دل میں اس عمارت کے بارے میں کوئی احساس نہیں جاگا۔ وہ تجسس کے ساتھ اس عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

''دیکھیں تو سہی یہ کون سی عمارت ہے ...... کون سی جگہ ہے۔'' اس نے اپنی باندیوں سے کہا اور باندیاں بھی اس کے پیچھے ہو لیں۔

اور تھوڑی دیر کے بعد وہ عمارت کے دروازے تک پہنچ گئیں۔

بڑی حسین عمارت ہو گی کسی زمانے میں ...... لیکن اب تو بالکل بدنما لگ رہی تھی۔ ساری عمارت کائی کی لپیٹ میں تھی۔ جگہ جگہ زنگ نے دیواروں کو بری طرح کھا لیا تھا۔

کئی جگہ سے اینٹیں گر چکی تھیں۔ ممکن ہے کبھی دریا کا پانی یہاں چڑھ آیا ہو جس کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ لیکن یہ بوسیدہ عمارت بڑی ہی عجیب اور پراسرار تھی۔

رانی نے ایک لمحے کے لئے جھرجھری سی لی۔ اسے نجانے کیوں یہ احساس ہوا کہ اس عمارت میں داخل ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹک دیا اور اس کے خوف پر تجسس غالب آ گیا۔ اس عمارت کو دیکھنا چاہئے۔ آخر یہ ہے کون سی عمارت اور کس نے بنوائی ہے؟ اس نے سوچا اور اپنی باندیوں کے ساتھ عمارت میں داخل ہو گئی۔

اندر کا ماحول بالکل خاموش تھا۔ عمارت کے بیچوں بیچ ایک ٹوٹی ہوئی سمادھی نظر آ رہی تھی۔ سمادھی کا اوپری حصہ ٹوٹ کر گر چکا تھا لیکن نچلا حصہ سلامت تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، گہری سانس لے کر بولی۔

''کسی کی سمادھی معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں مہارانی جی!''

''لیکن کس کی؟ اس سے پہلے ہم نے اس سمادھی کے بارے میں نہیں سنا۔''

''وہی بات آتی ہے مہارانی جی کہ یہ علاقہ ہماری راجدھانی سے اتنا دور ہے کہ ہم کبھی اس طرف نہیں آ سکے۔'' باندی نے جواب دیا۔

''لیکن انوکھی جگہ ہے ...... ہمیں تو بڑی عجیب محسوس ہو رہی ہے۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''مہارانی جی! آپ کو خوف تو محسوس نہیں ہو رہا؟''

''نہیں ......''

''ہمارا تو خیال ہے آیئے یہاں سے چلیں۔'' باندیوں نے کہا۔

''کیوں ...... تم لوگ کیوں پریشان ہو رہی ہو؟'' رانی پھول وتی نے پوچھا۔

''نجانے کیوں رانی جی ہمیں ایک عجیب سا احساس ہو رہا ہے جیسے ......'' باندی کوئی صحیح جملہ ادا نہ کر سکی اور خاموش ہو گئی۔

رانی پھول وتی ہنس پڑی تھی۔

''پگلی ہے تُو ...... چھوڑ ...... منش کے جیون کی انتہا تو یہی ہوتی ہے۔ پھر اس سے کیا ڈرنا؟'' رانی نے کہا اور پھر باندیوں سے بولی۔

''اچھا اب تم لوگ ذرا دور ہٹ جاؤ۔ میں کچھ دیر سونا چاہتی ہوں۔ ساری رات

کی جاگی ہوئی ہوں، سخت نیند آرہی ہے۔"

"راجکمار کو ہمیں دے دیں رانی جی۔" باندی نے کہا۔

"نہیں، اسے میرے پاس ہی سونے دو۔" رانی پھول وتی نے کہا اور پھر اپنے بچے کو سینے سے لگائے لیٹ گئی۔ باندیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ رانی خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

ابھی اسے لیٹے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دفعتہ اسے ایک سرسراہٹ محسوس ہوئی اور وہ چونک گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا لیکن دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ رانی نے اسے اپنی سماعت کا واہمہ سمجھا۔

اس نے پھر آنکھیں بند کیں۔ لیکن دفعتہ اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سا احساس جاگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی پلکیں جڑ گئی ہوں اور اب یہ پلکیں کھل نہ سکیں گی۔ اس نے پلکیں کھولنے کی کوشش کی لیکن کوشش کے باوجود اس کی پلکیں نہ کھلیں اور بند آنکھوں میں اسے دو آنکھیں نظر آئیں...... حسین آنکھیں...... ایسی حسین آنکھیں جن کی کشش کا وہ تصور نہیں کر سکتی تھی۔ یہ آنکھیں خوفناک نہیں تھیں، بڑی سندر، بڑی پیاری آنکھیں تھیں اور بڑے پیار سے رانی کو دیکھ رہی تھیں۔ رانی نے چونک کر دوبارہ پلکیں کھولنے کی کوشش کی اور اس بار اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر دفعتہ اس کی نگاہیں اپنے بچے پر پڑیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت سے اچھل کر بیٹھ گئی تھی۔ بچے کے قدموں میں خوبصورت پھولوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور یہ پھول قرب و جوار میں کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نجانے یہ پھول کہاں سے آ گئے تھے۔

رانی پھول وتی اپنی جگہ کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تعجب سے اپنے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پھول راج کمار کے قدموں میں مہک رہے تھے۔ جیتے جاگتے، تازہ پھول۔ کسی باندی کو کیا پڑی تھی کہ وہ سوتے ہوئے راجکمار کے چرنوں میں پھول بھینٹ کرے۔ اور پھر کوئی باندی تو یہاں آنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ رانی نے انہیں منع کر دیا تھا۔

پھر یہ پھول......؟ چند لمحات کے لئے رانی کے ذہن میں خوف کے سائے رینگ آئے۔ یہ سادھی نہ جانے کس کی ہے...... کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔ اس نے سوتے ہوئے راجکمار کو دیکھا جو بڑی مست نیند سو رہا تھا۔ بالکل پُرسکون۔ رانی کو

کچھ سکون ہوا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ لیکن نیند اب اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ پھولوں کے معمے کو حل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ آخر یہ پھول کہاں سے آئے؟ پھر اس نے سوچا۔ پھول تو عقیدت کی، پیار کی نشانی ہوتے ہیں...... ان سے کوئی برائی تو نہیں جھلکتی۔

"سچ کہا رانی جی!" ایک مدھر آواز اس کے کانوں میں ابھری اور رانی پھر اچھل پڑی۔

"کون ہے...... کون ہے یہاں......؟" اس کی گھگھیائی ہوئی آواز ابھری۔ لیکن اس سوال کا اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

"میں پوچھتی ہوں یہاں کون ہے؟" وہ پھر بولی اور اس کی آواز در و دیوار سے ٹکرا کر واپس پلٹ آئی۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

"ہے بھگوان...... میں کس مصیبت میں پڑ گئی۔ یہ کیا نشٹ پڑ گیا ہے مجھ پر؟ کیا کروں......؟" اس نے خود سے کہا اور گردن جھکا لی۔

"تم پریشان کیوں ہو پھول وتی؟" وہی آواز پھر ابھری۔ اور پھول وتی کا جھکا ہوا سر دوبارہ اٹھ گیا۔

"تم کون ہو...... سامنے کیوں نہیں آتیں؟ بولو، تم جو کوئی بھی ہو، سامنے آؤ۔" پھول وتی چیخ کر بولی لیکن جواب میں وہی پراسرار خاموشی چھائی رہی۔ رانی کے لئے اب یہاں رکنا ممکن نہ رہا تھا۔ بہر حال عورت تھی، کوئی خوفناک واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ پراسرار آواز اس کے لئے خوف کا باعث بن گئی تھی۔

اس نے راجندر کمار کو اٹھا کر کندھے سے لگایا اور وہاں سے واپس پلٹی تبھی اس کے کانوں میں سسکیاں گونج اٹھیں۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے...... میں نے تو تمہیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ٹھہرو، کچھ دیر ٹھہرو۔ آرام کر لو۔ اب میں تمہیں کوئی کشٹ نہیں دوں گی۔ ٹھہر جاؤ رانی پھول وتی! تھوڑی دیر تو ٹھہر جاؤ۔"

سسکیوں کے ساتھ یہ آواز بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ لیکن وہ نہ رکی۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اب اسے ویران ماحول سے واقعی خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

دور سے باندیاں نظر آئیں تو اسے کچھ ڈھارس ہوئی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ پھر باندیوں نے اسے دیکھ لیا اور اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے قریب پہنچ

گئی تھیں۔

''ہمیں آواز دے لی ہوتی ...... ہمیں بلا لیا ہوتا رانی جی!'' باندیاں کہنے لگیں۔

''آپ سوئی کیوں نہیں؟''

''کوئی بات نہیں ...... بس نیند نہیں آئی۔ جب نیند نہیں آئی تو میں نے وہاں رکنا بے کار سمجھا۔'' پھول وتی نے کہا۔ سادھی کے قریب کے واقعات کو اس نے دل ہی میں رکھا تھا۔ یہ باندیاں تھیں، بے وقوف لڑکیاں۔ اگر ان سے بات کا تذکرہ کر دیا جاتا تو وہ خوفزدہ ہو جاتیں۔ اس لئے رانی ان باتوں کو گول کر گئی تھی۔

''یہ ملاح نہیں آئے ابھی؟''

''ہاں ...... ابھی نہیں آئے رانی جی۔''

''دیکھو ان پاپیوں کو۔ باڑھ اگر کم ہو گئی ہو تو یہاں سے چلیں۔ کیا سارا دن یہاں لگا دیں گے؟''

باندیاں جانے لگیں تو رانی چیخ کر بولی۔

''کیا سب چلی جاؤ گی؟ بیلا! تم میرے پاس رک جاؤ۔''

''میں تو نہیں جا رہی رانی جی!'' بیلا جو کافی سمجھدار اور رانی کی خاص باندی تھی، رانی کو بغور دیکھتی ہوئی بولی۔

''باقی لوگ جاؤ اور ملاحوں کو جلدی بلا کر لاؤ۔'' رانی نے حکم دیا اور بیلا کے سوا ساری باندیاں چلی گئیں۔ بیلا انہیں جاتے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے رانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کہوں رانی جی؟''

''ہوں ...... کیا بات ہے؟''

''آپ سادھی کے اندر سے کچھ خوفزدہ سی آئی تھیں ...... کیا اس ویرانے میں ڈر محسوس ہوا تھا؟''

''نہیں بیلا! تو جانتی ہے میں اتنی ڈرپوک نہیں ہوں۔ بس کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے تھے کہ میں وہاں رک نہ سکی۔''

''واقعات؟'' بیلا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ...... واقعات۔''

''وہ کیا رانی جی؟''

''میں نے سونے کے لئے آنکھیں بند کیں تو میری نگاہوں میں دو آنکھیں کھب گئیں۔ ایسی سندر آنکھیں کہ بس من لٹ کر رہ جائے۔ نہ جانے وہ کس کی آنکھیں تھیں۔ یہ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن ......''

''لیکن کیا مہارانی جی؟'' بیلا نے بے چینی سے پوچھا اور پھول وتی نے اسے پھولوں کے بارے میں اور پھر اس آواز کے بارے میں بتایا اور بیلا ششدر رہ گئی۔

''تب تو یہ جگہ بڑی خطرناک ہے۔''

''بکواس مت کر ...... میں نے یہ سب تجھے اس لئے نہیں بتایا ہے۔ یہ سادھی جس کی بھی ہے اور وہ آواز جس کی بھی تھی، وہ کوئی بری روح نہیں ہے۔ بس یہ ہمارے من کا ڈر ہے۔''

''مگر رانی جی!''

''کس طرح یہ معلوم ہو کہ یہ سادھی ہے کس کی؟''

''یہ بہت پرانی عمارت ہے۔ صدیوں پرانی۔ اس سے پہلے تو کبھی اس کے بارے میں سنا بھی نہیں۔''

''ہاں ...... دیواروں پر کیسی کائی لگی ہوئی ہے۔ یہ معلوم ضرور ہونا چاہئے کہ یہ سادھی کس کی ہے۔''

''یہاں سے نکل کر تو چلیں رانی جی! بھگوان کرے کہ اب ندی میں باڑھ نہ ہو۔''

''باڑھ ہوئی بھی تو رک ہی جائے گی۔ چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھول وتی نے کہا۔

بیلا خوفزدہ نگاہوں سے سادھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں کچھ سائے رقصاں ہوں اور اس کے چہرے سے خوف کے آثار جھلک رہے تھے۔ لیکن رانی اس کے احساسات سے بے خبر سادھی میں کھوئی ہوئی تھی۔

تبھی باندیاں ملاحوں کے ساتھ واپس آ گئیں۔ ملاح مطمئن اور مسرور تھے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''بھگوان نے کرپا کی ہے مہارانی جی! باڑھ ٹوٹ گئی ہے۔ کشتی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔''

''تم کہاں جا مرے تھے؟'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''کشتی کو دیکھ رہے تھے مہارانی جی! کہیں ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی ہے۔ آ گیا ہوتو

چلیں؟''

''ہاں چلو۔'' رانی نے جواب دیا اور پھر آخری بار اس نے سادھی کی طرف نگاہ ڈالی۔ ایک دم اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ سادھی کی جگہ اب ایک ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ سفید ساڑھی میں لپٹا ہوا بدن، جس کا چہرہ نمایاں نہ ہو رہا ہو۔ پھر ایک نازک کومل ہاتھ فضا میں لہرایا اور پھر لہریں سی پھیل گئیں۔ ہیولے کی جگہ اب سادھی نظر آ رہی تھی۔

رانی ایک ٹھنڈی سانس لے کر پلٹ پڑی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اسے اس سادھی سے ایک اپنائیت کا سا احساس ہو رہا تھا۔ نجانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سادھی جس کی بھی ہے وہ اس کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ لیکن کون ہے وہ...... کون ہے......؟

ملاح کشتی تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے احتیاط سے رانی کو کشتی میں سوار کرایا اور کشتی دریا کے مخالف سمت کھینے لگے۔ رانی خاموش تھی۔ دیر تک یہ خاموشی جاری رہی۔ باندیاں رات کے طوفانی سفر کے بعد اب واپسی کے خیال سے مسرور نظر آ رہی تھیں۔

سجنا کماری نے ایک گیت شروع کر دیا۔ اس کی آواز بڑی من موہنی تھی۔ لیکن اس وقت جو گیت اس کے ہونٹوں سے چھوٹا اس نے رانی کو مضمحل کر دیا۔ یہ گیت برہا کا تھا۔ ایک پیاسی اپنے بھاگوں کو رو رہی تھی۔ برہا کی ان سیاہ راتوں کی دہائی دے رہی تھی جو اس کے مقدر کی طرح تاریک تھیں۔

نجانے کیسے اور کہاں سے دو آنسو پھول وتی کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ دوسری باندیاں بھی متاثر نظر آ رہی تھیں۔ پھر گیت ختم ہو گیا اور ایک لمحے تک سحر طاری ہو گیا۔ پھر اس سحر سے آزاد ہو کر رانی نے سجنا کماری کی طرف دیکھا۔

''اس سمے یہ گیت گانے کی کیا ضرورت تھی سجنا؟'' اور سجنا کماری چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''مجھ سے کچھ کہا رانی جی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میں پوچھ رہی تھی اس سمے تجھے یہ گیت کیوں یاد آیا؟'' رانی نے کہا اور سجنا کماری پاگلوں کی طرح ایک ایک کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار تھے۔

''مہارانی جی کیا کہہ رہی ہیں بیلا؟''

''گیت کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔''

''کون سے گیت کے بارے میں؟''

''جو تُو گا رہی تھی۔''

''میں؟''

''تُو اور کیا میں؟''

''مگر بھگوان کی سوگند میں تو بالکل خاموش ہوں۔'' سجنا نے کہا اور رانی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''بھگوان کی جھوٹی سوگند کھا رہی ہے؟'' رانی پھول وتی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''مہارانی کے چرنوں کی قسم...... میں نے کوئی گیت نہیں گایا۔ میں تو دیر تک ندی کی لہروں کو دیکھتی رہی ہوں۔''

''سجنا کماری پاگل ہو گئی ہے......'' باندیاں ہنسنے لگیں۔ لیکن سجنا کماری اسی طرح پریشانی سے ایک ایک کی صورت دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی گیت نہیں تھا۔

''تُو نے گیت نہیں گایا؟''

''ماتا کی سوگندھ۔ میں نے کوئی گیت نہیں گایا۔ میں نے تو آواز بھی نہیں نکالی ہے۔''

باندیاں پھر ہنسنے لگیں۔ لیکن رانی پھول وتی نے اب غصے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ پھر سادھی میں کھو گئی تھی۔ جو پراسرار واقعات اسے پیش آئے تھے وہی اتنے حیرت انگیز تھے۔ کیا کہا جا سکتا ہے، باندی سجنا بھی انہی واقعات کے زیر اثر ہو۔

باندیاں چہلیں کرتی رہی تھیں۔ لیکن رانی پھول وتی نے اب اس سلسلہ میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

سفر کافی طویل ہو گیا تھا۔ ملاح پوری قوت سے کشتی چلا رہے تھے لیکن ابھی تک انہیں کوئی جانا پہچانا راستہ نظر نہیں آیا تھا۔

''کیا ہم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں؟'' سورج ڈھلے رانی پھول وتی نے پوچھا؟''

''ہاں رانی جی۔''

''لیکن ابھی تک ہم پہنچے کیوں نہیں؟''

''باڑھ میں بہہ کر ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔''

''تو پھر کب تک پہنچیں گے؟''

''شاید رات تک۔'' ملاحوں نے جواب دیا اور رانی گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

سورج چھپا ہی تھا کہ دور سے بہت سی کشتیاں نظر آئیں جو اسی طرف آ رہی تھیں اور ملاح چیخ پڑے۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے اور کشتیاں ان کے قریب آتی جا رہی تھیں۔

خود راجہ چندر پرکاش ایک بڑی کشتی میں سوار تھا اور بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کشتیاں اس کشتی کے نزدیک پہنچ گئیں۔ باندیاں دوسری کشتیوں میں منتقل ہو گئیں اور رانی پھولوتی اس کشتی پر جس پر راجہ چندر پرکاش سوار تھا۔ چندر پرکاش نے بے چینی سے رانی کو سہارا دیا تھا۔ اس نے اپنے بچے کو گود میں لے لیا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو پھول وتی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں..... بھگوان کی کرپا ہے۔''

''کیا ہوا تھا، کہاں رہ گئی تھیں؟ کہاں چلی گئی تھیں؟'' راجہ چندر پرکاش نے پوچھا۔

''بیٹھو تو سہی مہاراج! تھوڑا سکون تو لو۔ بڑا کشٹ اٹھانا پڑا۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے..... مگر ہوا کیا تھا؟'' راجہ چندر پرکاش بولا اور رانی کو لئے

ہوئے کشتی کے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ رانی پھول وتی بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ راجندر کو راجہ چندر پرکاش نے گود میں لے رکھا تھا۔ رانی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ راجہ چندر پرکاش اس کی طرف پوری طرح متوجہ نہ سہی، اپنے بیٹے سے تو پریم کرتا ہے۔ یہی بات اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن گئی تھی۔ چندر پرکاش اب بھی پریشان نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں..... بتاؤ تو سہی، رات کہاں بتائی؟'' چندر پرکاش نے پھر پوچھا۔

''ایک عجیب جگہ مہاراج!'' رانی نے کہا۔

''کون سی جگہ؟ میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں۔''

''ہم مہاراج لال چند کے پاس سے واپس لوٹے تو دریا پُرسکون تھا۔ لیکن جب کشتی آگے بڑھی تو دریا میں باڑھ آنا شروع ہو گئی۔ نجانے کہاں سے بے پناہ پانی آنا شروع ہو گیا تھا۔ ملاح نے کشتی کو مخالف سمت کھینے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور پھر کشتی کا سفر شروع ہو گیا۔ اور پھر یہ سفر ایسی جگہ جا کر ختم ہو گیا جہاں جیون کی کوئی آس نہ رہی تھی۔ کشتی تنکے کی طرح دریا میں ڈول رہی تھی۔ لیکن پھر وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جس کے بارے میں مہاراج! میں کچھ نہیں جانتی۔ حالانکہ مجھے اپنے دیش کے اطراف کے بارے میں ساری معلومات حاصل ہیں۔''

''کون سی جگہ تھی وہ؟'' راجہ چندر پرکاش نے پوچھا۔

''بس مہاراج!..... دریا کے بیچوں بیچ کوئی جگہ تھی۔ جہاں خوبصورت جنگل پھیلے ہوئے ہیں اور اس کے درمیان ایک چھوٹی سی عمارت ہے۔ اور یہ عمارت کسی کی سمادھی کی حیثیت رکھتی ہے۔ گو یہ سمادھی صدیوں پرانی لگتی ہے۔ نجانے کس کی سمادھی ہے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''اچھا.....'' راجہ چندر پرکاش نے تعجب سے کہا۔

''ہاں مہاراج..... اور ہم نے رات اسی سمادھی میں بتائی۔''

''اوہ..... بھگوان کا شکر ہے کہ تم لوگ بچ گئے۔ جب تم کافی دیر تک نہ پہنچیں تو لوگوں نے مجھے اطلاع دی۔ میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہیں لال چند نے روک لیا ہوگا۔ پھر میں نے دریا کے کنارے آدمی دوڑائے تو مجھے پتہ چلا کہ دریا میں باڑھ آئی ہوئی ہے اور میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ رات ہی سے

بہت سی کشتیاں تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہیں اور صبح ہوتے ہی میں بجرا لے کر چل پڑا اور تم مجھے مل گئیں۔ بھگوان کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔''

''ہاں ...... بھگوان کا شکر ہے۔'' رانی پھول وتی نے جواب دیا۔

محل میں پہنچ کر وہ پُرسکون تھی لیکن وہ آنکھیں اب بھی اس کے ذہن میں گردش کیا کرتی تھیں۔ نجانے کیسی آنکھیں تھیں۔ نجانے کس کی آنکھیں تھیں۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر اس نے اس سلسلے میں راجہ ہی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

راجندر کمار محل میں پہنچ چکا تھا اس لئے راجہ بے فکر ہو گیا تھا۔ اس کی فطرت میں لاپرواہی اور عیاشی بسی ہوئی تھی۔ نت نئی سندر ناریاں اس کی خواب گاہ میں نظر آتی تھیں اور انہیں لانے والے انعام پاتے تھے۔ چنانچہ رانی پھول وتی کی عورت کی حیثیت سے تو کوئی اہمیت ہی نہ تھی لیکن بہرصورت راجندر کمار کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس کی اتنی اہمیت ضرور ہو گئی تھی کہ اگر وہ کسی وقت راجہ کو بلاتی تو وہ آ جاتا تھا۔

''کیا بات ہے شریمتی جی ...... کیسے یاد کر لیا چندر پرکاش کو؟'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

''میں آپ کی شکرگزار ہوں مہاراج! کہ کم از کم یاد کرنے سے آپ چلے تو آتے ہیں۔''

''کیوں نہیں ...... کیوں نہیں ...... ہماری پتنی ہو ...... ہمارے بیٹے کی ماں۔''

''ہاں ...... جب تک بیٹے کی ماں ہوں عزت اور حیثیت ہے۔ کل آپ کی کسی اور رانی کے ہاں بیٹا ہو جائے گا تو ہماری یہ عزت کہاں باقی رہے گی۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''نہیں ...... یہ بات نہیں ہے پھول وتی! تم ہونے والے راجہ کی ماں ہو۔ اس لئے تمہاری عزت اور حیثیت تو خودبخود ہی بن گئی۔'' چندر پرکاش نے کہا اور رانی پھول وتی کا سینہ خوشی سے پھول اٹھا۔ یہ بات اس کے لئے بڑی خوشی کا باعث تھی کہ چندر پرکاش آنے والے سمے میں راجندر کو راجہ بنائے گا۔ تب راجہ نے کہا۔

''لیکن تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟''

''ایک بات معلوم کرنی تھی مہاراج!''

''ہاں ہاں ...... کہو۔''

''یہ بتایئے آپ نے اس جگہ کے بارے میں کچھ معلوم کیا جس کا میں نے ذکر کیا

تھا؟''

''کون سی جگہ؟'' راجہ چندر پرکاش نے تعجب سے پوچھا۔

''میں نے بتایا تھا نا ...... بھول گئے ہوں گے۔'' پھول وتی نے ناز سے کہا۔

''ہاں رانی! تم جانتی ہو راج پاٹ کے کاموں میں پھنس کر اتنا سمے کہاں ملتا ہے۔''

''راج کے کاموں میں پھنس کر؟'' رانی طنز سے بولی۔

''تو اور کیا؟''

''یا حسین اور سندر ناریوں کی سیاہ زلفوں کے جال میں پھنس کر سمے نہیں ملتا؟'' رانی نے کہا۔

''رانی پھول وتی جی! یہ راجاؤں کی شان ہوتی ہے۔ بہرحال چھوڑو ان باتوں کو۔ کون سی جگہ کی بات کر رہی ہو؟''

''اس پرانی سمادھی کی۔''

''اوہ ...... جہاں تم نے رات بتائی ہے؟''

''ہاں ......''

''میں کیا کہوں رانی! راج کے کاموں میں پھنس کر بھول گیا۔ لیکن تمہارے من میں ابھی تک اس کا خیال ہے؟''

''ہاں ......'' رانی عجیب سے لہجے میں بولی۔

''آخر کیوں؟''

''اس لئے کہ وہ انوکھی جگہ تھی۔ اس لئے کہ میں نے وہاں بڑی انوکھی باتیں دیکھی تھیں۔''

''کیسی انوکھی باتیں؟''

''بس مہاراج! میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کس کی سمادھی ہے ...... کس نے بنوائی تھی؟ میں نے دو آنکھیں دیکھی تھیں جنہوں نے راجندر کمار کے چرنوں میں پھول ڈالے تھے۔ بجنا کماری نے ایک گیت گایا تھا۔''

''اوہ اس لئے تمہیں اس کی کھوج ہے۔''

''ہاں ...... مہاراج۔''

''تو رانی جی سنو! تم عورت ہو اور عورتیں ایسے وہم کا شکار ہو ہی جاتی ہیں بہرحال تم چنتا مت کرو۔ میں آج ہی لوگوں کو اس طرف روانہ کیے دیتا ہوں۔ وہ اس جگہ کے

بارے میں معلوم کر آئیں گے۔"

"آپ کی کرپا ہو گی مہاراج!"

"اس میں کرپا کی کیا بات ہے۔ اگر تم ہی ان لوگوں کو حکم دیتی تو وہ انکار تھوڑی کر سکتے تھے۔ مجال ہے کسی کی جو رانی جی کے حکم کی تعمیل نہ کرتے۔"

"تو آپ لوگوں کو وہاں بھیجیں گے۔"

"ہاں......" راجہ نے جواب دیا اور مہارانی پھول وتی مطمئن ہو گئی۔ راجہ نے سچ مچ احکامات جاری کر دیئے تھے۔

لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لوگ اس عمارت تک پہنچ گئے لیکن اس کی تاریخ نہ بتا سکے راجہ کا حکم تھا کہ اس کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ اس لئے کافی زور دار تحقیقات ہوئیں لیکن تین بڑے پرانے لوگوں نے بھی یہی بتایا کہ انہوں نے اس سادھی کو بچپن سے اسی صورت میں دیکھا ہے۔ ان کے پرکھے بھی یہی بتاتے تھے لیکن کوئی اس کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتا۔

راجہ نے یہ بات رانی کو بتا دی تھی۔ رانی کے ذہن سے یہ بات نہ مٹی اور حسب معمول جب مہینے کے پہلے چاند کو وہ لال چند کے پاس پہنچی تو اس کے من میں وہی بات تھی۔

جب تنہائی میں وہ گرو سے ملی تو اس نے وہی بات دہرائی۔ "پچھلی بار تو ہم موت کے منہ سے بچے تھے مہاراج!"

"اوہ کیسے......؟" گرو جی چونک پڑے اور پھول وتی نے پوری بات اسے بتا دی۔ گرو جی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

"سادھی! یہاں سے کتنی دور ہے وہ......؟"

"کافی دور ہے مہاراج......!"

"ہوں...... انوکھی بات ہے لیکن اس کے بارے میں ہم نہیں بتا سکیں گے۔ اگلی بار جب تم آؤ گی تو میں اس بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔" پنڈت جی نے جواب دیا اور رانی خاموش ہو گئی تھی۔

لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے وہ خیالات مٹنے لگے۔ تب اس کے ذہن میں وہ تجسس باقی نہیں رہا تھا اور پھر جب وہ مہینے کی پہلی تاریخ کو گرو جی کے پاس پہنچی تو گرو جی بہت فکر مند نظر آئے۔

"کیا بات ہے گرو جی......؟" رانی نے پوچھا۔ گرو جی کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"آج رات ہم جا رہے ہیں پھول وتی!"

"کہاں گرو جی......؟"

"بس چلہ کھینچنا ہے۔ آئندہ تم یہاں مت آنا۔"

"کیوں مہاراج......؟"

"اس لئے کہ ہم یہاں نہیں ملیں گے۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں مہاراج؟"

"تو نے پچھلی بار ایک بات کہی تھی ہم سے۔"

"کون سی بات......؟"

"بھول گئی...... ہاں...... تجھے بھولنا ہی تھا۔" گرو جی بولے۔

"کون سی بات...... مجھے یاد دلائیں مہاراج!"

"اس سادھی کے بارے میں۔"

"اوہ...... ہاں مجھے یاد ہے...... آپ نے اس کے بارے میں کچھ معلوم کیا۔"

"ہاں......"

"کیا معلوم ہوا مہاراج؟"

"بہت کچھ...... لیکن جو کچھ معلوم ہوا ہے ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے مہاراج...... مجھے بتائیں تو سہی۔"

"راجندر پر ایک کشٹ ہے...... اسے دور کرنا ہوگا۔ پھول وتی! تجھے اس کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ ورنہ آنے والے سمے کون تمہاری رکھشا کرے گا۔"

"مجھے بتائیں مہاراج...... کیا بات ہے......؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" گرو جی اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے کھڑاؤں پاؤں میں پہنیں۔

"راجندر کو بھی ساتھ لے لوں؟"

"نہیں...... اسے باندیوں کے حوالے کر دو۔" گرو جی نے کہا اور پھول وتی نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ راجندر کو اس نے اپنی خاص باندی کے حوالے کر دیا اور خود گرو جی کے ساتھ چل پڑی۔

گروجی آج پہلی بار اسے مندر کے اس حصے میں لے جا رہے تھے جو پھول وتی نے نہیں دیکھا تھا۔ پھول وتی عقیدت مندی سے ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مہاراج مندر کے آخری حصے میں پہنچ گئے۔ یہ جگہ چونکہ پہاڑیاں کاٹ کر بنائی گئی تھی اس لئے بعض جگہ اب بھی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں اور مندر کا یہ آخری حصہ ایک ناہموار چٹان سے ڈھکا ہوا تھا۔ ابھری ہوئی چٹان پر مہاراج لال چند نے زور لگایا اور چٹان اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ اس میں اتنا زیادہ رخنہ پیدا ہو گیا کہ کوئی اس میں سے گزر کر با آسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ مہاراج نے اندر قدم رکھے اور اندر پہنچ کر رانی کو آواز دی۔

''چلی آؤ پھول وتی! چنتا مت کرو کسی بات کی۔'' انہوں نے کہا۔ چند ساعت بعد ایک مشعل روشن ہو گئی۔ یہ مشعل شاید لال چند نے روشن کی تھی کیونکہ جب رانی پھول وتی اندر داخل ہوئی تو اس نے مشعل گروجی کے ہاتھ میں دیکھی تھی اور ان کے کھڑاؤں کی آواز کسی پتھریلی جگہ میں گونج رہی تھی۔ رانی پھول وتی حیران پریشان گروجی کے پیچھے پیچھے چلتی رہی اور اسے مہاراج کے قدموں کے ساتھ ساتھ کافی دور تک چلنا پڑا۔

گپھا میں گھٹن نہیں تھی اور وہ اتنی کشادہ تھی کہ رانی با آسانی اس میں چل رہی تھی نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جس کے دوسری جانب بھی روشنی نظر آ رہی تھی۔ مہاراج رکے اور ان کی آواز پھر ابھری۔

''چلی آؤ پھول وتی! اندر آ جاؤ۔'' اور پھول وتی اندر داخل ہو گئی۔ بہت بڑا غار تھا۔ جس میں کئی مشعلیں روشن تھیں پورا غار صاف شفاف تھا اور اس میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ زمین پر ایک مرگ چھالہ بچھا ہوا تھا جس کے نزدیک پانی کا ایک کنڈل رکھا ہوا تھا اور کوئی چیز یہاں پر نہیں تھی۔

مرگ چھالہ کے نزدیک پہنچ کر مہاراج لال چند نے کھڑاویں اتار دیں پھر وہ رانی پھول وتی کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ ہے وہ جگہ رانی پھول وتی جو ایک دن میں نے سپنے میں دیکھی تھی۔'' مہاراج نے کہا۔

''کیا......'' رانی اچھل پڑی۔

''ہاں...... میں نے تمہیں اس کے بارے میں بتایا تھا ناں۔''

''مجھے یاد آ رہا ہے مہاراج!''

''میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس گپھا میں ایک مرگ چھالہ بچھا ہوا تھا۔ مگر

چھالہ کے قریب ہی پانی کا ایک کنڈل تھا صرف ایک سمت کھڑاؤں پڑی ہوئی تھیں۔''

''ہاں مہاراج! یہ سب کچھ آپ نے بتایا تھا۔''

''اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ کنڈل میں پانی موجود تھا۔''

''ہاں......''

''اور اس لمحے بھی یہ سب کچھ یہاں موجود ہے۔'' مہاراج پراسرار انداز میں مسکرائے۔

''ہاں...... مہاراج......''

''اور شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہو کہ میں لال چند نہیں ہوں۔''

''جی......'' رانی کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔

''ہاں میرا نام صمو لالہ ہے۔''

''مم...... مگر...... مگر لال چند مہاراج...... وہ کہاں گئے۔''

''کہیں نہیں گئے رانی پھول وتی! بلکہ اگر میں تمہیں کانتی کہوں یا پھر نندریتا تو تمہیں تعجب ہو گا۔''

''نجانے آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج!''

''ہاں رانی! تمہیں نہیں پتہ...... تمہارے من پر صدیوں کی گرد پڑی ہے...... کشیون گزر گئے...... صدیاں بیت گئیں...... بہت کچھ بدل گیا...... ماحول بدل گیا...... لیکن کون کسے یاد رکھتا ہے...... تم رانی نندریتا ہو اور راجندر ست گرو ہے...... یوں سمجھو تم ست گرو کی ماں ہو اور تمہارا اصل نام نندریتا ہے...... کیا تم ست گرو کو جانتی ہو؟''

''نہیں مہاراج!''

''جیون کمار کو جانتی ہو؟''

''نہیں مہاراج...... آپ جانے کیا کہہ رہے ہیں...... کیسی باتیں کر رہے ہیں...... میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔'' رانی پھول وتی نے پریشانی سے کہا۔

''چنتا نہ کر پھول وتی! آنے والا سے تجھے سب کچھ بتا دے گا۔ سب کچھ...... اتنا کچھ کہ تم سوچ کر حیران رہ جاؤ گی۔'' مہاراج لال چند نے کہا اور پھول وتی انہیں ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

رانی پھول وتی کو مہاراج لال چند کی دماغی صحت پر شبہ ہو رہا تھا۔ نجانے کیسی باتیں کر رہے تھے وہ اس وقت۔ ان کی یہ ساری باتیں رانی پھول وتی کو سمجھ میں نہیں آ

رہی تھیں۔ وہ ایک مقدس بزرگ تھے اور رانی پھول وتی دل سے ان کی عقیدت مند تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''میں کچھ نہیں جانتی مہاراج ...... بھگوان کی سوگند میں کچھ نہیں جانتی ...... نجانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''او......'' لال چند ایک دم چونک پڑے۔ انہوں نے حیرت سے رانی پھول وتی کو دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولے۔

''اوہ...... اوہ کیا میں کچھ کہہ رہا تھا پھول وتی۔''

''مہاراج! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''کچھ نہیں ...... کچھ نہیں پھول وتی ...... ہمیں صدیوں کی ریت نبھانی پڑے گی ...... ہمیں وہ سب کچھ پھر سے دہرانا پڑے گا جو وقت دہراتا آیا ہے ...... یہ ضروری ہے ورنہ سنسار میں بڑی تبدیلیاں ہو جائیں گی ...... یہ تبدیلیاں نہیں ہونی چاہئیں ...... یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''مہاراج ...... مہاراج! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں ...... کچھ نہیں ...... کچھ نہیں تجھے چندر پرکاش کا جیون پیارا ہے پھول وتی......؟''

''کیوں نہیں ...... کیوں نہیں......؟'' پھول وتی تڑپ کر بولی۔

''تو پھر میری باتیں غور سے سن ...... میں جا رہا ہوں ...... ایک طویل سفر پر ...... یہ سفر پورے گیارہ سال کا ہو گا ...... گیارہ سال کے بعد میں پھر واپس آؤں گا ...... اس لمحے تک یہاں کچھ تبدیلیاں نہ ہوں ...... کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے میری تپسیا بھنگ ہو جائے یہ تیری ذمہ داری ہے پھول وتی!''

''مگر مہاراج ......'' پھول وتی نے کہا۔

''راجندر کے جیون کے لئے تجھے ایسا کرنا ہو گا۔'' لال چند نے کہا اور پاؤں میں پہنی کھڑاویں اتار دیں پھر وہ مرگ چھالہ پر بیٹھ گئے اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ لئے۔

رانی پریشانی سے ان کی صورت دیکھتی رہی۔ کافی دیر ہو گئی تو وہ چونکی۔

''میرے لئے کیا آگیا ہے مہاراج؟'' لیکن مہاراج نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیا میں واپس جاؤں۔'' وہ دوبارہ بولی لیکن اس بار بھی مہاراج نے کوئی جواب

نہیں دیا تو وہ ان کے قریب پہنچ گئی۔

''کیا آپ سو گئے ...... مہاراج میرے لئے ......'' اس نے مہاراج کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ لیکن مہاراج ایک طرف لڑھک گئے تھے۔ رانی پھول وتی اچھل پڑی اس نے سراسیمہ نگاہوں سے مہاراج کو دیکھا اور اسے اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ مہاراج اپنا شریر چھوڑ چکے ہیں۔

''مہاراج ......'' وہ خوف سے اچھل پڑی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ گرو جی کو دیکھ رہی تھی لیکن اب ان کے شریر میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ رانی سخت پریشان ہو گئی تھی۔

پھر اسے مہاراج کی باتیں یاد آئیں۔ انہوں نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اب کسی بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے مہاراج کی آگیا کا پالن کرنا تھا۔ اسے وہ سب کچھ کرنا تھا جو انہوں نے کہا تھا۔

''لیکن ...... لیکن یہ سب کیا تھا ...... یہ کیسی انوکھی باتیں ہیں۔'' اس نے سوچا اور پھر اس نے ایک مشعل ہاتھ میں اٹھائی اور واپس چل پڑی۔ اس کا دل لرز رہا تھا پے در پے پیش آنے والے عجیب واقعات نے اسے حیران کر دیا تھا۔

''اب کیا کروں ...... مہاراج کی موت کے بارے میں کسی کو کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں ...... مہاراج کی یہ تو خواہش تھی کہ اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی جائے تو پھر خاموشی ہی بہتر ہے۔ لیکن آنے والے سمے کیا ہو گا ...... یہ کیسے پتہ چلے؟ پنڈت لال چند کے ہزاروں عقیدت مند تھے ...... وہ ان کی گمشدگی سے پریشان ہو جاتے ...... ان لوگوں کو حقیقت کون بتائے گا۔'' غار سے واپس نکلتے ہوئے اس نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتائے اور وہ اسی فیصلے پر اٹل ہو گئی۔

دل میں پراسرار راز کو چھپائے ہوئے وہ واپس محل میں آ گئی اور کئی روز تک کسی اطلاع کا انتظار کرنے لگی۔ ایک دن اس کی باندی بیلا نے اسے یہ بتایا۔

''کچھ سنا آپ نے مہارانی جی؟''

''کیا بات ہے بیلا؟''

''لال چند مندر سے غائب ہو گئے ہیں۔''

''ارے کب......؟'' رانی نے پوچھا۔

''یہ تو پتہ نہیں لیکن اب وہ مندر میں موجود نہیں ہیں۔''

''اپنے چیلوں کو کچھ بتا کر گئے ہوں گے......؟''
''کسی کو کچھ نہیں معلوم......؟''
''وہ میرے گرو ہیں...... میں ان کے بارے میں ضرور پتا کروں گی۔'' رانی پھول وتی نے کہا اور پھر وہ خود بھی دریا پار جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ مہاراج چندر پرکاش سے آ گیا لی گئی تو وہ چلنے کے لئے تیار ہو گئے کیونکہ وہ خود بھی گرو جی سے عقیدت رکھتے تھے۔

شاہی کشتیاں دریا پار پہنچیں تو چیلوں کے ہجوم نے انہیں گھیر لیا۔ وہ بین کر رہے تھے۔ راجہ نے انہیں تسلی دی۔

''تم لوگوں کو معلوم ہے کہ گرو جی کتنے مہان گیانی تھے۔ وہ جہاں بھی ہوں گے سنسار کی بھلائی کے لئے ہی ہوں گے۔''
''مگر وہ کہاں گئے ہیں مہاراج!''
''کہیں چلہ نہ کر رہے ہوں۔''
''مندر میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے۔''
''آؤ تلاش کریں۔'' چندر پرکاش نے کہا۔ رانی پھول وتی اس جگہ کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس نے زبان بند رکھی۔ راجہ چندر پرکاش آہستہ آہستہ مندر کے اس حصے کی طرف ہی جا رہا تھا کہ رانی پھول وتی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ بالآخر وہ مندر کے آخری حصے میں پہنچ گئے۔

لیکن رانی پھول وتی یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی کہ وہاں اب کوئی چٹان نہیں تھی۔ کسی گپھا کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

گرو جی کی تلاش کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تو پھر رانی پھول وتی نے اپنے احکامات جاری کیے۔ اس نے مندر کے علاقے کی توسیع کرائی اور حکم دے دیا کہ گرو جی کو حاضر سمجھا جائے اور پوجا پاٹ ہوتی رہے اور چیلوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے چنانچہ اس کے احکامات کی تعمیل کی گئی اور معمولات حسب سابق جاری رہے۔

حالات پر سکون ہو گئے تھے۔ رانی پھول وتی سالوں پہلے کے واقعات بھول چکی تھی۔ دریا پار کے مندر میں آج بھی چہل پہل رہتی تھی لیکن اب پھول وتی وہاں نہیں جاتی تھی۔ سادھی کے واقعے کو بھی وہ بھول چکی تھی۔ اتنی پرانی باتیں کہاں اور کیسے یاد رہتی ہیں۔ سمے بیتتا رہتا ہے۔

راجہ چندر پرکاش کے وہی حالات تھے۔ لیکن ان کے ہاں ایک بیٹے کے علاوہ اور کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ بدستور عیاشیوں میں مصروف تھا اور راجندر کمار کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری خود رانی نے اٹھا رکھی تھی۔

یوں راجندر کمار گیارہ سال کا ہو گیا۔ اب وہ بارہویں میں لگ گیا تھا۔

حکومت کے معاملات ٹھیک چل رہے تھے لیکن کچھ عرصے سے راجہ چندر پرکاش کو راجہ روون کے بارے میں بہت بری خبریں مل رہی تھیں۔ منتری روزانہ کوئی نئی خبر دیتا تھا اور چندر پرکاش پریشان ہو گیا تھا۔

تلسی کا میلہ آ رہا تھا اور یہ میلہ گونا گوں خوبیوں کا حامل تھا۔ چندر پرکاش اس میلے میں بہت سے راجاؤں کو دعوت دیتا تھا اور میلے میں خوب سماں ہوتا تھا۔ چاروں طرف خیموں کا شہر آباد ہو جاتا تھا۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہوتے تھے۔ خود راجہ بھی اس میلے میں بڑی دلچسپی لیتا تھا اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بعض اوقات میلے میں ایسی ایسی حسین لڑکیاں آ جاتی تھیں جن میں سے کسی کا انتخاب راجہ کے لئے بہت دل خوش کن ہوتا تھا لیکن اس بار وہ متردد تھا۔

''آخر راجہ روون کیا چاہتا ہے......؟'' ایک دن اس نے منتری سے پوچھا۔
''اس نے کوئی اعلان تو نہیں کیا مہاراج! لیکن خیال ہے کہ وہ آپ سے بھی خراج حاصل کرنا چاہتا ہے۔''
''ہمارے خزانے اتنے وسیع کہاں ہیں منتری جی کہ ہم خراج ادا کر سکیں۔''
''یہ بات تو درست ہے مہاراج! خزانے تو خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ آمدنی کچھ نہیں ہے اور خرچ بہت زیادہ ہیں۔''
''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''
''روون مہاراج سے جنگ کرنا ہوگی۔''
''جنگ......'' وہ اچھل پڑا۔
''ہاں...... مہاراج جنگ۔''
''کیا ہماری فوجیں جنگ کے قابل ہیں۔''
''فوجیں تو اسی سمے کے لئے ہوتی ہیں مہاراج! اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ کہوں۔'' منتری نے کہا۔
''ہاں کہو......''

''خود مہاراج کبھی دیش کی طرف توجہ نہیں دیتے۔''

''دیش کی طرف توجہ...... اور کیا توجہ دیں ہم دیش کی طرف؟ دربار کرتے ہیں۔ لوگوں کی سنتے ہیں۔ فیصلے کرتے ہیں۔ کسے شکایت ہے ہم سے؟''

''پورے دیش کو مہاراج۔''

''کیا شکایت ہے ہماری جنتا کو؟''

''ہرکارے من مانی کر رہے ہیں...... جنتا کو اناج نہیں ملتا......ضروریات زندگی کی دوسری چیزوں پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جو مہاراج کے پاس آ کر ان سے مراعات لے جاتے ہیں اور پھر وہ غریب جنتا کو پیستے ہیں۔''

''اور تم کیا کرتے ہو منتری جی؟'' راجہ نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''مہاراج کی آگیا کا پالن۔''

''کیا مطلب......؟''

''میں مہاراج کے حکم کو کیسے ٹال سکتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے ہم راج نیتی میں ٹھیک نہیں ثابت ہو رہے۔'' راجہ نے پرخیال انداز میں کہا۔

''میں یہ بات نہیں کہہ سکتا مہاراج مگر جنتا یہی کہتی ہے۔ میں داس ہوں نمک حلال ہوں، ورنہ یہ بات آپ سے کبھی نہ کہتا۔ میں بھی دوسروں کی طرح آپ کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنا کام سیدھا کرتا۔'' منتری نے کہا۔

''ہمیں سوچنے کا موقع دو منتری جی۔ ہم رات کو تم سے پھر ملیں گے۔ چراغ جلے ہمارے پاس آ جانا۔'' راجہ نے کہا اور منتری جی چلے گئے لیکن راجہ پرکاش کے لئے وہ بڑی پریشانیاں چھوڑ کر گئے تھے۔

تنہائی میں راجہ چندر پرکاش اپنے بارے میں غور کرنے لگا۔ وہ بڑے سکون سے حکومت کر رہا تھا۔ کوئی پریشانی، کوئی تردد اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ حکومت کے سارے کام بآسانی چل رہے تھے اور سب سے بڑی بات کہ اس نے کبھی حکومت کے کاموں کا جائزہ بھی نہیں لیا تھا اور جنتا کی طرف سے بھی کوئی شکایت کبھی اس کے کانوں تک نہ پہنچی تھی۔ اس کے ہرکارے نظام حکومت بآسانی چلا رہے تھے۔ زیادہ تر ذمہ داریاں منتری جی پر تھیں اور منتری جی نے کبھی کسی سلسلے میں اسے پریشان نہیں کیا تھا خود اس کے اپنے یہ مشاغل تھے کہ ہر وقت وہ شراب اور حسین لڑکیوں میں کھویا رہتا تھا۔ جگہ جگہ

سے لوگ اسے تحائف میں سندر ناریاں بھیجا کرتے تھے۔ چندر پرکاش کو ان سب چیزوں سے بے حد دلچسپی تھی۔

لیکن اب صورت حال بڑی مختلف ہو گئی تھی اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ راجہ روون کی سپاہ کتنی ہے۔ اس کے ملک کی وسعت کتنی ہے اور وہ کتنی قوت سے چندر پرکاش پر حملہ کرے گا۔ نیز یہ کہ خود چندر پرکاش کی فوجوں کی کیا کیفیت ہے۔ کیا اس کی فوجیں لڑنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔

چندر پرکاش کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سارے عیش و عشرت یہ ساری آسائشیں اس وقت تک ہیں جب تک وہ راجہ ہے اور جب وہ راجہ نہ رہے گا تو یہ سارے عیش و عشرت اس سے چھن جائیں گے۔ اور...... اور راجہ چندر پرکاش بے حد پریشان ہو گیا۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی تب راجندر اس کے ذہن میں آیا۔

چندر پرکاش نے خود ہی حکومت اپنے قوت بازو سے حاصل کی تھی لیکن اس کے بعد وہ برائیوں کا شکار ہو گیا۔ اب راجندر اس کے بعد راجہ نہیں بن سکے گا۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو اس کی حکومت باقی نہ رہے گی۔ چندر پرکاش نے بہت کچھ سوچا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب تک وہ جو کچھ کرتا رہا ہے وہ تو ختم۔ اب اسے نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنی ہے اور اس سلسلے میں اس نے سب سے پہلی ملاقات رانی پھول وتی سے کی۔

وہ پھول وتی کے پاس جا پہنچا۔ پھول وتی اپنے بچے راجندر کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

خوبصورت راجندر کو ابھی گیارہ سال کا ہو کر بارہویں سال میں لگا تھا لیکن اس کا خوبصورت قد و قامت، اس کا بدن خاصا شاندار تھا اور اس عمر میں وہ بہت خوبصورت نظر آتا تھا۔ راجہ چندر پرکاش نے اسے دیکھا اور اسے اپنے دل میں عجیب سے خوف کا احساس ہوا یہ اس کا بیٹا ہے۔ مستقبل کا ہونے والا راجہ لیکن وہ حکومت اپنے بیٹے کو دے سکتا ہے۔ کیا اس نے اس کی گنجائش چھوڑی ہے۔

رانی پھول وتی کو اس کی آمد کا علم نہیں تھا۔ راجندر نے اسے دیکھ لیا۔

''پتا جی مہاراج!'' وہ بول اٹھا اور رانی نے چونک کر راجہ کو دیکھا۔

''آپ مہاراج!''

''ہاں ...... پھول وتی! اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔'' راجہ پرکاش نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں مہاراج! میں تو داسی ہوں۔ آپ کی بس مجھے آپ کے آنے کی خبر نہیں ملی تھی۔''

''ہم نے خود ہی خبر نہ کرائی تھی بس اپنے بیٹے سے ملنے چلے آئے۔'' راجہ نے پیار سے راجندر کو دیکھا اور رانی جی مسکرانے لگی۔

''بھگوان کا شکر ہے۔'' وہ بولی۔

''کس بات پر؟''

''یہی کہ مہاراج کو آج راجندر یاد آ گیا۔''

''ہم اسے بھولے کب ہیں اور پھر اسے بھول کر ہم رہ بھی کہاں سکتے ہیں۔ آنے والے سمے میں ہم مہاراج راجندر کی رعایا ہوں گے کیوں مہاراج آپ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

''آپ راجہ ہیں پتا جی راجہ رہیں گے۔'' راجندر بولا۔

''اور اگر ہم تمہیں راجہ بنا دیں تو؟''

''میں کبھی نہ بنوں گا۔''

''کیوں ......؟''

''اس لئے کہ مجھے پتا جی کا جیون پیارا ہے۔ میں ہمیشہ ان کے جیون کے لئے بھگوان سے پراتھنا کرتا ہوں۔''

''اوہ ...... پھول وتی ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم نے ہمارے لئے کتنے پیارے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ آج ہم اپنے بہت سے پاپوں کا پراشچت کرنا چاہتے ہیں۔ پھول وتی!''

''کیسے پاپ مہاراج!''

''ہم نے مستقبل کے راجہ کے لئے کچھ نہیں کیا ...... ہم نے تو اس کی تربیت کا صحیح بندوبست بھی نہیں کیا ...... لیکن اب۔''

''کونسی تربیت کی بات کر رہے ہیں مہاراج!''

''راج نیتی کے گر ...... فنونِ سپاہ گری۔''

''میں نے راجندر کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے مہاراج!''

''کیا مطلب؟''

''کسی سپاہی کو آواز دیں۔'' رانی بولی۔

''کیوں ......؟''

''راجندر کمار کی تلوار کے جوہر دیکھیں۔''

''ارے کیا مطلب؟'' راجہ چونک کر بولا۔

''داسی وہ فرض پورا کرتی رہی ہے جسے مہاراج بھول گئے تھے۔'' پھول وتی نے کہا اور راجہ شرمندگی سے اسے دیکھنے لگا پھر اس نے راجندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں راجندر جی! آپ کو تلوار چلانا آ گئی ہے؟''

''مہاراج کی کرپا ہے۔''

''تو آؤ دیکھیں۔ ہم نے بہت عرصے سے تلوار نہیں نکالی ہے۔'' راجہ پرکاش نے اپنی کمر سے لٹکی ہوئی تلوار نکال لی۔ راجندر مسکرانے لگا تھا۔ ''نکالو راجندر نکالو۔''

''نہیں پتا جی!'' راجندر بولا۔

''ہم حکم دیتے ہیں تلوار نکالو۔'' راجہ چندر پرکاش نے کہا اور راجندر نے اپنی خوبصورت تلوار اٹھا لی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور پھر اس نے جھک کر تلوار راجہ چندر پرکاش کے قدموں میں رکھ دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''پتا جی مہاراج کے سامنے راجندر جیون بھر تلوار نہیں اٹھائے گا۔''

''دھن واد ...... مگر اس سمے ہم ایک استاد ہیں اور گرو جو کہے اس کی بات ماننی چاہیے۔''

''آ گیا دیں گرو مہاراج!'' راجندر بولا۔

''راجندر تمہارے سامنے راجہ راون کھڑا ہوا ہے۔ تمہارے پتا کا دشمن۔ تلوار اٹھاؤ اور اس سے مقابلہ کرو۔''

''کہاں ہے راون راجہ؟'' راجندر نے پوچھا۔

''یہ اس کی تلوار ہے۔'' راجہ نے اپنی تلوار ہلائی اور پھر راجندر نے تلوار اٹھا لی۔ راجہ چندر پرکاش پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''اگر یہ راون راجہ کی تلوار ہے تو پھر یہ سنبھالیں۔'' راجندر نے ایک خطرناک وار کیا اور چندر پرکاش ایک دم سنبھل گیا۔ اگر وہ ہوشیاری سے کام نہ لیتا تو اس کی ایک

ٹانگ اڑ جاتی۔

''راون راجہ کے ہاتھ میں تلوار رہنی چاہیے مہاراج سنبھالیں۔'' راجندر بولا اور اس نے پینترے بدل بدل کر ایسے وار کیے کہ چندر پرکاش کو جان بچانا مشکل ہوگئی۔ ایک ایک وار کو روکتے ہوئے اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن راجندر کے بازو کی ضرب اتنی شدید تھی کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گرگئی۔

وہ ششدر کھڑا رہ گیا تھا اور پھر اس نے مسرت سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

''بھگوان کی سوگند اب مجھے کوئی چنتا نہیں ہے۔ اب مجھے راون راجہ کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

راجندر کمار تلوار پھینک کر اس کے سینے سے لگ گیا تھا۔ تب راجہ چندر پرکاش نے پھول وتی سے کہا۔

''میں جیون بھر تمہارا احسان مانوں گا۔ تم نے میری کمزوریوں کو سنبھال لیا۔''

''یہ داسی کا فرض تھا۔'' رانی بولی۔

''داسی نہیں ...... اس دیش کی رانی۔ اور آنے والے سے میں اس دیش کی راج ماتا۔'' چندر پرکاش بولا۔

''بھگوان آپ کی بات کی لاج رکھے۔'' رانی پھول وتی نے کہا۔

''بھگوان کی سوگند پھول وتی! بڑی چنتا لے کر آیا تھا۔ مگر من کو بڑی شانتی ملی ہے اس سے۔''

''کیا چنتا تھی مہاراج؟''

''بس اب کچھ نہیں ہے۔ منتری کے لئے جواب مجھے تمہارے پاس سے مل گیا ہے۔ اب میں اسے آرام سے جواب دے دوں گا۔'' چندر پرکاش نے کہا۔

''کچھ مجھے بھی تو بتائیں مہاراج!''

''راجہ راون بہت ہاتھ پاؤں نکال رہا ہے۔ اسے سبق دینے کی ضرورت ہے لیکن اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں نے اس کے لئے جواب سوچ لیا ہے۔'' چندر پرکاش نے کہا اور باہر نکل گیا۔ رانی پھول وتی اسے تشویشناک نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

بات لمحوں کی نہیں ہوتی۔ صدیوں کی داستانیں صدیوں چلتی ہیں اور نجانے ان میں کیا کیا الٹ پھیر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہندو عقیدے کے مطابق ہے۔ ہمارے ہاں ان کہانیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی اس طرح کے واقعات ذہن میں آ جاتے ہیں کہ یقین کرنا مشکل ہو جائے اور اس کے ذرائع بھی مختلف ہوتے ہیں۔ صدیوں پہلے کی یہ داستان جس طرح بھی عالم ظہور میں آئی ہو لیکن لمحے اس کے واقعات بڑی عمدگی سے ترتیب دیتے ہیں۔

یہی داستان ہارون کے علم میں بڑے عجیب وغریب طریقے سے آئی۔ زندگی کی سخت مشکل میں گرفتار تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو کس طرح صبر کرے جو کردار، جو داستانیں اس کے گرد بکھر گئی تھیں وہ ناقابل فہم تھیں۔ پہلے تو اس نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے ان داستانوں کی بھی ایک ترتیب ہے اور کچھ پراسرار غیر مرئی ہاتھ ان کی ڈوریں ہلا رہے ہیں۔ شمسہ ملی تھی اسے ایک بازار میں۔ ایک مفلوق الحال لڑکی کی حیثیت سے کچھ سبزیاں خرید رہی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر ہارون نے اسے پہچان لیا۔ بہت عرصے ساتھ رہا تھا۔ سگی بہنوں کی مانند تھی اس کے لئے۔ شمسہ کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ تڑپ گیا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ پیچھے سے اس نے شمسہ کو آواز دی تھی۔

''شمسہ!'' اور شمسہ پلٹ پڑی کچھ لمحے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی اور پھر سب کچھ بھول کر وہیں بازار میں اس سے لپٹ کر بلک پڑی۔

''بھیا! میرے بھیا ...... ہارون بھیا ...... میرے پیارے بھائی۔'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔ ہارون کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس نے شمسہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''تمہیں جو کچھ لینا تھا یہاں سے لے لیا بہن!''

"ہاں ...... کچھ پیسے کم پڑ گئے ہیں میرے پاس تھوڑی سی سبزی واپس کرنی تھی۔ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے پیسے اتنے ہو جائیں گے۔"

"کتنے پیسے ہوئے بھائی؟" ہارون نے سبزی والے سے پوچھا اور اس نے پیسے بتائے تو ہارون نے وہ پیسے ادا کیے اور شمسہ کے ہاتھوں سے سبزی کا تھیلا لے لیا پھر بولا۔

"آؤ ...... کتنی دور رہتی ہو یہاں سے۔"

"زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ سامنے جو گلی نظر آ رہی ہے اس کے آخری سرے پر میرا گھر ہے۔"

"چلو ......" ہارون نے کہا اور شمسہ کو ساتھ لئے ہوئے چل پڑا۔ شمسہ بدستور رو رہی تھی۔ ہارون اسے لئے ہوئے اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کا گھر تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا شمسہ اندر داخل ہو گئی۔ چھوٹا سا غربت زدہ گھرانہ تھا۔ تین بچے وہاں موجود تھے۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔"

"یہ تمہارے بچے ہیں؟" ہارون نے شمسہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ...... ان کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ بس میں ہوں اور یہ ہیں اور کوئی نہیں ہے ہمارا۔"

"اوہو ...... خرچہ کہاں سے چلتا ہے شمسہ ......؟" اور شمسہ نے سر جھکا لیا پھر بولی۔

"کچھ گھروں میں کام کرتی ہوں۔"

"بچے پڑھتے ہیں؟"

"نہیں ......"

"شمسہ! تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی۔"

"بس بھیا تقدیر کے کھیل ہیں۔ ہو گیا جو ہونا تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد باقی کیا رہا۔ شوہر کو ٹی بی ہو گئی۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔"

"عنایت ...... عنایت کہاں ہے کچھ پتہ چلا اس کا ......؟" جواب میں شمسہ کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔

"برے راستوں پر نکل گیا تھا۔ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ یہ بات بھی بہت

پرانی ہو گئی۔"

"اوہ ......"

"مگر تم ...... بھیا تم ......"

"بس شمسہ ...... کوئی بھی دل دکھ سے خالی نہیں ہے۔ میری کہانی بھی بڑی عجیب سی ہے۔ چلو چھوڑو، دیکھو، تم پتہ نہیں مجھ سے بڑی ہو یا چھوٹی۔ مگر میری بہن اور بیٹی ہی ہو۔ میں آ گیا ہوں، اب تمام پریشانیاں دل سے نکال دو۔ فی الحال تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔ میں کچھ مشکل کا شکار ہوں۔ بس میرے لئے دعا کر دو خلوص دل کے ساتھ کہ خدا مجھے میری مشکل سے نکالے۔ باقی تم فکر مت کرنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور آج سے گھر کے معاملات میں خود دیکھوں گا۔"

شمسہ ایک عجیب سی خوشی محسوس کر رہی تھی، جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ ہارون نے بچوں کو بھی پیار کیا۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ صحیح معنوں میں اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا کھویا ہوا گھر مل گیا ہو۔ اور اس کے بعد اس نے کچھ ضروری چیزیں بازار سے لا کر شمسہ کو دیں، رات کا کھانا بھی یہیں پر کھایا اور شمسہ کے اصرار پر رات کو وہیں پر رک گیا۔

پھر اس نے شمسہ کو اپنے بارے میں پوری تفصیل بتائی اور شمسہ ششدر رہ گئی۔ دفعتہً ہی اس نے چونک کر کہا۔

"ہارون بھائی! ایک چیز آپ کی امانت کے طور پر میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ ایک منٹ، میں ابھی آئی۔"

شمسہ اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پرانی سی صندوقچی دبی ہوئی تھی اور ہارون نے اس صندوقچی کو ایک لمحے کے اندر پہچان لیا۔ یہ وہ صندوقچی تھی جو عنایت لے بھاگا تھا۔ شمسہ نے اس بات کی تصدیق کر دی۔

"ہاں ...... یہ وہی صندوقچی ہے۔ عنایت بھائی، خدا ان کی مغفرت کرے بہت عرصے تک نجانے کیا کیا کرتے پھرے۔ اس کے بعد مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ الجھن ان کی وہی تھے۔ میرے پاس انہوں نے چند روز کے لئے پناہ لی تھی۔ اس دوران یہ صندوقچی ان کے سامان میں میرے پاس رہ گئی۔ ایک بار ماں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ صندوقچی ہارون بھائی کی امانت ہے۔ مجھے یہ بات یاد تھی، خیر پھر پولیس میرے گھر آئی، مجھ سے معلومات کیں اور مجھے بتایا کہ عنایت بھائی ایک جرم

کرتے ہوئے پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہو گئے۔ غرض یہ کہ صندوقچی میرے پاس موجود رہی۔''

ہارون ششدر رہ گیا تھا۔

صندوقچی کئی بار اس کے ذہن میں آئی تھی۔ اس صندوقچی میں کیا ہے، وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہ دن اس کے لئے زندگی کا عجیب ترین دن تھا جب اس نے صندوقچی کھولی۔ صندوقچی میں چند ضروری کاغذات رکھے ہوئے تھے جنہیں ہارون پڑھنے لگا۔ اور اس کے بدن میں سنائے دوڑ گئے۔ وہ ادھوری کہانی اس طرح مکمل ہوتی تھی کہ انگوری وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ نجانے کیسے کیسے روپ بدل کر جیتی رہی۔ پھر وہ چندر بدن کے روپ میں ایک خانہ بدوش قبیلے میں نمودار ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ تھا اور چندر بدن کا گھرانہ قبیلے میں خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اور اسی گھرانے میں گجراج نامی ایک شخص ملازمت کرتا تھا۔ گھر کا نوکر مالک کی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ انگوری اس وقت چندر بدن کے روپ میں تھی۔ چندر بدن کو جب اس بات کا علم ہوا کہ یہ نوکر اس سے عشق کرتا ہے تو اس نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

اسی دوران زمانہ قدیم کا ایک اور کردار ٹنڈن گوپال نمودار ہو گیا۔ ٹنڈن گوپال کو انگوری سے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی، بس وہ اپنی ابدی زندگی کے لئے جتن کر رہا تھا اور نجانے کیا کیا کچھ کر چکا تھا۔ وہ کالے جادو سے بھی واقفیت رکھتا تھا اور زمانے بھر کی غلاظتیں اس کی ذات سے منسلک ہو چکی تھیں۔

نجانے کہاں کہاں اس نے تپسیائیں کی تھیں اور پھر وہ اتفاق سے سہائے پور پہنچ گیا۔ سہائے پور کے ایک خاندان میں اس نے سکونت اختیار کر لی اور اسی دوران سہائے پور کے ایک بہت بڑے رئیس خاقان درانی سے اس کا واسطہ پڑ گیا۔ خاقان درانی نے اس کے ہمیشہ جینے کے منصوبے کو اپنی کاوشوں سے خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ کوئی درویش یا عالم نہیں تھا لیکن بس اس کی معلومات بے مثال تھیں۔ ٹنڈن گوپال اور اس کے درمیان ٹھن گئی۔

خاقان درانی ایک رئیس اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ ہی فطرتاً عیاش طبع تھا۔ چنانچہ اس نے چندر بدن کو دیکھا اور اس کے حصول کی تاک میں لگ گیا۔ بے شمار معرکے ہوئے یہاں تک کہ چندر بدن اس کے قبضے میں آ گئی۔ وہ اسے لے کر سہائے پور کی ایک حویلی کے تہہ خانے میں اتر گیا۔ وہاں اس نے چندر بدن کو قید کر دیا۔ باقی

تمام لوگ تو اس کی تلاش میں ناکام رہے لیکن گجراج کو ٹنڈن گوپال نے اس جگہ کا پتہ بتا دیا۔ چنانچہ گجراج اس تہہ خانے تک پہنچ گیا۔ لیکن خاقان درانی کوئی معمولی شخصیت نہیں تھا۔ ٹنڈن گوپال نے گجراج کی بھرپور مدد کی تھی لیکن خاقان درانی پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اس کے بعد خاقان درانی وہ تمام چیزیں لے کر گم ہو گیا جو ٹنڈن گوپال کو ابدی زندگی دینے والی تھیں۔

ٹنڈن گوپال کے شیطانوں نے اسے بتایا کہ کس طرح وہ ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لئے اسے بے شمار انسانوں کا خون کرنا پڑے گا۔ بہت سے چیلے چانٹے بنانے پڑیں گے اور ٹنڈن گوپال ان کاموں میں مصروف ہو گیا۔ ایک مرتبہ موقع پا کر اس نے خاقان پر حملہ کیا اور خاقان کا ایک بازو کٹ گیا۔ ٹنڈن گوپال نے وہ بازو اپنے قبضے میں کر لیا اور اپنے جادو منتروں سے خاقان پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن خاقان بھی بہت چالاک آدمی تھا، اس نے اس تہہ خانے میں پناہ لی جو اس کے علم وعمل کی درس گاہ تھی۔ پھر وہاں رہ کر اس نے بہت سے عمل کئے۔ اور اس کے بعد ٹنڈن گوپال کو اس نے بتایا کہ وہ تو خیر اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ لیکن اس کا پوتا ٹنڈن گوپال کو قتل کر دے گا۔ اس نے ٹنڈن گوپال کو اس کا مستقبل بھی دکھا دیا اور ٹنڈن گوپال خوفزدہ ہو گیا۔ وہ جو اپنی دانست میں حیات ابدی پانے کا نسخہ دریافت کر چکا تھا، خاقان درانی کے پوتے سے خوفزدہ ہو گیا۔

اس نے خاقان درانی کے ایک ایک فرد کو ختم کر دیا۔ یہاں تک کہ خاقان درانی بھی گم ہو گیا۔ ٹنڈن گوپال کو اس کا پتہ نہیں چل سکا لیکن خاقان درانی نے اپنے پوتے کو کسی ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں ٹنڈن گوپال اسے تلاش نہ کر سکے۔

اسی صندوقچی میں ہارون کو ایک اور دستاویز بھی ملی۔ جس میں ایسے انوکھے انکشافات تھے کہ ہارون ششدر رہ گیا۔ یہ خاقان درانی کی تحریر تھی جسے ہارون نے بڑے غور سے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''میں نہیں جانتا کہ مستقبل میں تمہارا نام کیا ہو گا۔ میں نہیں جانتا کہ تم کس مزاج کے نوجوان ہو گے۔ اس کے باوجود میں تمہیں جو تفصیلات بتا رہا ہوں انہیں نوٹ کرو۔ جس شخص کے پاس تم ہوش سنبھالو گے، اس کا نام حمایت علی ہے۔ اس کی بیوی کا نام رقیہ ہے۔ یہ شخص ہمارا پشتنی ملازم ہے۔ اس کے باپ اور دادا بھی ہمارے ہاں نوکری کیا کرتے

تھے چنانچہ اسے گھر کے ایک فرد کی حیثیت دی گئی ہے۔ لڑکے! تم جس نام سے بھی اس دنیا میں روشناس ہو، میں تمہیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ تمہارے شانوں پر ایک بہت بڑی انسانی ذمہ داری ہے۔ ہمارے پورے خاندان کا قاتل ٹنڈن گوپال ہے...... جو ماضی کی ایک ایسی کہانی سے وابستہ ہے جس کی ہمارے ہاں کوئی تصدیق نہیں ہے۔ یہ ہندو مذہب کی باتیں ہیں۔ اور ہم ہندو مذہب کی ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ ٹنڈن گوپال جو بھی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ شیطانی علوم کا ماہر ہے اور اپنے علوم سے لوگوں کو بڑے بڑے نقصانات پہنچا سکتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ تم کس پائے کے انسان ہو گے...... لیکن میں تمہیں یہ ذمہ داری سونپتا ہوں کہ جس طرح بھی بن پڑے، ٹنڈن گوپال کو قتل کر دو۔ یہ تمہاری ذمہ داری بھی ہے اور تمہارا منصب بھی۔ اور یقیناً میرا علم کہتا ہے کہ تم یہ کام کرو گے۔ اور سنو، اگر ٹنڈن گوپال نے تمہیں کسی مشکل میں گرفتار کر دیا ہے تو بھروسہ رکھو کہ اس کے قتل کے بعد تمہاری وہ مشکل خود بخود حل ہو جائے گی۔ لیکن ہمت شرط ہے۔ تم ہمت نہیں ہارو گے اور بھرپور کوشش کرو گے۔ اگر تم اپنے ذہن میں یہ سوال کرو کہ آخر تمہیں اپنی زندگی داؤ پر لگا کر ٹنڈن گوپال کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت ہے تو میں تمہیں ایک ایسے شاندار خزانے کی خوشخبری دیتا ہوں جو سہائے پور کے اسی تہہ خانے میں دفن ہے اور یہ میں نے تمہارے لئے انعام کے طور پر رکھا ہے۔ میرے بچے! دادا ہوں میں تمہارا۔ تمہارا باپ ایک عام آدمی تھا۔ اور وہ ٹنڈن گوپال کے ہاتھوں ہی موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اس کے اندر یہ سکت نہیں تھی کہ وہ ٹنڈن گوپال سے مقابلہ کر سکے۔ لیکن تمہارے بارے میں یہ بات جانتا ہوں کہ تم یہ سب کچھ با آسانی کر لو گے۔ اس کے بعد تم اپنے اہل خاندان کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔''

تمہارا دادا

خاقان درانی

اس کے بعد سہائے پور کے کھنڈرات میں اس جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں وہ عمارت اور تہہ خانہ موجود تھا۔ ہارون پر سکتہ طاری تھا۔ وہ ساری کہانی اس کے لئے ناقابل یقین تھی۔

بہرحال اس نے صندوقچی بند کر لی۔ شمسہ ہر طرح سے اس کے ساتھ تعاون کر رہی تھی اور اس نے بھی شمسہ کے گھر کو اپنا ہی گھر بنا لیا تھا۔ لیکن شمسہ کو اس نے اس راز میں شریک نہیں کیا اور خود اس منصوبہ بندی میں مصروف ہو گیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔

صفورہ عروج پر نہیں پہنچی تھی کہ زوال کا آغاز ہو گیا۔ اس نے اپنی شیطانی فطرت سے کام لے کر بے چارے بابو خان کو زندگی سے محروم کر دیا تھا لیکن اس کے بعد بھی وہ افشاں اور اشعر کو ٹنڈن گوپال تک نہیں پہنچا سکی۔ اس کے ذہن میں بڑی الجھنیں تھیں۔ اپنے اس کام کی تکمیل کے بعد ہی وہ گرو مہاراج کی پوری توجہ حاصل کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اب اس کی زندگی میں ایک اور دکھ پیدا ہو گیا تھا۔ پہلا دکھ تو یہ تھا کہ ہارون نے اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

لیکن دوسرا دکھ اس سے بھی زیادہ شدید تھا۔ ہارون نے اس کے بدن کی پیشکش قبول نہیں کی تھی اور نسوانیت کی یہ توہین کسی کے لئے بھی ناقابل برداشت ہو سکتی تھی۔ یہ صرف ٹنڈن گوپال تھا جس کے سحر نے اسے اس بات کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ وہ خود اس طرح کی لڑکی نہیں تھی۔ ساری برائیوں کے باوجود اس کے اندر اس طرح کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

پھر ہارون کو بدترین سزا دینے کے لئے اس نے زبردست کوششیں کی تھیں لیکن یہ خوش بختی تھی افشاں اور اس کے بیٹے کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح جلال بابا کے قدموں میں پہنچ گئے تھے اور جلال بابا نے انہیں اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ صفورہ کی ساری کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔

پھر اس کے ساتھ ایک اور واقعہ پیش آ گیا تھا۔ اسے بزرگوں کی محفل میں حاضری دینا پڑی تھی اور وہاں اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا تھا۔ اسے بدترین غلاظت قرار دے دیا گیا تھا اور پھر اسے بزرگوں کی عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا جہاں اس کے شدید مخالفین موجود تھے۔

''یہ شیطان زادی ہے...... اسے سنگسار کر دیا جائے۔ اس نے جو جرائم کئے ہیں، ان میں معافی کا کوئی تصور نہیں ہے۔''

''میں آپ کے ان جملوں پر اعتراض کرتا ہوں بزرگِ محترم!''

''کیا مطلب؟ کیا اعتراض ہے تمہیں؟''

''بزرگِ محترم! یہ ایک مسلمان زادی ہے۔ اسے شیطان زادی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے والدین اب بھی مسلمان ہیں اور اس کے لئے انتہائی غمزدہ اور دکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بزرگِ محترم! ہم ذرا سا اس کے ماضی میں چلے جاتے ہیں اور ماضی کی یہ کہانی مختصراً پیشِ خدمت ہے۔ کہانی یہ ہے بزرگِ محترم کہ یہ لڑکی ایک اندرونی احساس کا شکار ہو گئی تھی اور ایک نوجوان ہارون نے اسے مسترد کر دیا تھا جس کی وجہ سے یہ ذہنی بحران کا شکار ہو گئی اور اس نے غلط اقدامات کر ڈالے۔ یہ بھی صرف اتفاق تھا کہ ایک ہندو لڑکے نے اس کے ساتھ زیادتی کرنا چاہی اور وہ اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ تب ایک بدکار ہندو جو غلیظ عمل کر رہا تھا سامنے آ گیا اور اس نے اپنے مزموم مقاصد کے لئے اسے بہکا لیا اور پھر اس کے وجود میں شیطانی غلاظت اتار دی۔

بزرگِ محترم! اس کے بعد اس نے جس قدر اقدامات کئے وہ اسی شیطانی غلاظت کے تحت کئے۔ اگر وہ شیطانی غلاظت اس کے وجود میں نہ اترتی اور اسے وہ شیطانی قوتیں نہ حاصل ہو جاتیں تو لمحوں کی یہ بات لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ یہ وہاں تک نہ پہنچ پاتی۔ بزرگِ محترم! میں اس کے لئے سفارش کرتا ہوں کہ اسے اتنی بدترین سزائیں نہ دی جائیں۔ اور ایک مسلمان زادی سمجھ کر اور قبول کر کے اس کی جاں بخشی کر دی جائے۔ کیونکہ بہرحال کچھ ہاتھ اب بھی اس کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اور یہ وہ ہاتھ ہیں جو ماں اور باپ کے ہاتھ ہیں اور جن کے لئے ہمیشہ سوچنا پڑتا ہے۔''

''لیکن یہ غلیظ عورت کچھ لوگوں کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔''

''اگر ہم اس کے وجود سے شیطانی غلاظت نکال دیں تو اس کے سوچنے کا انداز بالکل بدل جائے گا۔ اگر مناسب سمجھیں آپ تو اسے اس کا موقع دیں۔''

کچھ اور آوازوں نے بھی اس بات کی تائید کی اور وہ معزز بزرگ جو اس عدالت کے جج معلوم ہوتے تھے، سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''لیکن اس کے لئے کیا تجویز ہے تمہارے ذہن میں؟ اس کی غلاظت کیسے

صاف ہو سکتی ہے؟''

''ایک سزا کے ساتھ۔ اور وہ سزا یہ ہے کہ اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ دیا جائے اور ہم اسے ایک نئے خون سے آشنا کریں۔''

''ہوں...... ٹھیک ہے...... صرف ان ہاتھوں کی لاج رکھنا ہو گی جو خدا سے اس کی زندگی کی دعا مانگ رہے ہیں۔'' بزرگ نے کہا اور اس کے بعد یہ عدالت برخاست ہو گئی۔ مغفورہ سکتے کے عالم میں یہ ساری داستان سن رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ تو بس ایک بات جانتی تھی، وہ یہ کہ گرو مہاراج کے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اور جب اسے ہوش آیا تو وہ شہر کی ایک عمارت کے پاس نیم بیہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ عمارت کسی دور دراز علاقے میں تھی اور اس علاقے کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ ایک عجیب سا بوجھ اس کے ذہن پر طاری تھا۔ وہ ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں جو اسے عالمِ ہوش یا عالمِ بے ہوشی میں سننے کو ملی تھیں۔ اس وقت وہ تقریباً نیم مدہوشی کی حالت میں تھی اور اسی طرح سے اٹھ کر وہ چل پڑی۔

عمارت سے تھوڑے فاصلے پر ایک پختہ سڑک نظر آ رہی تھی جس پر ہلکی ہلکی ٹریفک چل رہی تھی۔ وہ اس سڑک کے بیچوں بیچ نیم خوابی کے سے عالم میں چل پڑی۔ گاڑیوں والے ہارن دے رہے تھے۔ اور پھر خود ہی گاڑی کو اس سے بچا کر لے جاتے تھے۔ سڑک پر ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اس طرح چلتے دیکھ کر لوگوں کے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات گردش کر رہے تھے۔ کچھ اسے کوئی پراسرار آوارہ روح سمجھ رہے تھے اور کچھ سمجھ رہے تھے کہ وہ کوئی غلط لڑکی ہے، نشے کے عالم میں چل پڑی ہے۔

ابھی تک اتفاقیہ طور پر کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جو اسے صرف نوجوان لڑکی سمجھ کر اس کی بقیہ باتیں نظر انداز کر دیتا اور اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے جاتا۔ لیکن ایک بڑی سی اسٹیشن ویگن نے سارا حساب پورا کر دیا۔ اس وقت وہ ایک موڑ مڑی تھی۔ اور یہ موڑ ایسا تھا کہ پیچھے سے آنے والے کو صحیح طور پر دوسری طرف کا منظر نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ پیچھے سے آنے والی اسٹیشن ویگن نے اچھی خاصی رفتار سے موڑ کاٹا تھا اور

اس کے بعد ایک بھرپور ٹکر اسے رسید کی تھی۔ صفورہ تقریباً آٹھ یا نو فٹ اوپر اچھلی اور اس کے بعد قلابازیاں کھاتی ہوئی دور جا گری۔

اسٹیشن ویگن والوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ لیکن پھر ذرا مناسب قسم کے لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے صفورہ کو اٹھا کر ویگن میں ڈالا اور ہسپتال کی طرف دوڑ پڑے۔ صفورہ کے جسم سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اتنی چوٹیں لگی تھیں اسے کہ اس کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر برق رفتاری سے بہتا ہوا خون۔ نجانے کتنا خون اس کے بدن سے نکل گیا تھا۔

بہرحال اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس کے پاس سے جو سامان برآمد ہوا تھا وہ اس کے پتے کو بتانے کے لئے کافی تھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر فوری طور پر ایمرجنسی میں اس کا آپریشن کرنے لگے۔ لیکن اس خون کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے جس میں سرخ اور سفید ذرات کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں سیاہ رنگ کے ذرات بھی تھے۔ ان ذرات کو فوراً لیبارٹری میں ٹیسٹ کے لئے بھجوایا گیا تو وہاں سے ایک اور انکشاف ہوا اور ڈاکٹر ششدر رہ گئے۔ لیبارٹری رپورٹ میں بتایا گیا کہ یہ جرثومے نہیں ہیں بلکہ زندہ مخلوق ہیں جو تھوڑی بہت انسانی شکل رکھتی ہے۔

اس رپورٹ سے تہلکہ مچ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحبان سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ آخر یہ کون سے جراثیم ہیں؟ کافی خون محفوظ کر لیا گیا تاکہ اسے دنیا کے دوسرے ملکوں میں ٹیسٹ کے لئے بھیجا جا سکے۔

ادھر صفورہ کے دل کی دھڑکنیں سست پڑتی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس گندے خون کے ایک ایک قطرے کو اس کے جسم سے باہر نکالا جائے اور مزید خون کا بندوبست کر کے پہلے اس کے جسم کی تمام رگوں کو واش کیا جائے اور پھر نیا خون اس کے جسم میں داخل کیا جائے۔ یہ ایک انتہائی سنگین مسئلہ تھا۔ کیونکہ کسی بھی وقت خون کی ناموجودگی دل کی حرکت بند کر سکتی تھی۔

بہرحال ڈاکٹر اپنی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے اور تھوڑا تھوڑا خون صفورہ کو زندہ رکھنے کے لئے دے رہے تھے۔

ادھر طاہر علی اور نیرہ بیگم کو بھی اطلاع کی گئی اور بتایا گیا کہ ان کی بیٹی کا خوفناک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میاں بیوی دونوں وحشت زدہ ہو کر ہسپتال کی طرف بھاگے۔ ڈاکٹروں سے رجوع کیا تو انہوں نے انہیں ساری صورتحال بتائی اور طاہر علی اور نیرہ

بیگم ششدر رہ گئے۔ طاہر علی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! اس کے زندہ بچ جانے کا کوئی امکان ہے؟''

''ہم فوری طور پر اپنا عمل شروع کر دیتے۔ لیکن چونکہ جسم سے خون کے ایک ایک قطرے کو نکال دیا جائے گا اور نیا خون اس کے بدن میں داخل کیا جائے گا، اس عمل میں زندگی کا شدید خطرہ لاحق ہے...... آپ کی اجازت ضروری ہے۔''

''آپ اپنا کام کریں ڈاکٹر! ہماری طرف سے اجازت ہے۔'' طاہر علی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ڈاکٹروں کی حیرانی کو انہوں نے رفع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی جبکہ وہ جانتے تھے کہ صفورہ کس مشکل کا شکار ہے۔ وہ یقیناً جادوئی ذرات تھے جن کے بارے میں انہیں تفصیل تو نہیں معلوم تھی لیکن ٹنڈن گوپال کے بارے میں ضرور جانتے تھے۔ البتہ اس وقت انہوں نے ان تمام باتوں کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں سمجھا۔ ایک عجیب سی ہنگامہ آرائی ہو جاتی۔

ڈاکٹر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دس گھنٹے کی کوشش کے بعد انہوں نے طاہر علی اور نیرہ بیگم کو خوشخبری سنائی کہ پرانے خون کا ایک ایک قطرہ نکال دیا گیا ہے اور اس کے جسم نے نیا خون قبول کر لیا ہے اور اب اس کی زندگی خطرے سے باہر ہے۔

ماں باپ نے آنکھیں بند کر کے گردن جھکا لی تھی۔ اور پھر جب صفورہ ہوش میں آئی تو اس کی دنیا بدلی ہوئی تھی۔

''مجھے کیا ہو گیا ہے؟ بیمار ہوں کیا میں؟''

''تم کیسی ہو بیٹا؟''

''ٹھیک ہوں ماما...... بالکل ٹھیک ہوں...... ڈیڈی! کیا بات ہے، آپ لوگوں کے چہرے کتنے اترے اترے نظر آ رہے ہیں؟''

''تم بیمار تھیں ناں بیٹا! تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔''

''ایکسیڈنٹ؟'' صفورہ نے کہا اور آنکھیں بند کر کے اپنی یادداشت پر زور دینے لگی۔ پھر اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں رینگ گئیں۔

''ماما...... وہ...... وہ...... کمینہ ٹنڈن گوپال...... ماما! اس نے میرے دل و دماغ پر قابو پایا ہوا تھا۔ مگر...... مگر...... ماما...... اب تو مجھے کچھ بہتر محسوس ہو رہا ہے۔''

ماں باپ کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ طاہر علی نے کہا۔

"بیٹا! تمہیں کچھ یاد ہے، ٹنڈن گوپال سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟"

اس پر صفورہ انہیں اپنی پکنک اور اس کے بعد ٹنڈن گوپال کے مل جانے کے بارے میں بتانے لگی تھی۔ اسے ساری تفصیل یاد تھی۔ اور پھر اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماما..... میں نے..... میں نے..... میں نے بابو خان کو قتل کر دیا تھا۔ اور ماما! افشاں اور اشعر..... مگر میرا قصور نہیں تھا ماما..... میں..... میں اپنے ہوش میں ہی نہیں تھی۔" صفورہ زار و قطار رونے لگی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں ناں۔" طاہر علی نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

❁

یہ تمام تفصیل معلوم کرنے کے بعد اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آگے کیا ہونا چاہئے۔ تقدیر ہارون کی راہنمائی کر رہی تھی۔ کامران سے اچھا دوست بھلا اور کون ہو سکتا تھا۔ شمسہ کو اس نے ہر طرح کی سہولت مہیا کر دی تھی اور اس کے بعد اس نے کامران سے ملاقات کی۔ کامران کو ساری کہانی سنا دی۔ کامران بھی ششدر رہ گیا۔

"یار! کیا ہمارے مذہب میں ان باتوں کی گنجائش ہے؟"

"کامران! ارواح خبیثہ کا ذکر تو ہر جگہ ملتا ہے۔ ایسی روحیں جو بھٹکتی رہتی ہیں اور انہیں برزخ میں بھی جگہ نہیں ملتی۔ اب اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس ساری کہانی میں کیا کیا حقیقتیں ہیں؟ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔"

"اور اس صندوقچی میں خزانے کا بھی تذکرہ ہے۔"

"تھوکتا ہوں میں ہر قسم کے خزانے پر۔ میرا خزانہ تو میری بیوی اور بچہ ہے۔ مجھے اپنا وہ خزانہ چاہئے جو نجانے کہاں گم ہو گیا ہے۔"

کامران سوچتا رہا اور پھر اس نے کہا۔

"میری مانیں سر! تو ہمیں سہائے پور چلنا چاہئے۔"

"میں خود اس بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اور کامران! مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب ایک ماڈرن لڑکی کے روپ میں چندر بدن مجھے ملی تھی اور ہم دونوں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ لیکن پٹرول ختم ہونے کی وجہ سے مکمل تعاقب نہیں کر سکے تھے۔"

"ہاں..... بے شک..... اور اس بات کے بھی امکانات تھے کہ اگر ہم اس دن

چندر بدن کا کامیاب تعاقب کر لیتے تو شاید سہائے پور کے اسی کھنڈر تک پہنچ جاتے جس کے نیچے یہ ساری کہانی دفن ہے۔"

"تو پھر تمہارا خیال ہے ہمیں سہائے پور چلنا چاہئے؟"

"فوراً چیف..... فوراً۔ اس میں کسی قسم کی وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

انتظامات کئے گئے اور اس کے بعد کامران اس جیپ کو ڈرائیو کر کے لے چلا جس میں اس کے ساتھ ہارون بھی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ راستے اب ہارون کو بے حد بھیانک لگتے تھے۔ ان راستوں پر بے شمار داستانیں بکھری ہوئی تھیں۔ پراسرار اور ناقابل یقین داستانیں۔ ہارون قرب و جوار میں نگاہیں دوڑائے ان داستانوں کو تلاش کرتا رہا۔ اس کی نگاہیں چندر بدن کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے چندر بدن اسے نظر آ جائے۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔

سفر جاری رہا اور اس کی آنکھوں میں اپنی بیوی اور بیٹے کی تصویر رقص کرتی رہی۔ ان کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اسے یاد آ رہا تھا۔

کامران وفادار آدمی تھا۔ ایک بہترین اور قابل اعتماد دوست۔ جس نے دوستی کے بھرم کو آج تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی نوکری داؤ پر لگا دی تھی بلکہ اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی اس نے۔

آخر کار وہ لمبے راستے سے ہوتے ہوئے سہائے پور کے ان کھنڈرات میں پہنچ گئے جہاں پہلے بھی کئی بار پراسرار طریقے سے آ چکے تھے۔ کھنڈرات مسلسل خاموشی اور سناٹے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہاں کی ایک ایک اینٹ اپنی الگ کہانی سناتی تھی۔ اس نوٹ بک میں درج شدہ معلومات کے تحت اس عمارت کو تلاش کرنا تھا جس میں یہ کہانی مدفون تھی۔ اور اس کو تلاش کرتے کرتے انہیں رات ہو گئی۔

کامران خود بھی انتہائی متجسس انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ رات کی گہری تاریکیوں میں سہائے پور کے کھنڈرات بہت ہی خوفناک نظر آ رہے تھے۔ بہت دور وہ سائٹ نظر آ رہی تھی جہاں اب بھی کیمپ لگا ہوا تھا اور سروے کا کام جاری تھا۔

جیپ ایک جگہ رک گئی۔ کامران نے کھانے پینے کا بندوبست کیا اور اس کے بعد ہلکے سے لہجے میں بولا۔

"ہارون..... میں تمہارا اسسٹنٹ ہی نہیں، تمہارا دوست بھی ہوں۔ بہت ہی برا

وقت تھا جب ہمیں اس علاقے میں ڈیوٹی پر بھیجا گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وقت ہمیں ایسی کہانی سنائے گا اور ہم اپنا اتنا کچھ کھو چکے ہوں گے۔''

''ہاں ...... یہ بات تو ہے۔ لیکن دوست! تقدیر میں تو یہ سب کچھ لکھا ہی ہوا تھا۔ ہمارے پاس اس کے علاوہ کہنے کے لئے اور کیا ہے۔ جب حالات ہمارے بس سے باہر ہوتے ہیں تو ہم ہر چیز تقدیر سے منسلک کر دیتے ہیں۔ چلو ٹھیک ہے، قسمت کو یہی منظور تھا تو یہ ہی سہی۔''

''لگتا ہے وہ جگہ ہمیں نہیں ملے گی جس کی تلاش میں ہم یہاں آئے ہیں۔''

''میں اسے بھی تقدیر کے سپرد کرتا ہوں۔ ہم کل کا دن اور کئی دن یہاں اس عمارت کی تلاش میں بسر کریں گے۔ اگر اس کا وجود ہے تو اسے تلاش کر کے ہی چھوڑیں گے۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں دوست!'' کامران نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہاں ...... میں تمہیں اپنے وجود کا حصہ سمجھتا ہوں کامران!'' ہارون متاثر لہجے میں بولا۔

''میں نہیں جانتا کہ مجھے تم سے اتنی محبت کیوں ہے۔ ... اب اس وقت میری نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی ہیں کہ کاش چندر بدن کے گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دے جائے۔ کاش وہی ہماری راہنمائی کر دے۔''

''میں نے تمہیں ان جاگتی آنکھوں کے خواب کے بارے میں بتایا تھا کامران! جب خاقان نے چندر بدن کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر بعد میں خونریزی کر کے اسے اغواء کر لیا تھا۔ وہ میرے دادا تھے۔ اور لازمی بات ہے کہ مجھ تک یہ سارا سلسلہ انہی کے ذریعے پہنچا ہے۔ ہو سکتا ہے میں اسی عتاب کا شکار ہوں۔''

کامران نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

رات گزر گئی۔ صبح ہوئی اور وہ ثابت قدمی سے ڈائری کے اشارے کے مطابق وہ عمارت تلاش کرتے رہے جو زمین میں دفن ہو چکی تھی۔

پھر تقدیر نے یاوری کی اور انہیں وہ نشانات نظر آ گئے۔ کامران ہارون کی ہدایت پر اس جگہ زمین کو کریدنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد انہیں ایک ایسی جگہ نظر آ گئی جہاں سے وہ زمین کی گہرائیوں میں اتر سکتے تھے۔ انہیں خاصی بلندی سے نیچے کودنا پڑا تھا

اور جیسے ہی ان کے پاؤں زمین سے لگے، چاروں طرف ایک ہلچل سی مچ گئی اور ماحول لرزنے لگا۔ یہ لاتعداد بڑے چمگادڑ تھے جنہوں نے اُڑنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ مکمل تیاریوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔

چنانچہ انہوں نے روشنی کے لئے لیمپ روشن کر لئے اور چمگادڑ اس سوراخ سے باہر نکل نکل بھاگنے لگے جس سے یہ اندر داخل ہوئے تھے۔

لیمپوں کی روشنی میں انہوں نے بڑا بھیانک ماحول دیکھا۔ یہ ایک باقاعدہ عمارت تھی جس میں بے شمار کمرے نظر آ رہے تھے۔ پردے، قدیم طرز کا فرنیچر۔ لیکن چھت سے کئی کئی فٹ لمبے جالے لٹکے ہوئے تھے۔ دیواروں میں طرح طرح کے سوراخ تھے۔ چمگادڑ انہی سوراخوں سے نکل کر بھاگے تھے۔

وہاں انہیں بے شمار مشعلیں بھی ملیں اور انہوں نے ان مشعلوں کو جلانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھیانک ماحول پوری طرح روشن ہو گیا۔ شمع دانوں میں شمعیں لگی ہوئی تھیں۔ فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ تب ان کی نگاہوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ پتھر کی ایک بہت چوڑی سل پر ایک عمر رسیدہ شخص پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں اور اس کے دیکھنے کے انداز میں بڑی نفرت تھی۔

لیکن اس رات کو خاقان کی جو شکل ہارون نے دیکھی تھی وہ اب بھی اس کے ذہن میں محفوظ تھی اور اس نے فوراً اسے پہچان لیا۔ یہ خاقان درانی ہی تھا۔ ہارون کچھ لمحات کے لئے سکتے میں رہ گیا۔ خاقان درانی اسے گھور رہا تھا۔ پھر اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

''تم یہاں سیدھے کیوں چلے آئے؟ ٹنڈن گوپال آزاد ہے۔ اگر تم واقعی میرا خون ہو تو تمہیں اپنے تمام مفاد حاصل کرنے کے لئے پہلے ٹنڈن گوپال کو ختم کرنا ہو گا۔ یہ میرے اور اس کے درمیان عہد ہے۔ اگر تم اسے ختم نہ کر سکے تو میری نسل کے آخری فرد ثابت ہو گے۔ ٹنڈن گوپال تمہاری بیوی اور تمہارے بیٹے کو بھی قتل کر کے میری نسل فنا کر دے گا۔ اور اگر ٹنڈن گوپال کو تم نے قتل کر دیا تو پھر ٹنڈن گوپال کی نسل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ ورنہ اپنے مقصد کے حصول کے بعد وہ اپنی نسل کو بڑھانے کی کوشش کرے گا۔''

اسی وقت مدھم مدھم سسکیوں کی آواز ابھری اور ہارون کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ کامران نے بھی گردن گھما کر دیکھا تھا۔ پتھر کی ویسی ہی سل پر چندر بدن اسی

طرح پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی جس طرح خاقان بیٹھا تھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر زمین پر گجراج نظر آ رہا تھا۔ اس ماحول نے ان دونوں کے دماغ چکرا کر رکھ دیئے تھے۔ خاقان کی گفتگو بہت عجیب تھی۔ ہارون کے قدم چندر بدن کی جانب اٹھ گئے تو خاقان کی غراہٹ ابھری۔

"رک جاؤ ...... ادھر مت جاؤ ...... رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔"

چندر بدن اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ہماری چتا دے دو مہاراج ...... ہمیں ہماری چتا دے دو ...... ہم چتا کے بغیر بھٹک رہے ہیں۔ ہم قیدی ہیں مہاراج! دیکھو، ہمارے ہاتھ پاؤں کی زنجیریں دیکھو ...... ہماری آتماؤں کو قید کر لیا گیا ہے۔"

گجراج بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بھوں بھوں کی آوازیں نکال کر رونے لگا۔ وہ دونوں ایک ہی لفظ کہہ رہے تھے۔

"ہمیں ہماری چتا ...... ہمیں ہماری چتائیں دے دو۔" دفعتہً خاقان اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ......

"اور تم نے یہ تابوت نہیں دیا ...... میں اس وقت تک اس تابوت میں نہیں جاؤں گا جب تک ٹنڈن گوپال قتل نہیں ہو جاتا۔"

دفعتہً ہی خاقان اپنی جگہ سے بلند ہوا اور اس نے ایک تیز سنسناہٹ کے ساتھ اس کا بدن خلا میں تیرتا ہوا ادھر سے اُدھر آنے جانے لگا۔ شائیں شائیں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہلکی آواز والا جہاز ادھر سے اُدھر پرواز کر رہا ہو۔ ساتھ ہی چندر بدن اور گجراج کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

"ہمیں مکتی دلا دو ...... ہمیں مکتی دلا دو ...... ہمیں ہماری چتا دے دو ...... ہمیں ہماری چتا دے دو۔"

"نہیں ...... ٹنڈن گوپال کو قتل کر دو ...... پہلے ٹنڈن گوپال کو قتل کر دو۔ جاؤ، یہاں سے چلے جاؤ۔ جب ٹنڈن گوپال قتل ہو جائے تب یہاں آنا۔ جاؤ چلے جاؤ۔ میں نے تمہاری زندگی کی حفاظت کی ہے۔ میں نے تمہیں زندہ رکھنے کے لئے حمایت علی کے پاس بھیج دیا تھا۔ ورنہ ٹنڈن گوپال سب سے پہلے تمہیں قتل کر دیتا۔ جاؤ جب میں نے تمہاری زندگی کی حفاظت کی ہے تو تم میرے عہد کی حفاظت کرو۔"

ہارون خوف کے عالم میں وہاں کھڑا رہا۔ خاقان درانی کی خوفناک آوازیں ابھر

رہی تھیں۔

"جاؤ ...... جاتے کیوں نہیں ہو ...... جاؤ ...... کیوں نہیں جاتے ...... چلے جاؤ ...... جاؤ ......" ادھر پتھر کی سل پر زنجیر سے بندھے ہوئے چندر بدن اور گجراج کی آوازیں بھی بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ غار میں جگہ جگہ سے مٹی جھڑنے لگی۔ فانوس ہلنے لگے۔ ہارون اور کامران سہمے ہوئے انداز میں اس طرف بڑھ گئے جہاں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ہارون نے بے اختیار دروازہ کھولا۔ کامران بھی اس کے پیچھے تھا۔ کھلے دروازے کے دوسری طرف کالی رات جھانک رہی تھی۔ انہیں شدید حیرت ہوئی کہ یہ دروازہ کھلے میدان میں کھلتا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک اور چیز بھی دیکھی۔ یہ بھی ایک کھنڈر نما گھر تھا جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔

کامران اور ہارون سناٹے کے عالم میں وہاں کھڑے قرب و جوار کا ماحول دیکھتے رہے۔ پھر ہارون نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"اب کیا کریں کامران؟"

کامران کے منہ سے تو آواز ہی نہیں نکل سکی تھی۔ ہارون نے تھوڑی دیر تک اپنے آپ کو سنبھالا پھر بولا۔

"آؤ ......"

اور اس کے بعد وہ اس روشنی کی جانب چل پڑے۔ کھنڈر نما مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پُرتجسس انداز میں آگے بڑھتے ہوئے اس کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر کے ماحول کو دیکھتے ہوئے انہیں ایک بار پھر حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک سادھو قسم کا آدمی ایک کمرے میں مرگ چھالہ پر بیٹھا ہوا کوئی جنتر منتر پڑھ رہا تھا۔ اس کی مدھم مدھم مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

یہ دونوں سکتے کے عالم میں اسے دیکھتے رہے۔ پھر اچانک ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تو آ گیا ...... مجھے قتل کرنے آیا ہے تو ...... تو خاقان درانی کا پوتا ہے ناں؟ پر ٹنڈن گوپال کو مارنا اتنا آسان کام نہیں ہے بالک! بڑا جیون دیا ہے میں نے اپنے کالے گیان کو۔ لے سنبھال۔" اس نے کہا اور دفعتہً ہی اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے۔ نیلے رنگ کی شعاعوں کا ایک جال ان دونوں کی طرف لپکا اور کامران نے ہارون کو دھکا دے دیا۔ دونوں گر پڑے۔ شعاعوں کا جال ان کے عقب میں دیواروں

سے ٹکرایا اور تڑاکے کے ساتھ دیوار ٹوٹ گئی۔ ہارون کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر اس شخص کی طرف چھلانگ لگا دی اور اس تک پہنچ گیا۔

ٹنڈن گوپال ہارون سے لپٹ گیا تھا۔ ہارون نے اسے کمر سے پکڑ لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اسے فضا میں بلند کر کے زمین پر دے مارا۔ کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ ہارون تو ٹنڈن گوپال سے لپٹا ہوا تھا لیکن کامران نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ لمبی سفید داڑھی، بھنوئیں تک سفید۔ انہوں نے لکڑی کا ایک ٹکڑا کامران کی طرف بڑھا کر تیزی سے کہا۔

''لے...... اپنے دوست کو دے دے۔''

کامران پُر عقیدت انداز میں پیچھے ہٹا۔ نجانے کیوں اس کے ذہن میں ایک نام گونجا تھا...... ''جلال بابا...... جلال بابا'' لکڑی کا سیاہ رنگ کا ڈنڈا اس نے عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑا۔ ادھر اس نے ٹنڈن گوپال اور ہارون کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے فرش پر لوٹیں لگا رہے تھے۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اپنے پیچھے جلال بابا کو دیکھا لیکن وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ کامران ایک دم سنبھل گیا اور پھرتی سے ہارون کی طرف دوڑا۔

''ہارون! یہ ڈنڈا لو...... یہ جلال بابا کا تحفہ ہے۔''

جلال بابا کا نام کچھ ایسی اہمیت کا حامل تھا کہ ٹنڈن گوپال نے فوراً ہی ہارون کو چھوڑ دیا اور وحشت زدہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہارون نے ڈنڈا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ ٹنڈن گوپال نے ایک دیوار کی طرف چھلانگ لگائی اور اس سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ پھر وہ دوسری دیوار کی طرف لپکا، وہاں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ اور اس کے بعد اس نے ان دونوں کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ ان دونوں کو دھکیل کر باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہارون نے بروقت عمل کیا۔ ڈنڈا پوری قوت سے ٹنڈن گوپال کے پیٹ پر لگا اور وہ ایک مکروہ چیخ کے ساتھ نیچے گر پڑا۔ اس کے بعد ہارون نے اس ڈنڈے سے اسے مارنا شروع کر دیا۔ ٹنڈن گوپال کی دلدوز چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں اور کامران کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ ہارون کو دیکھ رہا تھا۔ ہارون ہر حال میں صلح پسند اور امن پسند آدمی تھا۔ اس نے شاید کبھی کسی کو ایک تھپڑ بھی نہ مارا ہو۔ لیکن اس وقت وہ وحشیانہ انداز میں ٹنڈن گوپال کو مار رہا تھا اور ٹنڈن گوپال کی ہڈیاں تڑخ رہی

تھیں۔ ہارون ان ہڈیوں کو بری طرح کچل رہا تھا اور یہ انداز اتنا وحشیانہ تھا کہ کامران کو دیکھ دیکھ کر چکر آ رہے تھے۔

ہارون نے آخری ضرب ٹنڈن گوپال کے سر پر لگائی اور ٹنڈن گوپال دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر اوندھا زمین پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر وہ کانپتا رہا اور اس کے بعد اس کا بدن سرد ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی جو کچھ ہوا وہ خون رگوں میں منجمد کرنے والا منظر تھا۔ ٹنڈن گوپال کے تمام مسامات باریک باریک کیڑے اُگل رہے تھے...... زندہ کیڑے جو بہت تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور ٹنڈن گوپال کا بدن چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ کیڑے کروڑوں کی تعداد میں پیدا ہو گئے لیکن وہ سارے کے سارے بھاگ رہے تھے جیسے خوفزدہ ہوں...... اور پھر ٹنڈن گوپال کے بدن کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں باقی رہ گئیں...... اس کے جسم کا سارا گوشت کیڑے بن کر فرار ہو گیا اور وہ یہ منظر دیکھتے رہ گئے۔

ہارون نے کامران کی طرف دیکھا۔ کامران وحشت سے سفید پڑا ہوا تھا۔ ہارون نے کہا۔

''آؤ...... میرا خیال ہے ٹنڈن گوپال ختم ہو گیا۔'' اس نے کامران کا ہاتھ پکڑا تو کامران کا ہاتھ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ ہارون، کامران کو پکڑے ہوئے مکان کے دروازے سے باہر آ گیا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے سارے کا سارا کھنڈر زمین بوس ہو گیا۔ مٹی کا غبار فضا میں بلند ہو گیا۔ وہ لوگ تیزی سے آگے بڑھ گئے تھے۔ پھر کافی فاصلے پر رک کر مٹی کے اس غبار کو دیکھتے رہے۔ وہاں عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

ہارون تھوڑی دیر تک وہاں دیکھتا رہا اور اس کے بعد واپسی کے لئے پلٹا اور اس دروازے کو تلاش کرنے لگا جہاں سے وہ باہر نکلے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس سے مدھم مدھم روشنی باہر آ رہی تھی۔

چنانچہ ہارون اس دروازے سے اندر داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اسی کھنڈر میں تھے۔ لیکن یہاں انہوں نے جو منظر دیکھا وہ بھی انتہائی وحشت ناک تھا۔ پہلے ان کی نگاہ چندر بدن اور گجراج پر ہی پڑی تھی۔ لیکن وہاں نہ چندر بدن تھی اور نہ گجراج تھا بلکہ دو انتہائی بھیانک انسانی ڈھانچے زمین پر پڑے نظر آ رہے تھے۔ اگر ان کے پیروں میں زنجیریں نہ پڑی ہوتیں تو ہارون اور کامران بالکل نہ پہچان

پاتے کہ ان میں سے ایک ڈھانچہ چندر بدن کا ہے اور دوسرا گجراج کا تھا۔

پھر ان کی خوفزدہ نگاہیں پتھر کی اس سل کی طرف اٹھیں جہاں خاقان درانی نظر آ رہا تھا۔ لیکن یہاں کا منظر بھی قابل دید تھا۔ یہاں بھی ایک انسانی ڈھانچہ پتھر کی سل پر لیٹا ہوا تھا اور اس کا آدھا بدن کفن سے ڈھکا ہوا تھا۔

ہارون کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''خاقان درانی۔''

''ہاں...... سو فیصدی۔''

''کامران! کیا تم میرا مزید ساتھ دو گے؟''

''بولو...... کیا کرنا ہے ہارون؟''

''میرا خیال ہے کہ اس کہانی کو اسی غار میں دفن ہو جانا چاہئے۔ ان دونوں انسانی جسموں کی چتائیں جلانی ہیں اور اپنے دادا مرحوم کو مجھے قبر میں دفن کرنا ہے۔''

ہر کام قدرت کی مرضی سے ہوتا ہے۔ مشیت ایزدی کے بغیر کائنات میں پتا بھی نہیں ہل سکتا اور ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔

کامران اور ہارون زمین کی ان گہرائیوں میں زمین کھودنے میں مصروف ہو گئے تاکہ دادا کی قبر تیار کی جائے۔ لیکن کوئی دو فٹ کھدائی کے بعد ہی کھدائی کرنے والے اوزار کسی چیز سے ٹکرائے۔ اور جب مزید کھدائی کی گئی تو وہاں تانبے کے کلسے برآمد ہوئے اور ان کلسوں میں اشرفیوں اور سونے کے زیورات تھے۔ یہی وہ خزانہ تھا جس کا تذکرہ اس تحریر میں کیا گیا تھا۔ یہ دادا کا پوتے کے لئے انعام تھا۔ اب فرشتہ تو ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ خزانے کے کلسے نکال لئے گئے اور یہ تعین کر لیا گیا کہ موجودہ دور میں ان کی مالیت اتنی ہے کہ ہارون ارب پتی کہلا سکتا ہے۔ پھر باقاعدگی سے قبر بنائی گئی اور کفن دے کر خاقان درانی کو دفن کر دیا گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے اسی جگہ جہاں چندر بدن اور گجراج کے ڈھانچے موجود تھے، غار کی ایسی چیزیں جمع کرنی شروع کر دیں جو آگ پکڑ سکیں۔ وہ اس کہانی کو زمین کے اوپر نہیں لانا چاہتے تھے۔ البتہ انہوں نے چندر بدن اور گجراج کی زنجیریں ان کی ہڈیوں سے باہر نکال دی تھیں۔ انسانی جسم سے شاید ان زنجیروں کو علیحدہ کرنا ایک مشکل عمل ہوتا لیکن سوکھے ہوئے ڈھانچوں میں وہ بہت ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ چنانچہ انہیں بہت آرام سے نکال دیا گیا۔

پردوں کے ڈھیر، دروازے، کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے لکڑیوں کے ٹکڑے جمع کئے گئے۔ پھر ایک مشعل سے ان پر آگ لگا دی گئی اور ہڈیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ غار نما مکان میں دھواں بھر گیا تھا۔ یہ دھواں اسی دروازے سے باہر نکل رہا تھا یا پھر اوپر کے اس حصے سے جہاں سے یہ لوگ کود کر نیچے آئے تھے۔ ان کے دم گھٹے جا رہے تھے لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔ آخر کار دھواں اور آگ ختم ہو گئی۔ ہڈیوں کے جلنے کی بدبو فضا میں نہیں تھی۔ خاقان درانی کی قبر بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

کامران اور ہارون نے اس قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پھر کلسوں کا خزانہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ بہت زیادہ وزن تھا لیکن خزانے آسانی سے اٹھا لئے جاتے ہیں اور انسان اور گدھے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ چنانچہ دونوں گدھے یہ بوجھ لادے ہوئے باہر نکل آئے اور پھر اپنی جیپ تک پہنچنے میں انہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

البتہ جب انہوں نے خزانہ جیپ کی سیٹوں کے نیچے چھپا دیا تو کامران نے ہنس کر کہا۔

''یار! کیا واقعی ہم اتنا وزن لے کر یہاں تک آ گئے ہیں؟''

''ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ وزن ہماری توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ مگر کامران! مجھے کیا کرنا ہے اس خزانے کا۔ یار! اگر اشعر اور افشاں مجھے نہ ملے تو کیا میری زندگی کا سفر جاری رہ سکتا ہے؟''

''خدا کی ذات سے مجھے امید ہے کہ جب اس نے تمہاری منزلیں اس قدر آسان کی ہیں تو آگے کے راستے بھی وہی متعین کر دے گا۔'' اور یہ بات بالکل درست تھی۔

جیپ کو اس بار وہ اس راستے سے نہیں لائے تھے جدھر سے یہاں تک آئے تھے بلکہ انہوں نے ان ڈھلانوں کا سفر شروع کر دیا تھا جہاں وہ سائٹ تھی۔ اس وقت غالباً صبح کے چار یا ساڑھے چار بج رہے تھے۔ فضا میں اُجالے تو ابھی نہیں ہوئے تھے لیکن مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اس روشنی میں جو انہیں پہلی چیز نظر آئی وہ جلال بابا کا مزار تھا جو یہاں نمودار ہوا تھا اور مزار کے پاس ایک سل پر انہیں وہی بزرگ نظر آ رہے تھے جنہوں نے ٹنڈن گوپال کی ہلاکت کے لئے انہیں وہ ڈنڈا دیا تھا۔

کامران کے حلق سے بے اختیار آواز نکلی۔

”ہارون! جلال بابا۔“

ہارون نے اُدھر دیکھا اور پھر نجانے کیوں وہ بے اختیار ہو گیا۔ دوسرے لمحے وہ روتا ہوا مزار کی جانب بھاگا۔

”جلال بابا! مجھ سے اس دنیا کا ہر خزانہ لے لو، مجھے میری افشاں اور میرا بچہ دے دو۔ افشاں میرے لئے لاکھوں خزانوں سے بہتر ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے عزیزی! مگر میرا ڈنڈا کہاں ہے جو میں نے تمہیں ادھار دیا تھا؟ بھول آئے ناں خزانوں کے چکر میں ہماری امانت کو؟“ ہارون یہ آواز سن کر حیران رہ گیا۔ پھر بزرگ نے پیچھے رخ کر کے آواز دی۔

”افشاں بیٹی...... اشعر بیٹے! آ جاؤ...... دیکھو تمہارے ابو آئے ہیں ...... افشاں، دیکھو تمہارے شوہر آئے ہیں۔“

اور افشاں اور اشعر ایک دیوار کے پیچھے سے باہر آ گئے۔ ہارون سکتے میں رہ گیا تھا۔ کامران بھی پتھر کا بت بن گیا تھا۔ لیکن جب اشعر دوڑ کر باپ سے لپٹا اور افشاں روتی ہوئی ہارون کے قریب آ گئی تب انہیں یقین آیا کہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ سچائی ہے۔ ہارون نے ممنون نگاہوں سے جلال بابا کی طرف دیکھا لیکن وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔

ہارون بے اختیار رو پڑا۔ کامران کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ اور پھر نجانے کہاں سے ایک آواز ابھری۔

”اللہ اکبر ...... اللہ اکبر ...... اللہ اکبر ...... اللہ اکبر......“ غالباً یہ آواز نئے سہائے پور کی کسی مسجد سے آ رہی تھی۔

(ختم شد)